پاکستان کی سیاسی تاریخ 11

"نفاذ اسلام" کے نام پر
مُلّائیت اور فرقہ واریت کا آغاز

زاہد چودھری

تکمیل و ترتیب: حسن جعفر زیدی



ادارہ مطالعۂ تاریخ

پاکستان کی سیاسی تاریخ

جلد 11

''نفاذ اسلام'' کے نام پر

مُلّائیت اور فرقہ واریت کا آغاز

زاہد چودھری

تکمیل و ترتیب:

حسن جعفر زیدی

ادارہ مطالعہ تاریخ

ایڈیشن دوم

ISBN 978-969-9806-35-3

ناشر: ادارہ مطالعہ تاریخ: 66-H/2، واپڈا ٹاؤن، لاہور

Ph: + 92(0)42-35182835, **Fax:** + 92(0)42-35183166
E-mails: hjzaidi@gmail.com
khalidmehboob@tehqeeq.org
Website: www.tehqeeq.org

مطبع: شرکت پرنٹنگ پریس، نسبت روڈ، لاہور

سال اشاعت: 2014ء

قیمت: 650/- روپے

قیمت بیرون ملک: $ 32/-

فہرست

باب 4: جناح بستر مرگ پر اور مُلّاؤں کی مسند اقتدار کے لئے دوڑ

باب5: جہاد کشمیر کے لئے حکومت نے اسلام کا نام استعمال کر کے ملاؤں کو دبالیا، جنگ بندی کے بعد ملاؤں نے اقتدار کے حصول کے لئے پھر یلغار کردی

باب 7: احراری مولویوں کی طرف سے احمدیوں کے خلاف بھرپور مہم کا پس منظر

باب 8: ملاؤں نے جاگیرداری اورزمینداری نظام کے حق میں فتوے دیئے اور کسانوں کے لئے زرعی اصلاحات کی مخالفت کی

باب 9 : پنجاب میں دولتانہ۔ممدوٹ دھڑوں کی سیاسی کشمکش میں احراری ملا دولتانہ دھڑے کے ساتھ، جماعت اسلامی ممدوٹ دھڑے کے ساتھ

باب10: ملک میں اسلامی نظام کے بارے میں مختلف تاویلیں اور لیاقت کی دورۂ امریکہ میں اسلام اور مغربی جمہوریت کی یکسانیت پر تقریریں

باب 11: آئین سازی کے لئے بنیادی اصولوں اور بنیادی حقوق کی رپورٹوں کو ملاؤں نے خلاف اسلام قرار دے دیا

باب 12: پنجاب کی انتخابی مہم...... پنجابی شاونسٹوں اور ملاؤں کی جانب سے لیاقت کے خلاف نفاذ اسلام کی مہم

باب 13: ملک میں مذہبی جنون کی فضا اور لیاقت علی کا قتل

دیباچہ ایڈیشن دوم

دیباچہ ایڈیشن اوّل

کہا جاتا ہے کہ اگر ایک جھوٹ بار بار اس طرح دہرایا جائے کہ اس پر سچ کا گمان ہو تو وہ واقعی سچ معلوم ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح قیام پاکستان کے فوراً بعد سے ایک جھوٹ اس طرح بار بار دہرایا گیا کہ عام آدمی کو بھی اس پر سچ کا گمان ہونے لگا۔ اور وہ جھوٹ یہ تھا کہ یہ ملک قرون وسطیٰ کا ''اسلامی نظام حکومت'' قائم کرنے کے لئے حاصل کیا گیا ہے۔ اس نعرہ سے وابستہ مختلف مفادات کے نمائندہ گروہ تھے اور ہر گروہ اس ''اسلامی نظام حکومت'' کی اپنے حساب سے تشریح کرتا تھا۔ ملاؤں کے نزدیک اس سے مراد قرون وسطیٰ کا دور ملوکیت ہوتا تھا جس میں ملا بطور قاضی و مفتی حکمران انتظامیہ میں ایک اہم عہدہ دار ہوا کرتے تھے، مسلم لیگ کے حکمران ٹولہ کے نزدیک اس سے مراد ایک ایسا نظام تھا جس میں بظاہر مغربی جمہوریت اور قرون وسطیٰ کے خلافتی نظام کا امتزاج نظر آئے اور یہ اسلامی نظام کی جدید تعبیر و تشریح سے آراستہ ہو لیکن حقیقتاً یہ ایک ایسا استبدادی نظام ہو جس کے ذریعے عوام کو ان کے جمہوری، معاشی اور صوبائی حقوق سے محروم رکھا جا سکے۔ پنجابی شاؤنسٹوں کے نزدیک اس کا مطلب یہ تھا کہ بنگالیوں، سندھیوں، پٹھانوں اور بلوچوں کو ان کے جائز قومی اور جمہوری حقوق سے محروم کر کے ان پر پنجابی درمیانہ طبقہ کی بالادستی قائم کی جائے۔ کراچی کے مہاجروں کے نزدیک اس اسلامی نظام کی تشریح یہ تھی کہ وہ اسلام کے نام پر ہندوستان چھوڑ کر یہاں آئے ہیں لہٰذا اُنہیں یہ حق دیا جائے کہ وہ پاکستان کے علاقوں میں آباد پنجابیوں، بنگالیوں، سندھیوں، پٹھانوں اور بلوچوں کو اپنی رعایا بنا کر ان پر بلاشرکت غیرے حکمرانی کریں کیونکہ ویسے بھی وہ خود کو ان سب سے بڑھ کر مہذب اور تعلیم یافتہ ہونے کی سند عطا کرتے تھے۔ اور جب بنگالی، سندھی، پٹھان اور بلوچ ان گروہوں کی جانب سے یہ نعرہ سنتے تھے تو وہ پریشان ہوتے تھے کہ ان کے ہی دین کو انہیں جمہوری

معاشی اور ثقافتی حقوق سے محروم کرنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے، اب وہ کدھر جائیں اور اپنا حق کس سے اور کیسے مانگیں؟ عام آدمی کی بھی یہی مشکل تھی کہ جاگیردار، سرمایہ دار اور بالا دست طبقات نے اپنے مفادات کی خاطر ایک ایسی ڈھال سامنے کر دی تھی جس سے مسلم عوام الناس اپنے دل کی گہرائیوں سے عقیدت و محبت رکھتے تھے اور اس کے نام پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کا جذبہ رکھتے تھے۔

پاکستان کن عوامل کے تحت اور کن حالات کے پس منظر میں وجود میں آیا، اس کا تفصیلی جائزہ اس سلسلہ اشاعت کی پہلی دو جلدوں ☆ میں لیا جا چکا ہے۔ ان حالات میں کبھی کہیں کسی جگہ پر نہیں کہا گیا تھا کہ اس ملک کا مطالبہ اسلامی نظام حکومت قائم کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ مسلم لیگ کی کسی بھی قرارداد میں خواہ وہ 1940ء کی قرارداد لاہور ہو یا 1946ء کی قرارداد دہلی ہو، یہ نہیں کہا گیا تھا کہ مسلم اکثریت پر مشتمل یونٹوں کو یکجا کر کے علیحدہ ملک اس لئے تشکیل دیا جائے کہ اس میں اسلامی نظام حکومت کا نفاذ کیا جا سکے۔ علامہ اقبال کے 1930ء میں الہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے خطبہ میں بھی ہندوستان کے وفاق کے دائرہ میں رہتے ہوئے شمال مغربی صوبوں یعنی پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان پر مشتمل ایک صوبائی خودمختار ریاست تشکیل دینے کی تجویز پیش کی گئی تھی جسے وفاقی امور میں ہندوستان کی وفاقی حکومت کے ماتحت قرار دیا گیا تھا ☆ لہٰذا اس میں اس اسلامی نظام حکومت کے نفاذ کا کوئی تصور نہیں تھا جس کا مطالبہ 1947ء میں قیام پاکستان کے بعد ملاؤں اور دیگر مفاد پرست طبقوں نے کرنا شروع کر دیا تھا۔ 1946ء میں مسلم لیگ نے حکومت برطانیہ کے وزارتی مشن منصوبہ کو قبول کیا اور اس کے تحت انتقال اقتدار کے فارمولے پر عملدرآمد کے لئے وائسرائے کی عبوری حکومت میں شمولیت اختیار کی۔ وزارتی مشن منصوبہ میں مجوزہ گروپنگ سکیم کے تحت مسلم اکثریتی صوبوں، پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان پر مشتمل گروپ الف اور بنگال و آسام پر مشتمل گروپ ب اور ہندو اکثریت کے صوبوں پر مشتمل گروپ ج تینوں ایک ہی وفاقی مرکز کے ماتحت رکھے گئے تھے اور یہ ساری سکیم ایک سیکولر نظام کی سکیم تھی۔ مسلم لیگ نے نہ صرف اس سکیم کو منظور کیا بلکہ قائداعظم جناح نے آخر وقت تک اس سکیم پر عملدرآمد کروانے کی کوشش کی، وہ لیاقت علی کے ہمراہ دسمبر 1946ء میں لندن بھی اسی مقصد کے لئے گئے اور برطانوی وزیراعظم ایٹلی اور دیگر برطانوی زعما کو وزارتی مشن منصوبہ پر

☆ پاکستان کی سیاسی تاریخ جلد اول و دوم۔ پاکستان کیسے بنا؟ ادارہ مطالعہ تاریخ لاہور

عملدرآمد کے لئے کوئی راستہ نکالنے کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر کانگرسی رہنماؤں کی طرف سے اس گروپنگ سکیم کو سبوتاژ کیا گیا اور یہ منصوبہ ناکام ہوگیا۔ اس کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے جو پاکستان تشکیل دیا وہ مسلم لیگ کا مطلوبہ پاکستان نہیں تھا بلکہ کانگرس کا تجویز کردہ کٹا پھٹا پاکستان تھا جس میں بنگال اور پنجاب کو تقسیم کر کے بنگالی ہندوؤں کی اکثریت اور پنجاب کے سکھوں اور ہندوؤں کو مسلم لیگ کے مطالبہ میں شامل سیکولر پاکستان کے علاقے سے علیحدہ کروا دیا گیا تھا۔

تاہم 14 راگست 1947ء کو جیسا بھی کٹا پھٹا پاکستان بنا تھا، اس کے خدوخال سیکولر تھے، اس کے آئین کی بنیاد رکھتے ہوئے قائداعظم جناح نے جو کہ گورنر جنرل اور صدر آئین ساز اسمبلی ہونے کے علاوہ بابائے قوم کا درجہ بھی رکھتے تھے، واشگاف الفاظ میں 11 راگست 1947ء کو آئین ساز اسمبلی میں فرمایا تھا کہ آج سے نہ ہندو ہندو ہیں، نہ مسلمان مسلمان ہیں، نہ عیسائی عیسائی ہیں، نہ پارسی پارسی ہیں اور نہ سکھ سکھ ہیں بلکہ تمام پاکستانی ہیں۔ جہاں تک حکومت اور کاروبار حکومت کا معاملہ ہے، مذہب کا اس سے کوئی سروکار نہیں ہوگا۔ ہاں البتہ مذہب ایک نجی معاملہ ہوگا اور عقائد کی مکمل آزادی ہوگی۔ یہ تقریر پاکستان کے آئین کا سنگ بنیاد تھی اور اسے آئین کا دیباچہ ہونا چاہیے تھا۔ بابائے قوم نے پاکستان کی دستور سازی کی اسی روح کے تحت ایک ہندو اچھوت رہنما جوگندر ناتھ منڈل کو پاکستان کا وزیر قانون مقرر کیا تھا تا کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ اس ملک کا قانون سیکولر ہوگا۔ اگر بابائے قوم اس ملک میں شرعی قوانین کا نفاذ چاہتے تو وہ مولانا شبیر احمد عثمانی کو وزیر قانون مقرر کرتے جو کہ دستور ساز اسمبلی کا رکن بھی تھا اور بعد میں اسلامی نظام کے نفاذ کا علمبردار بھی بن گیا تھا۔ جس ملک کا پہلا وزیر قانون ایک ہندو تھا کیا وہ ملک شرعی قوانین کے نفاذ کے لئے بنایا گیا تھا؟ ایک اور اہم وزارت امور خارجہ کی تھی جس پر بابائے قوم نے ایک اعلانیہ احمدی سر محمد ظفر اللہ خاں کو متعین کیا تھا۔ جو اس وقت تو نہیں البتہ 1974ء میں ایک غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا تھا۔ یہاں ایک سیدھا سا سوال ہے کہ کیا بابائے قوم، بانیء پاکستان، حضرت قائداعظم محمد علی جناح رحمت اللہ علیہ قیام پاکستان کی روح سے نابلد تھے۔؟ انہیں نظریہ پاکستان اور اس کی نظریاتی سرحدوں کا علم نہیں تھا؟ اور کیا قیام پاکستان کی روح، نظریہ پاکستان اور اس کی نظریاتی سرحدوں کا ادراک صرف ان فتویٰ فروش ملاؤں کو تھا جنہوں نے بڑھ چڑھ کر قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی۔؟ قائداعظم کو کافرِ اعظم اور پاکستان کو ناپاکستان کہا تھا۔؟ آج انہی ملاؤں کی ریشہ

دوانیوں کا نتیجہ ہے کہ پورا ملک ملائیت اور فرقہ واریت کے شعلوں میں بھسم ہوا جارہا ہے۔ محب وطن عوام پریشان ہیں اور ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ اس ملک کا کیا بنے گا۔؟ اس سوال کا جواب مذکورہ بالا سوالوں کے جواب میں پنہاں ہے۔ اس گھٹاٹوپ تاریکی میں جہاں ملائیت کا عفریت دندنا رہا ہے، آج بھی قائد کی 11 راگست 1947ء کی دستور ساز اسمبلی کی تقریر میں سے بہتری کی امید کی ہلکی سی کرن نظر آسکتی ہے۔ محب وطن قوتوں کے لئے یہی ایک مشعل راہ ہے۔

زیرنظر جلد میں اسی پس منظر کو بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح قائد کی دی ہوئی مشعل ہدایت کو حکمران طبقوں نے نظر انداز کیا اور تحریک پاکستان کے مخالف ملاؤں نے اپنی دکان چمکانے کے لئے، عوام کے مذہبی جذبات سے کھیلتے ہوئے نفاذِ شریعت کے نعروں کا سہارا لیا اور فرقہ واریت کو ہوا دے کر عوام کی توانائیوں کو تخریب اور تشدد کی نذر کر دیا۔ ملاؤں نے اس ناپاک کھیل کا آغاز قیام پاکستان کے چند ماہ بعد ہی کر دیا تھا جب قائد کی صحت نے جواب دے دیا تھا اور وہ صاحب فراش ہو گئے تھے۔ بعدازاں لیاقت علی خان اور اس کے اتحادی جاگیردار دھڑے نے اسلام کے نعرے کو اپنی آمرانہ روش اور صوبوں کو ان کے جائز جمہوری حقوق سے محروم کرنے کے لئے استعمال کیا۔ نوزائیدہ ملک کو درپیش مسائل کو تدبیر، فراست، فراخدلی اور جدید جمہوری طرز سیاست کے ذریعے حل کرنے کے بجائے لوگوں کے مذہبی جذبات اور قومی احساسات سے فائدہ اٹھا کر کھوکھلے نعروں کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔ مختلف مفاد پرست طبقات اپنے اپنے مفادات کے لئے ان نعروں کا سہارا لیتے رہے۔ داخلی اور خارجی تضادات کو ان نعروں کے سیلاب میں غرق کرنے کی کوشش کی گئی۔ تجریدی اور بے معنی فقروں پر مشتمل قرارداد مقاصد منظور کر کے ان مسائل سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن مسائل اور تضادات نہ اس طرح حل ہو سکتے تھے، نہ ہوئے۔ ان کی شدت میں اضافہ ہوا بلکہ قرارداد مقاصد سے ملاؤں کے ہاتھ میں ایک ایسا ہتھیار آ گیا جسے انہوں نے بڑھ چڑھ کر استعمال کیا اور ملک کو بعض ایسے اندرونی فرقہ وارانہ تنازعات سے بھی دوچار کر دیا جو اس سے پہلے علمی سطح پر تو تھے مگر پُرتشدد تنازعہ نہ بنے تھے۔ اس ملک کے حقیقی تضادات جن میں علاقائی قومیتوں کی خودمختاری اور جمہوری حقوق کا مسئلہ سرفہرست تھا، جن کا احوال اس سلسلہ کی گزشتہ کئی جلدوں میں تفصیلاً بیان کیا جا چکا ہے، حکمرانوں نے حب الوطنی اور جمہوری تقاضے سے انحراف کرتے ہوئے اسے حل نہ کیا جس سے لوگوں کے درمیان فاصلے اور نفرتیں بڑھتی گئیں، ملاؤں

نے اس میں فرقہ وایت کا زہر گھول کر قوم کو مزید تقسیم کر دیا۔طویل عرصہ تک ملک کا آئین نہ بن سکا، نہ جمہوریت پنپ سکی، نہ ترقی اور خوشحالی کا دور شروع ہو سکا۔

زیرِ نظر جلد میں ملک کی آئین سازی کی ابتدائی تاریخ بھی آ گئی ہے۔ اسلام کے نام پر آئین سازی کو کس طرح سبوتاژ کیا جاتا رہا اور ملک کے عوام کو آئینی اور جمہوری حقوق سے برابر محروم رکھا جاتا رہا، اس کے صرف ابتدائی برسوں کی تاریخ ہی اتنے مواد سے بھری ہوئی ہے کہ اس جلد میں اگست 1947ء سے اکتوبر 1951ء میں لیاقت علی خان کے قتل تک اس موضوع کا احاطہ کیا جا سکا ہے۔آج کے دور تک کا احاطہ کرنے کے لئے مزید کئی جلدیں درکار ہوں گی۔ تاہم یہ جلد آئندہ کے مطالعہ کے لئے ایک فریم ورک یا بنیادی ڈھانچہ فراہم کر دیتی ہے۔ جیسا کہ گزشتہ جلدوں میں مختلف قومیتی اور قومی تضادات اور مسائل کے آغاز کا احاطہ کیا گیا ہے اور ایک بنیاد فراہم کر دی گئی ہے جس پر پاکستان کی آج تک کی سیاسی تاریخ کی عمارت استوار کی جا سکتی ہے۔ تمام اہم تضادات کی نشاندہی کر دی گئی ہے جو آج تک جوں کے توں موجود ہیں اور ان سے نمٹنے کے لیے حکمران طبقوں نے جن غیر جمہوری طریقوں کا آغاز میں استعمال کیا تھا، وہ بھی آج تک انہی طریقوں پر عمل پیرا ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ اشاعت کی تمام جلدیں ایک بنیادی تناظر مہیا کر دیتی ہیں جن پر بعد کے حالات وواقعات کو بھی بآسانی سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے۔

اس جلد کے ساتھ پاکستان کی سیاسی تاریخ کی گیارہ جلدیں مکمل ہو گئی ہیں۔حسب سابق اس سارے کام میں جو ٹیم ورک اور ٹیم سپرٹ شروع سے رہی ہے، اس جلد کی اشاعت بھی اس کے بغیر ممکن نہ تھی۔ خالد محبوب صاحب جو میرے بہترین دوست بھی ہیں، دست راست بھی ہیں، اس کی پروف ریڈنگ اور اشاریہ کی تیاری کے علاوہ اس جلد میں استعمال شدہ بیشتر مواد جمع کرنے کے لئے بھی ذمہ دار ہیں۔ سمیع اللہ ظفر ہمیشہ کی طرح اس ٹیم ورک میں روح رواں کا کردار ادا کرتے رہے ہیں۔صدیق درانی صاحب کی شفقت تو ہمیشہ شامل حال رہی ہے لیکن زیر نظر جلد میں وہ مواد بھی استعمال کیا گیا ہے جو درانی صاحب نے مرکزی اسمبلی لائبریری اسلام آباد سے پہلی دستور ساز اسمبلی کی کارروائیوں سے حاصل کر کے دیا تھا۔ ڈاکٹر مبشر حسن صاحب، دلاور محمود صاحب، شیخ منظور حسین صاحب، صفدر قریشی صاحب، محمد اورنگ زیب صاحب، خورشید عالم صاحب، حسین نقی صاحب، مہدی حسن صاحب، قمر عباس صاحب اور ثائر علی صاحب کی شفقت،

تعاون اور حوصلہ افزائی شامل حال نہ ہوتی تو یہ سلسلہ گیارہویں جلد تک نہ پہنچ پاتا۔ ان تمام حضرات کا خلوص اور ایک مقصد کے ساتھ کمٹ منٹ اس عظیم کام کی انجام دہی میں ہمہ وقت مجھے حوصلہ عطا کرتے رہے ہیں۔ مصطفی وحید صاحب اس سلسلہ کی طباعت واشاعت کی گرانقدر ذمہ داری کو جس لگن کے ساتھ نبھا رہے ہیں اس کی مثال آج کے پرآشوب دور میں بہت کم نظر آتی ہے۔ ان کے بھائی آصف محمود اور معاون نعیم احسن بھی اس ذمہ داری کی تکمیل میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کرتے اور خوب سے خوب تر کے لئے کوشش کرتے ہیں۔

اس جلد کے ماخذ حسب سابق زیادہ تر اوریجنل ہیں۔ یعنی زیادہ مواد اخبارات کی فائلوں سے لیا گیا ہے۔ جن میں نوائے وقت، انقلاب، امروز، پاکستان ٹائمز، ڈان اور سول اینڈ ملٹری گزٹ نمایاں ہیں...... علاوہ ازیں پہلی دستور ساز اسمبلی کی طبع شدہ کاروائیوں، 1953ء کی اینٹی احمدیہ ایجی ٹیشن کی عدالتی تحقیقاتی رپورٹ جو منیر انکوائری رپورٹ کے نام سے بھی مشہور ہے، استفادہ کیا گیا ہے۔ ابوالاعلیٰ مودودی کی قیام پاکستان سے پیشتر اور بعد کی تمام تحریریں اوریجنل سے Quote کی گئی ہیں، کہیں بھی ثانوی ماخذ استعمال نہیں کیا گیا۔ جن لائبریریوں سے مواد جمع کیا گیا ہے ان میں پنجاب پبلک لائبریری لاہور، پنجاب یونیورسٹی ریسرچ سوسائٹی لائبریری لاہور، عجائب گھر لائبریری لاہور، پاکستان ٹائمز ریفرنس سیکشن، ریکارڈ روم نوائے وقت، ادارہ طلوع اسلام لاہور اور مغلپورہ سوشل ویلفیئر سوسائٹی لائبریری شامل ہیں۔ ان لائبریریوں کے لائبریرین صاحبان اور عملہ کے افراد کا میں اور خالد محبوب بے حد ممنون ہیں جنہوں نے اپنی سہولیات کے استعمال میں ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔

قارئین نے گزشتہ دس جلدوں کی پذیرائی کر کے جو حوصلہ اور ہمت دی اس کی بدولت یہ گیارہویں جلد پیش کرنے جا رہا ہوں۔ آپ کا تعاون اور پذیرائی اسی طرح ملتی رہی تو عنقریب یہ سلسلہ پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے گا۔ اگر اس جلد میں کوئی کوتاہی یا کمی رہ گئی ہے تو اس کا میں ذمہ دار ہوں، اسے اگلے ایڈیشن میں دور کر دیا جائے گا۔ آپ کے مشوروں اور رہنمائی کا ہمیشہ منتظر رہوں گا۔

لاہور　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　حسن جعفر زیدی

اگست 1996ء

باب:1

قائداعظم کا سیکولر نظریہ حکومت اور کراچی و پنجاب کے رجعت پسندوں کی طرف سے اس کی مخالفت

سیاسی مسائل پر قابو پانے کے لئے رجعت پسندوں کی طرف سے جابرانہ اقدامات کے علاوہ اسلام کا سیاسی حربہ استعمال کرنے کی کوشش

کراچی اور پنجاب کے حکمران طبقوں نے 14 راگست 1947ء کو قیام پاکستان کے بعد اپنے اقتدار کے ابتدائی چار سالوں میں بنگالیوں، بلوچوں، سندھیوں اور پٹھانوں کے قومیتی تضادات کی وجہ سے پیدا شدہ سیاسی مشکلات پر قابو پانے کے لئے خارجی طور پر پاکستان اور ہندوستان کے درمیان قومی تضادات کا سہارا لینے کے علاوہ داخلی طور پر کئی ایک جابرانہ اقدامات بھی کئے مگر یہ سب بے اثر ثابت ہوئے اور داخلی سیاسی مشکلات میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ جب 16 راکتوبر 1951ء کو وزیراعظم لیاقت علی خان جاں بحق ہوا تو وہ اپنے پیچھے ان مشکلات کا ایسا انبار چھوڑ گیا تھا جس میں مملکت خداداد پاکستان کی تخریب و بربادی کے بہت سے خطرات موجود تھے۔ قومیتی تضادات کے حل کے لئے جو سب سے پہلے غیر جمہوری اقدامات کئے گئے تھے وہ یہ تھے کہ 48-1947ء میں صوبہ سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو اور سندھ میں محمد ایوب کھوڑو کی وزارت کو برطرف کر دیا گیا حالانکہ ان دونوں وزارتوں کو اسمبلیوں میں اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ پھر قانون آزادیٔ ہند (1947ء) میں ایک نئی دفعہ 92 الف کا اضافہ کر کے صوبائی گورنروں کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ ''ہنگامی حالات'' پیدا ہو جانے کی صورت میں نمائندہ وزارت کو برطرف کر کے اپنے صوبوں میں گورنر جنرل کا راج نافذ کر سکتے تھے، پھر جنوری 1949ء میں عوامی نمائندوں یعنی وزارت کی نااہلی کا قانون منظور کر کے یہ قرار دیا

گیا کہ اگر کسی وزیر کے خلاف سپیشل ٹربیونل کی عدالت میں رشوت ستانی، اقربا نوازی اور دوسری بدعنوانیوں کے الزامات ثابت ہو جائیں تو وہ گورنر جنرل کی مقررہ میعاد تک کسی پبلک عہدہ پر فائز نہیں ہو سکے گا اور پھر اکتوبر 1949ء میں پبلک سیفٹی قانون نافذ کر کے حکومت کے سیاسی مخالفین کو مقدمہ چلائے بغیر نظر بند کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا بعد ازآں حالیکہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اسی مقصد کے لئے فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز کا استعمال ہو رہا تھا۔ 1950ء میں یہ پروگرام بنایا گیا کہ پہلے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں اور پھر مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں ایسے مسلم لیگی لیڈروں کو بہر صورت کامیاب کرایا جائے گا جن سے کسی مخالفت کی توقع نہیں ہو گی۔ اس پروگرام میں عمل درآمد کی ابتدا 1951ء کے اوائل میں، پنجاب اسمبلی کے ''انتخابات'' سے ہوئی۔ عام خیال یہ تھا کہ آئندہ دو ایک سال میں دوسری اسمبلیوں کے ''انتخابات'' کے لئے بھی ایسا ہی ڈھونگ رچایا جائے گا اور جو کوئی اس ڈھونگ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے گا اس پر اسلامی اتحاد و یکجہتی اور مسلم قومیت کی دشمنی کا ٹھپہ لگا دیا جائے گا۔

پاکستان میں اسلام کو بطور سیاسی حربہ استعمال کرنے کی کوشش اگست 1947ء ہی سے شروع ہو گئی تھی اور اس امر کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے کہ اس نوزائیدہ ملک میں رجعت پسند جاگیرداروں اور دقیانوسی مذہبی پیشواؤں کے علاوہ درمیانہ طبقہ کے ایسے مفاد پرست عناصر موجود ہوں گے جو اسے ترقی و خوشحالی کی راہ پر چلانے کی ہر کوشش کی مذہب کے نام پر مزاحمت کریں گے۔ انہوں نے پہلے دن ہی سے ملک میں ایسے نظام حکومت کا نقشہ کھینچنا شروع کر دیا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ یہ لوگ وطن عزیز کو مُلّائیت کے ایسے غار میں دھکیلنے کا عزم رکھتے ہیں جہاں سے اس کی سلامتی کے ساتھ واپسی ممکن نہیں ہو گی۔ یہ لوگ اعلانیہ چاہتے تھے کہ ''پاکستان کی دینی ریاست میں قرون وسطیٰ کا ایک ایسا خلافتی نظام رائج ہونا چاہیے جس میں امیر المومنین کو کلی اختیارات حاصل ہوں۔ خلیفہ کی امداد کے لئے دینی علوم کے ماہرین پر مشتمل ایک ایسی مجلس شوریٰ ہونی چاہیے جس میں ذمیوں یعنی غیر مسلموں کو رکنیت یا رائے دہندگی کا حق نہیں دیا سکتا۔ فوج میں ذمیوں سے کوئی خدمت نہیں لینی چاہیے ان کی فوجی حفاظت کی ذمہ داری صرف مسلمانوں پر عائد ہونی چاہیے اور ان سے صرف جزیہ لینے پر اکتفا کرنا چاہیے۔ سول انتظامیہ میں کلیدی مناصب اور وہ عہدے جو پالیسی کے تعین و تحفظ سے تعلق رکھتے ہیں کسی صورت بھی ذمیوں کو نہیں دیئے جا سکتے

ہیں البتہ محض کارکنوں کی حیثیت سے ذمیوں کی خدمات حاصل کرنے میں مضائقہ نہیں ہوگا۔"

بابائے قوم کا دستور ساز اسمبلی میں واشگاف اعلان کہ مذہب کا سیاست اور کاروبار حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہوگا

مغربی پاکستان کے بعض جاگیرداروں، مُلّاؤں، اور درمیانہ طبقہ کے بعض اخبار نویسوں کی طرف سے نظام حکومت کے بارے میں اس تھیوکریٹک تصور کی تشہیر اس حقیقت کے باوجود ہوئی کہ بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح نے قیام پاکستان سے تین روز قبل 11 راگست 1947ء کو دستور ساز اسمبلی میں جو پہلی پالیسی تقریر کی تھی وہ اس تصور کے بالکل برعکس تھی۔ اس تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ پاکستان میں مغرب کی طرز کا جدید جمہوری نظام رائج ہوگا جس میں ملک کے سارے شہریوں کو بلالحاظ مذہب وملت اور رنگ ونسل مساوی حقوق حاصل ہوں گے اور مذہب کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ قائداعظم نے ہندوستان کے مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل اس نئی مملکت کے بارے میں بنیادی اصولوں کی تشریح کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اگر ہم پاکستان کی اس عظیم مملکت کو خرم وخوشحال بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ ہم باشندوں کی خصوصاً عوام اور غربا کی فلاح وبہبود پر اپنی تمام کوششیں مرتکز کردیں۔ اگر تم باہم تعاون سے کام کروگے، ماضی کو بھول جاؤ گے اور مخالفتوں کو ترک کردوگے تو تم لازماً کامیاب ہوجاؤ گے۔ اگر تم اپنے ماضی کو بدل دوگے اور اس سپرٹ میں متحد ہوکر کام کروگے کہ تم میں سے ہر ایک خواہ وہ کسی کمیونٹی سے تعلق رکھتا ہو، خواہ ماضی میں اس کے تعلقات تمہارے ساتھ کیسے ہی رہے ہوں، خواہ اس کا رنگ، اس کی ذات اور اس کا عقیدہ کچھ بھی ہو اول، دوم اور آخر اس مملکت کا شہری ہے جس کے حقوق وفرائض بالکل مساوی ہیں، تو تمہارے عروج وترقی کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔ میں اس معاملے میں انتہائی زور دینا چاہتا ہوں۔ ہمیں اس سپرٹ میں کام شروع کردینا چاہیے۔ کچھ مدت میں اکثریت اور اقلیت اور ہندو کمیونٹی اور مسلم کمیونٹی کی یہ تمام بدنمائیاں غائب ہوجائیں گی، کیونکہ آخر مسلمان ہونے کی حیثیت میں بھی تمہارے ہاں پٹھان، پنجابی، شیعہ، سنی وغیرہ موجود ہیں اور ہندوؤں میں بھی برہمن، ویش، کھتری اور پھر بنگالی، مدراسی وغیرہ ہیں۔ اگر مجھ سے پوچھو تو میں یہ کہوں گا کہ یہ چیز ہندوستان کی آزادی وخودمختاری کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ رہی ہے۔ اگر یہ بات نہ

ہوتی تو ہم مدتوں پہلے آزاد ہو چکے ہوتے۔ دنیا کی کوئی طاقت کسی قوم کو خصوصاً چالیس کروڑ نفوس کی قوم کو اپنا محکوم نہیں رکھ سکتی۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو کوئی تم کو مفلوج نہ کر سکتا اور اگر کر بھی لیتا تو زیادہ مدت تک تم پر اپنا تسلط قائم نہ رکھ سکتا (چیئرز)۔لہٰذا اس سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیے۔ تم آزاد ہو، اس مملکت پاکستان میں تم اپنے مندروں میں آزادانہ جاسکتے ہو اور مساجد اور دوسری عبادت گاہوں میں بھی جانے میں آزاد ہو۔ تمہارا مذہب، تمہاری ذات، تمہارا عقیدہ کچھ بھی ہو، کاروبار مملکت کا اس سے کوئی تعلق نہیں (ہیئر ہیئر)۔تم جانتے ہو تاریخ شاہد ہے کہ کچھ مدت پیشتر انگلستان کے حالات آج کل کے ہندوستان کے حالات سے بدتر تھے۔ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ایک دوسرے کو تکلیف پہنچانے میں مصروف تھے۔ آج بھی بعض ایسی مملکتیں موجود ہیں جن میں ایک خاص طبقے کے خلاف استبدادیت و قیود عائد کی جارہی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم ایسے ایام میں اپنی مملکت کا آغاز نہیں کر رہے ہیں۔ ہمارا آغاز ایسے ایام میں ہو رہا ہے جب ایک قوم اور دوسری قوم، ایک ذات اور مسلک اور دوسری ذات اور مسلک کے درمیان کوئی فرق وامتیاز نہیں رہا۔ ہم اس بنیادی اصول کی بنا پر آغاز کر رہے ہیں کہ ہم تمام شہری ہیں اور ایک مملکت کے مساوی شہری ہیں (پرزور اظہار مسرت)۔ انگلستان کے لوگوں کو بھی ایک زمانے میں صورت حالات کے حقائق کا سامنا کرنا پڑا تھا اور ان ذمہ داریوں اور گراں باریوں سے بھگتنا پڑا تھا جو ان کی حکومت نے ان پر عائد کی تھیں اور وہ اس آگ میں سے قدم بقدم گزر چکے ہیں۔ آج تم بجا طور سے کہہ سکتے ہو کہ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کا کوئی وجود باقی نہیں۔ آج صرف یہ حقیقت موجود ہے کہ ہر شخص برطانیہ عظمیٰ کا شہری ہے۔ ہر شہری کی حیثیت مساوی ہے اور تمام شہری ایک قوم کے افراد ہیں۔ میرے نزدیک ہمیں اس نصب العین کو پیش نظر رکھنا چاہیے پھر تم دیکھو گے کہ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد نہ ہندو ہندو رہیں گے نہ مسلمان مسلمان رہیں گے۔ مذہبی معنوں میں نہیں کیونکہ وہ تو ہر فرد کا ذاتی عقیدہ ہے بلکہ سیاسی معنوں میں سب ایک مملکت کے شہری ہوں گے۔''[1]

قائداعظم جناح کی اس تاریخی تقریر کے خاتمہ پر ایوان کے سارے ارکان نے پرجوش تالیوں کے ذریعے اس کے نفس مضمون سے اتفاق کا اظہار کیا تھا اور کسی ایک رکن نے بھی اس تقریر کے کسی بھی حصے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا حالانکہ اس میں غیر مبہم الفاظ میں اعلان کیا گیا تھا کہ پاکستان کے سارے شہری برطانیہ کے رومن کیتھولکوں اور پروٹسٹنٹوں کی طرح بلالحاظ

مذہب وملت اور بالکل مساوی حیثیت سے ایک قوم کے رشتے میں منسلک ہوں گے اور یہ کہ مذہب ہر فرد کا ذاتی عقیدہ ہے اور اس کا کاروبار مملکت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس تقریر میں مسلمانوں اور ہندوؤں لئے نیشن (Nation) کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا تھا بلکہ ان کے لئے کمیونٹی (Community) کے لفظ کا استعمال ہوا تھا اور کہا گیا تھا کہ کچھ عرصہ کے بعد ان اکثریتی اور اقلیتی فرقوں کی بدنمائیاں غائب ہو جائیں گی اور یہ کہ ان دونوں فرقوں کے درمیان امتیازات کی نوعیت بالکل ایسی ہی ہے جیسی کہ پٹھانوں، پنجابیوں، شیعوں، سنیوں، برہمنوں، وشنوؤں، کھتریوں، بنگالیوں، مدراسیوں، رومن کیتھولکوں اور پروٹسٹنٹوں کے درمیان ہوتی ہے۔ اس تقریر کے بعد ایوان نے بابائے قوم کے لئے عقیدت وتشکر کے اظہار کی غرض سے ایک قرارداد کے ذریعہ قائداعظم کا خطاب دیا اور یہ اعلان کیا کہ آئندہ ساری سرکاری دستاویزات میں محمد علی جناح کے نام کے ساتھ اس خطاب کا استعمال ہوگا۔ تاہم ایوان سے باہر بہت سے مُلّاؤں اور درمیانہ طبقہ کے بعض عناصر کو گورنر جنرل پاکستان کی یہ پہلی پالیسی تقریر پسند نہ آئی کیونکہ اس میں جو کچھ کہا گیا تھا وہ ان کے دوقومی نظریے کے سراسر منافی تھا اور اس میں دور دور تک کوئی ایسا عندیہ نظر نہیں آتا تھا کہ پاکستان میں قرون وسطیٰ کا نظام خلافت رائج ہوگا۔ درمیانہ طبقہ کے ان اسلام پسند عناصر کے ایک ترجمان کی رائے یہ تھی کہ ''قائداعظم کی اس تقریر کی بنیاد اس حقیقت پر تھی کہ انہیں ہندوستان میں رہنے والے چار کروڑ مسلمانوں کے بارے میں بڑی تشویش تھی۔ ان مسلمانوں نے تحریک پاکستان میں سبقت حاصل کی تھی اور پاکستان کے نصب العین کے پرچم کو سربلند رکھا تھا لیکن اب انہیں نئے اور مشکل حالات درپیش تھے کیونکہ ہندو ان سے اس بنا پر برہم تھے کہ انہوں نے پاکستان کی حمایت کی تھی۔ قائداعظم نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ جس ملک میں ہیں اس کے غیر متزلزل طور پر وفادار رہیں۔ یہ حقیقت کبھی ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ تقسیم سے دونوں طرف اقلیتیں باقی رہ جائیں گی۔ دونوں فرقوں کا بہترین مفاد امن وفرقہ وارانہ مصالحت میں مضمر تھا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قائداعظم اپنی اس تقریر میں دوقومی نظریے سے دستبردار ہو گئے تھے وہ اس حقیقت کو نظرانداز کرتے ہیں کہ پاکستان کسی لشکر کشی سے حاصل نہیں ہوا تھا بلکہ یہ نتیجہ تھا برصغیر کی تقسیم پر ایک سمجھوتے کا جو ہندو اور مسلم فرقوں کے درمیان گفت وشنید سے طے ہوا تھا۔ اس سمجھوتے کا ایک واضح اور لاینفک حصہ یہ تھا کہ دونوں مملکتوں میں اقلیتوں کو مساوی حقوق اور

قانون کے تحت مساوی تحفظات حاصل ہوں گے۔

اس سیاق وسباق میں قائداعظم اس بنیادی اصول پر زور دینے میں بالکل حق بجانب تھے کہ ''ہم سب ایک مملکت کے شہری اور مساوی شہری ہیں۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ مملکت کو ''اپنے باشندوں کی جان، مال اور مذہبی مقامات کی پوری حفاظت کرنی چاہیے اور اپنی ساری توجہ لوگوں کی بالخصوص عوام اور غریبوں کی بہبود پر مرکوز کر دینی چاہیے'' سیاسی تدبر کے یہ عملی فرائض صرف اسی وقت بہ حسن وخوبی ادا کئے جا سکتے ہیں کہ سب شہریوں کو مساوی حقوق اور مساوی ذمہ داریوں سے بہرہ ور کیا جائے لیکن اس سے اس حقیقت کی نفی نہیں ہوتی ہے کہ ''پاکستان کے باشندوں کی بھاری اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے اور نہ ہی مسلم کمیونٹی کو قیادت کی ذمہ داری سے سبکدوش کیا جا سکتا ہے۔ اگر قیادت اپنے قول وفعل میں مخلص ہو اور اس کا قلب ونظر حقیقی معنوں میں اسلامی ہو تو پھر ملک کی حکمرانی کے اصول لازماً اسلام کی بنیاد پر استوار ہوں گے۔''[2]

اگر قائداعظم جناح کی اس تقریر کے بارے میں چودھری محمد علی کی مذکورہ تاویل کو صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ قائداعظم نے محض ہندوستان کے چار کروڑ مسلمانوں کے تحفظ کے لئے اور برصغیر کی تقسیم کے سمجھوتے کے مطابق دونوں فرقوں میں مفاد امن اور فرقہ وارانہ مصالحت کی غرض سے یہ تقریر کی تھی تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ قائداعظم نے اس تقریر میں اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے مناسب الفاظ استعمال نہیں کئے حالانکہ ان کے سرکاری سوانح نگار ہیکٹر بولیتھو (Hector Bolitho) کے بیان کے مطابق انہوں نے اپنی یہ ''عظیم ترین تقریر لکھنے میں بہت سے گھنٹے صرف کئے تھے۔'' اگر قائداعظم کی اس تقریر کا مقصد صرف یہی تھا کہ وہ برصغیر کی تقسیم کے سمجھوتے کے مطابق دونوں ملکوں میں اقلیتوں کو مساوی حقوق اور قانون کے تحت مساوی تحفظات دلانا چاہتے تھے تو اس مقصد کے لئے انہیں یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ مذہب کا کاروبار مملکت سے کوئی تعلق نہیں اور وہ صرف فرد کے ذاتی ایقان وایمان کا معاملہ ہے۔ یہ بھی کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ ہمیں اس سپرٹ میں کام شروع کر دینا چاہیے کہ کچھ مدت میں اکثریت اور اقلیت اور ہندو فرقے اور مسلم فرقے کی یہ بدنمایاں غائب ہو جائیں گی کیونکہ آخر مسلمان ہونے کی حیثیت میں بھی تمہارے ہاں پٹھان، پنجابی، شیعہ، سنی وغیرہ موجود ہیں اور پھر ہندوؤں میں بھی برہمن، ویش، کھتری اور پھر بنگالی، مدراسی وغیرہ ہیں اور پھر یہ بھی کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ جس

طرح برطانیہ میں اب رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کا کوئی وجود باقی نہیں رہا اور تمام شہری ایک قوم کے افراد ہیں اسی طرح کچھ زمانہ گزرنے کے بعد نہ ہندو ہندو رہیں گے نہ مسلمان مسلمان رہیں گے۔ مذہبی معنوں میں نہیں کیونکہ وہ تو ہر فرد کا ذاتی عقیدہ ہے بلکہ سیاسی معنوں میں سب ایک مملکت کے شہری ہوں گے۔ قائداعظم جناح منزہ عن الخطا نہیں تھے۔ بہت سے مسلم اور غیر مسلم سیاسی زعما ان سے بہت سے سیاسی مسائل کے بارے میں شدید اختلافات کرتے تھے اور بعض اوقات انہوں نے اپنے اس اختلاف کا بڑے تلخ اور نازیبا الفاظ میں اظہار کیا تھا لیکن کبھی ان کے بدترین سیاسی حریف نے بھی الزام عائد نہیں کیا تھا کہ ان کے سیاسی نظریے کے اظہار میں غیر ذمہ داری، منافقت یا بددیانتی کا عنصر ہوتا تھا۔ دستور ساز اسمبلی میں جناح کی یہ تقریر تاریخ پاکستان کا پہلا سنگ میل تھا۔ ان کی تقریر کسی انتخابی جلسے کی فی البدیہہ تقریر نہیں تھی۔ انہوں نے یہ پالیسی تقریر لکھنے میں بہت محنت کی تھی۔ ان کے مخاطب اپنی مملکت کے مسلم وغیر مسلم باشندے بھی تھے اور اہل علم بھی۔ اور ان کا مقصد یہ تھا کہ جس نصب العین کے حصول کی خاطر نئی مملکت اپنی تمام طاقتوں کو وقف کرنے والی تھی اس کو حتی الامکان نہایت واضح طور پر معین کر دیا جائے۔ اس تقریر میں بار بار ماضی کی تلخیوں کا ذکر کر کے یہ اپیل کی گئی تھی کہ ماضی کو بدل دو اور جنگ و پیکار کو دفن کر دو۔ انہوں نے غیر مبہم الفاظ میں یقین دلایا تھا کہ اس مملکت کے آئندہ شہری کو بلا امتیاز رنگ ونسل اور بلالحاظ مذہب وملت برابر کے حقوق حاصل ہوں گے اور اس پر برابر فرائض عائد ہوں گے۔

نظام حکومت کے بارے میں بابائے قوم کا نظریہ برطانیہ کے بورژوا جمہوری نظام کے عین مطابق تھا

ظاہر ہے کہ ملک کے نظام حکومت کے بارے میں بابائے قوم کا یہ نظریہ برطانیہ کے بورژوا جمہوری نظام کے نظریے کے عین مطابق تھا اور مُلّاؤں کے خلافتی نظام کے نظریے سے بالکل مختلف تھا۔ جناح کا یہ سیاسی نظریہ کوئی نیا نہیں تھا بلکہ ان کی ساری زندگی اس سیکولر نظریے کے ساتھ وابستگی میں گزری تھی۔ انہوں نے کسی مذہبی دارالعلوم میں درس نہیں لیا تھا بلکہ ان کی تعلیم انگریزوں کے جدید نظام تعلیم کے تحت کراچی کے ایک مشنری سکول سے شروع ہوئی تھی اور لندن

کی لنکنز ان(Linclons Inn) میں ختم ہوئی تھی۔ ہیکٹر بولیتھو کے بیان کے مطابق وہ لندن میں لبرل پارٹی سے متاثر ہوئے تھے جو ان دنوں بلا امتیاز سارے شہریوں کے لئے مساوی سیاسی، معاشی اور معاشرتی حقوق کی علمبردار تھی۔ عالم اسلام میں ان کا ہیرو سعودی عرب کا ابن سعود نہیں تھا بلکہ ترکی کا مصطفی کمال اتاترک تھا جس نے اگست 1923ء میں ترکی کا صدر منتخب ہونے کے بعد فروری 1924ء میں خلافت اسلامیہ کے ادارے کو ختم کر دیا تھا اور قومی اسمبلی سے جو سیکولر آئین منظور کروایا تھا اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر آئندہ کسی شخص یا جماعت کی جانب سے سیاسی مقاصد کے لئے، مذہب کا استعمال ہوگا تو اسے قید و بند کی سخت سزا دی جائے گی۔ جناح کی 11 راگست 1947ء کی تقریر کی بنیاد سیکولر نظام حکومت کے بارے میں مصطفی کمال کے اسی نظریے پر تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ مذہب کا کاروبار حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے کیونکہ مذہب فرد کے ذاتی ایقان اور ایمان کا معاملہ ہے لیکن اس کے برعکس رجعت پسند جاگیردار، دقیانوسی مُلّا نٹے اور درمیانہ طبقہ کے بعض ناعاقبت اندیش عناصر پاکستان کی نوزائیدہ قومی ریاست کو یہاں کے سارے مذاہب اور ساری قومیتوں کے لوگوں کے لئے مساوی حقوق کی بنیاد پر نہیں چلانا چاہتے تھے بلکہ وہ اسلام اور مسلم قومیت کے سسٹم کے زور سے اپنے استحصالی سامراجی اور آمرانہ نظام کے قیام کے لئے راہ ہموار کرنا چاہتے تھے۔

پیر الٰہی بخش اور لاہور کے بعض اخبارات کی تجویز کہ جناح کا نام خطبہ جمعہ میں بطور امیر المومنین شامل کیا جائے، جناح نے اسے قبول نہ کیا

استحصالی عناصر کی جانب سے پہلے سندھ کے ایک موقع پرست وزیر تعلیم پیر الٰہی بخش کی طرف سے 26 راگست کو کراچی کی ایک جامع مسجد میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ پاکستان کی تمام جامع مساجد میں جمعہ کی نماز کے خطبے میں قائداعظم محمد علی جناح کا بطور امیر ملت نام لینا چاہیے۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ مسلمانوں میں یہ رسم چلی آئی ہے کہ اگر مسلم ملک میں کوئی خلیفہ یا بادشاہ ہو تو اس کا نام خطبہ میں لیا جائے۔ چونکہ پاکستان ایک آزاد و خود مختار ملک بن چکا ہے اور قائداعظم رئیس الحکومت ہیں اس لئے ان کا اسم گرامی خطبے میں شامل کرنا لازمی ہے اور پاکستان کے طول و عرض میں جمعہ کی نماز کے خطبہ میں ان کا نام لینا چاہیے، غالباً سیاسی موقع پرستی نے اس شخص کی ذات میں خلوص

ودیانت کا کوئی عنصر باقی نہیں رہنے دیا تھا۔ اس نے جمعتہ الوداع کی نماز کے موقع پر یہ تجویز اولاً اس لئے پیش کی تھی کہ وہ ان سادہ لوح مسلمانوں میں مقبول ہونا چاہتا تھا جو بابائے قوم سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے اور ثانیاً اس لئے کہ وہ کلی اختیارات کے حامل گورنر جنرل کو اپنی غیر متزلزل وفاداری کا یقین دلانا چاہتا تھا۔ اس نے یہ تجویز پیش کرتے وقت اس حقیقت کو پیش نظر رکھنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ جناح کی 11 راگست کی تقریر کے مطابق پاکستان میں امیر المومنین کے وجود کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور یہ کہ جس ملک میں سنی العقیدہ مسلمانوں کی اکثریت ہو اس میں ایک اسماعیلی شیعہ امیر المومنین کیسے بن سکتا ہے۔ مزید برآں اس نے اس حقیقت کو بھی پیش نظر نہیں رکھا تھا کہ مجلس احرار کے مظہر علی اظہر جیسے مُلاّؤں کا ایک حلقہ جناح کو کافر اعظم قرار دیتا تھا۔ جماعت اسلامی کے امین احسن اصلاحی جیسے مُلاّؤں کے دوسرے حلقے کا خیال یہ تھا کہ جو مملکت جناح کے 11 راگست کے نصب العین پر مبنی ہوگی وہ ''ابلیس کی مخلوق'' ہوگی اور خود جماعت اسلامی کے امیر مودودی کا فتویٰ یہ تھا کہ ''لیگ کے قائداعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطہ نظر سے پرکھتا ہو۔ یہ لوگ مسلمان کے معنی ومفہوم اور اس کی مخصوص حیثیت کو بالکل نہیں جانتے۔'' یہ مُلاّ جناح کی زیر قیادت قائم شدہ حکومت کو اسلامی حکومت تصور نہیں کرتا تھا اور اس بنا پر وہ مسلمانوں کو مشورہ دیتا تھا کہ وہ اس غیر اسلامی حکومت کی وفاداری کا حلف نہ اٹھائیں۔

اگرچہ جناح نے پیر الٰہی بخش کی اس تجویز کا کوئی نوٹس نہ لیا حالانکہ ان دنوں کراچی اور لاہور کے بعض حلقوں میں اس مسئلہ پر بحث جاری تھی۔ لاہور کے اخبار نوائے وقت کی 21 راگست کی اشاعت کے ایک مضمون میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ پاکستان کے اہل الرائے کو یہ طے کرنا چاہیے کہ جمعہ کے خطبہ میں کس کا نام لیا جائے۔ صوبائی وزیر اعلیٰ کا یا مرکزی پاکستان گورنمنٹ کا یا قائداعظم کا۔ دوسری تجاویز یہ تھیں کہ قانون سازی کے کام میں مشورہ حاصل کرنے کے لئے چیدہ علما کی سب کمیٹیاں مقرر کرنی چاہئیں۔ زکوٰۃ کا نظام رائج کرنا چاہیے اور وقتاً فوقتاً اختلافی مسائل کو حل کرنے کے لئے جمعیت العلمائے اسلام کا اجلاس بلانا چاہیے۔ 22 راگست کو لاہور کے ایک انگریزی اخبار ایسٹرن ٹائمز میں بھی ایک مضمون نگار پیر تاج الدین بارایٹ لانے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد قائداعظم کو پاکستان کا پہلا امیر المومنین بننے پر

مبارکباد دی تھی اور پھر 28راگست کو پاکستان ٹائمز میں ایک مراسلہ نگار کی تجویز یہ تھی کہ قائداعظم کو رنگون جا کر آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے مزار پر پاکستان کے مسلمانوں کی جانب سے خراج عقیدت پیش کرنا چاہیے کیونکہ اس طرح 1857ء اور 1947ء کے درمیانی عرصے کی وہ خلیج پر ہو جائے گی جو اس عرصے میں مسلمانانِ ہند کے اقتدار سے محروم ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ گویا یہ مراسلہ نگار جناح کو بھی مطلق العنان مغلیہ حکمرانوں کے سلسلے کی ایک کڑی تصور کرتا تھا۔ اس کی سوچ 1947ء میں بھی مغلیہ دربار کی حدود سے باہر نہیں نکلی تھی۔ 29راگست کو اسی اخبار میں ایک شخص ایم۔ ایم۔ شریف مجاہد نے ایک مضمون میں پاکستان کے مسلمانوں کو تلقین کی کہ انہوں نے انگریزوں سے جو دقیانوسی اور زوال پذیر نظام حکومت ورثہ میں لیا ہے اسے از سر تا پا تبدیل کر دیں اور اس کی جگہ قرآن، حدیث اور فقہ کے اصولوں کی بنیاد پر نیا نظام نافذ کریں اور اس طرح گمراہ اور برخود غلط بنی نوع انسان کو تاریکی، تباہی اور تنزلی سے نکال کر اسے روشنی، تعمیری رجحانات اور ترقی کی بلند و بالا سطح پر پہنچا دیں اور پھر 21راگست کو نوائے وقت میں مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی کا ایک مضمون بعنوان ''الجزیہ'' شائع ہوا جس میں بتایا گیا تھا کہ اسلامی سلطنت میں دو قسم کا جزیہ وصول کیا جاتا ہے اول ان غیر مسلموں سے جو مسلمانوں سے جنگ نہیں کرتے لیکن اسلام بھی قبول نہیں کرتے اور دوئم ان غیر مسلموں سے جن پر امام المسلمین جنگ کے ذریعے غلبہ حاصل کرتا ہے۔ ان دونوں قسم کی شرح چار آنے سے لے کر ایک روپیہ ماہوار فی کس تک بنتی ہے۔ اس لئے پاکستان میں رہنے والے غیر مسلموں کو چاہیے کہ معمولی ٹیکس سے بچنے کے لئے اپنے وطن کے قانون کو ترک نہ کریں۔ اسلام دنیا جہاں کے لئے رحمت الٰہی کا سایہ ہے جو خدائے رحمٰن و رحیم نے اپنے نبیﷺ رحمت العالمین کی معرفت تمام عالمین کے سروں پر پھیلایا ہے۔

شبیر احمد عثمانی کی جانب سے بابائے قوم کے نظریہ حکومت کے خلاف بیان

جب اس قسم کے پروپیگنڈے سے قائداعظم جناح پر کوئی اثرات مرتب ہوتے نظر نہ آئے تو بعض حلقوں میں اضطراب پیدا ہوا۔ ان حلقوں میں شیخ الہند مولانا شبیر احمد عثمانی بھی تھا۔ یہ شیخ الہند دار العلوم دیوبند سے فارغ التحصیل تھا اور قیام پاکستان سے قبل حیدر آباد (دکن) کی مکی جامع مسجد میں امامت کے فرائض سرانجام دیتا تھا اور ''اعلیٰ حضرت'' میر عثمان علی خان سے وظیفہ

لیتا تھا۔اس کے حیدر آباد دکن جانے کی وجہ یہ تھی کہ چوتھے عشرے میں اس کے دیوبند کے کانگرسی مولویوں سے نظریاتی اختلافات ہو گئے تھے اور ''اعلیٰ حضرت'' کو اپنی ہندو اکثریت والی ریاست میں ایسے مولوی کی خدمات کی ضرورت تھی جو کانگرس کی وطنیت کی بنیاد پر سیکولر انڈین نیشنلزم کے جواب میں بین الاقوامی مسلم قومیت کی تبلیغ کرے اور ریاست میں اسلامی نقطہ نگاہ سے آریہ سماجیوں کی سرگرمیوں کا بھی توڑ کرے۔ اکتوبر 1945ء میں اس نے تحریک پاکستان کی حمایت کرنے والے مولویوں کی نئی تنظیم جمعیت العلمائے اسلام کی صدارت قبول کر لی اور پھر اس نے 46-1945ء کی انتخابی مہم میں حصہ لے کر مسلمانوں کو تلقین کی تھی کہ وہ مسلم لیگ کے امیدواروں کو ووٹ دیں۔ یہ نہایت راسخ العقیدہ حنفی تھا اور اس وجہ سے اس نے تقریباً 20 سال قبل ایک کتابچہ الشہاب کے نام سے لکھا تھا جس کے پہلے حصے میں ثابت کیا گیا تھا کہ احمدی مرتد ہیں اور دوسرے حصے میں اس دعوے کے حق میں دلائل دیئے گئے تھے کہ اسلام میں ارتداد کی سزا موت ہے۔ جب اودھ میں تعلقہ داریوں کا سوال اٹھا تھا تو اس کا فتویٰ یہ تھا کہ تعلقہ داریوں کی حفاظت میں جان دینا شہادت ہے۔ یہ پاکستان کی اسلامی مملکت میں ذمیوں سے جزیہ وصول کرنے کے حق میں تھا اور انہیں یہ حق نہیں دیتا تھا کہ وہ قانون ساز یا پالیسی ساز اداروں کے رکن بنیں یا کلیدی مناصب پر فائز ہوں۔ اسے جون 1947ء میں مشرقی بنگال کے کوٹا میں سے پاکستان دستور ساز اسمبلی کا رکن منتخب کیا گیا تھا اور اس نے اس حیثیت سے قیام پاکستان کے فوراً ہی بعد کراچی پہنچ کر پاکستان میں نہ صرف اپنے مکتب فکر کے مولویوں کی از سر نو تنظیم کا بیڑا اٹھا لیا بلکہ اس نے اس ''اسلامی پلیٹ فارم'' سے یو۔پی اور حیدر آباد (دکن) کے ''مہاجرین'' کی نمائندگی کی ذمہ داری بھی سنبھال لی تھی۔ چونکہ قائداعظم کی 11 ر اگست کی تقریر اس کے ان دونوں ہی مقاصد کے راستے میں حائل تھی اس لئے یہ ان لوگوں میں پیش پیش تھا جو اس تقریر کے سیکولر نصب العین کو بہر صورت ناکام کرنا چاہتے تھے لیکن اس کی سیاسی مصلحت اسے کھلم کھلا قائداعظم کی مخالفت کی فوری طور پر اجازت نہیں دیتی تھی۔ چنانچہ یہ چند دن تک منقار زیر پر رہا لیکن جب کراچی اور لاہور میں خلافتی نظام یا مُلّائیت کے حق میں پروپیگنڈا جاری رہا تو یکم ستمبر 1947ء کو اس نے بھی زبان کھولی۔ اس نے ایک بیان بغرض اشاعت اخبارات کو دیا جس کی ابتدائی چند سطروں میں تو دولت پاکستان کے قیام پر خداوند باری تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنے کے علاوہ

یہ کہا گیا تھا کہ ملت اسلامیہ قائد اعظم کی ممنون احسان ہے جنہوں نے انتھک مساعی اور اپنی دور اندیشی سے مسلمانوں کی رہنمائی کی اور انہیں منزل کے حصول تک پہنچایا لیکن پھر مُلّاؤں کے مخصوص انداز میں بابائے قوم کی اس طرح مخالفت کی کہ ''اس موقع پر میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ قائد اعظم کی یہ فتح مبین مسلمانوں کے ضبط و نظم کی مرہون احسان ہے۔ مسلمانوں کی افتاد طبع مذہبی واقع ہوئی ہے اور دو قوموں کے نظریے کی بنیاد بھی مذہب ہے۔ اگر علمائے دین اس میں نہ آتے اور تحریک کو مذہبی رنگ نہ دیتے تو قائد اعظم یا کوئی اور لیڈر خواہ وہ کسی قابلیت و تدبر کا مالک ہی کیوں نہ ہوتا یا سیاسی جماعت مسلم لیگ مسلمانوں کے خون میں حدت پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ تاہم علمائے دین اور مسلمان لیڈروں کی مشترکہ جہد و سعی سے مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہوئے اور ایک نصب العین پر متفق ہو گئے...... یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی تمام مساعی پاکستان کے دستور اساسی کے ترتیب پر صرف کریں اور اسلام کے عالمگیر اور فطری اصولوں کو سامنے رکھیں کیونکہ موجودہ مرض کا یہی ایک علاج ہے۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو مغربی جمہوریت اپنی تمام برائیوں کے ساتھ چھا جائے گی اور اسلام کی بین الاقوامیت کی جگہ تباہ کن قوم پرستی چھا جائے گی۔ دو قوموں کا نظریہ بے معنی نعرہ نہ تھا بلکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے اور اسے کوئی بدل نہیں سکتا کیونکہ اس کی بنیاد قرآن مجید اور حدیث کے بنیادی اور ٹھوس اصولوں پر ہے جس میں ذرا بھی تبدیلی ناممکن ہے۔ مسلمان اور دوسری قومیں باہمی اشتراک کے نظم و نسق کی باگ ڈور بلا خوف و خطر سنبھال سکتی ہیں۔ اسلام ہم پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ ہم دوسری قوموں کے ساتھ اشتراک عمل اور تعاون کریں۔ تاریخ اسلام اس امر کا زندہ ثبوت ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ مسلمان ہمیشہ مسلمان ہی رہتا ہے۔ مسلمان گھر میں بھی مسلمان ہے، باہر بھی مسلمان ہے، جامع مسجد میں بھی، مصلیٰ پر بھی، اسمبلی ہال میں بھی، گورنر کی کرسی پر بھی۔ اور اسلام کی یہی ایک امتیازی شان ہے کہ مسلمان کسی شعبہ زندگی میں کیوں نہ ہو مسلمان ہی رہتا ہے۔ اس کی اجتماعی اور انفرادی زندگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس کے باوجود وہ غیر مسلموں کے ساتھ ایسا فراخدلانہ سلوک کرتا ہے کہ دوسری قوموں کی تاریخ میں ایسی مثال چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ خواہ حالات کتنے ہی نامساعد کیوں نہ ہوں مسلمان مسلمان رہے اور ہندو ہندو۔ اسلامی ریاست ان کے جان و مال اور عبادت خانوں کی حفاظت کرے گی بشرطیکہ وہ وفادار شہری ہوں۔''[3]

شبیر احمد عثمانی کے اس بیان پر ایک نظر ڈالنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس نے یہ بیان قائداعظم جناح کی 11 / اگست کی تقریر کی مخالفت میں جاری کیا تھا۔ اس نے اس بیان میں قائداعظم کی خدمات کا صرف اس حد تک اعتراف کیا کہ انہوں نے اس تحریک میں انتھک مساعی اور اپنی دوراندیشی سے مسلمانوں کی رہنمائی کی تھی اور پھر یہ دعویٰ کیا کہ اگر علمائے دین اس میں نہ آتے اور تحریک کو مذہبی رنگ نہ دیتے تو قائداعظم یا کوئی اور لیڈر خواہ کسی قابلیت وتدبر کا مالک ہی کیوں نہ ہوتا، سیاسی جماعت مسلم لیگ مسلمانوں کے خون میں حرارت پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے مذہب وملت سے بالاتر پاکستانی قومیت کے بارے میں جناح کے مغربی نظریے کو تباہ کن قرار دیا اور کہا کہ دو قوموں کا نظریہ بے معنی نظریہ نہیں تھا بلکہ یہ ایک مسلّم حقیقت ہے اور اسے کوئی بدل نہیں سکتا کیونکہ اس کی بنیاد قرآن مجید اور حدیث کے بنیادی اور ٹھوس اصولوں پر ہے جس میں ذرا بھی تبدیلی ناممکن ہے۔ اس نے الفاظ کے ہیر پھیر سے جناح کے اس موقف کو غلط قرار دیا کہ پاکستان میں کچھ زمانہ گزرنے کے بعد نہ ہندو ہندو رہیں گے نہ مسلمان مسلمان رہیں گے اور یہ سب سیاسی معنوں میں ایک مملکت کے شہری ہوں گے۔ پھر کہا کہ مسلمان ہمیشہ مسلمان ہی رہتا ہے۔ مسلمان گھر میں بھی مسلمان ہے باہر بھی مسلمان، جامع مسجد میں بھی، مصلّیٰ پر بھی، اسمبلی ہال میں بھی، گورنر کی کرسی پر بھی اور اسلام کی یہی ایک امتیازی شان ہے کہ مسلمان کسی شعبہ زندگی میں کیوں نہ ہو مسلمان ہی رہتا ہے اس کی اجتماعی اور انفرادی زندگی میں کوئی فرق نہیں آتا اس ہی لئے میں چاہتا ہوں کہ حالات خواہ کتنے ہی نامساعد کیوں نہ ہوں مسلمان مسلمان رہے اور ہندو ہندو۔ بالفاظ دیگر شبیر احمد عثمانی مسلمانوں اور ہندوؤں پر مشتمل ایک پاکستانی قوم کے نظریے کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ وہ مسلمانوں کو حکمران قوم اور ہندوؤں کو محکوم قوم تصور کرتا تھا اور کہتا تھا کہ مسلمان بحیثیت حکمران قوم اسلامی ریاست میں ہندوؤں کے جان ومال اور ان کے عبادت خانوں کی حفاظت کریں گے بشرطیکہ وہ وفادار شہری ہوں۔

شبیر احمد عثمانی کی جانب سے گورنر جنرل پاکستان کے خلاف اس قسم کا بیان دینے کی جرأت کرنے کی کئی وجوہ تھیں۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اگست کے آخری ہفتے میں مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا منظم قتل عام شروع ہو چکا تھا اور مسلمان مہاجرین کے قافلے بھی لاہور پہنچنے شروع ہو گئے تھے۔ ایسے حالات میں پاکستان میں مذہبی

عصبیت کا فروغ پانا ناگزیر تھا اور مسلم عوام الناس کے نزدیک مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ قومیت کا تصور قابل قبول نہیں ہوسکتا تھا۔ عثمانی نے مذہبی عصبیت کے اس جذباتی ماحول سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے پہلے تو یہ دعویٰ کیا کہ پاکستان علمائے دین کی مساعی کی پیداوار ہے اور پھر بالواسطہ طور پر یہ اعلان کیا کہ اسلامی ریاست میں جناح کے نظریے کے مطابق سیکولر جمہوری نظام حکومت قائم نہیں ہوگا بلکہ یہاں قرون وسطیٰ کا خلافتی نظام نافذ ہوگا جس میں محکوم ہندوؤں کو محض ذمیوں کی حیثیت حاصل ہوگی۔ اس کے اس بیان کی دوسری وجہ یہ تھی کہ قیام پاکستان کے فوراً بعد دہلی، یو۔ پی اور حیدرآباد (دکن) سے جو سرکاری ملازمین اور دوسرے طالع آزما لوگ کراچی پہنچے تھے، حکومت سندھ ان کی آبادکاری کے راستے میں حائل ہو رہی تھی۔ سندھ کے وزیراعلیٰ کھوڑو اور دوسرے سندھی جاگیرداروں کا خیال تھا کہ اگر ہندوستان سے آنے والے لوگوں کا اسی طرح تانتا بندھا رہا تو کراچی اور سندھ کے دوسرے علاقوں میں سندھیوں کی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی حیثیت کو نقصان پہنچے گا جبکہ ان مہاجرین کا خیال یہ تھا کہ وہ سندھ کے علاقے اور اس کے وسائل پر اپنا حق صرف اسلام اور مسلم قومیت کے زور پر ہی منوا سکتے ہیں۔ اگر مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ سیکولر قومیت کے نظریے پر عمل ہوا تو سندھ کے ہندو ترک وطن نہیں کریں گے اور اس بنا پر اس صوبہ میں مسلمان مہاجرین کی آبادکاری کا امکان پیدا نہیں ہوگا۔ عثمانی نے اسی خیال کے تحت اپنے اس بیان میں یہ بھی کہا تھا کہ پاکستان کے لئے، سب سے پہلے اقلیت والے صوبوں کے مسلمان سینہ سپر ہوئے، انہوں نے اپنے جان و مال کو داؤ پر لگایا اور انہوں نے اپنی قربانیوں سے پاکستان کا راستہ ہموار کیا۔ آج ہمیں آزادی کے نشے میں چور ہو کر ان معصوم و مغفور روحوں کو فراموش نہیں کرنا چاہیے یہ بہت بڑی غداری ہوگی اگر ہم نے ان مجاہدوں کو فراموش کر دیا جنہوں نے استقلال پاکستان کے لئے جانیں قربان کیں۔ یہ بہت عجیب و غریب اور افسوسناک بات ہے کہ پاکستان کے دارالسلطنت میں ہم صوبائی تعصب کا شور کر رہے ہیں۔ اگر صوبائی تعصب کا یہ بت ہم نے نہ توڑا تو پاکستان کی بنیادیں ابتدا میں ہی لرز جائیں گی۔ وزیراعظم لیاقت علی خان اور مرکزی حکومت کے دوسرے ارکان کو بھی کراچی پہنچنے والے مسلمان سرکاری ملازمین اور دوسرے ''مہاجرین'' کے اس خیال سے اتفاق تھا۔ چنانچہ اسی لئے چند دن قبل مرکزی وزیر خوراک راجہ غضنفر علی خاں نے سندھ مدرسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''جو لوگ یہ نعرہ

بلند کرتے ہیں کہ سندھ سندھیوں کا ہے اور پٹھانستان پٹھانوں کا ہے وہ پاکستان کے دشمن ہیں۔ پاکستان قابلیت اور اہلیت کی قدر کرے گا خواہ کسی جگہ کیوں نہ ہو۔ ہندوستان کے قابل اور ماہر ترین افراد کا خیر مقدم بھی اسی تپاک سے کیا جائے گا جس تپاک سے پاکستان کے لئے ابھی تک مصائب و آلام کا سامنا کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کا بھی پاکستان پر حق ہے کیونکہ ان کی قربانیوں پر یہ پاکستان تعمیر کیا گیا ہے۔"[4]

شبیر احمد عثمانی کے اس بیان کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ اگرچہ اسے نظام حکومت اور پاکستانی قومیت کے بارے میں جناح سے بنیادی نوعیت کا اختلاف تھا تاہم وہ بابائے قوم کی کھل کر غیر مبہم الفاظ میں مخالفت کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اسے اپنے اس بیان کی ابتدائی سطور میں قائداعظم کی انتھک مساعی اور دور اندیشی کی طوعاً و کرہاً تعریف کرنا پڑی بلکہ اسے اسی دن ایک نامہ نگار سے انٹرویو کے دوران یہ بھی کہنا پڑا کہ اگر قائداعظم کا جمعہ کے خطبہ میں بطور رئیس الحکومت نام آ جائے تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔ اس کے اس انٹرویو کی نوائے وقت میں شائع شدہ خبر کا دلچسپ متن یہ تھا کہ "ایک نامہ نگار نے علامہ شبیر احمد عثمانی صدر جمعیت العلمائے اسلام سے ملاقات کی اور خطبوں میں قائداعظم کے نام کو شامل کرنے کے متعلق ان کا عندیہ معلوم کیا۔ علامہ موصوف نے فرمایا کہ بنو امیہ کے زمانہ سے یہ رواج ہے۔ بنی عباس خطبہ میں رئیس السلطنت کا نام خاص طور پر شامل کرتے تھے۔ آپ نے کہا کہ اگر خطبہ مناسب اور جائز طریقہ سے دیا جائے تو یقیناً رئیس السلطنت کا نام بھی خطبہ میں آ جائے گا۔ جہاں تک قائداعظم کا تعلق ہے وہ لاریب دولت پاکستان کے رئیس الحکومت ہیں۔"[5] چونکہ عثمانی کے دل میں جناح کے لئے عقیدت و احترام کا کوئی خاص جذبہ نہیں تھا اس لئے اس نے اس سوال کا جواب سیدھے اور غیر مبہم الفاظ میں نہ دیا۔ اس نے پہلے تو بنو امیہ اور بنی عباس کے عہد کے رواج کا ذکر کیا اور پھر اس مقصد کے لئے خطبہ کے مناسب اور جائز طریقہ کے ہونے کی شرط عائد کی۔ لیکن اس نے جائز اور مناسب طریقہ کے خطبہ کی کوئی تصریح نہ کی۔ یعنی یہ نہ بتایا کہ مسلمانوں کے کون سے فرقہ کا خطبہ مناسب اور جائز طریقہ ہوگا اور یہ بھی نہ بتایا کہ جو رئیس الحکومت اسماعیلی شعیہ فرقہ سے تعلق رکھتا ہو اور جو سیکولر نظام حکومت اور مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ قومیت کے نظریے کا علمبردار ہو اس کا نام خطبے میں لیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

درمیانہ طبقہ کے جذباتی عناصر کی طرف سے قرون وسطیٰ کے تصورات پر مبنی مضامین اور مراسلے

تاہم پاکستان ٹائمز کی 5 ستمبر کی اشاعت میں ایک مراسلہ نگار کی رائے یہ تھی کہ صرف پاکستان میں اسلامی آئین یا خلافتی نظام نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ اس مقصد کے لئے پہلے دنیا کے سارے اسلامی ممالک کی ایک فیڈریشن قائم ہونی چاہیے پھر اس فیڈریشن کا سربراہ اعلیٰ ایک ایسا خلیفہ ہونا چاہیے جو اسلامی آئین کے مطابق اور اجتماعی مفاد کے تحت مرکز سے فیڈریشن کے مختلف حصوں کی پالیسی کو کنٹرول کرے۔ اور ایسٹرن ٹائمز کے ایک بہت ہی جوشیلے مضمون نگار کا خیال یہ تھا کہ پاکستان کے مسلمانوں کے قومی نصب العین کی تکمیل صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ ”مشرقی پنجاب کے علاوہ دہلی تک کا علاقہ ہماری تحویل میں ہو اور لال قلعہ پر ہمارا ہلالی پرچم لہراتا ہو۔ دہلی میں اسلامی اقتدار کی تاریخ دفن ہے۔ یہ بات مردمیت کے خلاف تھی کہ ہم نے اس شہر کو اپنے مطالبات کی فہرست میں شامل نہیں کیا۔ تاہم اب ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں اس کا اولین مقام ہونا چاہیے۔ ہمیں سکولوں، کالجوں، اخبارات کے ذریعے اور سیاسی پلیٹ فارم سے پاکستان کی سرحدوں کی دہلی تک توسیع کے نصب العین کا ولولہ پیدا کرنا چاہیے۔“[6] ایسٹرن ٹائمز میں جب یہ مضمون شائع ہوا تھا اس وقت مشرقی پنجاب سے ہر روز ہزاروں خانماں برباد مسلمان مہاجر بھی لاہور پہنچ رہے تھے اور بعض سیاسی مبصرین یہ کہتے تھے کہ معلوم نہیں پاکستان کی نوزائیدہ اور مفلوک الحال مملکت مہاجرین کے اس ریلے کی متحمل ہو سکے گی یا نہیں؟ ایسی صورت حال میں اس قسم کی مضمون نگاری قدامت پرست مُلّاؤں کے غیر حقیقت پسند اور تباہ کن سیاسی، مذہبی نعروں کی پیداوار تھی۔ درمیانہ طبقہ کے نیم تعلیم یافتہ اور جذباتی عناصر اس قسم کے گمراہ کن نعروں سے بہت متاثر ہوتے تھے۔

اس قسم کے ایک جوشیلے شخص کا ایک مضمون 29 ستمبر کو نوائے وقت میں شائع ہوا۔ اس مضمون نگار کو ماضی میں صدر جمہوریہ پاکستان کے وہ بیانات پسند نہیں آئے تھے جن میں جمہوریت مطلقہ کا ذکر ہوتا تھا لیکن اب اس نے قائداعظم کے کسی بیان میں اسلامی جمہوریت کی اصطلاح دیکھی تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اور اس کے تصور کے سامنے مسٹر جناح ایک ایسا جامہ پہنے ہوئے کھڑے تھے جو خلافت الٰہیہ کا جامہ تھا۔ چنانچہ زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے

قائداعظم زندہ باد اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگائے تھے۔

شبیر احمد عثمانی اور ظفر علی خان کی طرف سے مجاہدین اور سرفروشان اسلام بھرتی کرنے کی تنظیم سازی

مذکورہ مضمون کی اشاعت سے دو دن پہلے 27 ستمبر کو تقریباً 50 علما کے اجتماع میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے ''جماعت مجاہدین اسلام'' کے نام سے ایک تنظیم بنائی تھی اور مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ وہ اسلام کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو جائیں اور پھر 28 ستمبر کو اس نے ایک ادبی و ثقافتی انجمن بنائی تھی جس کا نصب العین یہ تھا کہ وہ پاکستان میں عربی زبان کو فروغ دے کر عالم اسلام کے ثقافتی، سیاسی اور مذہبی اتحاد کے لئے راہ ہموار کرے گی۔ جس اجتماع میں یہ انجمن قائم کرنے کا اعلان کیا گیا تھا اس میں مرکزی حکومت کے وزیر تعلیم فضل الرحمٰن، سندھ کے وزیر تعلیم پیر الٰہی بخش اور سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اے۔ بی۔ اے۔ حلیم نے بھی شرکت کی تھی اور ان سب کی موجودگی میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ آئندہ سندھ کے سکولوں اور کالجوں میں پانچویں جماعت کے بعد عربی زبان ایک لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جائے گی اور سندھ یونیورسٹی کے ارباب اختیار سے کہا جائے گا کہ وہ مسلمان طلبا کو اس وقت تک کوئی ڈگری نہ دیں جب تک کہ وہ عربی زبان اور قرآنی ادب کا امتحان پاس نہ کریں۔

پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے قدامت پسند عناصر اور کراچی کے علما کی جانب سے یہ پروپیگنڈا اور جماعت سازیاں اس مقصد کے تحت کی جا رہی تھیں کہ قائداعظم جناح نے 11 اگست کو مغربی طرز کی جمہوریت مطلقہ کے بارے میں جو تقریر کی تھی اس پر عمل درآمد نہ ہونے دیا جائے۔ ملک کی سیاسی صورتحال ان جوشیلے مجاہدین کے حق میں تھی۔ پنجاب اور دہلی میں فرقہ وارانہ قتل عام جاری تھا۔ کشمیر کے ہندو راج کے خلاف پونچھ کے مسلمانوں نے علم بغاوت بلند کیا ہوا تھا اور اس بنا پر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان قومی تضاد کی شدت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ ایسی صورتحال میں جناح کے سیکولر جمہوریت کے نظریے کے فروغ کا کوئی امکان نہیں تھا۔ خیبر سے لے کر کراچی تک اسلام کی سربلندی کے لئے جہاد کے نعرے لگ رہے تھے۔ وہ نہ صرف کشمیر اور مشرقی پنجاب کو فتح کرنے کا عزم رکھتے تھے بلکہ وہ دہلی کے لال قلعہ پر ہلالی پرچم

لہرانے کا بھی خواب دیکھ رہے تھے۔ اکتوبر کو اس مقصد کے لئے لاہور کے روزنامہ زمیندار کے دفتر میں ایک تنظیم بنام مجلس تحفظ پاکستان وجود میں آئی۔ مولانا ظفر علی خاں کو اس جماعت کا صدر منتخب کیا گیا اور یہ طے پایا کہ یہ جماعت مولانا کی زیر قیادت مسلمانوں کو ہر صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرے گی۔ اس کے اگلے دن اس اخبار کے ایک انتہائی اشتعال انگیز مضمون کا عنوان یہ تھا کہ ''غیور مسلم نوجوانو! صوبہ سرحد، مغربی پنجاب اور مشرقی پنجاب کی تمیز اڑا کر جوق در جوق خدا کی تنظیم میں بھرتی ہو جاؤ'' یہ مضمون اتنا اشتعال انگیز تھا کہ حکومت پنجاب کو تادیبی کارروائی کے طور پر اس اخبار کی اشاعت دو ہفتے کے لئے بند کرنا پڑی تھی۔

شبیر احمد عثمانی اور ظفر علی خاں وغیرہ کی طرف سے مجاہدین اور سرفروشان اسلام کی غیر سرکاری طور پر بھرتی شروع کرنے کا ایک پس منظر یہ تھا کہ دہلی اور مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام اب اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ سردار پٹیل اور ہندوستان کے بعض دوسرے ارباب اقتدار نے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو پاکستان کی طرف دھکیلنے کا عزم کیا ہوا تھا۔ پاکستان کے گورنر جنرل کی، حکومت برطانیہ کی وساطت سے دولت مشترکہ کے ممالک سے اپیل یہ تھی کہ مسلمان مہاجرین کی ٹرینوں اور قافلوں پر قاتلانہ حملے بند کروائے جائیں اور دونوں ممالک کے فسادزدہ علاقوں میں اقوام متحدہ کے مبصرین مقرر کئے جائیں۔ مگر ہندوستانی ارباب اقتدار نے یہ تجویز مسترد کر دی تھی۔ انہوں نے ریاست جوناگڑھ کے پاکستان کے ساتھ الحاق کو بھی تسلیم نہیں کیا تھا اور بمبئی میں وہ اپنی ایک عبوری حکومت بنا کر جوناگڑھ پر فوجی چڑھائی کا اعلان کر رہے تھے۔ کشمیر میں مہر چند مہاجن کے وزیر اعظم کے عہدہ پر تقرر اور شیخ عبداللہ کی رہائی کے بعد اس امر کے واضح آثار تھے کہ مسلم اکثریت والی اس ریاست کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔ پاکستان کو اس کے حصے کے فوجی سامان کی ترسیل بند کر دی گئی تھی اور ہندوستان اور پاکستان کے مشترکہ سپریم کمانڈر سر کلاڈ آکن لیک (Claud Auchenlek) کی اپنی حکومت کے نام رپورٹ یہ تھی کہ ہندوستانی کابینہ ہر ممکن کوشش کر رہی ہے کہ پاکستان مضبوط بنیادوں پر قائم نہ ہونے پائے اور اس بنا پر دونوں ملکوں کے درمیان جنگ کا حقیقی خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ تاہم سندھ کے ایک ممتاز لیڈر ہاشم گزدر کا خیال یہ تھا کہ ہندوستان میں پاکستان کا گلا گھونٹنے کی جو سازش کی گئی ہے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے علما کی زیر نگرانی پرائیویٹ طور پر

مجاہدین کی بھرتی نہیں ہونی چاہیے بلکہ اس مقصد کے لئے حکومت پاکستان کو سرکاری طور پر عوام الناس کی فوجی تربیت اور تنظیم کا انتظام کرنا چاہیے۔ غالباً ہاشم گزدر کے اس بیان کی بنیاد بعض سندھی لیڈروں کے اس خطرے پر تھی کہ مولانا شبیر احمد عثمانی کے ''مجاہدین'' دہلی کے لال قلعے تک تو کبھی نہیں پہنچ پائیں گے البتہ وہ سندھ سے ہندوؤں کی بے دخلی کے لئے خونریزی کریں گے۔ ایسٹرن ٹائمز کی 8/اکتوبر کی ایک رپورٹ کے مطابق کراچی میں مولانا شبیر احمد عثمانی کے مجاہدین کی تنظیم کا بہت چرچا تھا۔ ہر روز سوڈیڑھ سو لوگ اس تنظیم میں بھرتی ہو رہے تھے اور اس کے نوجوان ارکان پچاس سے لے کر سو تک کے جتھوں کی صورت میں اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے سڑکوں پر مارچ کرتے تھے۔ انہی دنوں کراچی میں پاکستان کے مشائخ عظام کی بھی ایک پانچ روزہ کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں ''مسلمانان پاکستان کی علی العموم اور معتقدین یا مخلصین مشائخ طریقت کی علی الخصوص روحانی، اخلاقی، جسمانی اور عسکری تنظیم کے لئے نہایت مفید لائحہ عمل مرتب کیا گیا تھا۔''

قائداعظم کی حکومت سیکولر نظریہ پر قائم تھی، وزیر قانون ایک ہندو اور وزیر خارجہ ایک احمدی تھا

مشائخ کی مذکورہ کانفرنس کے ایک وفد نے 7/اکتوبر کو قائداعظم جناح سے ملاقات کی تھی تو اس موقع پر پاکستان میں اقلیتوں کے تحفظ کا مسئلہ زیر بحث آیا تھا کیونکہ چودھری محمد علی کے بیان کے مطابق قائداعظم نے ستمبر کے اواخر میں آل انڈیا کانگرس کے صدر اچاریہ کرپلانی سے کراچی میں ملاقات کے دوران اسے یقین دلایا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے قتل عام کے باوجود پاکستان میں فرقہ وارانہ امن وامان برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی جائے گی اور اقلیتوں کو مکمل تحفظ اور مساوی حقوق دیئے جائیں گے۔ مشائخ کے وفد نے قائداعظم کے اس موقف سے اتفاق کیا اور انہیں اطمینان دلایا کہ ''ہمارے پیش نظر خالصتاً مسلمانان پاکستان اور دولت پاکستان کی حفاظت ہے۔ اقلیتوں کو اس سے کوئی اندیشہ نہ کرنا چاہیے اس لئے وہ جب تک پاکستان کے وفادار کی حیثیت سے رہیں، دولت پاکستان کے خلاف دشمنوں سے سازش نہ کریں اور پاکستان کے امن وامان میں خلل انداز نہ ہوں، ہم پر واجب ہے کہ ہم پوری ہمت کے ساتھ ان کی کامل حفاظت کریں کیونکہ اسلام نے نہایت صراحت کے ساتھ ہمیں اس کا حکم دیا ہے جبکہ قائداعظم نے

اپنے خطبۂ صدارت مجلس دستور ساز میں بھی یہ وضاحت سے فرمایا ہے۔"[7]

پاکستان ٹائمز کی ایک رپورٹ کے مطابق اسی دن یعنی 7/اکتوبر کو سندھ کے ہندو سیٹھوں کے ایک وفد نے بھی وزیر خزانہ غلام محمد سے ملاقات کر کے سندھ میں ہندوؤں کے تحفظ کا مسئلہ اٹھایا تھا تو غلام محمد نے انہیں انتہائی غیر مبہم الفاظ میں یقین دلایا کہ "پاکستان ایک سیکولر جمہوری ریاست ہے۔ یہ مذہبی ریاست نہیں ہے اس لئے تم میں سے ہر ایک کو اس ریاست کے شہری کی حیثیت سے وہی حقوق و مراعات حاصل ہیں جو کہ خود سربراہ ریاست قائداعظم محمد علی جناح کو حاصل ہیں۔"[8] وزیر خزانہ غلام محمد کی اس قطعی یقین دہانی کا مطلب یہ تھا کہ اگرچہ اکتوبر 1947ء میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات کی نوعیت انتہائی دشمنانہ ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود قائداعظم کے ایوان اقتدار میں سیکولر نظام حکومت کے اسی نظریے کا بول بالا تھا جس کی وضاحت انہوں نے 11/اگست 1947ء کی تقریر میں کی تھی اور جس کی مشائخ کے وفد نے بھی تائید کی تھی۔ کراچی میں مولانا شبیر احمد عثمانی اور پنجاب میں درمیانہ طبقہ نیز بعض "خلافتی" عناصر کے پروپیگنڈے کے باوجود جناح نے سیکولرازم کو ترک نہیں کیا تھا کیونکہ ان کے لئے مُلّاؤں کا مذہبی نظام حکومت کبھی بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ اگست میں انہوں نے ایک اچھوت جوگندر ناتھ منڈل کو، جسے شبیر احمد عثمانی پاکستان کی اسلامی مملکت میں کسی قانون ساز یا پالیسی ساز ادارے کی رکنیت کا مستحق نہیں سمجھتا تھا، مرکزی حکومت میں وزیر قانون بنایا تھا۔ ستمبر میں انہوں نے ایک احمدی سر ظفر اللہ خاں کو جو شبیر احمد عثمانی کے فتوے کے مطابق مرتد اور واجب القتل تھا، پاکستانی وفد کے قائد کی حیثیت سے اقوام متحدہ بھیجا تھا اور اکتوبر میں عام قیاس آرائی یہ تھی کہ جب دسمبر میں ظفر اللہ خاں اقوام متحدہ سے واپس آئے گا تو اسے وزارت خارجہ کے عہدے پر فائز کیا جائے گا۔

پنجاب کے رجعت پسند جاگیرداروں اور درمیانہ طبقہ کے قدامت پسندوں نے ایک یہودی نومسلم کو احیائے اسلام کا کام سونپ دیا

قائداعظم کے سیکولر نظریے کے خلاف کراچی سے بھی بڑا محاذ پنجاب کے رجعت پسند جاگیرداروں اور درمیانہ طبقہ کے قدامت پسند عناصر نے بنایا ہوا تھا۔ اس صوبہ کا وزیر اعلیٰ ایک نیم تعلیم یافتہ اور کم عقل جاگیردار نواب افتخار حسین خان ممدوٹ تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ اس کے اپنے اور

اس کے طبقے کے مفادات کے تحفظ کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کو صبح وشام سیاسی حربے کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اس نے اپنے بعض غیر سرکاری دوستوں کے مشورے کے مطابق پہلے تو ستمبر میں ایک شخص غلام محمد اسد سے ریڈیو پاکستان لاہور سے ''اسلام اور مسلمان'' کے عنوان سے تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کروایا اور پھر اکتوبر میں اس کی سربراہی میں ایک نئے محکمے بنام ''تعمیر اسلامی'' کا اضافہ کیا۔ یہ شخص آسٹریا کا یہودی تھا اور اس کا اصلی نام لیو پولڈ ویس (Leopold Wese) تھا۔ اس نے روس میں 1917ء میں پرولتاری انقلاب کے بعد اسلام قبول کر کے بطور اخبار نویس مشرق وسطیٰ میں سارے عالم عرب کا دورہ کیا تھا۔ اسے انگریزوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران ہٹلر کا جاسوس ہونے کے شبہ میں احمد آباد میں نظر بند کر دیا تھا۔ جنگ کے خاتمہ پر اس کی رہائی ہوئی تھی تو اس نے لاہور میں ڈیرے ڈال لئے تھے اور قیام پاکستان کے بعد وہ یہاں اسلام کا عظیم ترین علمبردار بن بیٹھا تھا۔ اس کی زندگی کا خود اپنایا ہوا یا کسی کا دیا ہوا واحد نصب العین یہ تھا کہ مشرق وسطیٰ اور برصغیر کے شمال مغربی علاقے میں سوویت یونین کے اثر ورسوخ کا سدباب کیا جائے۔ اس نے اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں اپنے محکمہ تعمیر اسلامی کا چارج سنبھالا تو چند دن بعد اس نے ریڈیو پاکستان لاہور سے تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہماری یہ مملکت پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اور ہم مسلمان اسلام سے وابستگی کی وجہ سے ایک قوم ہیں۔ میرا یہ نیا محکمہ مسلمانوں کی انفرادی واجتماعی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے کام میں مدد کرے گا۔ ملک میں اسلامی آئین کی ترتیب کے لئے مسلم رائے عامہ کی تعلیم وتربیت کرے گا۔ ممتاز علما پر مشتمل ایک شریعت کمیٹی قائم کرے گا جو قرآن وسنت کے مطابق قوانین وضع کرنے کے لئے تجاویز پیش کرے گی اور علما کی ایک اور کمیٹی اسلامی اصولوں کے مطابق ملک کی معاشی ترقی کے لئے تجاویز مرتب کرے گی۔ ظاہر ہے کہ اس شخص کی 14 اکتوبر کی یہ ریڈیائی تقریر قائداعظم کی 11 اگست کی تقریر کے سراسر منافی تھی۔ تاہم پنجاب میں اس کی تقریر کی خوب تشہیر ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ ان دنوں ریاست جموں وکشمیر کی پاکستان کے ساتھ الحاق کی بات چیت ٹوٹ چکی تھی اور نتیجتاً کشمیر میں قبائلی پٹھانوں کے ''جہاد'' کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ چونکہ قبائلیوں کی یہ یلغار اسلام کے نام پر ہونا تھی اس لئے اس موقع پر مذہب کو بطور سیاسی حربہ استعمال کرنے پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔

پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے اسلام فروشوں نے بھی اس موقع کو غنیمت سمجھا اور انہوں

نے قائداعظم جناح کا نام لئے بغیران کے سیکولر نظریہ سیاست پر بھرپور حملہ شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں 21/اکتوبر کو پنجاب اسمبلی کے ایک رکن میاں نوراللہ نے صوبائی لیگ کی مجلس عاملہ، مجلس عمل اور مجلس تنظیم کے مشترکہ اجلاس میں یہ قرارداد پیش کی کہ پاکستان میں شرعی نظام حکومت نافذ کیا جائے۔ اس قرارداد پر کوئی بحث نہ ہوئی اور یہ طے پایا کہ اس پر وسط نومبر میں پروانشل لیگ کونسل کے اجلاس میں غور ہوگا۔ اس قرارداد کا متن یہ تھا کہ ''چونکہ مسلم لیگ نے گزشتہ انتخابات اس غرض سے لڑے تھے کہ پاکستان میں ایک ایسی آزاد جمہوری ریاست قائم کی جائے جس کی اساس شریعت اسلامیہ پر ہوگی اس لئے مسلم لیگ کو صاف طور پر یہ اعلان کر دینا چاہیے کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہوگی۔ اگر کسی وجہ سے ایسا اعلان نہیں کیا جاسکتا تو پھر مسلم لیگ کی تنظیم کو ختم کر دیا جائے اور طریق حکومت کے متعلق بلاواسطہ عوام سے استصواب کیا جائے۔''[9] جس دن یہ قرارداد اخبارات میں شائع ہوئی اس دن جناح لاہور میں تھے لیکن حالات نے انہیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنے سیکولر نظریے کے خلاف اس قسم کے مذہبی پروپیگنڈے کا نوٹس نہ لیں۔ داخلی طور پر مسئلہ کشمیر نے مذہبی نعرے کا جواز پیدا کر دیا تھا اور خارجی طور پر مسئلہ فلسطین نے پان اسلام ازم یا اسلامی اتحاد کے نظریے کو ایک مرتبہ پھر زندہ کر دیا تھا۔

قائداعظم کی کشمیر پالیسی کی ناکامی نے انہیں بھی مذہبی نعروں کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا

26/اکتوبر کو حکومت ہندوستان نے مہاراجہ کشمیر کی جانب سے پیش کردہ الحاق کی درخواست کی منظوری کا فیصلہ کر لیا اور اس سے اگلے دن ہندوستانی فوجیں سری نگر پہنچ گئیں تو یہ حقیقت اظہر من الشّمس ہوگئی کہ ریاستوں کے بارے میں جناح کی غیر جمہوری اور غیر حقیقت پسندانہ پالیسی سے پاکستان کو سخت نقصان پہنچا ہے۔☆ انہوں نے اس نقصان کے ازالہ کے لئے پاکستانی فوج کے انگریز کمانڈر انچیف کو کشمیر میں فوجی کاروائی کا حکم دیا مگر اس نے اس حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا۔ 28/اکتوبر کو ہندوستان اور پاکستان کا مشترکہ سپریم کمانڈر سر کلاڈ آکن لیک

☆ تفصیلات کے لیے دیکھیے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ۔ جلد 3، ''پاک بھارت تنازعہ اور مسئلہ کشمیر کا آغاز'' ایڈیشن دوم 2013ء ص ص 417 - 442

دہلی سے لاہور پہنچا اور اس نے جناح سے ملاقات کر کے انہیں اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ کشمیر میں فوجی کارروائی سے متعلقہ اپنے حکم کی تعمیل پر اصرار نہ کریں۔ چونکہ اس صورتحال سے پاکستان میں جناح کے سیاسی وقار پر سخت ضرب لگی تھی اس لئے انہوں نے 20 اکتوبر کو لاہور کے یونیورسٹی سٹیڈیم میں ایک پبلک جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے مذہب کا سہارا لینا ضروری سمجھا۔ ان کا ان ابتلائی حالات میں اپنے حاضرین کو مشورہ یہ تھا کہ ''قرآن حکیم'' کو شمع ہدایت بنائیں۔ مجاہدین کا جذبہ پیدا کریں۔ پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنائیں اور اسلامی تعلیمات کے مطابق جام شہادت نوش کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہیں تو فتح تمہارے قدم چومے گی۔''[10] جناح کی یہ تقریر ان کی سیاسی بے بسی کے کھلے اعتراف کی حیثیت رکھتی تھی۔ کشمیر کے بارے میں ان کی پالیسی کی ناکامی نے ان کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ پاکستان میں اپنے وقار کو برقرار رکھنے کے لئے مذہبی نعروں کا استعمال کریں۔ چودھری محمد علی کا بیان ہے کہ ''کشمیر میں حالات کے اس تغیر نے قائداعظم کی صحت پر سخت ناموافق اثر ڈالا۔ تقسیم کے وقت اس ریاست کی مسلم آبادی اور جغرافیائی محل وقوع کی بنا پر انہیں پورا یقین تھا کہ کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق ضرور ہو جائے گا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ''کشمیر ہماری جھولی میں پکے ہوئے پھل کی طرح آ گرے گا۔'' اب وہ محسوس کرتے تھے کہ ان سے دھوکا کیا گیا ہے اور سابقہ رجائیت کی جگہ شدید مایوسی نے لے لی۔ انہوں نے کہا ''ہمیں غلط گاڑی پر سوار کر دیا گیا ہے'' جناح کی یہ مایوسی خود ان کی اپنی پیداوار تھی۔ انہیں کسی نے غلط گاڑی پر سوار نہیں کیا تھا بلکہ وہ 3 جون 1947ء کو برصغیر کی تقسیم کے منصوبے کے اعلان کے بعد ریاستوں کے بارے میں خود ہی غلط سیاسی گاڑی پر سوار رہنے پر مصر تھے اور اب اس غلط پالیسی کی وجہ سے ان کے اپنے سیاسی وقار کو اور پاکستان کو اس قدر شدید نقصان پہنچا تھا کہ ان کے پاس اپنے سیاسی وقار اور پاکستان کے وجود کے تحفظ کے لئے مذہب کا ہتھیار استعمال کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ ان کی 11 اگست کی تقریر اور 20 اکتوبر کی تقریر میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

پنجابی رجعت پسندوں کے ترجمان اخبار نوائے وقت کی طرف سے مغربی جمہوری نظام اور قائداعظم کی مخالفت

قائداعظم جناح کی اس زبردست سیاسی ہزیمت سے پنجاب میں قدامت پرست

حلقوں کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ جناح نے اپنی 30/اکتوبر کی تقریر میں مذہب کو قومی سیاست میں ملوث کر کے ان قدامت پرست حلقوں اور دقیانوسی مُلاؤں کو کھل کھیلنے کا سنہری موقع فراہم کیا تھا۔ چنانچہ ان مذہب فروش عناصر کے ترجمان اخبار نوائے وقت نے قیام پاکستان کے بعد پہلی مرتبہ پاکستان کے نظام حکومت کے موضوع پر خامہ فرسائی کی۔ اس کا اداریہ یہ تھا کہ ''ہم مغرب کے جمہوری نظام کی مذمت کرتے ہیں اور ہمارے قارئین بھی اس نظام کو اپنے ملک اور قوم کے مزاج کے ناموافق بتاتے رہے ہیں۔ 15/اگست کے بعد یہ نظام ہمارے لئے یکا یک مرغوب یا موافق کیونکر بن سکتا ہے۔ مغربی جمہوری نظام کا صاف مطلب یہ ہے کہ پاکستان ایک ایسی سٹیٹ ہوگی جس میں مذہب کو سیاست سے کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔ ہم ان مسلمانوں میں سے ہیں جو ہرگز یہ پوزیشن قبول نہیں کریں گے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام کی رو سے سیاست بھی مذہب کی تابع ہے اور کوئی ریاست جو سیاست اور مذہب کو جدا رکھتی ہے صحیح معنوں میں اسلامی ریاست نہیں۔ اس ریاست میں اور کسی دوسری لادین ریاست میں اسلامی نقطۂ نگاہ سے کوئی فرق نہیں۔ حب الوطنی کا تقاضا بے شک یہی ہے کہ ہم اس لادین ریاست کو بھی کسی دوسری لادین ریاست پر ترجیح دیں۔ مگر یہ ریاست اسلام کے نام پر ہم سے کوئی اپیل نہیں کر سکتی، یہ اصولی بات ہے اور کسی لیڈر کے ذاتی رجحانات، خواہ وہ لیڈر کتنا ہی جلیل القدر کیوں نہ ہو، ہمیں اس کے اظہار سے باز نہیں رکھ سکتے۔ لیکن عملاً بھی ہمیں اس میں کوئی مصلحت نظر نہیں آتی کہ پاکستان کا نظام حکومت اسلامی نہ ہو۔ اگر ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام بہترین نظام حیات ہے تو اللہ کے اس احسان عظیم کے بعد کہ اس نے ہمیں ایک ایسا ملک عطا کیا ہے جس میں ہم ضابطہ اسلامی رائج کر سکیں ہم اسلامی نظام کو چھوڑ کر مغرب کے مردود جمہوری نظام کے پیچھے کیوں بھاگیں''؟[11]

نوائے وقت کے اس اداریے میں اگر کوئی ابہام تھا تو صرف اتنا تھا کہ اس میں قائداعظم جناح کا نام نہیں لیا گیا تھا اور نہ ہی ان کی 11/اگست کی تقریر کا براہ راست حوالہ دیا گیا تھا۔ اگر ان باتوں کو اداریے میں شامل کر لیا جائے تو پھر اس کا صحیح مطلب سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ مطلب یہ تھا کہ جناح نے اپنی 11/اگست کی تقریر میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ پاکستانی قومیت کا ذکر کر کے اور مذہب کو سیاست سے الگ کر کے مغرب کی طرز کے لادینی جمہوری نظام حکومت کی علمبرداری کی تھی۔ اب انہیں قرآن حکیم اور اسلام کے نام پر

مسلمانوں سے اپیل کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ہم نے اب تک مصلحتاً جناح کے لادینی نظریۂ سیاست کی مخالفت نہیں کی تھی لیکن ہم آئندہ ایسا کرنے سے باز نہیں رہیں گے۔ ہم مغرب کے جدید سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کے خلاف ہیں اور قرون وسطیٰ کے جاگیردارانہ خلافتی نظام کے حق میں ہیں جس میں غیر مسلموں کو ذمیوں کی حیثیت حاصل ہوگی اور وہ کاروبار حکومت میں مساوی حیثیت سے حصہ لینے کے حقدار نہیں ہوں گے۔ مدیر نوائے وقت کی یہ قدامت پرستی کوئی نئی نہیں تھی۔ یہ 1944ء کے اوائل میں بھی اسی نظریے کا حامل تھا اور لیگ ہائی کمان کو محض اس لئے قرآن اور اسلام کے خلاف تصور کرتا تھا کیونکہ اس کے بعض لیڈر یہ کہا کرتے تھے کہ ''پاکستان کا نظام حکومت اس علاقے کی اکثریت طے کرے گی۔'' یہ پاکستان کے عوام کو یہ حق دینے کے حق میں نہیں تھا بلکہ یہ کسی ''امام'' کا منتظر تھا۔ اس کی شکایت تھی کہ خواجگان لیگ روش بندہ پروری سے بیگانہ ہیں اور میران کارواں خوئے استواری سے ناآشنا ہیں۔ اس نے اپنے اس نظریے اور شکایت کا اظہار حیدرآباد دکن میں ایک لیڈر بہادر یار جنگ کے نام فروری اور مارچ 1944ء میں تحریر کردہ دو خطوط میں کیا تھا۔☆

نوائے وقت کے اس اداریے کے بعد پنجاب میں جناح کے خلاف مذہبی سیاست کا ایک محاذ کھل گیا۔ چنانچہ یکم نومبر کو مسجد نیلا گنبد میں جمعہ کی نماز کے بعد ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں یہ کہا گیا تھا کہ ''اگر قرآن پاک کو شمع ہدایت بنائیں اور اس کی تعلیمات پر عمل کریں تو دنیا کی کوئی طاقت پاکستان کے وجود کو ختم نہیں کر سکتی اور کامیابی ہمارے قدم چومے گی اور ہم موجودہ آزمائش سے کامیاب و کامران نکلیں گے۔ لہٰذا ہر پاکستانی ہم سے، خواہ وہ حاکم ہو یا محکوم، راعی ہو یا رعایا، مطالبہ کرتا ہے کہ ایسا نمونہ اور کریکٹر اسلامی بنائے اور ایسی آسانیاں بہم پہنچائے کہ ہماری حکومت پاکستان میں قرآن اور شرعی نظام قائم ہو جائے کیونکہ یہی چیز ہماری مصیبتوں اور دکھوں کا واحد اور صحیح علاج ہے اور اگر اللہ کے فضل سے یہ نظام جلد قائم ہو گیا تو ہماری قربانیاں اس کے مقابلے میں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔ یہ بہت سستا اور ارزاں سودا ہے۔ ہم مسلمانان پاکستان حکومت وقت کے ساتھ ہر وقت تعاون اور اطاعت کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ حکم کتاب وسنت کے

☆ تفصیلات کے لیے دیکھئے پاکستان کی سیاسی تاریخ جلد 5۔ مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء ایڈیشن دوم 2013ء ص ص 401-400

مطابق ہو اور انتظامی معاملات میں اسلام، پاکستان اور مسلمانوں کی سربلندی مقصود ہو۔"[12]
جس دن یہ قرارداد منظور کی گئی تھی اس دن ہندوستان کا گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن لاہور میں تھا اور اس نے تنازعہ کشمیر کے پرامن تصفیہ کے لئے پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم جناح کی تجاویز منظور کرنے سے معذوری ظاہر کی تھی اور قبائلی "مجاہدین" میں بھگدڑ مچ چکی تھی۔ دوسری طرف جوناگڑھ کی ریاست کے نواحی علاقوں میں بھی ہندوستانی فوج کا داخلہ شروع ہو گیا تھا۔ جب آئندہ چند دنوں میں ان دونوں محاذوں پر ہندوستان کو مزید کامیابیاں ہوئیں اور پنجاب میں خانماں برباد مہاجرین کا سیلاب بڑھتا ہی چلا گیا تو عمر رسیدہ جناح کی بے بسی اور مایوسی میں بہت ہی اضافہ ہوا اور اس کے ساتھ ان ترقی پسند عناصر کی بھی بہت ہی حوصلہ شکنی ہوئی جو پاکستان کی تعمیر ایک جدید بورژوا جمہوری ریاست کے طور پر کرنا چاہتے تھے۔ ان عناصر میں پنجاب کا ایک مسلم لیگی لیڈر میاں افتخار الدین بھی تھا جو ضلع لاہور کا ایک بہت بڑا زمیندار ہونے کے باوجود پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کو ایک سیکولر جمہوری ریاست بنانا چاہتا تھا۔ مگر نومبر کے وسط میں اسکی سیاسی بے چارگی کا عالم یہ تھا کہ جب صوبائی لیگ کونسل کے اجلاس میں وہ صوبہ لیگ کا نیا صدر منتخب ہوا تو اس کی زیر صدارت میاں نوراللہ کی اس مضمون کی قرارداد بھی منظور کی گئی کہ "پاکستان میں ایک ایسا جمہوری آئین مرتب کیا جائے جو اسلامی شرع کے اصولوں کے عین مطابق ہو۔"

مودودی کی پاکستان آنے کے بعد بھی تحریک پاکستان کی مخالفت اور اسلامی نظام کے نام پر نوائے وقت کی ہم نوائی

قائداعظم جناح اور ان کے ہم خیال عناصر کی اس سیاسی بے چارگی و زبوں حالی سے ان مُلّاؤں نے فائدہ اٹھانے میں کوئی تاخیر نہ کی جنہوں نے مارچ 1940ء سے لے کر اگست 1947ء تک تحریک پاکستان کی سرتوڑ مخالفت کی تھی۔ ان مُلّاؤں میں ایک مُلّا ابوالاعلیٰ مودودی بھی تھا جس نے 1941ء میں لیگ کے مطالبہ پاکستان کی مخالفت کے لئے پٹھانکوٹ کے نزدیک ایک مسلمان زمیندار کی زیر سرپرستی قائم کردہ اپنی درسگاہ میں "جماعت اسلامی" کے نام سے ایک سیاسی تنظیم قائم کی تھی۔ جب 14راگست 1947ء کے بعد مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا منظم طریقے سے قتل عام شروع ہوا تو اس شخص کو بھی اپنے حواریوں کے ہمراہ لاہور میں آکر پناہ لینا

پڑی تھی جہاں اس نے تقریباً تین ماہ تک پاکستان کے بارے میں بالکل خاموشی اختیار کئے رکھی لیکن جب اکتوبر کے اواخر میں نوائے وقت اور اس کے ہم خیال عناصر نے کھل کر جناح اور ان کے سیکولر نظریہ سیاست کی مخالفت کی شروع کی تو اسے بھی مسئلہ پر اظہار خیال کی ہمت ہوئی اور اس نے بھی جماعت کے ترجمان ہفت روزہ ''کوثر'' کی 16 ر نومبر کی اشاعت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نعرہ لگا دیا۔ کوثر کا اعلان یہ تھا کہ ''ہم سے یہ بھی پوچھا جاتا ہے کہ تم لوگ جب تحریک کے ہمنوا نہیں تھے جس کے نتیجے میں پاکستان بنا ہے تو اب آخر تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ اس پاکستان کی سرزمین میں پناہ لو۔ اس سوال کا جواب ہمارے پاس یہ ہے کہ ہاں فی الواقع ہماری حیثیت پاکستان میں پناہ گزینوں کی سی ہے اور اگرچہ ہم اس تحریک کو آج بھی صحیح نہیں سمجھتے جس کے نتیجے میں پاکستان بنا ہے اور پاکستان کا اجتماعی نظام جن اصولوں پر قائم ہو رہا ہے ان اصولوں کو اسلامی نقطۂ نظر سے ہم کسی قدر و قیمت کا مستحق نہیں سمجھتے لیکن جو چیز ہمیں یہاں کھینچ لائی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کے باشندے اعمال و کردار کے لحاظ سے چاہے کوئی بھی رویہ رکھتے ہیں لیکن بہر حال وہ اس خدا کا نام لیتے ہیں جس کی عبادت و اطاعت ہماری نگاہ میں واجب ہے۔ وہ اپنے آپ کو اسی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت دیتے ہیں جس کے اسوہ کا اتباع ہماری نظر میں لازمۂ اسلام ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس کتاب کا حامل مانتے ہیں جس کے ایک ایک شوشہ کی پابندی مسلمان کے لئے فرض عین ہے اور وہ اس اسلامی نظام کے قیام کی خواہش ظاہر کرتے ہیں جس کے سوا کسی دوسرے نظام کو قائم یا قبول کرنا روا نہیں ہے۔ اب ہم اس سرزمین پر اس توقع سے قدم رکھ رہے ہیں کہ یہاں ہمارے لئے مسلمان کے لئے دین کا کام کرنا نسبتاً سہل ہوگا اور یہاں ہم کو اسلامی نظام کے برپا کرنے کے مواقع حاصل ہوں گے اور یہاں کے باشندے جن مقاصد کا نام لیتے ہیں ان کی دیانت دارانہ خدمت میں ہمارا ساتھ دیں گے۔ پاکستان بنانے کے لئے چاہے انداز غلط اختیار کیا گیا ہو لیکن مسلمانوں سے ہم یہ امید وابستہ رکھتے ہیں کہ اب اس پاکستان کو حاصل کر لینے کے بعد صحیح اسلامی اصولوں پر اسے فی الواقع پاکستان بنانے میں پس و پیش نہ کریں گے اور یہاں ایک ایسی حکومت قائم کرنے میں حصہ لیں گے جو پچھلی کوتاہیوں کو پورا کرنے والی ہو اور از سرتا پا دعوت الی الحق، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک مضبوط ادارہ بن جائے۔''

''نوائے وقت نے ''کوثر'' کا یہ اعلان اپنی 22 ر نومبر کی اشاعت میں اس مختصر

تبصرے کے ساتھ شائع کیا کہ ''یہ جماعت اسلامی کی طرف سے ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے پورے خلوص کے ساتھ لکھا گیا ہے مگر ہماری ناقص رائے میں پاکستان بن جانے اور جماعت اسلامی کے ارکان کے پاکستان پہنچ جانے کے بعد بھی اس پر اصرار اور اس کا اعلان کہ تحریک پاکستان غلط تھی نامناسب ہے۔''

گویا ان دنوں نوائے وقت کو جماعت اسلامی پر جو معمولی اعتراض تھا وہ یہ تھا کہ وہ پاکستان بننے کے بعد بھی اعلانیہ تحریک پاکستان کو غلط قرار دیتی تھی۔ نوائے وقت کو جماعت کی اس رائے سے اتفاق تھا کہ قائداعظم کی زیر قیادت پاکستان کا اجتماعی نظام جن اصولوں پر قائم ہو رہا تھا ان اصولوں کی اسلامی نقطہ نگاہ سے کوئی قدر و قیمت نہیں تھی اور وہ جماعت کے ساتھ مل کر ایسی حکومت قائم کرنے میں حصہ لینے کو تیار تھا جو پچھلی کوتاہیوں کو پورا کرنے والی ہو اور جو از سر تا پا دعوت الی الحق اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مضبوط ادارہ ہو۔ بظاہر مدیر نوائے وقت نے جماعت اسلامی سے اسی اتفاق رائے کی بنا پر اپنے اخبار کے 22/نومبر کے شمارے میں ہی اپنے اس اداریے کا لفظ بلفظ اعادہ کیا جو اس نے 30/اکتوبر کو شائع کیا تھا اور جس میں اس نے قائداعظم اور ان کی 11/اگست کی تقریر کا حوالہ دیئے بغیر یہ لکھا تھا کہ ''ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام کی رو سے سیاست بھی مذہب کے تابع ہے اور کوئی ریاست جو سیاست اور مذہب کو جدا رکھتی ہے صحیح معنوں میں اسلامی ریاست نہیں ہے۔ اس ریاست میں اور دوسری لادین ریاست میں اسلامی نقطہ نگاہ سے کوئی فرق نہیں...... یہ ریاست اسلام کے نام پر ہم سے کوئی اپیل نہیں کر سکتی۔ یہ اصولی بات ہے اور کسی لیڈر کے ذاتی رجحانات خواہ وہ کتنا ہی جلیل القدر کیوں نہ ہو ہمیں اس کے اظہار سے باز نہیں رکھ سکتے۔''

جناح اور غلام محمد کی سیکولر نظام کو فروغ دینے کی کوشش جبکہ لیاقت علی اور شبیر عثمانی کا اپنے مفاد کی خاطر اسلام اور مسلم قومیت کا استعمال

نوائے وقت اور جماعت اسلامی کے درمیان اس اتفاق رائے کے موقع پر قائداعظم جناح لاہور ہی میں تھے تاہم یہ کسی کو معلوم نہیں کہ انہوں نے اپنے خلاف پنجاب کے مذہب فروشوں اور قدامت پرستوں کے اس گٹھ جوڑ کا کوئی نوٹس لیا تھا یا نہیں؟ البتہ یہ سب کو معلوم ہے کہ

کراچی کے روزنامہ ڈان کے نامہ نگار نے 24 رنومبر کو لاہور سے قابل اعتماد ذرائع کا حوالہ دے کر یہ خبر بھیجی تھی کہ ’’ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا 13، 14 اور 15 ردسمبر کو کراچی میں جو اجلاس ہو رہا ہے اس میں آل انڈیا مسلم لیگ کو توڑ کر اس کی جگہ ایک پاکستان نیشنل لیگ قائم کی جائے گی جس کی رکنیت کے دروازے بلالحاظ ذات یا مسلک پاکستان کے سارے شہریوں کے لئے کھلے ہوں گے۔ اس طرح ہندوستان کے مسلمان مسلم لیگ کے ساتھ وفاداری کے رشتے سے آزاد ہو کر وہاں اپنی منشا کے مطابق کسی بھی پارٹی میں شامل ہو سکیں گے اور ان کے اس رویے سے انڈین یونین کی سیاسی فضا کے تکدر میں کمی ہو گی اور مسلمانوں کے بارے میں بے اعتمادی کا تاثر دور ہو جائے گا۔ مزید برآں پاکستان کی سیاست میں اس انقلابی تبدیلی سے بلالحاظ مذہب پاکستان کے سارے شہریوں میں ایک صحت مند قومی نظریے کی تعمیر میں مدد ملے گی۔ ‘‘[13]

روزنامہ ڈان نے 27 رنومبر کو اس خبر پر ایک اداریہ لکھا جس کا ایک حصہ تو یہ تھا کہ بلاشبہ مسلم لیگ کو بہ ہیئت موجودہ پاکستان میں برقرار رکھنے کی ضرورت نہیں اور اس کی جگہ ایک غیر فرقہ وارانہ تنظیم کے قیام کو عمومی طور پر پسند کیا جانا چاہیے جیسا کہ ہم نے حال ہی میں لکھا تھا۔ پاکستان میں مسلمان ایک قوم ہیں اور ان کی تنظیمیں خواہ سیاسی، معاشی یا معاشرتی ہوں فی الحقیقت قومی تنظیمیں ہوں گی۔‘‘ لیکن آگے چل کر اس اخبار کی رائے یہ تھی کہ مسلم لیگ کے خاتمہ کے بعد جمعیت العلمائے اسلام کو نئی اہمیت ملے گی اور اس کو تقویت دینے کی ضرورت ہو گی۔ یوں تو لادینی ریاست کی باتیں بھلی لگتی ہیں لیکن اس بات کو فراموش کرنے سے کچھ نہ حاصل ہو گا کہ ریاست کے اداروں اور قوانین کو اسلامی تصور حیات کے سانچے میں ڈھالنا ہو گا۔ پاکستان کے عوام اور قائدین کے ذہن میں لادینیت کا اس قسم کا تصور نہیں ہو سکتا جیسی کہ مصطفی کمال کے ترکیہ کے ابتدائی سالوں میں رائج کی گئی تھی۔ قائداعظم نے ابھی چند دن ہی ہوئے (24 رنومبر کو) لاہور میں مصری اخبار نویسوں سے انٹرویو کے دوران صحیح طور پر یہ بات زور دے کر کہی تھی کہ ’’ پاکستان کے آئین کی بنیاد اسلامی اصولوں اور شریعت پر ہو گی۔ لہٰذا غیر فرقہ وارانہ سیاسی تنظیم کے ساتھ ساتھ ایک ایسی جماعت کی نشوونما ضروری ہے جو اسلامی اصولوں اور شریعت کے بارے میں مطلوبہ رہنمائی کرے گی اور خود کو تنظیم و تبلیغ کے کام کے لئے وقف کرے گی۔ پاکستان کے معماروں کو جو سب سے بڑا کام درپیش ہے وہ یہ ہے کہ مسلم قوم کو ایک مرتبہ ہر چیز میں اسلام کے حقیقی جذبے سے

سرشار کریں تا کہ وہ حقیقی مسلمان بنیں۔''[14]

روزنامہ ڈان کی 24/نومبر کی متذکرہ خبر دراصل جناح کی 11/اگست 1947ء کی تقریر کی آئینہ داری کرتی تھی اور اس کا مطلب یہ تھا کہ بابائے قوم نومبر کے تیسرے ہفتے میں بھی نہایت غیر موافق سیاسی حالات کے باوجود اور اپنے خلاف پنجاب کے قدامت پرستوں کے گٹھ جوڑ کے باوجود اپنے سیکولر نظریہ سیاست پر قائم تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان میں جدید بورژوا جمہوری نظام کے تحت ایک غیر فرقہ وارانہ قومی جماعت کے پرچم تلے مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ قومیت کی نشوونما ہو۔ تاہم ڈان کا 27/نومبر کا اداریہ جو شبیر احمد عثمانی کے یکم ستمبر کے بیان کی آئینہ داری کرتا تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ مغربی جمہوریت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ قوم پرستی تباہ کن ہے۔ دو قوموں کا نظریہ بے معنی نہیں تھا اور میں چاہتا ہوں کہ ''حالات خواہ کتنے ہی نامساعد کیوں نہ ہوں مسلمان مسلمان رہے اور ہندو ہندو۔'' غالباً ڈان کی یہ خبر وزیر خزانہ غلام محمد کی تحریک پر شائع کی گئی تھی جو ان دنوں قائداعظم کے ہمراہ لاہور میں تھا اور کھلم کھلا سیکولر نظام حکومت کی حمایت کرتا تھا۔ اور ڈان کا اداریہ وزیر اعظم لیاقت علی خان کی تحریک پر شائع ہوا تھا جو جگہ جگہ اسلامی اصولوں کی تبلیغ کرتا پھر رہا تھا۔ گورنر جنرل جناح اور وزیر خزانہ غلام محمد کی جانب سے غیر فرقہ واریت اور سیکولرازم کی علمبرداری کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کے خیال میں صرف اس طرح شاید ہندوستان میں مسلم اقلیت کے جان و مال کا تحفظ ہو سکتا تھا بالخصوص ایسی حالت میں کہ جس شخص چودھری خلیق الزماں کو جناح نے ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت کا فرض سونپا تھا۔ وہ اپنے خاندان کے سارے ارکان کے ہمراہ وہاں سے فرار ہو کر کراچی پہنچ گیا تھا اور اس کوشش میں تھا کہ اس کے بعد اس کے خاندان کو ضلع لاڑکانہ میں متروکہ شہری و دیہاتی جائیدادیں الاٹ ہو جائیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ سندھ سے ہندوؤں کے انخلا کو قومی مفاد کے منافی سمجھتے تھے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ اگر سندھ میں ہندو اقلیت موجود رہے گی تو نہ صرف ہندوستان میں مسلم اقلیت سے قدرے رواداری کا سلوک ہو گا بلکہ سندھ کی معیشت میں بھی خلا پیدا نہیں ہو گا لیکن دوسری طرف وزیر اعظم لیاقت علی خان اور شبیر احمد عثمانی کا خیال یہ تھا کہ اگر پاکستان میں اسلام اور مسلم قومیت پر زور نہ دیا گیا تو حیدر آباد دکن، دہلی اور یو۔ پی سے جو مہاجرین جوق در جوق کراچی پہنچ رہے تھے ان کی سندھ اور پاکستان کے دوسرے علاقوں میں آبادکاری میں مشکل پیش آئے گی۔

یہ کام وہ سندھی اور پنجابی شاونزم کے خلاف اسلام اور مسلم قومیت کا سٹیم رولر چلا کر ہی کر سکتے تھے۔ علاوہ بریں لیاقت علی خان کو یہ بھی خطرہ لاحق تھا کہ اگر پاکستان میں غیر فرقہ واریت کو فروغ حاصل ہوا تو حسین شہید سہروردی وزارت عظمیٰ پر قبضہ کر لے گا۔ سہروردی پاکستان میں غیر فرقہ وارانہ نیشنل لیگ کے قیام کا حامی تھا۔ جناح اسے وزارت بحالیات کا عہدہ پیش کر چکے تھے۔ اور یہ بات بھی سب کو معلوم تھی کہ جناح کے نزدیک لیاقت علی خان کی شخصیت پسندیدہ نہیں تھی۔

جناح اور ان کے ہم خیال حلقوں کی طرف سے مسلم لیگ کا نام بدل کر نیشنل لیگ رکھنے کی کوشش اور پنجابی اسلام پسندوں، لیاقت علی اور جاگیردار دھڑے کی طرف سے مخالفت

یہ لیاقت علی خان اور شبیر احمد عثمانی وغیرہ کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں کم از کم اس مسئلہ پر پنجاب سے زبردست تائید وحمایت حاصل تھی۔ پنجاب میں جو عناصر قرون وسطیٰ کے خلافتی نظام اور مسلم قومیت کے نعرے بلند کرتے تھے ان میں کچھ تو ایسے تھے جو اپنی کم علمی و کم عقلی کے باعث واقعی یہ باور کرتے تھے کہ اگر پاکستان میں علما کے تصور کے مطابق اسلامی نظام رائج ہو جائے تو نہ صرف ایک مرتبہ پھر دہلی کے لال قلعہ پر اسلامی پرچم لہرانے لگے گا بلکہ ساری دنیا میں اسلام کا بول بالا ہو جائے گا اور بعض دوسرے عناصر ایسے تھے جو اسلام و مسلم قومیت کے زور پر پورے پاکستان میں پنجابی راج قائم کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ فوج ان کے پاس ہے اور اگر اس فوج کو اسلام اور مسلم قومیت کے نظریاتی ہتھیاروں سے لیس کر دیا جائے تو علامہ اقبال کے خواب کے مطابق پنجابی سلطنت کے قیام کے راستے میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہو گی۔ وہ سندھیوں، بلوچوں، پٹھانوں اور بنگالیوں کے سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کو اسلامی بندوق کے زور سے سلب کرنا چاہتے تھے۔

لاہور کا روزنامہ نوائے وقت ان دونوں عناصر کی ترجمانی کرتا تھا۔ چنانچہ اس کا 29 نومبر کو اداریہ یہ تھا کہ ''مسلم لیگ کے خاتمہ اور نیشنل لیگ کے قیام کا فیصلہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس میں مصلحت غالباً یہ ہے کہ نیشنل لیگ بھی عملاً مسلم لیگ ہی ہو گی کیونکہ مسلمانوں کو اس

میں غلبہ حاصل ہوگا۔لیکن اگر صورتحال یہی ہوگی تو پھر اس حسن ظن کی بنیاد کس چیز پر ہے کہ اس اقدام سے ہندوستانی مسلمانوں کی پوزیشن بھی بہتر ہوجائے گی اور چونکہ ہم پاکستان میں ہندوؤں کو اپنی ''نیشنل تنظیم'' میں شامل کرلیں گے اس لئے ہندوستان میں ہندو بھی کانگرس کے دروازے مسلمانوں پر کھول دیں گے۔ یہ دروازے تو اب بھی کھلے ہوئے ہیں۔اصل سوال تو یہ ہے کہ دروازے کے اندر پہنچنے کے بعد مسلمانوں سے کیا سلوک ہوتا ہے؟ ہمیں اعتراف ہے کہ مغربی سیاست کے لحاظ سے اس تجویز میں بہت سی خوبیاں ہیں مگر بایں ہمہ یہ دلائل اتنے وزنی نہیں کہ ہمیں لیگ کے خاتمے کے حق میں رائے دینے پر آمادہ کرسکیں۔صحیح اقدام یہی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو آل انڈیا مسلم لیگ کی حلقہ بگوشی سے آزاد کردیا جائے اور پاکستان میں مسلم لیگ بدستور کام کرے۔ یہ فیصلہ لیگ کونسل کے ممبروں کو کرنا ہے۔ممکن ہے ان کی اکثریت اس خیال کی حامی ہو کہ مسلم لیگ کی جگہ نیشنل لیگ ہی قائم کی جائے۔ اس کے باوجود ان لوگوں کو، جن کا نصب العین یہ ہے کہ پاکستان میں ایک اسلامی مملکت قائم کی جائے، اپنی مہم جاری رکھنی چاہیے۔ وہ نیشنل لیگ کے اندر یا باہر ایک ایسا گروپ منظم کریں (مثلاً اخوان المسلمین مصر کی طرح) جس کا مطمع نظر یہ ہو کہ دنیا کی سب سے بڑی آزاد مسلم ریاست کو صحیح معنوں میں اسلامی ریاست بنایا جائے۔'' اس اداریے میں اخوان المسلمین کا ذکر خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔مصر میں اینگلو۔امریکی بلاک کی زیر سرپرستی قائم شدہ مذہبی جنونیوں کا یہ دہشت پسند گروہ وہاں کی غیر فرقہ وارانہ قوم پرست وفد پارٹی کے خلاف تھا۔اس پارٹی نے عیسائی اقلیت کو نہایت فراخدلانہ رعایات دے کر مصر میں غیر فرقہ وارانہ قومیت کے تصور کو فروغ دیا تھا۔

چونکہ اس امر کا امکان تھا کہ پاکستان میں مجوزہ نیشنل لیگ بھی مصر کی وفد پارٹی کا سیاسی مسلک اختیار کرے گی۔اس لئے نوائے وقت اس کے خلاف اخوان المسلمین کے قیام کا حامی تھا۔ اس کا اس سلسلے میں ادارتی خیال یہ تھا کہ ''جمعیت اخوان المسلمین مصر کی ایسی باوقار جماعت ہے جس کا نصب العین مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان بنیں اور قرآن اور اسوۂ رسول ﷺ کو اپنے لئے مشعل ہدایت بنائیں۔اس جماعت کا آغاز مصر میں ہوا مگر اب مشرق وسطیٰ کے تمام ممالک میں اس کی شاخیں موجود ہیں۔گو بعض اصحاب اس جماعت کے ارکان کی تعداد 80 لاکھ بتاتے ہیں مگر ہمارا اندازہ یہ ہے کہ اخوان المسلمین کے ارکان کی تعداد کم وبیش 20

لاکھ ہے۔ یہ جماعت مشرق وسطیٰ میں بہت مقتدر اور مؤثر ہے اور اس کی سرگرمیوں کی وجہ سے عرب ممالک میں روح اسلامی از سرِ نو بیدار ہو رہی ہے۔ اگر پاکستان میں بھی اخوان المسلمین کی شاخ قائم کی جائے تو یہ ایک مبارک اقدام ہوگا۔ پاکستانی مسلمانوں بالخصوص نوجوانوں میں اسلام کی طرف رغبت روز افزوں ہے۔ جمعیت اخوان المسلمین کے قیام سے نہ صرف یہ جذبہ ترقی کرے گا اور اس سے ملت کے لئے معتبر عملی نتائج مرتب ہو سکیں گے بلکہ پاکستانی مسلمانوں اور مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں میں ایک گہرا رابطہ بھی استوار ہو جائے گا۔ جمعیت اخوان المسلمین کے نائب قائد سید صالح اشماری آج کل پاکستان میں ہیں۔ ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سلسلہ میں ان سے تبادلۂ خیالات کرنا چاہیے۔"[15] اس اداریے کے دو تین دن بعد نوائے وقت میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں پہلے تو ان لوگوں کی مذمت کی گئی جو مسلم لیگ کے "پیارے نام" کو پاکستان نیشنل لیگ کا "نامسعود نام" دینا چاہتے تھے اور پھر آخر میں یہ لکھا تھا کہ "پاکستان کے معمارو! خدا کے لئے ہوش میں آؤ۔ اس عظیم الشان اسلامی سلطنت کی تعمیر کے لئے یقین کے چونے اور خلوص کے گارے کی ضرورت ہے اور تم تو ان کی اینٹوں سے اسلامی نشانوں کو بھی کھرچ رہے ہو۔ ذرا سوچو تو سہی کہ تمہارا یہ طریق کار کہاں تک درست ہے۔ پاکستان کی عزت کے خواہشمندو! یہ بات گوش ہوش سے سن لو کہ اگر تم نے اسلامی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا، اگر تم نے اسلامی اصول سے روگردانی کی تو یاد رکھو تمہارا نام صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا جائے گا اور تمہیں ان مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا جن کا تمہیں سان گمان تک نہیں۔"[16]

پاکستان کے معماروں کے خلاف نوائے وقت کی اتنی زیادہ برہمی کی ایک وجہ یہ تھی کہ قائداعظم جناح نے 27 نومبر کو پاکستان کی پہلی سہ روزہ ایجوکیشنل کانفرنس کو جو پیغام دیا تھا اس میں مذہبی تعلیم کو فروغ دینے کی ضرورت کا کوئی ذکر نہیں تھا البتہ اس میں کہا گیا تھا کہ "ہماری معاشی زندگی کی تعمیر کے لئے فوری اور اشد ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے عوام کو سائنسی اور تکنیکی تعلیم دیں اور ہمیں اس امر کا بھی بندوست کرنا چاہیے کہ ہمارے عوام سائنٹیفک تجارت اور بالخصوص منصوبہ بندی کے تحت قائم شدہ صنعتوں میں حصہ لیں۔" تاہم جب 29 نومبر کو اس کانفرنس کی رپورٹ شائع ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس کانفرنس نے پاکستان کے تمام سکولوں اور کالجوں میں مسلمان طلبا کے لئے مذہبی تعلیم کو لازمی قرار دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کانفرنس میں مدیر نوائے وقت کے ایک محسن

نواب مشتاق احمد گرمانی کی یہ قرارداد بھی منظور کی گئی کہ اسلامی تعلیمات کے فروغ کے لئے ایک کونسل آف اسلامک ریسرچ قائم کی جائے۔ یہ کانفرنس مرکزی وزیر تعلیم فضل الرحمان کی زیر صدارت منعقد ہوئی تھی۔ اس میں کئی دوسرے مرکزی اور صوبائی وزرا نے شرکت کی تھی اور اس کے فیصلوں کو وزیر اعظم لیاقت علی خان کی تائید و حمایت بھی حاصل تھی۔ لہٰذا اس کانفرنس کے خاتمہ پر یہ بات واضح ہوگئی کہ جو مسلم لیگی عناصر آل انڈیا مسلم لیگ کو توڑ کر اس کی جگہ پاکستان نیشنل لیگ قائم کرنا چاہتے تھے وہ پاکستان کی بساط سیاست پر اقلیت میں تھے۔ اکثریت انہی عناصر کی تھی جو پاکستان کو مُلّا ئیت کی تاریکی میں دھکیلنے کے درپے تھے۔

چنانچہ 7 دسمبر کو ڈان کی رپورٹ یہ تھی کہ اگر آل انڈیا مسلم لیگ کو توڑ دیا گیا تو یہ فیصلہ مشرقی بنگال کے مسلم لیگیوں کے لئے قابل قبول نہیں ہوگا اور 10 دسمبر کو ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کی خبر میں بتایا گیا تھا کہ مغربی پنجاب کے مسلم لیگی کونسلروں کی بھاری اکثریت آل انڈیا مسلم لیگ کو توڑ کر اس کی جگہ ایسی پاکستان نیشنل لیگ کے قیام کی تجویز کے خلاف ہے جس کی رکنیت کے دروازے اقلیتوں پر بھی کھلے ہوں گے۔ ان کونسلروں کا موقف یہ ہے کہ اگر ایسا کیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پاکستان کے مسلمانوں نے یکا یک دو قومی نظریے کو ترک کر دیا ہے جو مطالبہ پاکستان کی بنیاد تھا۔ اسی دن نوائے وقت نے ایک اور اداریہ لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ ''ہم ابھی تک اپنی پہلی رائے پر قائم ہیں کہ پاکستان میں مسلم لیگ کا وجود باقی رہنا چاہیے۔ اس لئے کہ پاکستان بن جانے کے بعد مسلم لیگ کا کام ختم نہیں ہوا بلکہ اصل کام ابھی شروع ہوا ہے۔ پاکستان محض جغرافیائی تقسیم کا نام نہیں، نہ ہی یہ چیز مسلمانوں کا نصب العین تھی۔ مسلمانوں کا نصب العین مسلمان اکثریت کے علاقوں میں آزاد و خود مختار اسلامی ریاست کا قیام تھا۔ ابھی مسلمانوں کو یہ اہم کام سرانجام دینا ہے اور اسے کامیابی کے ساتھ سرانجام دینے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کی صفیں مضبوط ہوں اور ان میں کامل اعتماد ہو۔ اس وقت سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کو متحد رکھنے والے عوامل صرف دو ہیں۔ قائد اعظم کی ذات اور مسلم لیگ۔ فرد خواہ کتنا ہی عظیم الشان کیوں نہ ہو اس کی ذات ہمیشہ کے لئے کسی قوم کے لئے نقطۂ اتحاد نہیں بن سکتی۔ یہ کام فوجی جماعت (مدیر نوائے وقت نے یقیناً قومی جماعت لکھا ہو گا لیکن کاتب کی غلطی نے فوجی جماعت بنا دیا اور یہ تاریخی ستم ظریفی تھی کہ اس کی یہ غلطی بعد میں بالکل صحیح ثابت ہوئی) ہی کر سکتی

ہے۔ہمیں اندیشہ ہے کہ مسلم لیگ کے ختم ہوتے ہی مسلمانوں میں ازسر نو انتشار پیدا ہو جائے گا۔ مختلف نئی جماعتیں، مختلف دعاوی اور مختلف پروگراموں کے ساتھ معرض وجود میں آ جائیں گی اور مسلمانوں کی توجہ تعمیر کی بجائے تخریب پر مرتکز ہو جائے گی اور وہ پاکستان کو ایک آزاد مضبوط اسلامی ریاست بنانے کی بجائے خود مسلمانوں کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں مصروف ہو جائیں گے۔اگر دو قوموں کا نظریہ صحیح تھا اور صحیح ہے، اگر ہندو اور مسلمان دو قومیں تھیں اور دو قومیں ہیں، اگر مسلمانوں کے پاس اپنا کوئی مخصوص لائحہ عمل تھا اور ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس نظریہ کے حامی اور ان معتقدات کے حامل اب اپنے ہاتھ سے اس پر خط تنسیخ پھیریں؟ اگر مقصد واقعی اسلامی حکومت کا قیام تھا تو اس مقصد کے حصول کے لئے مسلمانوں کی جماعت ضروری ہے۔اسلامی نظام حیات کی ترویج کا مطالبہ ایک مسلمان جماعت ہی کر سکتی ہے ایک نیشنل جماعت نہیں......مشرقی بنگال میں مسلمان پسماندہ اور غریب ہیں۔اس کے برعکس ایک کروڑ بیس لاکھ کی ہندو اقلیت منظم و مضبوط ہے۔اس وقت بھی مشرقی بنگال اور مغربی بنگال کو متحد کرنے کی تحریک جاری ہے۔مشرقی بنگال میں مسلم لیگ کو ختم کر کے اس کی جگہ پاکستان نیشنل لیگ قائم کرنے کا قدرتی ردعمل یہ ہوگا کہ متحدہ بنگال کی تحریک کو تقویت پہنچے گی اور دونوں بنگال ایک ہو جائیں گے یعنی مشرقی بنگال پاکستان سے علیحدہ ہو جائے گا اور اس کے ساتھ ساڑھے تین کروڑ مسلمان انڈین یونین کی آغوش میں چلے جائیں گے۔''[17] لیکن مدیر نوائے وقت نے اس اداریے میں یہ نہیں بتایا تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی کون سی قرارداد میں یہ کہا گیا تھا کہ ہندوستان کے مسلم اکثریتی علاقوں میں جو آزاد و خودمختار ریاست قائم ہو گی وہ اسلامی ریاست ہو گی اور اس میں اسلامی نظام رائج ہو گا جس کے تحت غیر مسلموں کو مساوی حقوق نہیں دیئے جائیں گے۔مسلم لیگ کی 23 مارچ 1940ء کی قرارداد میں ایسی کوئی بات نہیں کہی گئی تھی بلکہ اس میں مسلم اکثریتی علاقوں کی جغرافیائی تقسیم کا مطالبہ کیا گیا تھا اور یہ یقین دلایا گیا تھا کہ ان ریاستوں کے آئین میں اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی حقوق و مفادات کے لئے ان کے مشورہ سے کافی اور مؤثر تحفظات رکھے جائیں گے۔اسی طرح اپریل 1946ء میں مسلم لیگی ارکان اسمبلی کے کنونشن میں جو قرارداد منظور کی گئی تھی اس میں بھی اسلامی ریاست یا اسلامی نظام کا کوئی ذکر نہیں تھا اور پھر نوائے وقت نے کبھی بابائے قوم کی 11 اگست کی تقریر پر براہ راست تبصرہ نہیں کیا تھا اور کبھی یہ نہیں بتایا تھا کہ اس میں غیر فرقہ

وارانہ پاکستانی قومیت اور لادینی نظام حکومت کا اعلان کیا گیا تھا۔ البتہ اس نے 30ر اکتوبر کے بعد اشاروں کنایوں میں نہ صرف خود جناح کی ذات پر حملے شروع کر دیئے تھے بلکہ دوسروں سے بھی حملے کروائے تھے اور اس مقصد کے لئے جماعت اسلامی کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے کی کوشش تھی۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں جناح کے حامی سیکولر دھڑے کی ناکامی...... پاکستان نیشنل لیگ کے بجائے پاکستان مسلم لیگ کا قیام

پروگرام کے مطابق 13ر دسمبر 1947ء کو کراچی میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے دو اجلاس ہوئے اور پھر 14ر دسمبر کو مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا جس میں مجلس عاملہ کی تجویز کے مطابق اور حسین شہید سہروردی کی تجویز کے برعکس یہ فیصلہ کیا گیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے بجائے پاکستان اور بھارت کے لئے مسلم لیگ کی علیحدہ علیحدہ تنظیمیں ہونی چاہئیں۔ پاکستان میں مسلم لیگ کا کنوینر لیاقت علی خان ہوگا اور بھارت میں مسلم لیگ کا کنوینر نواب محمد اسماعیل خان ہو گا۔ لیگ کونسل کے فیصلے سے قدامت پرست خلافتیوں کی فتح ہوئی اور قائداعظم جناح سمیت ان ترقی پسند عناصر کی شکست ہوئی جو پاکستان کو ایک سیکولر جمہوری ریاست بنانے کے خواہاں تھے۔ کونسل کی ایک اور قرارداد میں اس امر پر خوشی و اطمینان کا اظہار کیا گیا کہ مسلم لیگ نے اپنا نصب العین یعنی پاکستان حاصل کر لیا ہے اور کہا کہ ''کونسل تمام ہندوستانی مسلمانوں کو اس کامیابی پر ہدیہ تبریک پیش کرتی ہے۔ کونسل کو پورا یقین ہے کہ آزاد و خودمختار سلطنت کے قیام کی خاطر قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں مسلم لیگ کی بے مثال جدوجہد اور ایک اسلامی سلطنت کے قیام کی صورت میں مسلم لیگ کی آخری فتح موجودہ دور کا اہم ترین واقعہ ہے۔ اب کونسل پاکستان کے تمام مسلمانوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ تعمیر پاکستان کی خاطر اپنی مساعی صرف کر دیں تاکہ کم از کم عرصہ میں یہ نوزائیدہ مملکت قوموں کی برادری میں ایک باعزت جگہ حاصل کرے اور سماجی انصاف کی بنا پر ایک قابل تقلید جمہوری سلطنت ہونے کا فخر حاصل کر سکے۔ اسلام کے زریں اصولوں کے مطابق اس مملکت میں انسانی آزادی کا احترام ہوگا اور یہ عالمگیر امن کو برقرار رکھنے کے لئے کوشاں رہے گی۔ فوجی اعتبار سے مضبوط و مستحکم، اخلاقی و مادی وسائل کے لحاظ سے اس معیاری مملکت میں تمام شہریوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے اور یہاں خوف، قلت اور جہالت

کا نام تک نہیں ہوگا۔[18] یہ قرارداد قدامت پسند ''خلافتیوں'' اور جدیدیت پسند ''جمہوریوں'' کے درمیان مصالحت کا نتیجہ تھی۔ اس میں اسلامی مملکت اور اسلام کے زریں اصولوں کا بھی ذکر تھا اور سماجی انصاف پر مبنی ایک مثالی جمہوری مملکت اور سارے شہریوں کے لئے مساوی حقوق کی یقین دہانی بھی کرائی گئی تھی۔ اس میں نہ تو یہ کہا گیا تھا کہ پاکستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی غیر فرقہ وارانہ مشترکہ قومیت کے نظریے کی بنیاد پر سیکولر جمہوری نظام حکومت رائج ہوگا اور نہ ہی یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ یہاں قرون وسطیٰ کا خلافتی نظام نافذ ہوگا جس میں غیر مسلموں کو مساوی حقوق نہیں ملیں گے اور ان سے جزیہ وصول کیا جائے گا۔

مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کونسل کے یہ اجلاس بند کمرے میں ہوئے تھے اس لئے ان میں جو تقریریں کی گئی تھیں ان کی کوئی رپورٹ اخبارات میں شائع نہیں ہوئی تھی۔ تاہم بعد کی بعض اطلاعات کے مطابق مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے جس اجلاس میں مسلم لیگ کو بطور فرقہ وارانہ جماعت قائم رکھنے کی تجویز منظور کی گئی تھی وہ وزیر اعظم لیاقت علی خان کے مکان پر منعقد ہوا تھا۔ اس میں قائداعظم جناح نے خرابی مصحلت کی بنا پر شرکت نہیں کی تھی اور پھر کونسل کے اجلاس میں جناح نے اپنی ایک گھنٹہ کی تقریر میں اس مسئلہ پر کوئی اظہار خیال نہیں کیا تھا۔ ان کی صحت بڑی خراب تھی اور وہ افسردہ تھے۔ تاہم وزیر اعظم لیاقت علی خان اور سردار عبدالرب نشتر نے اپنی تقریروں میں پاکستان مسلم لیگ کی فرقہ وارانہ حیثیت کو برقرار رکھنے کی حمایت میں تقریریں کیں اور حسین شہید سہروردی اور میاں افتخار الدین نے اس تجویز کی مخالفت کی۔

کراچی کے ہندو اخبار ''ڈیلی گزٹ'' نے 18 دسمبر کو اپنے افتتاحیہ میں مسلم لیگ کونسل کے اس فیصلے پر سخت اظہار افسوس کیا کہ پاکستان نیشنل لیگ کی بجائے مسلم لیگ کا فرقہ وارانہ رنگ برقرار رکھا گیا ہے۔ اخبار کی رائے یہ تھی کہ یہ فیصلہ رجعت پسند عناصر کی فتح ہے اور اس فیصلہ میں کوئی معقولیت دکھائی نہیں دیتی۔ سندھ کے سابق مسلم لیگی لیڈر جی۔ ایم۔ سید کی رائے یہ تھی کہ پاکستان نیشنل لیگ کا قیام ضروری ہے جس میں تمام قوموں اور جماعتوں کے ارکان شامل ہوں۔ حسین شہید سہروردی کو بھی جی۔ ایم۔ سید کی اس رائے سے پورا اتفاق تھا اور اسے حیرت تھی کہ مسلم لیگ کے اعلیٰ سطح کے لیڈروں میں اس کے مخالف نظریہ فروغ پا رہا ہے حالانکہ مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کی خاصی تعداد موجود ہے۔ ڈیلی گزٹ کا ایڈیٹر ایم۔ ایس۔ شرما بڑا متعصّب ہندو تھا اور

اسے مسلمانوں اور پاکستان میں کبھی کوئی خوبی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ لیگ کونسل کے اس اجلاس کے دوران بڑا سرگرم تھا اور اس نے ان ہی دنوں قائداعظم سے ملاقات بھی کی تھی۔ اس نے اپنی ایک کتاب میں اس ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ وہ اعتراف کرتا ہے کہ ''قیام پاکستان کے بعد جناح کو ہندوؤں سے کوئی رنجش نہیں تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر ہندو۔ مسلم اتحاد کے سفیر کا اپنا پرانا مشہور کردار ادا کرنے کے متمنی تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ میں پاکستان میں ہندو اقلیت کا پروٹیکٹر جنرل بن کر رہوں گا...... جناح کو کراچی میں سکھوں کی خونریزی کے المیہ پر بے انتہا صدمہ ہوا تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ جب ہندو شرنارتھیوں کے کیمپوں کا معائنہ کیا تو یہ مرد آہن اپنے اعصاب پر قابو نہ رکھ سکا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے...... جناح نے مسلم لیگ کو ایک غیر فرقہ وارانہ قومی جماعت بنانے کی بہت کوشش کی تھی۔ وہ اس جماعت کی رکنیت کے دروازے بلا لحاظ ذات، مسلک، نسل اور مذہب پاکستان کے سارے شہریوں کے لئے کھلے رکھنا چاہتے تھے۔''[19]

اگرچہ شرما نے قائداعظم سے اپنی ملاقات کی جو تفصیل بیان کی ہے وہ من گھڑت معلوم نہیں ہوتی تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ جناح نے 27 / اکتوبر کو کشمیر میں اپنی پالیسی کی ناکامی کے بعد اپنے 11 / اگست 1947ء کے سیکولر نظریے پر زوردار طریقے سے اصرار نہیں کیا تھا اور نہ ہی انہوں نے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں نیشنل لیگ کے قیام کی تجویز کی کھل کر حمایت کی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کشمیر میں ہندوستانی افواج کی فتوحات کی وجہ سے پاکستان کے عوام میں بالعموم اور پنجاب کے عوام میں بالخصوص شکست خوردگی کا جو احساس پیدا ہو گیا تھا اس کے پیش نظر پاکستان میں وقتی طور پر غیر فرقہ وارانہ سیاست کی گنجائش نہیں رہی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ 27 / اکتوبر کے بعد جناح کی صحت واقعی بہت خراب ہو گئی تھی اور اس بنا پر ان میں اس قوت ارادی کی کمی ہو گئی تھی جس کا وہ ماضی میں بڑی کامیابی سے مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے سیکولر نظریۂ سیاست سے دستبردار ہو گئے تھے۔ وہ نظریاتی طور پر اپنی 11 / اگست کی تقریر پر بدستور قائم تھے۔ چنانچہ لیگ کونسل کے اس اجلاس کے تین چار دن بعد 14 / دسمبر کو جب بی۔ بی۔ سی (B.B.C) کے ایک نمائندہ نے ان سے ایک انٹرویو کے دوران یہ سوال پوچھا کہ آیا پاکستان مسلم لیگ ایک ایسی قومی تنظیم کی صورت اختیار کر لے گی جس کی رکنیت سارے مذہبی فرقوں کے لئے کھلی ہو گی، تو ان کا جواب یہ تھا کہ ابھی اس قسم کی قومی تنظیم کے قیام کا

وقت نہیں آیا۔ پاکستان کے مسلمانوں کی رائے عامہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ہمیں ایسے جمہوری نعروں سے متاثر نہیں ہونا چاہیے جن کی بنیاد حقائق پر نہ ہو۔مسلمانوں نے ابھی حال ہی میں اپنے لئے وطن حاصل کیا ہے۔ انہیں ابھی ایسے ڈھانچے کی تعمیر کرنی ہے جو آنے والے حالات وواقعات کے لئے موزوں ہو۔لیکن پاکستان میں خالص مسلم جماعت کے قیام کا فیصلہ ناقابل تنسیخ نہیں ہے۔سیاسیات میں کوئی چیز جامد وساکت نہیں ہوتی۔'' انہوں نے اس انٹرویو کے پانچ چھ دن بعد 25/دسمبر 1947ء کو اپنے یوم پیدائش کی ایک تقریب میں سرظفراللہ خاں سے وزارت خارجہ کے عہدے کا حلف لیا حالانکہ وزیراعظم لیاقت علی خاں اس تقرر کے خلاف تھا اور شبیر احمد عثمانی کے علاوہ بہت سے دوسرے علما اسے مرتد اور واجب القتل تصور کرتے تھے۔

باب:2

سیکولر نظام حکومت کے علمبرداروں کی پسپائی اور مُلّاؤں کی چڑھائی

یو۔ پی کے مُلّاؤں نے سندھ میں اردو بولنے والوں کے لئے جائیدادوں اور دیگر مادی مفادات کی خاطر اسلام کے نام پر تنظیمیں قائم کرنا شروع کر دیں

مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں ''خلافتیوں'' کی فتح ہوئی تو دو ایک دن بعد مولانا شبیر احمد عثمانی نے مولانا ظفر احمد انصاری کے مکان پر اپنے ہم خیال علما کو جمع کیا اور پاکستان میں اپنی جمعیت العلمائے اسلام کی بنیاد رکھ دی۔ یہ جماعت دراصل علما کے پریشر گروپ کے طور پر قائم ہوئی تھی۔ اس کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ مرکزی حکومت اور مسلم لیگ میں سیکولر نظریہ سیاست رکھنے والے عناصر کو پنپنے نہ دیا جائے۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ اسلام اور مسلم قومیت کے زور پر صوبہ سندھ کی متروکہ جائیدادوں کا دہلی، یو۔ پی اور حیدر آباد دکن کے مہاجرین کو قبضہ دلوایا جائے اور تیسرا مقصد یہ تھا کہ مشرقی بنگال، صوبہ سرحد اور بلوچستان کی پسماندہ قومیتوں کی جانب سے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کا جو مطالبہ اٹھ رہا تھا اس کا اسلام کے ہتھوڑے سے ابتدا ہی میں سر کچل دیا جائے۔ مشرقی بنگال میں نومبر کی ایجوکیشنل کانفرنس کی اس تجویز کے خلاف احتجاج شروع ہو گیا تھا کہ اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیا جائے۔

عثمانی نے روزنامہ ڈان کے 27 رنومبر کے ادارتی مشورے کے مطابق اپنی جمعیت قائم کرنے کے بعد سب سے پہلے 19 ردسمبر کو کراچی کی جیکب لائنز کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کے خطبہ میں اعلان کیا کہ ''ہمیں پاکستان کے قیام سے پہلے اور اس کے بعد جو زخم لگے ہیں وہ صرف

اسلامی آئین کے نفاذ سے ہی بھر سکتے ہیں۔ پاکستان میں آج کل جو غیر اسلامی اور اسلام دشمن طور طریقے دیکھنے میں آرہے ہیں ہم انہیں برداشت نہیں کریں گے...... اگر وزرا اور گورنروں نے مسلم رائے دہندگان سے کئے گئے وعدے پورے نہ کئے تو انہیں اپنے عہدوں کو چھوڑنا پڑے گا۔"[1] پھر اس نے 22/دسمبر کو ایک بیان میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ مشرقی بنگال میں قومی زبان کا تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا ہے اور پھر اس نے 27/دسمبر کو کراچی کے عیدگاہ میدان میں ایک پبلک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ صوبہ پرستی کے انداز میں نہ سوچیں۔ اس نے کہا کہ "قیام پاکستان سے قبل میں مسلمانوں سے یہ کہا کرتا تھا کہ ہماری نئی مملکت برصغیر کے دس کروڑ مسلمانوں کا بچاؤ کرے گی۔ مجھے سندھ کے مسلمان لیڈروں نے بھی یہی یقین دلایا تھا اور کہا تھا کہ ان کا صوبہ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کا اسی طرح خیر مقدم کرے گا جس طرح رسول پاک ﷺ کے زمانے میں مدینہ کے انصار نے مہاجرین کا کیا تھا۔ لیکن حیرت ہے کہ اب اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ ان کے لئے پاکستان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اب ایسے نعرے لگ رہے ہیں کہ پنجاب پنجابیوں کے لئے ہے اور سندھ سندھیوں کے لئے ہے۔ مجھے یہ سن کر بے انتہا صدمہ ہوا ہے کہ دہلی اور یو۔پی کے مسلم مہاجرین سے یہ کہا جا رہا ہے کہ ان کے لئے پاکستان میں کوئی جگہ نہیں حالانکہ وہ پاکستان کی جدوجہد میں پیش پیش تھے اور انہوں نے پاکستان کی حمایت کرنے کی وجہ سے بہت مالی و جانی نقصان اٹھایا ہے۔" اس نے حکومت سندھ کے وزرا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "انہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کا وجود محض یو۔پی اور دہلی کے مسلمانوں کی قربانیوں کی وجہ سے ہے۔ انہیں مہاجرین سے بدسلوکی نہیں کرنا چاہیے اور یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جنہوں نے ان کو اقتدار دیا ہے ان سے یہ اقتدار واپس بھی لے سکتے ہیں۔"[2] مولانا کی اس تقریر سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے پاکستان میں اپنی مذہبی سیاست کا کاروبار حکومت سندھ کے خلاف یو۔پی کے مہاجرین کے پلیٹ فارم سے شروع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کا یہ فیصلہ صحیح تھا کیونکہ دسمبر 1947ء میں کھوڑو کی حکومت سندھ اور مرکزی ارباب اقتدار کے درمیان کراچی کی علیحدگی اور مہاجرین کی آبادکاری کے مسائل پر زبردست کشمکش شروع ہو چکی تھی اور اس کشمکش میں سندھیوں کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا۔

مولانا عثمانی اس کاروبار میں تنہا نہیں تھا۔ کراچی میں اس کا ایک زبردست حریف بھی تھا جس کا نام مولانا عبدالحامد بدایونی تھا اور جو بریلوی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ چنانچہ جب مولانا

عثمانی نے مہاجرین کے پلیٹ فارم کو استعمال کرنے کی ابتدا کی تو مولانا بدایونی بھی فوراً بازار میں آ گیا اور اس نے 2 رجنوری 1948ء کو مہاجرین کی ایک سنٹرل کمیٹی بنالی۔ تاہم اس کے دو دن بعد یعنی 4 رجنوری کو سندھ کے وزیر تعلیم پیر الٰہی بخش کی زیر صدارت مولانا عثمانی کی جمعیت مہاجرین بھی وجود میں آ گئی۔

پنجاب مسلم لیگ کے ترقی پسند رہنما میاں افتخار الدین کی غریب اور بے زمین مہاجرین کی آبادکاری کے بارے میں ترقی پسندانہ سکیم اور جاگیرداروں اور مُلّاؤں کی اس کے خلاف مہم

جب کراچی میں ان دونوں مولاناؤں نے مہاجرین کے نام پر اپنی اپنی دکانیں سجائی تھیں، اس وقت پنجاب میں بھی جاگیرداروں اور مُلّاؤں کا ایک بڑا حلقہ شب وروز مذہب فروشی میں مصروف تھا۔ ان کا ہدف پنجاب مسلم لیگ کا کنوینر میاں افتخار الدین تھا جس کو 1947ء میں صوبائی وزارت بحالیات کا عہدہ دیا گیا تھا لیکن اس نے تقریباً دو ماہ بعد نومبر میں اس عہدے سے اس بنا پر استعفیٰ دے دیا تھا کہ اس نے صوبہ میں مہاجرین کی آبادکاری کے بارے میں جو سکیم مرتب کی تھی وہ نواب ممدوٹ کی صوبائی کابینہ نے مسترد کر دی تھی۔ افتخار الدین کی سکیم کا خلاصہ یہ تھا کہ زرعی پیداوار میں زمینداروں کے حصہ میں بہت کمی کی جائے۔ ایک معقول حد سے زیادہ نجی آمدنی پر بھاری ٹیکس عائد کئے جائیں۔ اس ٹیکس سے جو آمدنی ہو اس سے بے روزگار مہاجرین کی مالی امداد کی جائے۔ صنعتکاری کی رفتار میں اضافہ کیا جائے اور ساری بڑی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا جائے اور قومی دولت کی تقسیم عمومی طور پر زیادہ منصفانہ طریقہ سے کی جائے۔ افتخار الدین نے اپنے استعفے کے بعد لائلپور، جھنگ، منٹگمری، کیمبلپور اور مغربی پنجاب کے متعدد دوسرے اضلاع کا دورہ کر کے عوامی جلسوں میں اپنی سکیم کی وضاحت کی۔ اس کی تقریروں کا لب لباب یہ تھا کہ اگر کاشتکاروں کے لئے معاشی یونٹ بارہ ایکڑ سے گھٹا کر چھ ایکڑ کر دیا جائے اور زرعی پیداوار میں سے زمینداروں کے حصہ میں خاصی کمی کر دی جائے تو بے زمین مہاجرین کی آبادکاری کے لئے کافی اراضی دستیاب ہو جائے گی۔ اس کی تجویز یہ تھی کہ جن زمینداروں کے پاس دو مربعوں سے زیادہ زمین ہے ان کی

اس رقبہ سے فالتو زمین پر 16 ایکڑ فی خاندان کے حساب سے مہاجرین کو آباد کیا جائے۔ زمیندار کا حصہ مالیہ کی تین گنا حد سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ زمیندار کے حصہ کی وصولی سرکاری انتظامیہ کے ذریعہ ہونی چاہیے تا کہ کسان زمیندار کی گرفت سے کچھ باہر نکل کر سکھ کا سانس لے سکیں۔ وہ کہتا تھا کہ صوبہ میں دو مربع سے زیادہ رقبہ کے مالک زمینداروں کی تعداد 80 ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر ان کی فالتو زمین اس کی سکیم کے مطابق برائے کاشت بے زمین کسانوں کو دے دی جائے تو اس طرح ایک کروڑ 72 لاکھ کسانوں کو فائدہ پہنچے گا۔ اس کی مزید تجویز یہ تھی کہ جو مسلمان زمیندار ہندوستان سے نقل مکانی کر کے پاکستان میں آئے ہیں انہیں متروکہ اراضی کے بڑے بڑے رقبے الاٹ کر کے صوبہ میں نئے زمینداروں کا طبقہ پیدا کیا جائے بلکہ متروکہ اراضی کو معاشی یونٹوں میں تقسیم کر کے اسے بے زمین مہاجرین کو الاٹ کر دیا جائے بلا لحاظ اس کے کہ یہ مہاجرین ہندوستان میں زرعی اراضی کے مالک تھے یا نہیں۔ وہ سارے متروکہ کارخانوں کو قومی ملکیت میں لینے کے حق میں تھا کیونکہ اس طرح حکومت پر اقربا نوازی کا الزام عائد نہیں ہوگا اور صوبہ کی معاشی مشکلات پر قابو پانے میں بڑی مدد ملے گی۔ وہ کہتا تھا کہ میں کمیونسٹ نہیں ہوں۔ میں کبھی کمیونسٹ پارٹی کا رکن نہیں رہا۔ میں نے مہاجرین کی آبادکاری کے لئے جو سکیم پیش کی ہے وہ غیر اسلامی نہیں ہے۔ اسلام معاشی و معاشرتی مساوات کی تعلیم دیتا ہے اس لئے ہمیں ایسی پالیسی اختیار نہیں کرنی چاہیے جس سے امیر امیر تر ہوں اور غریب غریب تر۔

چونکہ افتخار الدین جہاں جاتا تھا اس کے پبلک جلسوں میں بہت سے لوگ شریک ہو کر اس کی سکیم کی پرجوش تائید و حمایت کرتے تھے اس لئے مفاد پرست جاگیرداروں اور ان کے زرخرید مُلّاؤں کے حلقوں میں تہلکہ مچ گیا۔ ہر طرف سے شور برپا ہوا کہ افتخار الدین کمیونسٹ ہے اور اسلام دشمن ہے۔ یہ متروکہ زرعی اراضی اور کارخانوں کو قومی ملکیت میں لینے کا پرچار کرتا ہے حالانکہ اسلام کی رو سے نجی ملکیت پر کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ زمینداروں کے اخبار ایسٹرن ٹائمز نے نومبر اور دسمبر 1947ء میں احمد شفیع، پیر تاج الدین اور بعض دوسرے افراد کے کئی مضامین اور اداریے شائع کئے جن میں یہ الزام عائد کیا گیا کہ افتخار الدین جو کچھ کہتا ہے وہ غیر اسلامی ہے اور اسے خداداد مملکت پاکستان میں اشتراکیت کا پروپیگنڈا کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ ایسٹرن ٹائمز کے 28 نومبر 1947ء کی اشاعت کے ایک مضمون میں تجویز پیش کی گئی تھی کہ

پاکستان میں اسلام کے بنیادی اصولوں پر مبنی تھیوکریٹک نظام حکومت رائج ہونا چاہیے۔ اگر اس ملک میں اسلام کا قانون وراثت نافذ کیا جائے تو زکوٰۃ کا نظام رائج کیا جائے۔ لوگوں میں خوف خدا ہو اور وہ صدقہ وخیرات باقاعدگی سے دیں تو معاشی عدم مساوات کا خود بخود انسداد ہو جائے گا۔ آج کل کے نازک حالات میں یقیناً جماعتی نظام نقصان دہ ہے اور اس سے حالات کو کنٹرول میں نہیں رکھا جا سکا۔ قائداعظم کو چاہیے کہ اپنی پالیسی پر نظر ثانی کر کے بلالحاظ جماعتی روابط باصلاحیت لوگوں کو حکومت میں شریک کریں۔ پاکستان کے لئے تھیوکریٹک نظام حکومت اس لئے ضروری ہے کہ اس کے وسائل بہت کم ہیں۔ یہ ملک صرف اسلامی اصولوں کو اپنا کر ہی خوشحال اور طاقتور ہو سکتا ہے۔

بظاہر وزیراعلیٰ نواب ممدوٹ بھی اس مضمون نگار سے متفق تھا۔ چنانچہ اس نے بھی افتخار الدین کی اس مہم کا توڑ کرنے کے لئے اپنی تقریروں اور بیانات میں اسلامی اصولوں کی پابندی پر زور دیا۔ 29 رنومبر 1947ء کو ممدوٹ نے لاہور میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے صوبہ میں بدکرداری کی ممانعت اور شرعی قوانین کے نفاذ کے بارے میں اپنی حکومت کے فیصلے کا اعلان کیا۔ اس پریس کانفرنس میں اس کا وزیر خزانہ ممتاز دولتانہ بھی تھا۔ اس نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ''صوبائی حکومت شراب نوشی پر پابندی عائد کرنے کے حق میں ہے لیکن چونکہ اس مسئلہ کا تعلق مرکزی حکومت سے ہے اس لئے اس سلسلے میں قطعی فیصلہ صرف مرکزی حکومت ہی کر سکتی ہے۔''[3] ان کی اس پریس کانفرنس کا مقصد عوام کو یہ تاثر دینا تھا کہ ان کے اسلامی نقطۂ نگاہ سے صوبہ میں اصلی عوامی مسئلہ متروکہ زرعی زمینوں اور کارخانوں کی ملکیت کا نہیں تھا بلکہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ بدکاری، شراب نوشی اور دوسری معاشرتی برائیوں کا سدباب کیا جائے۔ 4 ردسمبر کو وزیر خزانہ ممتاز دولتانہ نے سیالکوٹ کے ایک پبلک جلسہ میں بتایا کہ صوبائی اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں ایک شریعت بل پیش کیا جائے گا جس کے تحت وراثت اور طلاق وغیرہ کے مسائل کا فیصلہ اسلامی ضوابط کے مطابق ہوگا۔

22 ردسمبر کو لندن کے اخبار مانچسٹر گارڈین نے بھی پنجاب کی اس عوامی بحث کا نوٹس لیا اور خدشہ ظاہر کیا کہ ''پاکستان کے ریڈیکل ازم کی جانب جھکنے کا امکان ہے۔ مسلم لیگ میں ریڈیکل عناصر موجود ہیں۔ جب جناح کا کنٹرول ختم ہو جائے گا تو ان عناصر کو پھلنے پھولنے کا موقع مل جائے گا۔ سب سے بڑا ریڈیکل لیڈر افتخار الدین ہے جس کی سیاسی زندگی کا بیشتر حصہ کانگرس

کے ریڈیکل حلقوں میں گزرا ہے۔ ان دنوں اس پر کئی بار خفیہ کمیونسٹ ہونے کا الزام عائد کیا گیا تھا جبکہ اسے بہت سے سرگرم نوجوانوں کی حمایت حاصل تھی۔ ان نوجوانوں میں بعض سابق کمیونسٹ بھی تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر پاکستان کا ریڈیکل ازم کی طرف جھکاؤ ہوا تو پھر اس کے اور ہندوستان کے درمیان تعلقات پر کیا اثر پڑے گا۔ ریڈیکل عناصر سیکولر ہیں اور اپنے نظریے کے لحاظ سے غیر فرقہ واریت کے قائل ہیں۔ لہٰذا اس امر کا امکان ہے کہ ہندوستان کے قدامت پسند عناصر پاکستان میں ریڈیکل عناصر کے عروج کو پاکستان میں کمیونزم کی طرف اور ہندوستانی امور میں عظیم ہمسایہ (سوویت یونین) کی مداخلت کی طرف پہلا قدم تصور کریں۔''[4]

سامراجی مفادات کی خاطر مودودی کا پرچار کہ زمین اور دوسری کسی ملکیت پر اسلام نے کوئی حد مقرر نہیں کی

مانچسٹر گارڈین کے اس اداریے کی تعبیر یہ تھی کہ پنجاب کے رجعت پسند حلقوں کو اور لندن کے سامراجی حلقوں کو افتخارالدین کی اس بے ضرر سی سکیم میں داخلی اور خارجی کمیونزم کا زبردست خطرہ نظر آنے لگا تھا کیونکہ اس کے جلسوں میں بہت سے لوگ شریک ہوتے تھے اور وہ زمینداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف پرجوش نعرے لگاتے تھے۔ ان حلقوں کا خیال تھا کہ افتخارالدین پاکستان کے غریبوں میں طبقاتی شعور کا جو جن بوتل سے نکال رہا ہے اس کو صرف اسلام کے ڈھکنے سے ہی بند رکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جنوری 1948ء میں انہوں نے اس مقصد کے لئے جماعت اسلامی کے امیر ابوالاعلیٰ مودودی اور بعض دوسرے مولویوں کی خدمات حاصل کیں۔ صوبائی محکمہ تعمیر اسلامی نے پہلے تو مُلّا مودودی سے ریڈیائی تقریروں کا سلسلہ شروع کروایا اور پھر لاہور کے لا کالج میں اس کے لئے لیکچروں کا بندوبست کیا۔ مُلّا مودودی معاشی امور میں اسلامی مساوات کا قائل نہیں تھا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ ''خدا کی بنائی ہوئی فطرت خود اس بات کی متقاضی ہے کہ انسانوں کے درمیان رزق میں تفاوت ہو۔ لہٰذا وہ تمام تدبیریں اسلامی نقطۂ نظر سے مقصد اور اصول میں غلط ہیں جو انسانوں کے درمیان ایک مصنوعی معاشی مساوات قائم کرنے کے لئے اختیار کی جائیں۔ اسلام جس مساوات کا قائل ہے وہ رزق میں مساوات نہیں بلکہ حصول رزق کی جدوجہد کے مواقع میں مساوات ہے۔ فطرت سے قریب تر نظام وہی ہو سکتا ہے جس میں

ہر شخص معیشت کے میدان میں اپنی دوڑ کی ابتدا اسی مقام اور اسی حالت سے کرے جس پر خدا نے اسے پیدا کیا ہے [5] ...... جو موٹر لئے ہوئے آیا ہے وہ موٹر ہی پر چلے، جو صرف دو پاؤں لایا ہے وہ پیدل ہی چلے اور جو لنگڑا پیدا ہوا ہے وہ لنگڑا کر ہی چلے۔ سوسائٹی کا قانون نہ تو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ موٹر والے کا مستقل اجارہ موٹر پر قائم کر دے اور لنگڑے کے لئے موٹر کا حصول ناممکن بنا دے اور نہ ہی ایسا ہونا چاہیے کہ سب کی دوڑ زبردستی ایک ہی مقام اور ایک ہی حالت سے شروع ہو اور آگے تک انہیں لازماً ایک دوسرے کے ساتھ باندھ رکھا جائے [6] ...... اسلام تمام دوسری ملکیتوں کی طرح زمین پر انسان کی شخصی ملکیت تسلیم کرتا ہے۔ جتنی قانونی شکلیں ایک چیز پر کسی شخص کی ملکیت قائم وثابت ہونے کے لئے مقرر ہیں ان ساری شکلوں کے مطابق زمین بھی اسی طرح ایک آدمی کی ملکیت ہوسکتی ہے جس طرح کوئی دوسری چیز۔ اس کے لئے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ ایک گز مربع سے لے کر ہزارہا مربع ایکڑ تک، خواہ کتنی ہی زمین ہو، اگر کسی قانونی صورت سے آدمی کی ملک میں آئی ہے تو بہر حال وہ اس کی جائز ملکیت ہے۔ اس کے لئے خود کاشت کرنے کی قید بھی نہیں ہے۔ جس طرح مکان اور فرنیچر کرائے پر دیا جاسکتا ہے اور تجارت میں شرکت کی جاسکتی ہے اسی طرح زمین بھی کرائے پر دی جاسکتی ہے اور اس میں بھی شرکت کے اصول پر زراعت ہوسکتی ہے۔ بلا کرایہ کوئی شخص کسی کو دے یا بٹائی لئے بغیر کسی کو اپنی زمین کاشت کر لینے دے تو یہ صدقہ ہے مگر کرایہ و لگان یا بٹائی پر معاملہ طے کرنا ایسے ہی ایک جائز فعل ہے جیسے تجارت میں حصہ داری یا کسی دوسری چیز کو کرایہ پر دینا...... [7] جو نظام زندگی انسان کی انفرادیت کو عزیز رکھتا ہو اور انسانی شخصیت کے ابھار کو مقصدی اہمیت دیتا ہو اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ اجتماعی فلاح کی ایسی تمام سکیموں کو اصولی طور پر قطعی وحتمی طور پر رد کر دے جن میں یہ تجویز کی گیا ہو کہ زمینوں اور کارخانوں اور تجارتوں کو قومی ملکیت بنا لیا جائے یا ان پر ریاست کا تازیانہ تسلط قائم کر کے ایک مرکزی منصوبہ بندی کے تحت ساری معیشت کی مشین گھمانی شروع کر دی جائے۔'' [8]

روزنامہ انقلاب کے مولانا غلام رسول مہر اور شاہی مسجد کے مولانا غلام مرشد کی جانب سے ترقی پسند زرعی اصلاحات کی حمایت

لاہور کے روزنامہ انقلاب کو علما کی اس قسم کی آرا سے اتفاق نہیں تھا۔ اس ساری بحث

کے بارے میں اس اخبار کے ایڈیٹر مولانا غلام رسول مہر کی ادراتی رائے یہ تھی کہ ''اس بدیہی حقیقت کو کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ امیر بچے اور غریب بچے کی طبعی ضروریات یکساں ہیں۔ ایک امیر جوان اور غریب جوان یا ایک امیر عورت اور غریب عورت کی احتیاجات میں اصولاً کوئی فرق نہیں۔ اگر ایک امیر نے سوسائٹی کی بے لگامیوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے لئے مخصوص و ممتاز ماحول پیدا کر لیا یا اسباب معیشت کی فراوانی نے اسے ایک خاص طرز معاشرت کا عادی بنا دیا تو اس کا یہ نتیجہ قطعاً نہیں ہو سکتا کہ ایک صالح اور حق شناس حکومت اس غلط عادت کو انفرادی حق مان کر اس کی حمایت کرے اور سینکڑوں غریبوں کو گوناگوں پریشانیوں میں مبتلا ہونے دے اور پھر اس سارے عمل پر اسلامیت کی تصدیقی مہر لگائی جائے اور جب کہا جائے کہ غریبوں اور امیروں کے وسائل میں توزان پیدا کرنا چاہیے تو شور مچا دیا جائے کہ یہ متاع تو لینن اور سٹالن کی منڈی سے لائی جا رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ اسلام نے انفرادی ملکیت کو تسلیم کیا ہے۔ بہت اچھا۔ لیکن اگر غیر مساوی اور غیر متوازن ملکیتوں کی جگہ مساوی متوازن ملکیتیں پیدا ہو جائیں تو اس میں پریشان ہونے کی کون سی وجہ ہے؟ کیا اسلام کا مدعا معاذ اللہ یہ ہی ہے کہ انفرادی ملکیتیں زیادہ سے زیادہ غیر متوازن ہوں۔ یعنی چند ہزار آدمی بڑے دولت مند ہوں، باقی سب محتاج ہوں اور وہ ہر لحظہ چند ہزار دولت مندوں کے صدقات و زکوٰۃ یا جذبہ انفاق مال سے اپنی ضروریات وابستہ کئے رہیں؟ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ تمام موجودہ ملکیتیں اسلامی قواعد کی پابندی میں وجود پذیر ہوئیں اور یہ تمام اشجار اسلامیت کی آب و ہوا میں پھلے پھولے۔ جب اودھ کی تعلقہ داریوں کا سوال اٹھا تو مولانا شبیر احمد عثمانی نے ان کے حق میں فتویٰ دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ ان کی حفاظت میں جان دینا شہادت ہے۔ حالانکہ یہ تعلقہ داریاں اس عہد کی یادگار تھیں جب شاہان وقت مختلف امرا کو فوجوں کی مخصوص تعداد مہیا رکھنے کے لئے جاگیریں دیا کرتے تھے۔ بادشاہ ختم ہو گئے، پرانے فوجی نظام ختم ہو گئے، انگریز آئے تو انہوں نے فوج کا الگ انتظام کر لیا لیکن یہ جاگیریں اس وجہ سے باقی رکھیں کہ جاگیردار انگریزی حکومت کی حمایت کے ستون بنے رہیں۔ ان جاگیرداروں پر آج تک میراث کا عمل جاری نہ ہوا۔ یہ کسی اسلامی تقاضے کی تکمیل نہ کر سکیں۔ (الا ماشاءاللہ) ان ملکیتوں یا ان جیسی ہزاروں دوسری ملکیتوں کو اسلام کی رو سے جائز انفرادی ملکیتیں تسلیم کرنا ہمارے فہم سے تو بالکل بالا ہے...... ہم مسلمان ہیں اور یقیناً ہمارا دلی عقیدہ ہے کہ ہماری دنیوی اور اخروی فلاح

صرف اسلام کے احکام کی پیروی پر موقوف ہے۔ ہمارے نزدیک اقتصادی توازن عین مقصد اسلام ہے اور اس توازن کے لئے سعی و کوشش میں تامل کی کوئی وجہ نہیں پاتے۔ اس کے لئے ہمیں لینن یا سٹالن کے پاس جانے کی ضرورت نہیں اور نہ یہ مناسب ہے کہ توازن کی صدا کو خواہ مخواہ لینن اور سٹالن سے منسوب کر کے نیک دل مسلمانوں کو ڈرایا جائے۔''[9]

ایڈیٹر انقلاب کی طرح لاہور کی شاہی مسجد کا امام مولانا غلام مرشد بھی، جس نے 26، 27/اکتوبر 1945ء کو کلکتہ میں مسلم لیگ اور مطالبہ پاکستان کے حامی علما کی پہلی کانفرنس کی صدارت کی تھی، اس سلسلے میں مودودی اور اسی قبیل کے دوسرے مُلّاؤں سے اتفاق نہیں کرتا تھا۔ مولانا مرشد کی پتوکی کے ایک جلسہ عام میں وزیر اعلیٰ نواب ممدوٹ کی موجودگی میں تقریر یہ تھی کہ اسلامی زرعی قوانین کے ماتحت حکومت کا اختیار ہے کہ وہ شہریوں کی ضروریات سے زائد زمین پر جبراً تصرف حاصل کر لے۔ اس نے حضرت عمرؓ کی مثال پیش کی جنہوں نے رسولﷺ کریم کے ایک سرکردہ صحابی حضرت بلالؓ کو اپنی جاگیر سے دستبردار ہونے پر مجبور کیا تھا۔ خلیفہ وقت کا یہ اقدام اس بنا پر تھا کہ حضرت بلالؓ کو جس وقت یہ جاگیر عطا کی گئی تھی اس وقت دوسرے لوگوں کی ضروریات اتنی اہم نہیں تھیں۔''[10]

میاں افتخارالدین کی مہم کے مثبت نتائج اور اس کے خلاف رجعت پسند صحافیوں اور احراریوں کی مہم

روزنامہ انقلاب کے مذکورہ اداریے، مولانا غلام مرشد کی اس تقریر اور بعض دوسرے ترقی پسند دانشوروں اور زمینداروں کی جانب سے پاکستان میں روزافزوں معاشی اور معاشرتی عدم مساوات کی صداؤں سے ظاہر تھا کہ افتخارالدین کی یہ مہم بے اثر ثابت نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ جب جنوری کے دوسرے ہفتے میں صوبائی اسمبلی کا سیشن شروع ہوا تو 9/جنوری کو ایوان میں صوبائی حکومت کی طرف سے یہ اعلانات کئے گئے کہ صوبہ میں رشوت ستانی کے انسداد کے لئے ایک ایسا قانون منظور کیا جائے گا جس کے تحت رشوت خوروں کو درے لگائے جائیں گے۔ ایک اور قانون بنام مسلم پرسنل لا (شریعت) ایپلی کیشن بل منظور کیا جائے گا جس کے تحت موروثی جائیداد کی تقسیم شرعی قانون کے مطابق ہوگی اور مالیہ اور آبیانہ پر دو آنے فی روپیہ کے حساب سے مہاجر ٹیکس عائد

کرنے کے لئے دو قوانین منظور ہوں گے۔ اس سے اگلے دن 10 رجنوری 1948ء کو ایسٹرن ٹائمز میں احمد شفیع کا ایک مضمون شائع ہوا جس کی تان اس بات پر ٹوٹی تھی کہ صوبہ میں فی الفور زکوٰۃ کا نظام رائج کیا جائے، قبل اس کے کہ میاں افتخار الدین کی کمیونسٹ شرارت خطرے کی حد تک پہنچ جائے۔ مضمون نگار کا خیال تھا کہ زکوٰۃ کمیونزم کے جراثیم کے لئے ڈی۔ ڈی۔ ٹی کا کام کرے گی۔ یہ شخص رجعت پسند مُلّاؤں سے بھی زیادہ دقیانوسی تھا۔ اسے میاں افتخار الدین کی ہر بات میں کمیونزم کی بو آتی تھی۔ اس کے نزدیک انگریزوں اور ہندوؤں کا غلبہ کمیونزم سے بہتر تھا۔ چنانچہ قبل ازیں اس نے 5 ردسمبر 1947ء اور 17 ردسمبر کو بھی افتخار الدین اور اس کے کمیونزم کے خلاف بڑے زوردار مضامین لکھے تھے۔ یہ کہتا تھا کہ ساری دنیا میں مسلم معاشرے کی حیاتی قوت کا انحصار سیاسی اقتدار پر نہیں ہے بلکہ اس بات پر ہے کہ یہ معاشرہ طبقاتی شعور سے مبرا ہے اور میاں افتخار الدین اسی حیاتی قوت کو کچلنے کے درپے ہے۔ مذہبی لحاظ سے امیر اور غریب بھائی بھائی ہیں۔ مذہب نے ان دونوں کے حقوق و فرائض کا تعین کر دیا ہوا ہے۔ ہمیں خود ایسے معاشی اقدامات کرنے چاہئیں کہ مسلم معاشرے کی نمایاں خصوصیتیں برقرار رہیں۔ ان خصوصیتوں میں ایک خصوصیت نجی جائیداد کا حق ہے۔

11 رجنوری 1948ء کو مجلس احرار کے ایک کارکن شورش کاشمیری نے گوجرانوالہ میں ایک پبلک جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے افتخار الدین پر اس بنا پر نکتہ چینی کی کہ وہ کمیونسٹ خطوط پر زرعی زمین کو قومیانے کی مہم چلا رہا ہے۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ ''اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اس لئے ہمیں اپنے مسائل حل کرنے کے لئے دوسروں کی جانب دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پاکستانی مسلمان ہر غیر اسلامی چیز کی درآمد کی مخالفت کریں گے۔ یہاں صرف اسلام کو ہی اعلیٰ ترین مقام حاصل رہے گا۔''[11] یہ آغا شورش کاشمیری تحریک پاکستان کی سر توڑ مخالفت کرنے والی مجلس احرار کا نہایت بدکلام اور بے لگام کارکن تھا۔ یہ شخص قیام پاکستان سے قبل اپنی تقریروں میں پاکستان اور قائداعظم کو غلیظ گالیاں دیا کرتا تھا مگر اب یہ یکا یک پنجاب میں جاگیرداروں کا اس لئے سیاسی حلیف بن گیا تھا کہ یہ جاگیرداری نظام کو اسلامی نقطہ نگاہ سے جائز قرار دیتا تھا۔ افتخار الدین نے صوبہ میں زرعی زمین کو قومیانے کی کبھی کوئی تجویز پیش نہیں کی تھی۔ اس نے تو محض مہاجر کسانوں کے لئے زمینداروں سے چند رعایات کا مطالبہ کیا تھا مگر پنجابی جاگیردار اس سلسلے میں اس قدر

بے رحم اور سنگدل تھے کہ انہوں نے اس بنا پر نہ صرف صوبے کے طول وعرض میں اشتراکی خطرے کی گھنٹیاں بجا دی تھیں بلکہ اس خطرے کے سدباب کے لئے انہوں نے رجعت پسند مُلّاؤں اور موقع پرست اخبار نویسوں کی خدمات حاصل کرنے کے علاوہ جماعت اسلامی اور مجلس احرار جیسی پاکستان دشمن تنظیموں سے بھی گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔

طبقاتی اور قومیتی تضادات میں روز افزوں شدت

مرکزی ارباب اقتدار کے لئے صرف پنجاب کا افتخار الدین ہی دردسر نہیں تھا بلکہ نواب ممدوٹ اور ممتاز دولتانہ کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی نے بھی ایک مسئلہ کھڑا کر دیا تھا اور 14 رجنوری 1948ء کو پنجاب کے مزدور لیڈروں کے اجتماع میں یہ فیصلہ بھی ہو چکا تھا کہ پاکستان میں ایک ٹریڈ یونین فیڈریشن کی تشکیل کی جائے گی۔ سندھ میں ایوب کھوڑو، جی۔ ایم۔ سید اور ہاشم گزدر وغیرہ نے سندھیوں کے حقوق کے لئے زبردست مہم شروع کر دی تھی۔ اس مہم کی ابتدا دراصل 21 راکتوبر 1947ء کو ہوئی تھی جبکہ صوبائی مسلم لیگ کونسل نے ایک قرارداد میں مطالبہ کیا تھا کہ پاکستان میں ایک ایسا سوشلسٹ آئین مرتب کیا جائے جس کے تحت وفاق کے صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل ہوں۔ نومبر میں باآواز بلند یہ شکایت کی گئی تھی کہ مرکزی حکومت میں سندھیوں کا کوئی نمائندہ شامل نہیں ہے۔ دسمبر میں وزیر اعلیٰ کھوڑو نے مرکزی حکومت کو مطلع کیا تھا کہ حکومت سندھ مشرقی پنجاب کے پانچ لاکھ مہاجرین کو اپنے ہاں آباد نہیں کر سکتی۔ اسی مہینے کی 4 تاریخ کو کراچی میں پاکستان سوشلسٹ پارٹی کی تشکیل ہوئی تھی۔ اور پھر جنوری 1948ء میں حکومت سندھ نے مرکزی حکومت کو بتایا تھا کہ اس کے لئے کراچی کی صوبہ سندھ سے علیحدگی کی تجویز قابل قبول نہیں ہوگی۔ صوبہ سرحد میں خان عبدالغفار خان پٹھانوں کے لئے حق خود اختیاری کا مطالبہ کرتا تھا اور سوشلسٹ پروگرام کی ایک نئی سیکولر پارٹی کی تشکیل کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ بلوچستان میں ایک طرف تو خان قلات اپنی آزاد و خودمختار سلطنت قائم کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا اور دوسری طرف قبائلی سردار اسلام کے نام پر اپنا ظالمانہ قبائلی نظام برقرار رکھنے پر مصر تھے۔ جبکہ ملحقہ ایران میں سوویت یونین تیل کی تلاش کا حق مانگتا تھا اور مشرقی بنگال میں قومی زبان کے مسئلہ پر اساتذہ اور طلبا میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔ مختصر یہ کہ جنوری 1948ء میں پاکستان اور ہندوستان

کے درمیان قومی تضاد بے انتہا شدید ہونے کے باوجود پاکستان کے اندر قومیتی اور طبقاتی تضادات میں نمایاں طور پر شدت پیدا ہو رہی تھی۔

اس صورتحال میں مرکزی حکومت کا وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر ڈھاکہ گیا اور اس نے وہاں 10 / جنوری کو ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''جو بنگالی'' پنجابی یا بہاری مسلمانوں میں کوئی امتیاز پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ پاکستان اور اسلام کے بدترین دشمن ہیں۔ اسلام کے نزدیک سب مسلمانوں کو مساوی درجہ ہے۔ اگر ہم نے صوبائی تعصب کو فی الفور خیر باد نہ کہا تو ہم مسلمانوں میں ہندو سوسائٹی کے ذات پات کے سسٹم کو رائج کرنے کا موجب بنیں گے۔ اب وقت ہے کہ ہم قرآنی احکامات اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات پر عمل پیرا ہو کر صحیح مسلمان بنیں کیونکہ صرف اسی طرح ہم اپنی موجودہ مشکلات پر عبور حاصل کر سکتے ہیں۔''[12]

سردار عبدالرب نشتر پاکستان کے کٹر خلافتیوں میں سے تھا اور وزیر اعظم لیاقت علی خان کا دست راست تھا۔ اس نے 30 / اکتوبر 1947ء کو قائداعظم جناح کی لاہور میں تقریر، 24 / نومبر کو جناح کے مصری اخبار سے انٹرویو (جس میں جناح نے کہا تھا کہ پاکستان کا آئین اسلامی اصولوں کی بنیاد پر بنے گا) اور پھر 14 / دسمبر کو نیشنل لیگ کی تجویز کے مسترد کئے جانے کے بعد اسلام اور مسلم قومیت کے بارے میں کھل کر پروپیگنڈا مہم شروع کر دی تھی۔

مسلم قوم پرستی، تحریک پاکستان، مسلم لیگ اور قائداعظم کے خلاف مودودی کی تحریریں،......قیام پاکستان کے بعد اس کی قلابازی

13 / جنوری 1948ء کو جماعت اسلامی کے امیر ابوالاعلیٰ مودودی نے راولپنڈی میں پہلے جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''اب جبکہ مسلمانوں کا نصب العین پورا ہو گیا ہے تو پاکستان کے علمبرداروں کو چاہیے کہ اس مسلم ملک میں اسلامی قوانین کے مطابق آئین مرتب کر کے اپنے وعدے پورے کریں۔ پورے ملک پر صرف قرآن کی حاکمیت ہونی چاہیے۔''[13]

قیام پاکستان کے بعد مُلّا مودودی کی کسی پبلک جلسے میں یہ پہلی تقریر تھی۔ اس تقریر کا نفس مضمون اس کے ان سیاسی نظریات کے سراسر منافی تھا جن کا وہ قیام پاکستان سے پہلے پٹھانکوٹ کے نزدیک اپنے دارالسلام سے چرچا کیا کرتا تھا۔ وہ وطنی قومیت کے خلاف تھا اور

جغرافیائی حدود سے بالاتر مسلم قومیت کے نظریے کی تبلیغ کرتا تھا۔ وہ تحریک پاکستان کو غیر اسلامی تحریک قرار دیتا تھا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ ہندوستان کے مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان ہی نہیں ہیں اس لئے کوئی تحریک اور کوئی جماعت اس کی ہمدردی کی مستحق نہیں ہے۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ یہ لوگ ازسرنو مسلمان بنیں تو اس کی امداد کے مستحق ٹھہریں گے ورنہ اس کو ان سے کوئی ہمدردی نہیں نہ ان سے وہ کوئی سروکار رکھنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ ''اگر مسلمان اب بھی سچے مسلمان بن جائیں تو آج ہی یہ سارے مسائل ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں لیکن اگر یہ فی الواقع خلوص قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لئے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان پاکستان بن سکتا ہے اور اس میں ایک لادینی جمہوری حکومت یا عوامی پارلیمنٹری حکومت نہیں بلکہ خاص خدائی حکومت کتاب وسنت کے اصول پر قائم ہو سکتی ہے۔''[14]

مودودی مسلمانوں کو بے دین قوم سمجھتا تھا اور مسلم قوم پرستی کا سخت مخالف تھا۔ اس نے لکھا تھا ''اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ٹرکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں) تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟ ہیرے نے اگر اپنی جوہریت ہی کھو دی تو پھر جوہری کو اس سے کیا دلچسپی کہ وہ کمبخت پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رل مل جائے۔ میں نے اس تحریک (پاکستان) کے اندر داعیہ دینی کی بجائے داعیہ قومی کو بہت زیادہ کارفرما دیکھا۔ اگرچہ ہندوستان کے عام مسلمان میں اسلام اور مسلم قوم پرستی ایک مدت سے خلط ملط ہیں لیکن قریبی دور میں اس معجون کا اسلامی جز اتنا کم اور قوم پرستانہ جز اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس میں نری قوم پرستی ہی قوم پرستی نہ رہ جائے۔''[15]

قرارداد پاکستان، مسلم لیگ اور قائداعظم کے بارے میں مودودی نے لکھا کہ ''جب میں مسلم لیگ کے ریزولیشن (قرارداد پاکستان) کو دیکھتا ہوں تو میری روح بے اختیار ماتم کرنے لگتی ہے۔ ان لوگوں کو ایک موقع اور نادر موقع ملا تھا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا کی ساری قوموں پر اپنے اخلاقی مرتبہ کی برتری کا سکہ جما دیتے۔ ان کو ایک بیش قیمت موقع ملا تھا اس

حقیقت کے اظہار کا کہ ہم ایک اخلاقی اصول کے پیروکار ہیں اور وہ اخلاقی اصول حق اور عدل کی پاک ترین روح کا حامل ہے اور دنیا میں صرف ہماری جماعت ہی وہ ایک جماعت ہے جو شخصی یا قومی نفع ونقصان کے تصورات سے بالاتر ہو کر مجرد اخلاق کی بنیاد پر کام کرتی ہے۔ اگر لیگ کے رہنماؤں میں اسلامی حس کا شائبہ بھی موجود ہوتا تو وہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے اور اس کا جو گہرا اخلاقی اثر مرتب ہوتا اس کی قدر و قیمت کے مقابلے میں کوئی نقصان جو ایسا طرز عمل اختیار کرنے کی وجہ سے حاصل ہونے کی توقع ہے قطعاً کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ مگر افسوس کہ لیگ کے قائداعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی طرز فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطہ نگاہ سے دیکھتا ہو۔ یہ لوگ مسلمان کے معنی ومفہوم اور اس کی مخصوص حیثیت کو بالکل نہیں جانتے۔ ان کی نگاہ میں مسلمان بھی ویسی ہی ایک قوم ہے جیسی دنیا میں دوسری قومیں ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہر ممکن سیاسی چال اور ہر مفید مطلب سیاسی تدبیر سے اس قوم کے مفاد کی حفاظت کر دینا ہی بس ''اسلامی سیاست'' ہے حالانکہ ایسی ادنیٰ درجہ کی سیاست کو اسلامی سیاست کہنا اسلام کے لئے ازالہ حیثیت عرفی سے کم نہیں!''[16] اس سلسلے میں آگے چل کر وہ مزید لکھتا ہے ''اسلام کو نہ تو کسی نسلی گروہ سے کوئی دلچسپی ہے نہ وہ کسی جماعت کی موروثی عادات اور رسوم سے لگاؤ رکھتا ہے۔ نہ وہ دنیا کے معاملات کو چند اشخاص یا مجموعۂ اشخاص کی منفعت کے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ نہ وہ اس لئے آیا ہے کہ انسانیت جن گروہوں میں بٹی ہوئی ہے ان کے اندر اپنے ایک اور گروہ کا اضافہ کر دے۔ نہ وہ انسانی جماعتوں کو جانور بنانا چاہتا ہے کہ ایک دوسرے کے بالمقابل تنازع للبقا کے میدان میں اتریں اور انتخاب طبیعی کے امتحان میں شریک ہوں۔ یہ سب کچھ غیر اسلامی ہے۔ لہٰذا اگر یہ آپ کی قومیت اور یہ آپ کا کلچر ہے اور یہ آپ کے قومی مقاصد ہیں تو آپ اپنی قوم کا جو نام چاہیں تجویز فرمالیں۔ اسلام کا نام استعمال کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے۔''[17]

مودودی کے یہ ''اسلامی خیالات'' اس کی کتاب ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش'' (حصہ سوم) میں درج ہیں۔ یہ کتاب اس کے ان متعدد مضامین کا مجموعہ ہے جو اس نے 23 مارچ 1940ء میں قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد لکھے تھے اور جن کا مقصد اپنی جماعت کی تشکیل کے لئے نظریاتی بنیاد استوار کرنا تھا۔ اس نے اپنی جماعت اسلامی اگست 1941ء میں قائم کر لی تھی اور اس طرح وہ اسلام کے نام پر مسلم لیگ کی تحریک پاکستان کے خلاف خم ٹھونک کر میدان

سیاست میں آ گیا تھا۔ اس کے ان مضامین پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شخص بہت ہی اقتدار پسند اور جاہ وحشمت کا شیدائی تھا۔ یہ خارجیوں کی طرح خالص تجریدی اسلام کا علمبردار تھا۔ اس کے اسلام کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ویسے تو اسے اپنی اعلیٰ بصیرت اور تبحر علمی کا بہت زعم تھا لیکن دراصل یہ اپنے ہی تعمیر کردہ نظریاتی کنویں کا ایسا مینڈک تھا جو اس کنویں سے باہر کی دنیا سے بالکل بے خبر تھا۔ اسے اس وقت برصغیر اور دنیا کے حالات کا بہت ہی سطحی علم تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کون سے تاریخی محرکات تھے جو برصغیر کے مسلمانوں کو اپنے لئے ایک علیحدہ وطن حاصل کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ وہ کھلم کھلا کہتا تھا کہ اسے ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی حقوق و مفادات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو ساری دنیا میں صرف اللہ کی حاکمیت قائم کرنے کا متمنی تھا۔ اس کی رائے میں اس مقصد کے لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی منظم جماعت اٹھ کھڑی ہو۔ چنانچہ اس نے اپنے ان مضامین میں مزید لکھا تھا کہ ''اگر اسلام ایک زندہ عملی تحریک کی حیثیت سے میدان میں آ جائے اور اس کے اصولوں کی بنیاد پر ہندوستانی زندگی کے حقیقی مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک عملی پروگرام لے کر کوئی منظم جماعت اٹھ کھڑی ہو تو یقین رکھیئے کہ اس کا اپیل پیدائشی مسلمانوں تک محدود نہیں رہے گا بلکہ شاید ان سے بڑھ کر غیر مسلموں کو اپنی طرف کھینچے گا اور کوئی طاقت اس سیل رواں کو نہ روک سکے گی۔ آج جو لوگ اسلام کے تحفظ کی بس یہ ایک صورت دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر چند گوشہ ہائے عافیت میں پہنچا دیا جائے، افسوس ہے کہ وہ اسلام کے ان امکانات سے ناواقف ہیں۔''[18] وہ مزید لکھتا ہے ''اسلام کی رو سے مسلمانوں کی جمعیت وہ ہو سکتی ہے جو غیر الٰہی حکومت کو مٹا کر الٰہی حکومت قائم کرنے اور قانون خداوندی کو حکمران کرنے کے لئے جدوجہد کرتی ہے۔ جو جماعت ایسا نہیں کرتی بلکہ غیر الٰہی نظام کے اندر ''مسلمان'' نامی ایک قوم کے دنیوی مفاد کے لئے جدوجہد کرتی ہے وہ نہ تو اسلامی جماعت ہے اور نہ اسے مسلمانوں کی جماعت ہی کہنا درست ہے۔''[19]

مودودی کو مسلمان ملکوں کے وجود اور آئندہ وجود میں آنے والے پاکستان کے بارے میں انتہائی افسوس تھا۔ وہ لکھتا ہے ''ایک حقیقی مسلمان ہونے کی حیثیت سے جب میں دنیا پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس امر پر اظہار مسرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ترکی پر ترک، ایران پر ایرانی اور افغانستان پر افغانی حکمران ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں حکم الناس علی الناس کے

نظریے کا قائل نہیں ہوں کہ مجھے اس پر مسرت ہو۔ میں اس کے برعکس حکم اللہ علی الناس بالحق کا نظریہ رکھتا ہوں اور اس اعتبار سے میرے نزدیک انگلستان پر انگریزوں کی حاکمیت اور فرانس پر اہل فرانس کی حاکمیت جس قدر غلط ہے اسی قدر ترکی اور دوسرے ملکوں پر ان کے باشندوں کی حاکمیت بھی غلط ہے بلکہ اس سے زیادہ غلط۔ اس لئے کہ جو جو قومیں اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہیں ان کا خدا کی حاکمیت کی بجائے انسانوں کی حاکمیت اختیار کرنا اور بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ غیر مسلم اگر ضالین کے حکم میں آئیں تو یہ مغضوب علیہم کی تعریف میں آتے ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان میں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔ میرے لئے جو سوال سب سے مقدم ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے اس ''پاکستان'' میں نظام حکومت کی اساس خدا کی حاکمیت پر رکھی جائے گی یا مغربی نظریۂ جمہوریت کے مطابق عوام کی حاکمیت پر؟ اگر پہلی صورت ہے تو یقیناً یہ پاکستان ہوگا ورنہ بصورت دیگر یہ ایسا ہی ''ناپاکستان'' ہوگا جیسا ملک کا وہ حصہ ہوگا جہاں آپ کی اسکیم کے مطابق غیر مسلم حکومت کریں گے۔ بلکہ خدا کی نگاہ میں یہ اس سے زیادہ ناپاک، اس سے زیادہ مغضوب وملعون ہوگا کیونکہ یہاں اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے وہ کام کریں گے جو غیر مسلم کرتے ہیں۔ اگر میں اس بات پر خوش ہوں کہ یہاں رام داس کے بجائے عبداللہ خدائی کے منصب پر بیٹھے گا تو یہ اسلام نہیں ہے بلکہ نرا نیشنلزم ہے اور یہ ''مسلم نیشنلزم'' بھی خدا کی شریعت میں اتنا ہی ملعون ہے جتنا ہندوستانی نیشنلزم۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ تمام روئے زمین ایک ملک ہے۔ انسان نے اس کو ہزاروں حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ یہ تقسیم اگر اب تک جائز تھی تو آئندہ مزید تقسیم ہو جائے گی تو کیا بگڑ جائے گا؟ یہ کون سا بڑا مسئلہ ہے جس پر مسلمان ایک لمحہ کے لئے بھی غور و فکر میں اپنا وقت ضائع کرے؟ مسلمان کو تو صرف اس چیز سے بحث ہے کہ یہاں انسان حکم اللہ کے آگے سر جھکاتا ہے یا حکم الناس کے آگے۔''[20]

مودودی پاکستان اور اس میں جمہوری نظام کے قیام کی کھل کر مخالفت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمع نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم

کرنا ہے۔ برعکس اس کے ان کی طرف سے بصراحت اور بتکرار جس چیز کا اظہار کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے پیش نظر ایک جمہوری حکومت ہے جس میں دوسری غیر مسلم قومیں بھی حصہ دار ہوں مگر اکثریت کے حق کی بنا پر مسلمانوں کا حصہ غالب ہو۔ بالفاظ دیگر ان کو مطمئن کرنے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ ہندو اکثریت کے تسلط سے وہ صوبے آزاد ہو جائیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ باقی رہا نظام حکومت تو وہ ''پاکستان'' میں بھی ویسا ہی ہوگا جیسا ہندوستان میں ہو گا۔''[21] وہ مزید لکھتا ہے کہ ''جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ اس کا نام حکومت الٰہی رکھنا اس پاک نام کو ذلیل کرنا ہے۔''[22] وہ آگے چل کر لکھتا ہے ''ہمارے ہاں یہ سمجھا جا رہا ہے کہ بس مسلمانوں کی تنظیم ان کے تمام درد دل کی دوا ہے۔ ''اسلامی حکومت'' یا ''آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام'' کے مقصد تک پہنچنے کی سبیل یہ سمجھی جا رہی ہے کہ مسلمان قوم جن افراد سے مرکب ہے وہ ایک مرکز پر جمع ہوں، متحد ہوں اور ایک مرکزی امام کی اطاعت میں کام کریں۔ لیکن دراصل یہ قوم پرستانہ پروگرام ہے۔ جو قوم بھی اپنا بول بالا کرنے کے لئے جدوجہد کرنا چاہے گی وہ یہی طریق کار اختیار کرے گی۔''[23] ایک اور مقام پر وہ لکھتا ہے ''جنت الحمقا میں رہنے والے لوگ اپنے خوابوں میں خواہ کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں لیکن آزاد پاکستان (اگر فی الواقع وہ بنا بھی تو) لازماً جمہوری لادینی سٹیٹ کے نظریہ پر بنے گا جس میں غیر مسلم اس طرح برابر کے شریک ہوں گے جس طرح مسلمان۔ اور پاکستان میں ان کی تعداد اتنی کم اور ان کے نمائندگی کی طاقت اتنی کمزور نہ ہوگی کہ شریعت اسلامی کو حکومت کا قانون اور قرآن کو اس جمہوری نظام کا دستور بنایا جا سکے۔''[24]

تاہم مُلّا مودودی نے اپنے ان ''اسلامی نظریات'' کے باوجود مئی 1946ء میں، جبکہ برطانیہ کا وزارتی مشن ہندوستان کے آئینی مستقبل کے بارے میں مسلم لیگی اور کانگرسی لیڈروں سے گفت وشنید کر رہا تھا، ہندوستان کی گتھی کا جو حل پیش کیا تھا☆ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ضلع، صوبہ اور

☆ مودودی کے اس مضمون کے مکمل متن کے لیے دیکھئے: پاکستان کی سیاسی تاریخ: جلد دوم، پاکستان کیسے بنا؟ ایڈیشن سوم۔ 2012ء۔ ضمیمہ الف ص ص 643-635

مرکز کی سطح پر ہندو اور مسلمان قوموں کے درمیان وفاق قائم کیا جائے جس میں تہذیبی خود اختیاری کی بنیاد پر اختیارات کی تقسیم ہو۔ اس نے اپنے مجوزہ وفاق کے قیام کے لئے چند اصول بیان کئے تھے جن میں سے ایک اصول یہ تھا کہ تعلیم، مذہبی معاملات (مثلاً عبادت گاہوں اور اوقاف کا نظم ونسق اور مذہبی احکام کو اپنے افراد قوم پر نافذ کرنا ان احکام کے خلاف ان کی سرکشی کو روکنا) اور مخصوص تمدنی اور معاشرتی مسائل (مثلاً نکاح، طلاق، وراثت اور قومی طرز معاشرت) میں ہر قوم کو پوری حکومت خود اختیاری حاصل ہو اور مرکز کو اس میں دخل دینے کا حق نہ ہو۔ ایک اور اصول یہ تھا کہ مرکزی مجلس قانون ساز میں نمائندگی اور انتخاب کا جو طریقہ اس وقت رائج ہے اسے بالکل بدل دیا جائے۔ چھوٹے چھوٹے حلقہ ہائے انتخاب بنانے کی بجائے ایک ریاست کے پورے حدود اراضی کو ایک حلقہ انتخاب قرار دیا جائے جس میں ایک نشست کے لئے الگ الگ امیدوار کھڑے نہ ہوں بلکہ تسلیم شدہ سیاسی جماعتیں اپنے اپنے امیدواروں کی فہرستیں پیش کریں اور ان کو کامیاب کرنے کے لئے جدوجہد کریں۔ اس صورت میں (اور یاد رکھئے کہ صرف اسی صورت میں) جداگانہ انتخاب کے طریقہ کو موقوف کر دینا چاہیے۔ اس لئے کہ پھر بند قلعوں میں رہنا ہر قوم کے لئے مضر ہوگا۔ جداگانہ طریق انتخاب اور نشستوں کے تعین کی ضرورت صرف اسی وقت تک ہے جب تک کہ یہاں انگلستان کی بوسیدہ ڈیموکریسی کے نمونہ پر چھوٹے چھوٹے ایک نشستی حلقہ ہائے انتخاب بنائے جاتے ہیں۔ یورپ کی جدید جمہوریتوں میں متناسب نمائندگی کے جو تجربات کئے گئے ہیں اگر ان سے استفادہ کر کے ایک صحیح جمہوری طریق اختیار کر لیا جائے تو پھر جداگانہ انتخاب کو اڑا دینا ہوگا۔ اس قسم کے دس بارہ اصول بیان کرنے کے بعد اس نے مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ ''وہ تقسیم ہند پر نہ مریں اور ایک ایسے دستور پر راضی ہو جائیں جس میں صوبوں اور ریاستوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دی جائے اور مالبقی اختیارات بھی انہی کو تفویض کئے جائیں اور صرف چند اختیارات ہندوستان کے وفاقی مرکز کے لئے مخصوص رہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت مسلمانوں نے اپنی تمام توجہ پاکستان پر مرکوز کر دی ہے اور ان کو اس کے سوا اپنے قومی حوصلوں کے پورے ہونے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر میرے اس تجویز کردہ نقشہ کو قبول کر لیا جائے اور تلخی اور کشمکش کی بجائے صلح و مصالحت سے دوستانہ اسپرٹ میں اس پر تصفیہ ہو جائے تو ہندوستان کی تقسیم کی بجائے ہندوستان کی وحدت مسلمانوں

کے لئے بھی زیادہ مفید ثابت ہوگی اور ہندوستان کی غیر مسلم آبادی کے لئے بھی۔ بظاہر اپنی آزاد قومی سٹیٹ کے قیام کا موقع کھودینا مسلمانوں کو ایک نقصان نظر آئے گا مگر میرا خیال ہے اور آئندہ پچیس سال اسے ثابت کردیں گے کہ اس طرح کی مصالحت مسلمانوں کے لئے اور ہندوستان کے لئے ویسی ہی رحمت ہوگی جیسی صلح حدیبیہ اسلام اور عرب کے لئے ہوئی تھی۔''[25]

مُلّا مودودی نے اسی قسم کی ایک تجویز اکتوبر، نومبر اور دسمبر 1938ء کے ترجمان القرآن میں بھی پیش کی تھی۔ اس تجویز کا پہلا خاکہ یہ تھا کہ ''دو یا زائد قوموں کے اس ملک میں ایک جمہوری ریاست بنانے کے لئے اسے وفاق (کنفیڈریشن) بنا دیا جائے۔ وہ ایک قوم کی ریاست نہ ہو بلکہ متوافق قوموں کی ایک ریاست ہو۔'' دوسرا خاکہ یہ تھا کہ ''مختلف قوموں کے الگ الگ حدود ارض مقرر کردیئے جائیں جہاں وہ اپنے جمہوری سٹیٹ بنا سکیں۔ پچیّس سال یا اس سے کچھ کم وبیش مدت تبادلہ آبادی کے لئے مقرر کردی جائے۔ ہر سٹیٹ کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دی جائے۔ اور تیسرا خاکہ یہ تھا کہ ''ہماری قومی ریاستیں الگ بنائی جائیں اور ان کا علیحدہ وفاق ہو۔ اسی طرح ہندو ریاستوں کا بھی ایک جداگانہ وفاق ہو اور پھر دو یا زائد وفاقی مملکتوں کے درمیان ایک طرح کی کنفیڈریشن ہو جائے جس میں مخصوص اغراض مثلاً دفاع اور مواصلات اور تجارتی تعلقات کے لئے مقرر شرائط پر تعاون ہو سکے۔''

مودودی کے اس منصوبے کی بنیاد حیدرآباد دکن کے ڈاکٹر سید عبداللطیف کی ایک سکیم پر تھی جو اس نے 1938ء میں ایک پمفلٹ کی صورت میں پیش کی تھی۔ یہ پمفلٹ بمبئی میں چھپا تھا اور اس میں ہندوستان کو مسلمانوں کے چار تہذیبی علاقوں اور ہندوؤں کے گیارہ تہذیبی علاقوں میں تقسیم کر کے دونوں مذاہب کی قوموں کے لئے تہذیبی آزادی کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ اس کے مسلمانوں کے تہذیبی علاقوں میں حیدرآباد دکن کا علاقہ بھی شامل تھا جہاں غیر مسلموں کی آبادی کا تناسب تقریباً 90 فیصدی تھا۔ چونکہ مُلّا مودودی نے 1939ء سے قبل دس بارہ سال حیدرآباد دکن میں گزارے تھے اور اس کی نظریاتی تعلیم و تربیت وہیں ہوئی تھی اس لئے اس کی جانب سے ہر اس سکیم کی کسی نہ کسی صورت میں تائید ضروری تھی جو ''اعلیٰ حضرت'' میر عثمان علی کی سلطنت کے مفاد میں ہو سکتی تھی۔ عبداللطیف بھی دونوں قوموں کے مجوزہ تہذیبی علاقوں کے درمیان تبادلہ آبادی کو ضروری سمجھتا تھا اور مُلّا مودودی بھی پچیّس سال یا اس سے کچھ کم وبیش مدت تبادلہ آبادی کے لئے

مقرر کرنے کے حق میں تھا۔ عبداللطیف مسلمانوں کے لئے کاملاً آزاد ریاست یا ریاستوں کا مطالبہ نہیں کرتا تھا اور مُلاّ مودودی بھی مسلمانوں کی کاملاً آزاد ریاست کے تصور کے خلاف تھا۔ وہ عبداللطیف کی طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کنفیڈریشن چاہتا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد مُلاّ مودودی کی جانب سے اپنے منصوبے سے انحراف اور فروری 1946ء کی اپنی پیش گوئی سے کہ ''آزاد پاکستان لازماً جمہوری لادینی اسٹیٹ کے نظریے پر بنے گا'' بے تعلق ہو جانے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے خیال میں مغربی پاکستان سے غیر مسلموں کے انخلا کے بعد یہاں اس کے تصور کے مطابق اسلامی نظام قائم ہوسکتا تھا۔ جب منیر انکوائری کمیٹی نے اس سے اس سیاسی قلابازی کی وجہ پوچھی تو اس کا جواب یہ تھا کہ ''1946ء میں مغربی پاکستان کے علاقوں میں غیر مسلموں کی آبادی کا تناسب تقریباً 26 فیصد تھا۔ اب یہ غیر مسلم یہاں سے چلے گئے ہیں اور مشرقی پاکستان میں غیر مسلموں کا تناسب کم ہو گیا ہے۔ اگر مشرقی پاکستان کی ایک الگ ریاست بنتی تو وہاں خالص اسلامی نظام نافذ کرنے میں مشکلات درپیش ہوتیں کیونکہ وہاں غیر مسلموں کی آبادی کا تناسب اب بھی 25 فیصدی ہے۔''[26] اور مزید یہ کہا کہ ''اگر ہم پاکستان میں اسلامی حکومت قائم کرلیں تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ ہندوستان میں مسلمانوں سے ملیچھوں اور شودروں کا سا سلوک کیا جائے۔ ان پر منو کے قوانین کا اطلاق کیا جائے اور انہیں حکومت میں حصہ اور شہریت کے حقوق قطعاً نہ دیئے جائیں۔''[27]

لیاقت علی خان اور قائداعظم کا اسلام کی ترقی پسند تعبیر کے ذریعے اسلام کو سیاست میں ملوث کرنے کا آغاز

بایں ہمہ وزیراعظم لیاقت علی خان کے لئے جماعت اسلامی اور مجلس احرار کے مُلاّؤں کی اس قسم کی نظریاتی وسیاسی قلابازی خوش آئند تھی کیونکہ بقول جی۔ ایم۔ سید اس نے پاکستان کی مختلف قومیتوں کے حقوق ومفادات کے ملبے سے اپنی ''مہاجر سلطنت'' تعمیر کرنے کا جو منصوبہ بنایا ہوا تھا اس کی تکمیل صرف اسلام اور مسلم قومیت کے زور پر ہی ہوسکتی تھی۔ چنانچہ اس نے مُلاّ مودودی کے جلسے کے اگلے دن 14 رجنوری کو پشاور کی ایک استقبالیہ تقریب میں اعلان کیا کہ ''پاکستان ہماری لیبارٹری ہے۔ ہم اس لیبارٹری میں دنیا کو سکھادیں گے کہ 1300 سال پرانے

اصولوں کا اب بھی اطلاق ہوسکتا ہے۔"[28] تاہم لیاقت علی خان ان اصولوں کی جو تعبیر کرتا تھا وہ قدامت پسند علما کی تعبیر سے مختلف ہوتی تھی۔ وہ پاکستان کی اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کو مساوی حقوق و اختیارات دیتا تھا جبکہ علما ذمیوں کو حکومت کے کاروبار میں کوئی حصہ دینے پر آمادہ نہیں تھے۔ لیاقت علی خان کو اب اپنے اس اسلامی تصور کے بارے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی تھی کیونکہ اب حالات نے قائداعظم جناح کو بھی اسی قسم کے تصور کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب بابائے قوم بھی یہ سمجھتے تھے کہ چونکہ ریاست جموں و کشمیر کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد اور سندھیوں، پٹھانوں، بلوچیوں اور بنگالیوں کی جانب سے قومی حقوق و مفادات کے روز افزوں مطالبات کے پیش نظر پاکستان کی یک جہتی و سالمیت کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔ اس لئے اسلام کو بطور سیاسی حربہ استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ انہوں نے لاہور میں 30/اکتوبر 1947ء کی تقریر اسی خیال کے تحت کی تھی اور اب 25/جنوری 1948ء کو عید میلاد النبی ﷺ کے موقع پر کراچی کی بار ایسوسی ایشن کو بھی انہوں نے اسی نقطہ نظر سے خطاب کیا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ "میرے نزدیک وہ لوگ نا قابل فہم ہیں جو دانستہ طور پر فتنہ پیدا کرنے کے خواہاں ہیں اور یہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ پاکستان کا آئین شریعت کی بنیاد پر نہیں بنے گا۔" انہوں نے کہا کہ "اسلام کے اصولوں کا زندگی میں آج بھی اسی طرح اطلاق ہوسکتا ہے جس طرح کہ 1300 سال پہلے ہوتا تھا۔ اسلام نے جمہوریت سکھائی ہے۔ اسلام نے سکھایا ہے کہ ہر ایک سے مساویانہ، منصفانہ اور عادلانہ سلوک ہونا چاہیے۔ لہٰذا کسی کو بھی ایسی جمہوریت، مساوات اور آزادی سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں جو نیک نیتی اور خلوص کے انتہا درجہ کے معیار کی ہو اور جس کی بنیاد ہر ایک سے عدل وانصاف کے اصول پر ہو۔ ہم ایسا آئین بنائیں گے اور ساری دنیا کو دکھائیں گے۔" انہوں نے صوبہ پرستی کی مذمت کی اور کہا کہ "صوبہ پرستی ایک بیماری اور لعنت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلمان صوبہ پرستی کی بیماری سے نجات حاصل کریں کیونکہ اگر پوری قوم ایک ساتھ نہ چلے تو وہ ترقی نہیں کر سکتی۔" قائداعظم نے پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت اقدس میں ہدیہ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ "وہ عظیم معلم، عظیم قانون ساز، عظیم مدبر اور عظیم حکمران تھے۔ بلاشبہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جو ہماری اسلام کی باتوں کی قدر و قیمت کو نہیں پہچانتے۔ اسلام صرف عبادات، روایات اور روحانی عقائد کا نام نہیں ہے۔ اسلام ہر مسلمان کے لئے ایک ایسا ضابطہ بھی

ہے جو نہ صرف اس کے طریقہ زندگی کا تعین کرتا ہے بلکہ سیاسیات و معاشیات وغیرہ میں بھی اس کا کردار متعین کرتا ہے۔ اسلام کی بنیاد سب لوگوں کے لئے عزت، نیک نیتی اور عدل و انصاف کے اعلیٰ ترین اصولوں پر مبنی ہے۔ اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اصول توحید اور توحید کی مساوات ہے۔ اسلام میں ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ اسلام کے بنیادی اصول مساوات، آزادی اور اخوت کی صفات پر مشتمل ہیں...... پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دنیا کے عظیم ترین انسان تھے۔ انہوں نے 1300 سال پہلے جمہوریت کی بنیاد رکھی تھی۔[29]

جناح کی یہ تقریر لیاقت علی خان کی 14 ر جنوری کی تقریر سے مختلف نہیں تھی۔ لٰہذا یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا تھا کہ مرکزی حکومت نے اکتوبر 1947ء کے بعد اعلیٰ ترین سطح پر فیصلہ کیا تھا کہ بابائے قوم کی 11 ر اگست 1947ء کی تقریر کے برعکس ملک کی سیاست سے اسلام کو بالکل خارج نہ کیا جائے۔ تاہم اس کی تعبیر ایسی ترقی پسندانہ کی جائے جو عصر حاضر کی سیکولر جمہوریت کے اصولوں کے عین مطابق ہو۔ اس تقریر میں جناح کا موقف یہ تھا کہ اسلام نے سارے انسانوں کو مساوات، اخوت، جمہوریت، انصاف اور آزادی کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ وہ انسان اور انسان کے درمیان کسی امتیاز کو روا نہیں رکھتا یعنی وہ بلا امتیاز مذہب و ملت اور رنگ و نسل سب کو مساوی حقوق دیتا ہے۔ دراصل انہوں نے یہی بات 11 ر اگست کی تقریر میں بھی کہی تھی۔ فرق یہ تھا کہ 11 ر اگست 1947ء کی تقریر میں مذہب کو سیاست سے الگ رکھا گیا تھا لیکن اب 25 ر جنوری 1948ء کو تقریر میں کہا گیا تھا کہ اسلام ایک ضابطہ حیات ہے جو ہمارے سیاسی و معاشی کردار کا بھی تعین کرتا ہے۔ تاہم ان کی 25 ر جنوری کی تقریر بھی شبیر احمد عثمانی اور ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ کے لئے قابل قبول نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ یہ علمائے دین پاکستان کے ہندوؤں کو مساوی حقوق دینے کے حق میں نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہندو ذمی ہیں۔ ان سے جزیہ لینا چاہیے۔ ہندوؤں کو قانون ساز اور پالیسی ساز اداروں میں شامل نہیں کیا جاسکتا اور انہیں کلیدی عہدے بھی نہیں دیئے جاسکتے۔ وہ جدید مغربی جمہوریت کے بھی خلاف تھے اور قرون وسطیٰ کا خلافتی نظام نافذ کرنے کا عزم رکھتے تھے۔

قائداعظم جناح، وزیراعظم لیاقت علی خان، وزیر خارجہ سر محمد ظفر اللہ خاں، وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر اور حتیٰ کہ وزیر خزانہ غلام محمد کی جانب سے جنوری 1948ء میں پاکستان کی سیاست میں اسلام کو اس طرح ملوث کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسئلہ کشمیر سیکورٹی

کونسل میں پیش ہو چکا تھا اور امید کی جاتی تھی کہ اقوام متحدہ کا یہ اعلیٰ ترین ادارہ ایسی قرارداد منظور کرے گا جو پاکستان کے حق میں ہوگی۔ اس امید کی بنیاد اس حقیقت پر تھی کہ برطانیہ کا وزیر خارجہ ارنسٹ بیون (Ernest Beven) اور وزیر دولت مشترکہ نوئیل بیکر (Noel Baker) برطانوی سامراجیوں کے ان حلقوں سے تعلق رکھتے تھے جن کا خیال یہ تھا کہ مشرق وسطیٰ میں سوویت یونین کے اثر ورسوخ کا سد باب اسلامی ملکوں کے درمیان فوجی اتحاد اور سیاسی ہم آہنگی قائم کرنے سے ہوسکتا ہے اور پاکستان مذہب کی بنیاد پر اس مجوزہ گٹھ جوڑ کے قیام میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کے اخبارات میں اس مقصد کے لئے عالمگیر اسلامی کانفرنس منعقد کرنے کا زبردست پروپیگنڈا ہو رہا تھا۔ اس سلسلے میں نوائے وقت کا اداریہ یہ تھا کہ ''اگرچہ اس مجوزہ عالمگیر اسلامی کانفرنس کی نوعیت سیاسی نہیں ہوگی بلکہ صرف معاشی اور تہذیبی۔ لیکن معاشی اور تہذیبی مسائل کو سیاست سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ خصوصاً آج کل جبکہ ہر تہذیبی اور معاشی مسئلہ کا اصلی اور بنیادی حل دراصل سیاسی ہے، چنانچہ جب ہم اسلامی ممالک کے معاشی اور تہذیبی مسائل پر غور وخوض کرنے بیٹھیں گے تو لازمی طور پر ہم ان مسائل کے ضمن میں کوئی نہ کوئی سیاسی طرز عمل اختیار کرنے پر ضروری مجبور ہوں گے۔''[30] 24 رجنوری کو وزیر خزانہ غلام محمد کی، جو سیکولر نظام حکومت کا عظیم علمبردار تھا، اسلامیہ کالج پشاور میں تقریر یہ تھی کہ ہم نے پاکستان محض آزادی منانے کے لئے حاصل نہیں کیا تھا بلکہ ہمارا نصب العین یہ تھا اور ہمیشہ یہی رہے گا کہ ہم اسلامی نظریہ پر پورا اتریں گے اور زندگی کا ایک ایسا ضابطہ تشکیل کریں گے جو ہمارے خصوصی رجحانات کے مطابق ہوگا۔ ہم ہندوستان کی ظالمانہ اکثریت کے بالکل برعکس طور طریقوں کا اثر قبول نہیں کریں گے۔[31]

سیکولر نظام حکومت کے علمبرداروں کی پسپائی اور مُلّاؤں کی چڑھائی

اگرچہ قائداعظم جناح اور دوسرے مرکزی ارباب اقتدار اسلام کی ترقی پسندانہ تعبیر کرتے تھے اور وہ اپنا کاروبار حکومت عملاً سیکولر خطوط پر ہی چلا رہے تھے تاہم ان کی اس قسم کی تقریروں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کے قدامت پرست عناصر اور بھی کھل کھیلے۔ مُلّاؤں کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ ان میں بجا طور پر یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ان کے تھوڑے سے دباؤ سے سیکولر نظام

حکومت کے علمبرداروں میں پسپائی کی علامتیں نظر آنے لگی ہیں تو ان پر مزید تھوڑا سا دباؤ انہیں مکمل پسپائی پر مجبور کر دے گا۔ چنانچہ جب 29 رجنوری کو پنجاب اسمبلی میں مسلم پرسنل لا (شریعت) اپلی کیشن بل پر بحث ہوئی تو ان مُلاّؤں کے ایک ترجمان عبدالستار نیازی نے اس بنا پر اس کی مخالفت کی کہ یہ مسودہ قانون اس کے تصور کے مطابق اسلامی شرع کے مطابق نہیں تھا۔ اس کا مطالبہ یہ تھا کہ ''انگریزوں کے وضع کردہ موجودہ عدالتی نظام کو ختم کر کے اس کی جگہ شرعی عدالتوں کا نظام قائم کیا جائے۔ ہائی کورٹ اور چھوٹی عدالتوں کے ججوں کی جگہ اسلامی قانون کے مطابق دیوانی اور فوجداری مقدمات کی سماعت کے لئے قاضیوں اور مفتیوں کا تقرر کیا جائے۔''[32] جب عبدالستار نیازی صوبائی اسمبلی میں اپنی زوردار اور گرجدار تقریر میں یہ مطالبہ کر رہا تھا تو عین اس وقت اخبارات کے دفاتر میں یہ خبر موصول ہو رہی تھی کہ ''آزاد کشمیر کی حکومت نے اپنے علاقے میں شرعی قوانین نافذ کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور قوانین کے تحت مفتیوں کی عدالتیں قائم ہوں گی۔ زانیوں کو سرعام دروں کی سزا دی جائے گی اور شرابیوں کو دو سال قید کی سزا ملے گی۔ جب آئندہ چند دنوں میں اس فیصلے کو جامہ عمل پہنایا جائے گا تو انگریزوں کے وضع کردہ عدالتی نظام کا بالکل خاتمہ تو نہیں ہوگا البتہ یہ ہوگا کہ موجودہ دیوانی اور فوجداری عدالتوں کے ساتھ مفتیوں کی عدالتیں بھی ہوں گی۔ اگر کبھی شبہ ہوا کہ کسی مقدمہ کا فیصلہ غیر شرعی ہوا ہے تو مفتی کو اس پر نظر ثانی کا اختیار ہو گا۔ ایک مفتی اعلیٰ کا بھی تقرر ہوگا جو شرعی قوانین کی تعبیر اور اطلاق کے بارے میں اپیلوں کا فیصلہ کرے گا اور اس کا فیصلہ قطعی ہوگا۔''[33]

30 رجنوری کے اخبارات میں شائع شدہ ان دونوں خبروں کا مطلب یہ تھا کہ قدامت پرست مُلاّ گرج رہے تھے اور جدید بورژوا جمہوری نظام کے اہم ترین ستون یعنی عدالتی ادارے کو تباہ و برباد کرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھے۔ ان مُلاّؤں کا دبدبہ اتنا تھا کہ وکالت پیشہ لوگ بھی ان کے سامنے بڑی احتیاط سے بات کرتے تھے۔ مثلاً گوجر خاں کے وکیل راجہ سید اکبر نے، جو صوبائی اسمبلی کا رکن بھی تھا، 29 رجنوری کو ایوان میں مُلاّ عبدالستار نیازی کی تقریر کے بعد مسلم پرسنل لا کے مسئلہ پر جس طریقے سے اظہار خیال کیا اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اس میں مُلاّؤں کے ناقابل عمل تصورات کے خلاف کھل کر بات کرنے کی جرأت نہیں ہے۔ راجہ سید اکبر کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ''کون نہیں چاہتا کہ ہمارا قانون اسلامی ہو اور ہمارے ہائی کورٹوں میں فقیہان

اسلام حاوی ہوں مگر پہلے آپ جیسے فقیہہ تو پیدا کریں۔ بنی بنائی عمارت کومسمار کر دینا آسان ہے مگر تعمیر مشکل کام ہے۔ ابتدا ہوئی ہے۔ اسے آگے بڑھائیے۔ اس بل میں کچھ خامیاں ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وزیراعلیٰ اس کے متعلق ایوان کو یقین دلائیں گے کہ خامیاں دور کر دی جائیں گی اور اسلامی آئین چند مخصوص معاملات پر ہی نہیں دیوانی وفوجداری سب امور پر پوری آب وتاب سے حاوی ہوگا۔''[34]

عورتوں کے حقوق کو اسلام کے نام پر دبانے کی مُلاّؤں کی کوشش کے خلاف خواتین ارکان اسمبلی کا ردعمل

مسلم پرسنل لا پر مذکورہ بحث صرف اس مسئلہ تک ہی محدود نہیں تھی کہ ملک میں عدالتی نظام کس طرز کا ہونا چاہیے بلکہ اس بحث کی لپیٹ میں عورتوں کے حقوق کا مسئلہ بھی آ گیا تھا۔ اسمبلی میں مُلاّ نیازی عورتوں کی آزادی، بے پردگی اور غیر اسلامی طرز زندگی پر بھی بہت برسا تھا۔ اس کی مذمت اور ملامت کی برسات اتنی موسلا دھار تھی کہ بیگم شاہنواز، بیگم سلمیٰ تصدق اور دوسری خاتون ارکان اسمبلی کانپ اٹھیں۔ بیگم شاہنواز کا موقف یہ تھا کہ ''مسلمان عورتوں نے حصول پاکستان کی جدوجہد میں بڑی قربانیاں دی ہیں اس لئے وہ اپنی آزادی کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں۔ اسلام نے عورتوں کو ہر قسم کی سہولت دی ہے اور اس بات کا کہیں بھی ذکر نہیں کہ انہیں جانوروں کی طرح گھروں کی چار دیواری میں ہی مقید رکھا جائے۔ آج کل ضرورت اس امر کی ہے کہ روس، امریکہ اور برطانیہ کی عورتوں کی طرح پاکستان کی عورتوں کو بھی اپنے دفاع کے لئے مسلح کیا جائے۔ انہیں اپنی عزت وآبرو کے تحفظ کے لئے اور اپنی قوم کے وقار کو بلند رکھنے کے لئے بندوق چلانے کی تربیت دینی چاہیے۔'' بیگم سلمیٰ تصدق کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ''دنیا کے کسی اسلامی ملک میں عورتوں کے لئے اس قسم کے غیر اسلامی پردہ کی پابندی نہیں جیسی کہ اس ایوان کے بعض ارکان چاہتے ہیں۔'' ان ماڈرن خواتین کے ماڈرن خیالات پر قدامت پرست عناصر کو بہت طیش آیا جس کا اظہار 3رفروری کے پاکستان ٹائمز میں ایک مراسلے کی صورت میں بھی ہوا۔ مراسلہ نگار کا کہنا یہ تھا کہ ''عصر حاضر کا سب سے بڑا اسلامی ملک پاکستان جدید دنیا میں پہلا ملک ہوگا جس میں اگر ہمارے خوابوں کی تعبیر ہوئی تو اسلام ازم پر پوری طرح عمل کیا جائے گا۔ ہم

اپنے اقوال واعمال سے ساری دنیا پر یہ ظاہر وثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام ازم آج بھی اتنا ہی تروتازہ ہے جتنا کہ 1300 سال پہلے تھا۔ پاکستان میں ذہین عورتیں شاعر، ڈاکٹر اور معلم بن سکتی ہیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ وہ پہلے عورتیں بنیں اور بعد میں کچھ اور بنیں۔ جو عورتیں گھر نہیں چلانا چاہتی ہیں وہ یقیناً اس ملک کے لئے خطرے کا باعث بنیں گی۔ وہ ہماری سوشل سروس میں اصلاح کرنے کی بجائے اس میں خرابی پیدا کریں گی کیونکہ انہیں خود معاشرتی زندگی کا کچھ پتہ نہیں ہوگا۔ عورت کی اخلاقی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ زیادہ وقت گھر میں گزارے جہاں وہ اپنے آپ کو تعلیم دے سکتی ہے اور قوم کو پڑھا سکتی ہے۔"[35]

عوام کے جمہوری اور قومیتی حقوق کو دبانے کے لئے اسلام کے استعمال کا آغاز

لاہور کے دوسرے اخبارات میں بھی اسی قسم کے خطوط اور مضامین شائع ہوئے جن سے ظاہر تھا کہ قومی زندگی کا ہر شعبہ مُلّائیت کی زد میں تھا۔ روزنامہ انقلاب میں بہاولپور کی انجمن جمعیت المسلمین اور مجلس احرار اسلام کے دو لیڈروں محمد عبدالعزیز اور محمد حسین چغتائی کا ایک خط شائع ہوا جس میں نواب بہاولپور کو مشورہ دیا گیا تھا کہ "ریاست میں غیر اسلامی جمہوری اصلاحات نافذ نہ کی جائیں بلکہ وہاں کے نظام حکومت کی اساس قرآن وحدیث کو قرار دیا جائے جس کی مثال خلافت راشدہ کا زمانہ پیش کرتا ہے جو مغربی جمہوریت، کمیونزم، آمریت اور ملوکیت کے ناقص نظریات کی بجائے حیات انسانی کے لئے کہیں زیادہ فلاح اور ارتقا کا پیغامبر ہے۔ انگریزی اقتدار اٹھ جانے کے بعد شرعی قوانین کے نفاذ میں امامت اور اولیت بہاولپور کا حق ہے اور حقیقتاً قوانین شریعت کا کاملاً نفاذ ہی اس مملکت کو صحیح معنوں میں اسلامی بنا سکے گا۔"[36] بظاہر یہ خط حکومت بہاولپور کے محکمہ تعلقات عامہ کی تحریک پر لکھا گیا تھا۔ نواب بہاولپور اپنا شجرۂ نسب خلفائے عباسیہ تک پہنچاتا تھا اور اس بنا پر اس کی خواہش تھی کہ اپنی سلطنت کا مطلق العنان خلیفہ بنے۔ یہی وجہ تھی کہ قیام پاکستان کے فوراً بعد اس نے خود ہی اپنے لئے جلالتہ الملک کا لقب اختیار کر لیا تھا جبکہ پنجاب کا ایک یونینسٹ جاگیردار نواب مشتاق احمد گرمانی اس کا وزیر اعظم تھا۔

اس ساری بحث کا حیرت انگیز پہلو یہ تھا کہ اس قسم کے غیر جمہوری نظریات صرف جدید علوم سے بے بہرہ مُلّاؤں تک ہی محدود نہیں تھے بلکہ جدید علوم سے آراستہ بعض دانشور بھی

اس قسم کی باتیں کرتے تھے۔ ان دانشوروں میں گورنمنٹ کالج لاہور کا پروفیسر آف فلاسفی خواجہ عبدالحمید بھی تھا۔ 4رفروری کو وائی۔ ایم۔ سی۔ اے۔ ہال میں سر عبدالقادر کی زیر صدارت ایک اجتماع میں اس کی تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ درحقیقت اسلامی ریاست میں قانون ساز ادارے کو خودمختاری کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ اس ادارے کا کام حقیقی معنوں میں میونسپل ہی ہوسکتا ہے پارلیمنٹری نہیں ہوسکتا۔ ایک مسلمان صرف اسلامی ریاست کا ہی وفادار ہوسکتا ہے اگر وہ کسی غیر اسلامی ریاست کا وفادار ہو تو اللہ سے اس کی وفاداری خطرے میں پڑ جائے گی۔ کسی ملک میں مسلمان شہری کی یہ خصوصی حیثیت ہوتی ہے اور شاید اسی وجہ سے اسے یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ مسلم ملک میں رہے بصورت دیگر وہاں سے ہجرت کر جائے۔ [37] اس قسم کے ''پروفیسروں'' کی موجودگی میں اگر مُلّا ئیت فروغ نہ پاتی تو یہ حیرت کی بات ہوتی۔ غالباً پنجاب کے وزیر اعلیٰ نواب ممدوٹ نے اسی قسم کے پروفیسروں کے مشورے کے مطابق قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی کی طرز کی ایک اسلامی اکیڈمی قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور محکمہ تعمیر اسلامی کے ڈائریکٹر کو ہدایت کی تھی کہ وہ اس مقصد کے لئے علما اور ماہرین تعلیم کی ایک کمیٹی قائم کرے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس کمیٹی کا صدر بننے کی دعوت قبول کر لی تھی۔ [38]

مشرقی بنگال میں مرکزی وزیر تعلیم فضل الرحمان بھی کچھ اسی قسم کی سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ وہ فروری کے اوائل میں وہاں گیا تھا کیونکہ نومبر 1947ء میں پاکستان کی پہلی ایجوکیشنل کانفرنس نے اردو کو قومی زبان بنانے کی جو سفارش کی تھی اس کے خلاف احتجاج بدستور جاری تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ یہ احتجاج صوبہ پرستی کا مظہر ہے چنانچہ اس کا وہاں کی حکومت کو مشورہ یہ تھا کہ صوبہ پرستی کے انسداد کے لئے تعلیمی اداروں میں مسلم طلبا کے لئے مذہبی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔ 7رفروری کو ڈھاکہ ریڈیو سے اس کی نشری تقریر یہ تھی کہ ''اسلام کی عالمگیر اخوت کا سورج طلوع ہو گیا ہے اور قوم پرستی و صوبہ پرستی کی رات کی تاریکی چھٹ گئی ہے۔ ہم مسلمان ہیں۔ سارا جہاں ہمارا ہے۔ اب ہم پاکستان سے اسلامی اصولوں کے ذریعے ساری دنیا کے دل جیت لیں گے۔ جیسا کہ حال ہی میں قائداعظم نے کہا ہے آج کل بھی ہماری زندگی میں اسلام ہمیں جمہوریت، مساوات، اخوت اور عدل و انصاف کا سبق دیتا ہے۔ اب ہم غلام نہیں ہیں اس لئے صوبہ پرستی کو نہیں مانتے۔ اب ہم سارے پاکستان، سارے مسلم ممالک اور ساری دنیا کے

مسلمان اخوت کے رشتے میں منسلک ہیں۔ اب ہم سب خواہ قاضی نذر السلام یا ڈاکٹر محمد اقبال یا بابا فرید یا شاہ عبداللطیف یا رحمان بابا یا وارث شاہ کی زبانیں بولتے ہیں، ایک ہیں...... حکومت پاکستان ڈھاکہ ریڈیو کے شارٹ ویو کا ٹرانسمیٹر لگا رہی ہے۔ اس طرح ہمیں مشرقی بنگال میں اپنی اردو زبان کو مقبول بنانے میں مدد ملے گی۔ ہم مسلمانوں نے اس زبان کے لئے کام کیا ہے۔ ہم اس کا رسم الخط عرب سے لائے تھے اور ہم اس کی لغت کا کچھ حصہ بھی عرب، ترکی اور ایران سے لائے تھے۔ ہم نے اس لغت کی اس برصغیر کی زبان کے ساتھ آمیزش کی اور اس طرح ہم نے اظہار خیال کا ایک ایسا ذریعہ پیش کیا جو شاندار تاریخ اور بیش بہا ادب سے بھر پور ہے۔ ہم اس زبان کو مقبول عام بنائیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا بات کا خیال رکھیں گے کہ اس طرح ہماری علاقائی زبانوں کو کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔''[39] فضل الرحمان کی اس اسلامی تقریر کا پس منظر یہ تھا کہ 1948ء میں پورے مشرقی بنگال میں چاول اور دوسری ضروریات زندگی کی بہت قلت پیدا ہو گئی تھی۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد بے روزگار تھی۔ ان کے لئے تجارت، صنعت اور سرکاری ملازمتوں کا کوئی دروازہ نہیں کھلتا تھا اور اردو کو پاکستان کی واحد قومی زبان بنانے کی تجویز سے عوام الناس میں یہ تاثر پیدا ہو گیا تھا کہ اگر اس تجویز پر عمل ہوا تو ان کی کم از کم دو ایک نسلوں کے لئے تو خوشحالی اور آسودگی کے سارے راستے مسدود رہیں گے۔ فضل الرحمان مشرقی بنگال کے عوام کے ان سارے مسائل کو محض اسلام، اخوت اور مسلم قومیت کے نعروں کے زور سے حل کرنا چاہتا تھا۔ تاہم اس کی یہ کوشش بے نتیجہ ثابت ہوئی اور 4 رجولائی کو ڈھاکہ میں مسلم سٹوڈنٹس لیگ کے نام سے ایک ایسی تنظیم وجود میں آئی جس کا نصب العین مشرقی بنگال کے عوام کو ان کے جائز حقوق دلوانا تھا۔

فضل الرحمان کے اس دورہ مشرقی بنگال سے کراچی اور پنجاب کے قدامت پرستوں کے حوصلے اور بھی بڑھے۔ چند دن قبل وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر بھی وہاں کا اسی قسم کا کامیاب دورہ کر چکا تھا۔ لہٰذا انہیں امید تھی کہ اگر اس قسم کے دوروں کا سلسلہ جاری رہا تو وہاں بنگالی نیشنلزم کو فروغ حاصل نہیں ہو گا بلکہ مسلم قومیت کے نظریے کا غلبہ ہو گا باوجود اس کے کہ وہاں کی آبادی میں غیر مسلموں کی آبادی کا تناسب 25 فیصدی ہے۔ اور یہ کہ اس نظریے کے زور سے وہاں کے عوام کو سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی لحاظ سے مغلوب رکھا جا سکے گا۔ ان کی اس امید میں کراچی

کے میمن، خوجے اور بوہرے وغیرہ اور پنجاب کے شیخ اور سید وغیرہ بھی شامل تھے جو تجارت اور صنعت کے میدانوں میں اسلام کے زور پر مشرقی بنگال کے عوام کا استحصال کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ ان دنوں پاکستان مسلم لیگ کونسل کے پہلے اجلاس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ یہ اجلاس 21 رفروری کو ہونے والا تھا۔ کراچی اور پنجاب کے استحصالیوں کی کوشش یہ تھی کہ اس اجلاس میں مشرقی بنگال سے جو کونسلر آئیں وہ اسلام اور مسلم قومیت کے جذبے سے سرشار ہوں تاکہ اس سرکاری جماعت پر افتخار الدین اور ایوب کھوڑو جیسے عناصر کا غلبہ نہ ہونے پائے جو ملک میں طبقاتی اور قومیتی شعور پیدا کر رہے تھے اور جن کے جی۔ ایم۔ سید اور عبدالغفار وغیرہ سے بھی دیرینہ روابط تھے۔

17 رفروری کو لیگ کونسل کے دو ارکان مولانا محمد اسماعیل ذبیح اور مولانا عبدالقیوم نے اس اجلاس میں ایک قرارداد پیش کرنے کا نوٹس دیا جس کی پہلی شق یہ تھی کہ "پاکستان ان سب لوگوں کا وطن ہے جو یہاں پہلے سے آباد ہیں یا نئے آکر آباد ہوئے ہیں یا آئندہ آباد ہوں۔ اس کے حقوق سب کے لئے یکساں ہوں گے اور اگر کوئی تحریک صوبائی یا نسلی تفریق کی بنیاد پر چلائی جائے گی وہ قومی غداری متصور ہوگی اور قابل تعزیر ہوگی۔"[40]

اس قرارداد کی اسلامی ریاست کی شہریت کے بارے میں یہ شق مُلّا مودودی کے اس اسلامی تصور کے عین مطابق تھی جو اس نے اپنی 20 رجنوری 1948ء کی ایک ریڈیائی تقریر میں پیش کیا تھا۔ اس کا تصور یہ تھا کہ "شہریت کے حقوق اسلام صرف انہی لوگوں کو نہیں دیتا جو اس کی ریاست کی حدود میں پیدا ہوئے ہوں بلکہ ہر مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی گوشے میں پیدا ہوا ہو اسلامی ریاست کی حدود میں داخل ہوتے ہی آپ سے آپ اس کا شہری بن جاتا ہے اور پیدائشی شہریوں کے برابر حقوق کا مستحق قرار پاتا ہے۔ دنیا میں جتنی ریاستیں بھی ہوں گی ان سب کے درمیان شہریت مشترک ہوگی۔ مسلمان کو کسی اسلامی ریاست کی حدود میں داخل ہونے کے لئے پاسپورٹ کی ضرورت نہ ہوگی۔ مسلمان کسی نسلی، قومی یا طبقاتی امتیاز کے بغیر ہر اسلامی ریاست میں کسی بڑے سے بڑے ذمہ داری کے منصب کے اہل ہو سکتا ہے۔"[41]

گویا مُلّا ذبیح اور مُلّا مودودی وغیرہ یہ چاہتے تھے کہ سندھ، بلوچستان، سرحد اور مشرقی بنگال میں اولاً دہلی، یو۔ پی اور حیدر آباد دکن کے مہاجرین کا غلبہ ہو اور ثانیاً اگر اس غلبہ میں پنجاب کے استحصالی بھی شریک ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں ہوگا کیونکہ پنجابیوں کی فوج تھی، اس فوج کے

پاس بندوقیں تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ نوائے وقت نے اپنے ایک اداریے میں اس نظریے کی پرزور تائید کی۔ اس نے لکھا کہ ''ہم مسلمان بلالحاظ رنگ ونسل وزبان ایک مستقل قوم ہیں لیکن بدقسمتی سے قیام پاکستان کے بعد اہل غرض نے پٹھان اور پنجابی، سندھی اور غیر سندھی، بنگالی اور غیر بنگالی اور دہلوی اور پنجابی کے امتیازات وتفریق کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر اس خطرناک فتنہ کا سدباب نہ کیا گیا تو یہ چنگاری مستقبل میں ایک ہولناک آگ کی صورت اختیار کر لے گی۔''[42]

لیگ کونسل کے اجلاس سے دو دن قبل یعنی 19 رفروری کو قائداعظم جناح نے بھی پاکستان کی یکجہتی کو قائم رکھنے کے لئے اسلام کی اہمیت کا ذکر کیا۔ ان کا خیال تھا کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے علیحدہ اور دور افتادہ علاقوں کے درمیان اسلام کی وجہ سے اتحاد قائم رہ سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے آسٹریلوی عوام کے نام ایک ریڈیائی تقریر میں کہا کہ ''ہماری آبادی کی بھاری اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں۔ ہم اسلامی برادری کے رکن ہیں جس کے سارے ارکان حقوق، وقار اور عزت نفس کے لحاظ سے برابر ہیں۔ نتیجتاً ہم میں باہمی اتحاد کا بہت خصوصی اور گہرا احساس ہے لیکن میری اس بات کو غلط نہ سمجھیں۔ پاکستان تھیوکریسی یا اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اسلام ہم سے دوسرے مسلکوں کے بارے میں رواداری کا مطالبہ کرتا ہے۔ ہم بلالحاظ مسلک سب سے قریب ترین روابط کا خیر مقدم کرتے ہیں جو پاکستان کے سچے اور وفادار شہریوں کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرنے پر آمادہ ہیں۔''[43]

پاکستان میں اسلام پر عمل درآمد کے بارے میں جناح اور مُلّاؤں کے نقطہ نظر میں بڑا فرق تھا

پاکستان میں اسلام کے بارے میں جناح کے اس نقطہ نگاہ اور مُلّاؤں کے موقف میں بہت فرق تھا۔ جناح کے نزدیک اسلام اور سیکولرازم میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ وہ پاکستان کے ہر شعبہ زندگی میں غیر مسلموں کو مساوی حقوق دینے کے حق میں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حکومت پاکستان نے ہفتہ عشرہ قبل اعلان کیا تھا کہ پاکستان کی بری، بحری اور ہوائی افواج کے سارے عہدوں پر عیسائیوں کے لئے بھرتی کے دروازے کھلے ہوں گے اور عیسائی لیڈر دیوان بہادر ایس۔ پی۔

سنگھا نے اس اعلان کا پر جوش خیر مقدم کیا تھا۔"[44] جناح کے اس نقطہ نگاہ کے برعکس مُلاّؤں کے نزدیک پاکستان کی اسلامی مملکت کی افواج میں غیر مسلموں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔ افواج میں صرف مسلمان ہی بھرتی ہو سکتے تھے۔

جناح اور مُلاّؤں کے درمیان مذہب کے بارے میں ان کی اختلاف رائے کا اظہار انہی دنوں ایک اور موقع پر بھی ہوا جبکہ بابائے قوم نے امریکی عوام کے نام ایک نشری تقریر میں کہا کہ "پاکستان آئین ساز اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخر کار شکل کیا ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ جمہوری طرز کا آئین ہوگا جس میں اسلام کے بنیادی اصول متشکل ہوں گے۔ یہ اصول آج بھی اسی طرح زندگی میں قابل عمل ہیں جس طرح 1300 سال پہلے تھے۔ اسلام اور اس کے آئیڈیلزم نے ہمیں جمہوریت کا درس دیا ہے۔ اس نے انسانی مساوات، عدل اور ہر شخص سے منصفانہ برتاؤ سکھایا ہے۔ ہم ان درخشاں روایات کے وارث ہیں اور پاکستان کا آئندہ آئین بنانے والوں کی حیثیت میں ہمیں اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کا پورا احساس ہے۔ بہر حال پاکستان ایک ایسی مذہبی مملکت نہیں ہوگا جس میں مذہبی پیشوا مامور من اللہ کے طور پر حکومت کریں گے۔ ہمارے ہاں بہت سے غیر مسلم ہیں...... ہندو، عیسائی اور پارسی ہیں...... لیکن وہ سب پاکستانی ہیں۔ وہ بھی تمام دوسرے شہریوں کی طرح حقوق اور مراعات سے بہرہ ور ہوں گے اور پاکستان کے معاملات میں کماحقہٗ کردار ادا کریں گے۔"[45]
جناح کی اس تقریر اور ان کی 11 راگست 1947ء کی تقریر میں صرف الفاظ کا فرق تھا۔ نفس مضمون کا کوئی فرق نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی اس تقریر میں بھی پاکستان کے سارے شہریوں کو بلالحاظ مذہب وملت ایک قوم قرار دیا تھا اور یقین دلایا تھا کہ پاکستان کے سارے غیر مسلموں کو مسلمانوں کی طرح یکساں حقوق حاصل ہوں گے۔ یہاں کا آئین جمہوری طرز کا ہوگا۔ نظام حکومت جمہوری ہوگا اور یہ ملک ایک ایسی مذہبی مملکت نہیں ہوگا جس میں مذہبی پیشوا مامور من اللہ کے طور پر حکومت کریں گے۔ گویا جناح نے اس تقریر میں اسلام کی تعبیر ایسی کی تھی جو یورپ کے جدید بورژوا جمہوری نظام کے لادینی نظریے کے عین مطابق تھی۔

مُلاّؤں کے لئے جناح کی یہ تعبیر کسی صورت قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی جناح ایک سیکولر جمہوری نظام میں عوام الناس کے حاکمیت یعنی عوام الناس کے نمائندوں کی حاکمیت کے قائل تھے

جبکہ بیشتر مُلاّؤں کی جانب سے خدا کی حاکمیت یعنی خود ان مُلاّؤں کی اپنی حاکمیت کا نظریہ پیش کیا جاتا تھا۔ وہ بالعموم اسلام کے سیاسی نظام کی جو تعبیر کرتے تھے اس کا ایک مختصر سا خاکہ ابوالاعلیٰ مودودی نے 20 رجنوری 1948ء کو اپنی ایک نشری تقریر میں پیش کیا تھا۔ مودودی کا تصور یہ تھا کہ ''جو چیز اسلامی جمہوریت کو مغربی جمہوریت سے الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مغرب کا نظریہ سیاسی ''جمہوری حاکمیت'' کا قائل ہے اور اسلام ''جمہوری خلافت'' کا۔ وہاں جمہور خود بادشاہ ہیں اور یہاں بادشاہی خدا کی ہے اور جمہور اس کے خلیفہ ہیں۔ وہاں اپنی شریعت جمہور آپ بناتے ہیں، یہاں ان کو اس شریعت کی پابندی کرنی ہوتی ہے جو خدا نے اپنے رسولﷺ کے ذریعہ سے دی ہے۔ وہاں حکومت کا کام جمہور کا منشا پورا کرنا ہوتا ہے، یہاں حکومت اور اس کے بنانے والے جمہور سب کا کام خدا کا منشا پورا کرنا ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ مغربی جمہوریت ایک مطلق العنان خدائی ہے جو اپنے اختیارات کو آزادانہ استعمال کرتی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی جمہوریہ ایک پابند آئین بندگی ہے جو اپنے اختیارات کو خدا کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرتی ہے...... اسلامی ریاست کے انتظام کی ذمہ داری ایک امیر کے سپرد کی جائے گی جسے صدر جمہوریہ کے مماثل سمجھنا چاہیے۔ امیر کے انتخاب میں ان تمام بالغ مردوں اور عورتوں کو رائے دینے کا حق ہوگا جو دستور کے اصولوں کو تسلیم کرتے ہوں۔ انتخاب کی بنیاد یہ ہوگی کہ روح اسلام کی واقفیت، اسلامی سیرت، خدا ترسی اور تدبر کے اعتبار سے کون شخص سوسائٹی کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کا اعتماد رکھتا ہے۔ ایسے شخص کو امارت کے لئے منتخب کیا جائے گا پھر اس کی مدد کے لئے ایک مجلس شوریٰ بنائی جائے گی اور وہ بھی لوگوں کی منتخب کردہ ہوگی۔ امیر کے لئے لازم ہوگا کہ ملک کا انتظام مجلس شوریٰ کے مشورے سے کرے...... اسلامی ریاست میں قانون سازی ان حدود کے اندر ہوگی جو شریعت میں مقرر کی گئی ہیں۔ خدا اور رسولﷺ کے واضح احکام صرف اطاعت کے لئے ہیں۔ کوئی مجلس قانون ساز ان میں ردوبدل نہیں کرسکتی۔ رہے وہ احکام جن میں دو یا زیادہ تعبیریں ممکن ہیں تو ان میں شریعت کا منشا معلوم کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو شریعت کا علم رکھتے ہوں۔ اس لئے ایسے معاملات مجلس شوریٰ کی اس سب کمیٹی کے سپرد کئے جائیں گے جو علما پر مشتمل ہوگی۔''46

قائداعظم جناح کی مذکورہ تقریروں کے دو تین دن بعد پاکستان مسلم لیگ کونسل کا

اجلاس ہوا جو 25رفروری 1948ء تک جاری رہا۔ اس اجلاس میں اس جماعت کا جو آئین منظور کیا گیا اس کے مطابق غیر مسلموں کے لئے اس کی رکنیت کے دروازے بند رکھے گئے۔ جن مرکزی عہدیداروں کا انتخاب کیا گیا وہ سب کے سب موقع پرست تھے اور اسلامی نعروں کے زور سے قومیتی اور طبقاتی تضاد کو دبانے کے حق میں تھے۔ جن دنوں کونسل کا یہ اجلاس جاری تھا، قائداعظم جناح کی زیر صدارت دستور ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو 25رفروری کو ایوان کے ضوابط کار پر بحث کے دوران قومی زبان کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا جس نے تین یا چار ماہ پہلے سے مشرقی بنگال کے تعلیم یافتہ حلقوں میں بے چینی پھیلا رکھی تھی اور جو بڑی تیزی سے ایک قومیتی مسئلہ بنتا جا رہا تھا۔ مشرقی بنگال کے ایک ہندو رکن دھرندر ناتھ دتہ کی تجویز یہ تھی کہ ایوان کے ضوابط کار میں اس امر کی گنجائش رکھی جائے کہ ارکان اسمبلی انگریزی اور اردو کے علاوہ بنگالی زبان میں بھی اظہار خیال کر سکیں مگر اس کی یہ تجویز کثرت رائے سے مسترد کر دی گئی کیونکہ وزیراعظم لیاقت علی خان کا موقف یہ تھا کہ پاکستان مسلمانوں کا ملک ہے اور اردو مسلمانوں کی زبان ہے اس لئے صرف اسی زبان کو ہی قومی زبان کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ دستور ساز اسمبلی کے اس فیصلے پر مشرقی بنگال میں سخت مخالفانہ ردعمل ہوا اور 27رفروری سے ڈھاکہ کے طلبا نے قومی زبان کے مسئلہ پر زوردار ایجی ٹیشن شروع کر دی۔ چونکہ مرکزی ارباب اقتدار کے لئے یہ ایجی ٹیشن غیر متوقع نہیں تھی اس لئے انہوں نے اسے کچلنے کے لئے پہلے ہی سے تدابیر سوچ رکھی تھیں۔ حکومت پاکستان کے وزیر داخلہ فضل الرحمان کی 20رفروری کو پولیس کے اعلیٰ حکام کی کانفرنس میں تقریر یہ تھی کہ "اگرچہ جغرافیائی حیثیت سے ہماری مملکت دو حصوں میں منقسم ہے اور طویل و بعید مسافت نے ایک دوسرے سے جدا رکھا ہے۔ تاہم ہمیں ان دونوں اجزا میں ایک قطعی اور مقصودی اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اسلام کی تعلیم عالمگیر اخوت کی راہ میں بعد و مسافت کو سراسر تسلیم نہیں کرتی۔ پچھلے ایک دو مہینوں سے یہ شکایتیں سننے میں آ رہی ہیں کہ صوبہ پروری کا تعصب ہماری صفوں میں سرایت کر رہا ہے اور اندیشہ ہے کہ یہ خطرناک رجحان ساری قوم کی بنیادی وحدت کی جڑیں نہ اکھاڑ دے۔ اس خطرہ کا بروقت انسداد ہونا چاہیے اور آپ حضرات اس اور اس قسم کے دوسرے قبیح عناصر کی سرکوبی میں قابل فخر اور مؤثر حصہ لے سکتے ہیں۔"[47] فضل الرحمان کی اس تقریر سے ظاہر تھا کہ حکومت پاکستان مشرقی بنگال کے طلبا کی اس ایجی ٹیشن کو اسلام کے علاوہ لاٹھی و گولی کے زور

سے بھی کچلنے کا ارادہ رکھتی تھی حالانکہ اس ایجی ٹیشن میں یہ حقیقت کارفرما تھی کہ اناج اور دوسری ضروریات زندگی کی قیمتوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بہت بے روزگاری تھی اور پنجابی سول وفوجی بیوروکریسی کے ارکان بنگالی عوام سے حقارت آمیز سلوک کرتے تھے اور بیگم شائستہ اکرام اللہ کے بقول مشرقی پاکستانیوں میں یہ احساس بڑھ رہا تھا کہ ''مشرقی پاکستان کونظرانداز کیا جارہا ہے اوراس کے ساتھ مغربی پاکستان کی نوآبادی کا سلوک کیا جارہا ہے۔''

مُلّاؤں نے ملک کو درپیش مسائل سے بے نیاز ہوکر اپنے اقتدار کے لئے تگ ودو شروع کردی

کراچی کے شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کو مشرقی پاکستانیوں کے اس روز افزوں احساس محرومی کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔یہی وجہ تھی کہ اس نے 27رفروری کو دستور ساز اسمبلی کے سپیکر کو جو دو قرار دادیں پیش کرنے کا نوٹس دیا تھا اس میں ایسی کوئی بات نہیں کہی گئی تھی کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی شکایت کا ازالہ محض اسلامی نعروں، لاٹھیوں اور گولیوں کے زور سے نہیں ہوسکتا بلکہ اس مقصد کے لئے وہاں کے عوام کے پسماندگی اور مفلوک الحالی کے مسائل کو مخلصانہ اور بھرپور کوششوں سے حل کرنا چاہیے۔ شیخ الاسلام کی پہلی قرارداد یہ تھی کہ ''چونکہ پاکستان کا مطالبہ مسلمانوں نے اس غرض سے پیش کیا تھا کہ وہ جدا ایک ریاست قائم کرسکیں جہاں وہ اسلامی قوانین اور شریعت کے مطابق زندگی بسر کرسکیں اوراس نہج پر اپنے تمدن کو ڈھال سکیں اور چونکہ پاکستان کے باشندے ان مقدس مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے بہت بے صبری کا اظہار کررہے ہیں اور چونکہ اس آئین کی بنیاد شریعت اسلامیہ پر رکھی جائے گی اس لئے یہ اسمبلی قرار دیتی ہے کہ معتبر علما اور دوسرے مسلمان مفکرین پر مشتمل ایک مجلس مشاورت قائم کردی جائے جو شریعت اسلامیہ کے مطابق آئین ترتیب دینے کے لئے سفارشات پیش کرے۔'' اس کی دوسری قرارداد یہ تھی کہ ''اسلامی شریعت کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالنے کے لئے باشندگان پاکستان کی خواہش کی تکمیل کی طرف پہلا فوری قدم اٹھانے کے لئے اسمبلی قرار دیتی ہے کہ ایک قانون ساز ادارہ قائم کیا جائے جو اسلامی مذہبی اداروں اوراوقاف کے انتظام وانصرام، اسلامی تعلیم کی ترویج و تبلیغ اور دوسرے امور سے متعلق فرائض سرانجام دے۔''[48]

شیخ الاسلام کی پہلی قرارداد کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی مجوزہ مجلس مشاورت کے ذریعہ قانون سازی کے کام پر اپنا کنٹرول قائم کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے اپنی اس قرارداد میں یہ نہیں بتایا تھا کہ مسلمانوں کی کون سی جماعت نے اپنی کون سی قرارداد میں یہ کہا تھا کہ پاکستان کی اسلامی ریاست میں اسلامی قوانین اور شریعت کا نفاذ ہوگا۔ مُلّا مودودی کے بقول ''مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریریں میں یہ بات واضح نہیں کی گئی تھی کہ ان کا آخری مطمع نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا تھا۔ برعکس اس کے ان کی طرف سے بصراحت اور بتکرار جس چیز کا اظہار کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ ان کے پیش نظر ایک ایسی جمہوری حکومت تھی جس میں دوسری غیر مسلم قوموں کو بھی حصہ دار بنایا جائے گا مگر اکثریت کے حق کی بنا پر مسلمانوں کا حصہ غالب ہوگا۔'' دوسری قرارداد کا مطلب یہ تھا کہ مذہبی اداروں اور اوقاف کی آمدنی مُلّاؤں کے لئے مخصوص ہونی چاہیے اور تعلیمی اداروں پر بھی ان کا غلبہ ہونا چاہیے۔ شبیر احمد عثمانی کے نام کے ساتھ شیخ الاسلام کا لقب اس کی جمعیت العلمائے اسلام کی 13 رجنوری 1948ء کی قرارداد کے مطابق منسلک کیا گیا تھا۔ بظاہر اس قرارداد کا مطلب یہ تھا کہ جب پاکستان میں مُلّاؤں کے تصور کے مطابق خلافتی نظام نافذ ہوگا تو اگر وہ امیر المومنین نہ بن سکا تو کم از کم قاضی القضاۃ تو بن ہی جائے گا۔ مُلّا مودودی کا خیال تھا کہ اسلامی ریاست کے امیر کے انتخابات کی بنیاد یہ ہوگی کہ ''روح اسلام کی واقفیت، اسلامی سیرت، خداترسی اور تدبر کے اعتبار سے کون شخص سوسائٹی کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کا اعتماد رکھتا ہے۔'' اور یہ کہ ''جب اس اسلامی ریاست میں ایک شخص عدالت کی کرسی پر بیٹھ جائے گا تو وہ خدا کے قانون کے مطابق لوگوں کے درمیان بے لاگ انصاف کرے گا اور اس کے انصاف کی زد سے خود حکومت بھی بچ نہ سکے گی حتیٰ کہ خود حکومت کے رئیس اعلیٰ کو بھی مدعی یا مدعا علیہ کی حیثیت سے اس کے سامنے اسی طرح حاضر ہونا پڑے گا جیسے ایک عام شہری حاضر ہوتا ہے۔''[49]

29 رفروری کو جمعیت العلمائے اسلام کی پنجاب برانچ کے زیر اہتمام مولانا داؤد غزنوی کی زیر صدارت ایک پبلک جلسہ میں شبیر احمد عثمانی کی ان قراردادوں کی اس قرارداد کے ذریعہ تائید کی گئی کہ اگر اسلام کے مطابق آئین کی تشکیل نہ ہوئی تو اس کی سخت مزاحمت کی جائے گی۔ ایک اور قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ عورتوں سے قران پاک کے مطابق بذریعہ قانون حقیقی

اسلامی پردہ کروایا جائے۔[50] 2 مارچ کو جامع مسجد بازار کلاں وزیر آباد میں مولوی پیرزادہ بہاالحق قاسمی امرتسری کی زیر صدارت ایک جلسہ عام میں بھی دو قراردادیں منظور کی گئیں۔ پہلی قرارداد میں دستور ساز اسمبلی سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ سب سے پہلے اس بنیادی اصول کو تسلیم کرے کہ پاکستان اسلامی ملک ہے۔ اس کا سرکاری مذہب اسلام اور اس کا قانون قرآن مجید ہوگا۔ دوسری قرارداد میں اسمبلی سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ ''وہ جلد سے جلد (الف) شراب پینے اور اس کے تیار اور فروخت کرنے، زنا کاری اور اس کے محرکات مثلاً سینما میں عورتوں کے تھرکنے، ناچنے اور ریڈیو پر اور میلوں ٹھیلوں میں گانے بجانے اور عام بے پردگی اور بے حیائی اور ماہ رمضان المبارک میں دن کے وقت اعلانیہ کھانے پینے کو جرم قرار دے اور ان جرائم کی وہی سزا مقرر کرے جو اسلامی شریعت نے تجویز کی ہے۔ (ب) تمام سرکاری دفتروں اور اداروں میں فریضہ نماز کے لئے مناسب سہولتیں بہم پہنچائے اور تمام چھوٹے بڑے سرکاری ملازموں کو باجماعت نماز میں شمولیت کا حکم دے۔''[51]

7 مارچ کو لائل پور میں جعفری کانفرنس کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں مطالبہ کیا گیا کہ ''پاکستان کے لئے آئین سازی کا کام کرتے ہوئے شیعہ فقہ کو پیش نظر رکھا جائے اور دستور ساز ادارے میں دو شیعہ علما کو شامل کیا جائے۔ سکولوں میں شیعہ عقائد کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے اور حج کمیٹی کی طرح ایک زیارت کمیٹی بھی مقرر کی جائے۔''[52] اسی دن صادق آباد میں ایک جلسہ میں پیر مانکی شریف نے کہا کہ ''سرحدی، پنجابی، بنگالی کے امتیازات لغو ہیں۔ وطنی تعصب اور علاقائی تنگ نظری کے حامل قابل نفریں ہیں اور اسلام اس کو قطعاً برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر مسلمانوں نے وطنی تعصب نہ چھوڑا تو ان کا حشر اہل ہسپانیہ جیسا ہوگا۔ مملکت پاکستان میں اسلامی قانون کا نفاذ ہونا چاہیے تا کہ اس قسم کے رکیک اور ذلیل وطنی تعصب کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا جائے۔''[53]

اسلامی قراردادوں، تقریروں، اعلانات اور نعروں کا عوام کی قومیتی اور طبقاتی جدوجہد پر کوئی اثر نہ ہوا

کراچی اور پنجاب کے مُلّاؤں کی ان اسلامی قراردادوں اور اعلانات کا نہ صرف مشرقی بنگال کے طلبا کی ایجی ٹیشن پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ سندھیوں کی تحریک بھی غیر متاثر رہی جو

انہوں نے کراچی کی سندھ سے علیحدگی کی تجویز اور مہاجرین کی آبادکاری کے خلاف چلا رکھی تھی۔ مزید برآں خان عبدالغفار خان کا پٹھانوں کے لئے حق خود اختیاری کا مطالبہ بھی جاری رہا۔ بنگالی طلبا کی ایجی ٹیشن اتنی زوردار تھی کہ وہاں کا وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین گھبرا گیا اور اس نے یکم مارچ کو ایک توضیحی بیان میں یقین دلایا کہ اردو کے قومی زبان بنائے جانے کے بعد بھی مشرقی بنگال کی زبان بنگالی رہے گی اور وہ بدستور صوبہ کے تعلیمی اداروں میں ذریعہ تعلیم ہوگی۔ سندھ میں سندھیوں کی تحریک اتنی زبردست تھی کہ 2 / مارچ کو وہاں کے وزیر اعلیٰ ایوب کھوڑو نے مرکزی اسمبلی میں اعلان کیا کہ صوبہ سندھ کا کوئی شخص کراچی کی اپنے صوبہ سے علیحدگی پر رضامند نہیں ہوگا۔

6 / مارچ کو حسین شہید سہروردی نے مرکزی اسمبلی میں پاکستان کے ارباب اقتدار کو مشورہ دیا کہ وہ ''پاکستان خطرے میں ہے اور اسلام خطرے میں ہے'' کہ نعرے نہ لگائیں اور ملک میں غیر مسلم اقلیتوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کا بندوبست کریں اور اسی دن خان عبدالغفار خان نے مرکزی اسمبلی میں اعلان کیا کہ اب پاکستان میں مسلم لیگ کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ 9 / مارچ کو خان عبدالغفار خان نے کراچی میں اپنی مجوزہ آل پاکستان پیپلز پارٹی کے منشور کا اعلان کیا جس میں یہ تجویز بھی شامل تھی کہ پاکستان آزاد سوشلسٹ جمہوریتوں پر مشتمل ایک یونین قرار دیا جائے۔ اور پھر 11 / مارچ کو جبکہ مشرقی بنگال میں طلبا کی ایجی ٹیشن زور و شور سے جاری تھی، یہ سرکاری اعلان کیا گیا کہ گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح 20 / مارچ سے مشرقی بنگال کا دورہ کریں گے۔

اس اعلان سے چند دن قبل کلکتہ میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی دوسری کانگرس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ برصغیر میں طبقاتی انقلاب کے لئے مسلح جدوجہد کی جائے گی۔ اس سلسلے میں نوائے وقت کی رپورٹ یہ تھی کہ ''چونکہ ہندوستان میں سردار پٹیل اور جے پرکاش نارائن آپس میں لڑنے کے باوجود کمیونسٹوں کے خلاف متحدہ محاذ بنائے ہوئے ہیں اس لئے کمیونسٹ لیڈروں نے موقع شناسی سے کام لیا ہے اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہندوستان کی بجائے سردست پاکستان میں حصول اقتدار کی مساعی کو تیز تر کیا جائے۔ کمیونسٹ ہیڈ کوارٹرز میں طویل خفیہ مشاورتوں کے بعد ایک سکیم مرتب کی گئی ہے۔ کمیونسٹ پروگرام کی مطابق کراچی، لاہور اور ڈھاکہ پاکستان میں اس پارٹی کے تین اہم مرکز ہوں گے۔ پارٹی کے ارکان وقتی طور پر انتخابات میں قطعاً کوئی حصہ نہیں لیں

گے۔ پروگرام کی ابتدائی شق یہ ہے کہ پاکستان کے عوام بالخصوص مسلمانوں میں کمیونسٹ پارٹی کے متعلق شک وشبہ کے جذبات کو زائل کر کے انہیں یقین دلایا جائے کہ کمیونسٹ ان کے دوست اور ہمدرد ہیں...... جب میدان تیار ہو جائے تو سٹرائیک کا حربہ استعمال کیا جائے۔ ریلوے مزدور، محکمہ ڈاک وتار کے ملازم اور لوئر گریڈ کے سرکاری ملازم کام چھوڑ دیں اور سرکاری مشینری کو مفلوج ومعطل کر دیں۔ کمیونسٹ ان ہڑتالوں کو منظم کریں مگر ان کی قیادت ایسے لوگوں کو نہ دی جائے جن کے متعلق سب کو یہ معلوم ہو کہ پارٹی کے باقاعدہ ممبر ہیں...... عوام میں حکومت کے خلاف بدظنی پھیلائی جائے مگر براہ راست حملہ نہ کیا جائے۔ پاکستان کی اقتصادی کمزوریوں پر زور دیا جائے اور عوام کو یہ احساس دلایا جائے کہ قیام پاکستان سے ان کی مشکلات دور نہیں ہوئیں بلکہ ضروریات زندگی گراں اور نایاب ہو گئی ہیں۔ کمیونسٹوں کو بار بار ہدایت کی گئی ہے کہ وہ براہ راست حملہ نہ کریں۔ مذہب کے خلاف کچھ نہ کہا جائے۔ مگر لال جھنڈا سائز میں سبز جھنڈے سے بڑا ہو اور اس کا رنگ بھی زیادہ شوخ ہو۔ لیگ کے لیڈروں کے خلاف عوام کو بدظن کیا جائے مگر قائداعظم کی ذات کے متعلق کچھ نہ کہا جائے۔ کمیونسٹ کارکن مسلمانوں کے سے نام استعمال کریں۔ مختصر ناموں کی بجائے پورا اسلامی نام نامی نمایاں کیا جائے۔ جو کامریڈ مسلمانوں کی اعلیٰ ذاتوں کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں وہ اپنے نام کے ساتھ سید، خان اور مرزا ضرور لکھیں۔ تاکہ عوام پر اچھا اثر پڑے۔ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے ارکان کو خاص طور پر ہدایت کی گئی ہے کہ وہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ساتھ لاتعلقی کا اظہار کریں مگر مذکورہ بالا پروگرام اور ہدایات کی ترتیب کا سہرا کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے دو مسلمان ممبروں اور ایک ہندو ممبر کے سر ہے اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ایک مسلمان ممبر کو مغربی پاکستان بھیجا جا رہا ہے تاکہ وہ اس مہم کی نگرانی کریں۔‘‘[54]

یہ رپورٹ حکومت پاکستان کی تحریک پر شائع کی گئی تھی اور اس کا مطلب یہ تھا کہ آئندہ پاکستان کے ارباب اقتدار قومیتی اور طبقاتی تضادات کو دبانے کے لئے نہ صرف مذہب کو بطور سیاسی حربہ استعمال کریں گے بلکہ یہ الزام بھی لگا سکیں گے کہ پاکستان کی ساری داخلی مشکلات کمیونسٹوں کی سازش کا نتیجہ ہیں۔

نوائے وقت کی اس رپورٹ کے ساتھ ہی کراچی سے یہ رپورٹ بھی موصول ہوئی تھی کہ ’’سندھ یونیورسٹی میں تمام مذاہب کے طلبا کے لئے مذہب کو لازمی مضمون قرار دیا جائے۔ اس

مقصد کے لئے مسلمان، ہندو، عیسائی اور پارسی علما نے اپنی سفارشات پیش کر دی ہیں۔ میرٹھ کے مولانا عبدالعلیم صدیقی کا خیال یہ ہے کہ الحاد کی ترویج کے سد باب کے لئے ہمیں سب سے پہلے روحانی اور دنیاوی چیزوں کے درمیان جھوٹے فرق کو ختم کرنا چاہیے اور اسلام کی روشنی میں تعلیم کے ہر شعبے کے لئے اصلاح کرنی چاہیے۔"[55] 18 رمارچ کو کراچی سے ایک اور رپورٹ موصول ہوئی جس میں بتایا گیا کہ "سجادہ نشین تونسہ شریف نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ محکمہ مذہبی امور کی ایک نئی وزارت قائم کی جائے، ایک مشاورتی بورڈ قائم کیا جائے جو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کو آئین پاکستان کی تشکیل میں مدد دے۔"[56] مغربی پاکستان میں اس قسم کے پروپیگنڈا کے اثرات لے کر قائداعظم جناح 20رمارچ کو بذریعہ ہوائی جہاز ڈھاکہ پہنچے۔ ان کے وہاں پہنچنے سے تین چار دن پہلے 16رمارچ کو وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین تحریری طور پر طلبا کے سارے مطالبات تسلیم کر چکا تھا اور اس طرح قومی زبان کے مسئلہ پر تحریک ختم ہو چکی تھی۔ خواجہ ناظم الدین نے اس سلسلے میں طلبا کے ساتھ جس سمجھوتے پر دستخط کئے تھے اس کی ایک شق یہ تھی کہ قومی زبان کی تحریک ملک کے دشمنوں نے شروع نہیں کروائی تھی۔ اس شق کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی تھی کہ 27رفروری کے بعد اس تحریک کے دوران سرکاری ذرائع ابلاغ سے مسلسل یہ پروپیگنڈا ہوا تھا کہ یہ تحریک کمیونسٹوں اور ہندوستانی ایجنٹوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔

قائداعظم نے بنگالیوں کی معاشی، سیاسی اور ثقافتی حقوق کے حصول کی جدوجہد کو اسلام کے نام پر دبانے کی کوشش کی

تاہم جب قائداعظم جناح ڈھاکہ پہنچے تو انہوں نے اس بنا پر مذکورہ سمجھوتے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ خواجہ ناظم الدین نے دباؤ کے تحت اس پر دستخط کئے تھے۔ قائداعظم کا یہ پہلا اور آخری دورۂ مشرقی بنگال آٹھ نو دن تک جاری رہا اور اس دوران انہوں نے 21رمارچ کو ڈھاکہ کے ایک پبلک جلسے میں حاضرین کو واضح الفاظ میں بتایا کہ "تمہارے درمیان چند کمیونسٹ اور دوسرے ایجنٹ ہیں جنہیں غیر ملکی امداد ملتی ہے۔ اگر تم محتاط نہ رہے تو تم میں تفرقہ ڈال دیا جائے گا۔ یہ خیال ترک نہیں کیا گیا ہے کہ مشرقی بنگال کو پھر انڈین یونین میں شامل کیا جائے۔ یہ ان کا نصب العین ہے۔ میں ان سے ڈرتا نہیں ہوں لیکن پھر بھی بہتر ہوگا کہ ان سے خبردار رہا

جائے۔ مجھے پورا بھروسہ ہے کہ جو لوگ مشرقی بنگال کو دوبارہ انڈین یونین میں شامل کرنا چاہتے ہیں وہ خواب وخیال کی دنیا میں رہ رہے ہیں...... میں واضح ترین الفاظ میں تمہیں ان خطرات سے مکرر خبردار کر دینا چاہتا ہوں جو ابھی تک پاکستان کو اور بالخصوص تمہارے صوبے کو درپیش ہیں۔ قیام پاکستان کو روکنے میں ناکام ہونے کے بعد ناکامی سے سٹ پٹا کر پاکستان کے دشمن اب پاکستان کے مسلمانوں کے درمیان تفرقہ اندازی سے مملکت کو تباہ کرنے میں منہمک ہیں۔ ان کوششوں نے خاص طور پر صوبہ پرستی کی حوصلہ افزائی کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ جب تک آپ اپنی مملکت کو اس زہر سے صاف نہیں کریں گے اس وقت تک آپ اپنے آپ کو ایک حقیقی قوم کے سانچے میں ڈھالنے اور اسے مستحکم کرنے میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچی، پٹھان وغیرہ کی باتیں نہ ہوں۔ بلاشبہ یہ یونٹ ہیں۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا تم وہ سبق بھول گئے ہو جو تمہیں 1300 سال پہلے پڑھایا گیا تھا۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہاں تم سب باہر کے ہو تو یہ بات غلط نہیں ہوگی۔ بنگال کے ابتدائی باشندے کون تھے؟ وہ باشندے وہ نہیں تھے جو آج کل یہاں رہائش پذیر ہیں۔ لہٰذا یہ کہنے سے کیا فائدہ ہوگا کہ ہم بنگالی یا سندھی یا پٹھان یا پنجابی ہیں۔ اب ہم مسلم ہیں۔ اسلام نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے اور میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے اتفاق کرو گے کہ تم خواہ اور کیا ہو اور تمہاری حیثیت خواہ کچھ بھی ہو۔ تم بہر حال مسلمان ہو۔ اب تم سب ایک قوم سے متعلق ہو۔ تم نے ایک بہت وسیع علاقہ، اپنے لئے حاصل کر لیا ہے۔ یہ سب تمہارا ہے۔ تمہاری مرکزی حکومت قائم ہوگئی ہے جہاں مختلف حصوں کو نمائندگی حاصل ہے۔ اس لئے اگر تم اپنے آپ کو بحیثیت قوم تعمیر کرنا چاہتے ہو تو برائے خدا اس صوبہ پرستی کو چھوڑ دو۔ صوبہ پرستی ایک لعنت ہے اور فرقہ پرستی بھی مثلاً شیعہ وسنی وغیرہ۔"[57]

ظاہر ہے کہ جناح کی یہ تقریر ان کی 11راگست 1947ء کی پالیسی تقریر سے بالکل مختلف تھی۔ 11راگست کی تقریر میں انہوں نے پاکستانی قومیت اور قومی سیاست کو مذہب وملت سے بالاتر رکھ کر محض ذاتی ایقان و ایمان کا معاملہ قرار دیا تھا لیکن اب ان کی 21رمارچ 1948ء کی تقریر کے مخاطب صرف مسلمان تھے جو ان کے بیان کے مطابق بنگال کے ابتدائی باشندے نہیں تھے بلکہ وہ باہر سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے۔ انہوں نے بنگالی مسلمانوں کو ان کے مذہب کی بنا پر ایک قوم قرار دیا تھا اور 1300 سال پہلے کا سبق یاد دلا کر انہیں تلقین کی تھی کہ وہ اسلام کی

تعلیمات کے مطابق صوبہ پرستی کی لعنت کو ختم کریں۔ جناح کی اس تقریر پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مارچ 1948ء میں ان کی نظر میں مشرقی بنگال کی 25 فیصدی ہندو آبادی کا کوئی وجود ہی نہیں تھا اور بظاہر انہوں نے کراچی اور پنجاب کے مذہب فروش عناصر کے اس موقف سے اتفاق کر لیا تھا کہ نومبر 1947ء سے مشرقی بنگال میں قومی زبان کے مسئلہ پر جو تحریک جاری تھی ''وہ سراسر ان ہندوستانی ایجنٹوں، کمیونسٹوں اور ففتھ کالمسٹوں کی پیداوار ہے جنہیں غیر ملکی مالی امداد ملتی ہے۔'' چودھری محمد علی کے بیان کے مطابق جناح نے نومبر 1947ء میں اپنی کشمیر سے متعلقہ پالیسی کی قطعی ناکامی کے بعد شدید مایوسی کی حالت میں کہا تھا کہ ''ہمیں غلط گاڑی پر سوار کر دیا گیا ہے'' اور اب بدقسمتی سے کراچی اور پنجاب کے قدامت پرست اور استحصالی حلقوں نے انہیں ایک اور غلط گاڑی پر سوار کر دیا تھا۔ انہوں نے مشرقی بنگال کے عوام کی قومی زبان کی تحریک کے اسباب کا صحیح تجزیہ نہیں کیا تھا اور اس تحریک کو محض مذہبی نعروں کے زور سے دبانے کی کوشش کی تھی۔ بظاہر انہیں معلوم نہیں تھا کہ مشرقی بنگال کے عوام کے قومیتی حقوق کے بارے میں اس غلط گاڑی پر سوار ہونے کا بالآخر کیا نتیجہ نکلے گا؟

21 مارچ کے بعد جناح جتنے دن بھی مشرقی بنگال میں رہے قدامت پرست مُلّاؤں اور عوام دشمن استحصالیوں کی اس غلط گاڑی سے نہ اترے۔ انہوں نے اپنی تقریروں میں یہی موقف اختیار کئے رکھا کہ قومی زبان کی تحریک پاکستان اور اسلام کے دشمنوں کی سازش کا نتیجہ ہے اور یہ کہ اسلام اور پاکستان کی یکجہتی کا تقاضا یہ ہے کہ اردو اور صرف اردو ہی اس ملک کی قومی زبان ہو۔ 24 مارچ کو ڈھاکہ یونیورسٹی میں ان کی تقریر یہ تھی کہ ''مختلف صوبوں میں باہمی رابطہ کے لئے صرف ایک ہی زبان ہو سکتی ہے اور وہ زبان اردو ہونی چاہیے۔ یہ وہ زبان ہے جو پاکستان کے طول و عرض میں سمجھی جاتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ صرف یہی زبان ہے جو دوسری زبانوں کے مقابلے میں اسلامی ثقافت اور مسلمانوں کی روایات کے بہترین سرمایہ کی مظہر ہے۔ یہ زبان دوسرے مسلم ملکوں کی زبانوں سے بھی قریب ترین ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اردو کو ہندوستان سے نکال دیا گیا ہے اور سرکاری طور پر اردو رسم الخط کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے۔''[58]
جناح نے جب اردو کو اسلام کے ساتھ وابستہ کر کے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو یہ تلقین کی تھی کہ وہ اس زبان کو بطور قومی زبان قبول کر لیں تو انہوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا کہ ان دنوں

ہندوستان کے مشرقی اور جنوبی صوبوں میں ہندی زبان کے خلاف زبردست تحریک جاری تھی۔ حالانکہ دہلی کے ارباب اقتدار ہندی زبان کو ہندومت سے وابستہ کر کے اسے نہ صرف ہندو ثقافت وتہذیب کا مظہر قرار دیتے تھے بلکہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہندوستان کی یکجہتی کے لئے ہندی کو بطور قومی زبان رائج کرنا ضروری ہے۔

اگرچہ جناح نے 26 مارچ کو اپنی چٹاگانگ کی تقریر میں معاشرتی انصاف، اسلامی سوشلزم اور انسانوں کے درمیان مساوات واخوت کا ذکر کیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ ''انسان کی مساوات واخوت کے نکات ہمارے مذہب، ثقافت اور تہذیب کے بنیادی نکات ہیں۔ ہم نے اس لئے پاکستان کے لئے جدوجہد کی تھی کہ برصغیر میں انسانی حقوق کے پامال ہونے کا خطرہ تھا...... پاکستان کا قیام اس لئے ممکن ہوا تھا کہ ذات پات کی بنیاد پر استوار شدہ معاشرے میں انسانی روح کے کلی طور پر نیست ونابود ہوجانے کا خطرہ تھا۔''[59] تاہم ان کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں سوشلسٹ معیشت رائج کرنے کا پروگرام رکھتے تھے بلکہ ان کا مطلب صرف یہ تھا کہ انہوں نے اس تقریر میں ایک مرتبہ پھر اسلام کی بورژوا نقطہ نگاہ سے اس طرح ترقی پسندانہ تعبیر کی تھی کہ انہوں نے بلالحاظ مذہب وملت انسانوں کے درمیان معاشرتی انصاف، مساوات اور اخوت کے رشتوں کا ذکر کیا تھا۔ جو لوگ قائداعظم جناح کی اس تقریر سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ بابائے قوم پاکستان میں سوشلسٹ نظام معیشت رائج کرنے کے خواہاں تھے وہ بڑی ہی دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ ان کا یہ موقف بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ یہاں کے بعض قدامت پرست عناصر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جناح جب یہ کہتے تھے کہ پاکستان کے آئین کی بنیاد اسلامی شریعت پر ہوگی اور یہ کہ جو اسلامی اصول 1300 سال پہلے قابل عمل تھے ان کا آج بھی اطلاق ہوسکتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ پاکستان میں مُلّاؤں کے تصور کے مطابق اسلامی نظام حکومت یا خلافتی نظام رائج کرنا چاہتے تھے۔

سچی بات یہ تھی کہ جناح نظریاتی لحاظ سے ایک بورژوا سیاسی لیڈر تھے اور اس حیثیت سے وہ پاکستان میں سرمایہ داریت کی بنیاد پر مغرب کی طرز کا سیکولر جمہوری نظام رائج کرنے کے متمنی تھے۔ ان کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کا واضح طور پر مطلب یہی تھا اور انہوں نے اسی مقصد کے تحت بمبئی، مدراس، مشرقی افریقہ، کلکتہ اور رنگون سے خوجوں، بوہروں، میمنوں اور شیخوں

اور سیدوں وغیرہ کو بلا کر کہا تھا کہ یہاں تمہارے لئے صنعتکاری اور تجارت کے لامحدود وسائل اور مواقع موجود ہیں۔ لیکن جب اکتوبر، نومبر 1947ء میں ان کی کشمیر سے متعلقہ پالیسی قطعی طور پر ناکام ہوگئی، مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے لاکھوں مہاجرین کا سیلاب آگیا، ہندوستان کے بورژوا توسیع پسندوں نے پاکستان کو ختم کرنے کے لئے کھلم کھلا اعلانات شروع کر دیئے، سندھ، مشرقی بنگال، سرحد اور بلوچستان میں قومیتی تضاد بڑی تیزی سے ابھرنے لگا، سندھ اور پنجاب میں کسانوں کی طبقاتی کشمکش شدید ہونے لگی، کلکتہ میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی دوسری کانگرس نے برصغیر میں پرتشدد طبقاتی انقلاب برپا کرنے کا فیصلہ کیا، اینگلو۔امریکی بلاک کی طرف سے سوویت یونین کے خلاف عالم اسلام کے اتحاد کے تصور کی حوصلہ افزائی ہوئی، برما اور ملایا میں کمیونسٹوں کی بغاوتیں زور پکڑنے لگیں اور مشرقی بنگال کے طلبا کی قومی زبان کے مسئلہ پر تحریک وزیراعلیٰ خواجہ ناظم الدین کے قابو سے باہر ہوگئی تو جناح نے اپنی سیاسی مصلحت کے تحت اپنی 11/اگست 1947ء کی تقریر کو فراموش کر کے ایک مرتبہ پھر مذہب کو سیاست سے وابستہ کرنا شروع کر دیا۔ 28/مارچ 1947ء کو ان کی مشرقی پاکستان کے نام الوداعی تقریر یہ تھی کہ ''پاکستان ''مسلم قوم'' کے اتحاد کا مجسم مظاہرہ ہے اور ہمیشہ اس کی یہی کیفیت رہنی چاہیے۔ سچے مسلمانوں کی طرح ہمیں اس اتحاد کی حمیت کے ساتھ حفاظت کرنی چاہیے اور اسے برقرار رکھنا چاہیے۔ اگر ہم نے اپنے بارے میں یہ سوچنا شروع کر دیا کہ ہم پہلے بنگالی، پنجابی، سندھی، وغیرہ ہیں اور محض اتفاق سے مسلمان اور پاکستانی ہیں تو پھر پاکستان کا شیرازہ لازماً بکھر جائے گا۔ یہ مت سمجھئے کہ یہ کوئی دقیق مسئلہ ہے، ہمارے دشمن اس کے امکانات سے پوری طرح باخبر ہیں اور مجھے آپ کو خبردار کر دینا چاہیے کہ وہ پہلے سے ہی انہیں اپنے کام میں لانے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔''[60]

بلاشبہ جناح نے جب 30/اکتوبر 1947ء کے بعد اس قسم کی تقریروں کا سلسلہ شروع کیا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ انہوں نے مغربی طرز کے جدید جمہوری نظام حکومت سے متعلقہ اپنا ترقی پسندانہ نظریہ ترک کر دیا تھا اور انہوں نے اسلامی نظام کے بارے میں مُلّاؤں کے رجعت پسندانہ تصور کو قبول کر لیا تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس سیاسی پسپائی سے پاکستان میں اس مُلّائیت کو نمایاں طور پر فروغ حاصل ہونا شروع ہو گیا تھا جس کی انہوں نے فروری 1948ء

میں سخت مخالفت کی تھی۔ 30 ر اکتوبر کے بعد کراچی میں شبیر احمد عثمانی اور عبدالحامد بدایونی وغیرہ اور لاہور میں ابوالاعلیٰ مودودی اور داؤد غزنوی وغیرہ کھل کھیلے تھے اور کراچی و پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے مفاد پرست عناصر نے ان مُلّاؤں سے گٹھ جوڑ کرلیا تھا۔ نوائے وقت کا 31 ر اکتوبر 1947ء کا اداریہ اسلام کے نام پر پاکستان کے ''جلیل القدر سیاسی لیڈر'' کے خلاف کھلم کھلا اعلان جنگ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جناح کو معلوم نہیں تھا کہ نسلی قومیتوں اور مذہبی اقلیتوں کے حقوق تسلیم کرنے سے پاکستان کی وحدت کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوسکتا تھا بلکہ خطرہ کراچی اور پنجاب کے ان استحصالی عناصر کی طرف سے پیدا ہورہا تھا جو مذہبی نعروں کے زور سے سندھ، سرحد، بلوچستان اور مشرقی بنگال کے پسماندہ اور مفلوک الحال عوام کے حقوق غصب کرنے کے درپے تھے۔

جناح کی مشرقی بنگال کو روانگی سے چند روز قبل لاہور کے روزنامہ امروز نے صوبائی تعصّبات کی پرزور مذمت کرنے کے بعد یہ لکھا تھا کہ ''جن اسباب کی بنا پر افتراق ومنافرت کی یہ لہریں اٹھی ہیں اگر فوراً ان اسباب کو دور نہ کیا گیا تو پاکستان کی موجودہ وحدت کا شیرازہ ہی کہیں بکھر نہ جائے اور اس طرح ہمارے مخالفوں کو موقع مل جائے کہ وہ ہماری اس نوزائیدہ مملکت کو مستحکم ہونے سے قبل ہی ختم کردیں......ان صوبوں کا سب سے پہلا مطالبہ تو یہ ہے کہ انہیں لسانی اور انتظامی لحاظ سے ایک مستقل وحدت مانا جائے اور مرکز کی طرف سے ان کے اندرونی معاملات میں اتنی مداخلت نہ ہو کہ ان کی صوبائی آزادی بے اثر ہوکر رہ جائے اور ان کا دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ نظم ونسق اور حکومت اس بات کا خیال رکھے کہ صوبوں کے جو اصلی باشندے ہیں ان کے حقوق ضائع نہ ہوں اور دوسرے صوبوں کے لوگ وہاں اتنی مراعات حاصل نہ کرسکیں کہ اصلی باشندے اپنے جائز حقوق سے ہی محروم ہوجائیں۔ ہمارے خیال میں اگر پاکستان کے مختلف صوبوں کے یہ دو مطالبات مان لئے جائیں تو ان کی وجہ سے صوبائی تعصّبات کی یہ رو جو اس وقت کراچی، ڈھاکہ اور پشاور سے اٹھ رہی ہے، کسی حد تک رک جائے گی اور پاکستان کی وحدت اسی طرح بنی رہے گی جیسا کہ اسے بنی رہنا چاہیے اور ہماری ترقی کے راستے میں صوبائی تعصّبات کی جو رکاوٹیں پیدا ہورہی ہیں وہ ختم ہوجائیں گی۔''[61] مگر امروز کی یہ تجویز اس لئے صدا بصحرا ثابت ہوئی کہ یہ اخبار افتخار الدین کی ملکیت تھا جس پر پنجاب کے مفاد پرست جاگیرداروں اور مُلّاؤں کی جانب سے کمیونزم کا اسلامی ٹھپہ لگا دیا گیا تھا اور جو اس بنا پر گردن زدنی قرار پایا تھا۔ چند دن بعد ان

مذہب فروشوں کے اس رویے پر امروز کا تبصرہ یہ تھا کہ ''اسلام کے دشمن وہ نہیں جو اپنے غریب بھائیوں کے دکھوں کا مداوا چاہتے ہیں بلکہ وہ ہیں جو اسلام کے نام پر اپنی جائیدادوں اور اپنے خزانوں کو بدستور قبضے میں رکھنے پر مصر ہیں اور انہیں اس کی مطلق پرواہ نہیں کہ ان کے لاکھوں بھائی فقر و فاقہ کا شکار ہو رہے ہیں اور موت ان کے دروازے کو کھٹکھٹا رہی ہے...... یہ انسان کی فطری کمزوری ہے کہ جب اس کی اغراض پر زد پڑتی ہے تو وہ بلبلا اٹھتا ہے اور اپنے خصوصی مفاد کی مدافعت کرنے کے لئے جان کی بازی لگا دیتا ہے لیکن اس سلسلہ میں ہم اپنے ہاں کے ان زوردار طبقوں سے یہ درخواست ضرور کریں گے کہ وہ براہ کرم اس میں خدا اور رسول ﷺ کا نام نہ لائیں اور اپنی ناجائز منفعتوں کے لئے اسلام کے مقدس نام کو بدنام نہ کریں۔''[62]

باب:3

قائداعظم کی گرتی ہوئی صحت اور مُلاّؤں کی بڑھتی ہوئی یلغار

پاکستان میں اسلامی نظام کے نام پر جماعت احمدیہ نے اپنے عقائد کی زوروشور سے تبلیغ شروع کی تو مولویوں کو ان کے مدمقابل اپنی مذہبی سیاست چمکانے کا مزید موقع ملا

قائداعظم جناح کی زندگی ہی میں پنجاب کے مفاد پرست جاگیرداروں اور قدامت پرست مُلاّؤں کے علاوہ جن عناصر نے کٹھ مُلاّئیت اور مذہبی عصبیت کو فروغ دیا ان میں ضلع امرتسر کے قصبہ قادیان کے مرزا غلام احمد کا فرقہ احمدیہ بھی شامل تھا۔ چونکہ قیام پاکستان سے پہلے اس فرقہ کو بوجوہ انگریزوں کی سرپرستی حاصل تھی اس لئے اس کے ارکان کو صوبہ کی سیاسی و معاشی زندگی میں ممتاز حیثیت حاصل ہوئی تھی اور اس بنا پر ان کے اور روایت پسند و پسماندہ مسلم عوام کے درمیان تضادات کے وقتاً فوقتاً مظاہرے ہوتے رہتے تھے۔ بیسویں صدی کے چوتھے عشرے سے وسطی پنجاب اس فرقے اور مجلس احرار اسلام کے درمیان زبردست سیاسی و مذہبی محاذ آرائی کا میدان بنا رہا تھا۔ پانچویں عشرے میں جب تحریک پاکستان شروع ہوئی تو اس فرقہ وارانہ تضاد نے ثانوی حیثیت اختیار کر لی تھی کیونکہ مطالبہ پاکستان، مسئلہ ختم نبوت پر حاوی ہو گیا تھا مگر قیام پاکستان کے بعد جب اس فرقہ کا ایک سرکردہ رکن سر ظفر اللہ خان پہلے اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کا قائد اور پھر پاکستان کا وزیر خارجہ مقرر ہوا تو ایک طرف تو اس فرقہ کے کوتاہ اندیش قائدین نے

اپنے مذہبی عقائد کی پھر زور شور سے تبلیغ شروع کر دی اور دوسری طرف روایت پسند مُلّاؤں نے اتنے ہی زور شور سے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ 1948ء کے اوائل میں اس مذہبی تنازعہ کو خاصی ہوا ملی جبکہ قائداعظم جناح، وزیراعظم لیاقت علی خان، وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر اور وزیر داخلہ فضل الرحمان نے مذہب کو سیاست میں ملوث کر کے دونوں فرقوں کے مُلّاؤں کو فی سبیل اللہ فساد کرنے کا موقع مہیا کر دیا۔

فرقہ احمدیہ کے پیشواؤں نے اس موقع پر اس امر کا احساس نہ کیا کہ اگر پاکستان میں یہ تنازعہ جاری رہا تو بالآخر اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ انہوں نے 25/مارچ 1948ء کے نوائے وقت میں ایک بہت بڑا اشتہار چھپوایا جس میں اعلان کیا گیا تھا کہ ''احمدیہ اشاعت اسلام کا سالانہ سہ روزہ اجلاس 26/مارچ کو شروع ہوگا جس میں حسب ذیل موضوعات پر تقریریں ہوں گی۔ ارشادات مسیح موعود، حضرت مسیح موعود اور جہاد، حکومت اسلامی کا تصور، افغان اور کشمیری بنی اسرائیل ہیں، حضرت مسیح موعود اور امت محمدیہ ﷺ، اللہ تعالیٰ کی ہستی کا عملی ثبوت، پاکستان ہم سے کیا چاہتا ہے، جنت کے دو مزے، موت کی حقیقت اور اس کا ہماری زندگی پر اثر، اللہ کے دین پر کوئی غالب نہیں آئے گا اور اللہ کا دین سب پر غالب آئے گا۔ حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی قبریں کہاں ہیں۔ نظام زندگی اور قرآن کریم، اسلام اور کمیونزم اور جماعتی زندگی کی برکات۔'' اگرچہ یہ اشتہار جماعت احمدیہ کے لاہوری فرقہ کی طرف سے دیا گیا تھا تاہم یہ روایت پسند مُلّاؤں کے لئے بہت اشتعال انگیز تھا کیونکہ اس میں مرزا غلام احمد کو مسیح موعود قرار دے کر اس کے متنازعہ فیہ نظریات کی کھلم کھلا تبلیغ کا اعلان کیا گیا تھا۔ ان دنوں جماعت احمدیہ کا پیشوا مرزا بشیر الدین محمود تھا جسے وزیر خارجہ ظفر اللہ خان سمیت اس کے مقلدین خلیفۃ المسیح کہتے تھے۔

چونکہ اس جماعت کے ممتاز ترین رکن سر ظفر اللہ خاں نے اکتوبر 1947ء میں اقوام متحدہ میں مسئلہ فلسطین پر بحث کے دوران پاکستانی وفد کے قائد کی حیثیت سے عربوں کے موقف کی پرزور حمایت کی تھی اس لئے مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک اور پاکستان کے عامۃ الناس میں فرقہ احمدیہ کے لئے قدرے خیر سگالی کے جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ ظفر اللہ خان دسمبر 1947ء میں اقوام متحدہ سے واپس آیا تو اس نے محسوس کیا کہ پاکستان کی فضا اس کے لئے اور اس کی جماعت کے لئے خاصی خوشگوار ہے۔ قائداعظم جناح اسے وزیر خارجہ مقرر کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے اور وہ

جہاں جاتا تھا دانشور اس کا خیر مقدم کرتے تھے۔ 12 ر دسمبر کو اس نے کراچی کے سندھ مدرستہ الاسلام میں طلبا اور طالبات کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے محض مذہب کے حوالے سے پاکستان کے قیام کا جواز پیش کیا۔ اس نے کہا کہ ''ہم نے پاکستان اس لئے حاصل کیا ہے کہ اس سرزمین میں ایسی ثقافت قائم کرنا چاہتے ہیں جس کی اعلیٰ اقدار بنی نوع انسان کا اعلیٰ سطح پر تحفظ کریں گی...... ہماری ان اقدار کی بنیاد قرآن پاک پر ہونی چاہیے۔ قرآن پاک کی حیثیت شمع ہدایت کی ہے۔ یہ ایک ضابطہ ہے جس پر عمل ضروری ہے۔ قرآن پاک کے مطالعے سے ثقافت کی بنیاد ان اقدار پر رکھی جاسکتی ہے جن کا اس سے سبق ملتا ہے...... قرآن پاک میں الہامی تعلیمات آج بھی اتنی ہی تر و تازہ ہیں جتنی کہ اس وقت تھیں جب اللہ کی کتاب وارد ہوئی تھی۔ اس کا تمہاری زندگیوں پر اطلاق ہوتا ہے۔''[1]

ظفر اللہ خان کی اس تقریر میں مذہبی نقطہ نگاہ سے کوئی قابل اعتراض بات نہیں تھی لیکن سیاسی نقطہ نگاہ سے اس کی یہ تقریر اس کے لئے اور اس کی جماعت کے لئے خطرات پیدا کر سکتی تھی۔ اس نے قرآنی تعلیمات کو پاکستان کے قیام کی بنیاد بنایا تھا اور ان ہی قرآنی تعلیمات کے مطابق مولانا شبیر احمد عثمانی، ابوالاعلیٰ مودودی، عطا اللہ شاہ بخاری اور دوسرے بہت سے علما اس کو اور اس کی جماعت کے سارے ارکان کو مرتد اور واجب القتل قرار دے چکے تھے۔ ظفر اللہ خان اپنی غیر معمولی وکیلانہ قابلیت کے باوجود انتہا درجہ کی توہم پرستی اور مذہبی عصبیت سے مغلوب رہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ 1933ء کے بعد بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوا تھا اور یہ سارے عہدے اسے ''خلیفۃ المسیح'' کی نظر عنایت سے ہی ملے تھے۔ اس کے اپنے بیان کے مطابق اس کی زندگی میں شاید ہی کوئی ایسا واقعہ ہوا تھا جس کی پہلے سے خلیفۃ المسیح نے پیش گوئی نہیں کی تھی۔ وہ مرزا غلام احمد کو نبی یا مسیح موعود مانتا تھا۔ جبکہ دوسرے سارے علما کا قرآن پاک کے حوالے سے عقیدہ یہ تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے آخری نبی تھے اور ان کے بعد کسی اور نبی کے آنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ مرزا غلام احمد کو مسیح موعود بھی نہیں مانتے تھے کیونکہ ان کے عقیدہ کے مطابق اس میں وہ علامتیں نہیں تھیں جو کہ مسیح موعود میں ہونی چاہئیں۔

ظفر اللہ خان اور اس کی احمدیہ جماعت کی سب سے بڑی مخالف تنظیم مجلس احرار اسلام تھی۔ اس تنظیم نے مذہب کے نام پر تحریک پاکستان کی زبردست مخالفت کی تھی۔ اس لئے جب

پاکستان قائم ہو گیا تو اس کے قائدین نے دو تین ماہ تک گوشہ نشینی اختیار کیئے رکھی تھی۔ نومبر اور دسمبر 1947ء میں اس تنظیم کی مجلس عاملہ کے اجلاس ہوئے تھے۔ مگر ان میں آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ البتہ دسمبر میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ مئی 1948ء میں مجلس احرار کی کل پاکستان کانفرنس منعقد کی جائے گی۔ ظفر اللہ خان نے اپنی 12 ر دسمبر کی تقریر میں مذہب کو تحریک پاکستان کے ساتھ وابستہ کر کے دشمنان پاکستان کی اس مجلس کو میدان عمل میں آنے کا موقع مہیا کر دیا تھا۔ 14 ر دسمبر کو اس جماعت کے ''خلیفۃ المسیح'' مرزا بشیر الدین محمود نے لاہور کے لا کالج میں اسی قسم کی تقریر کر کے احراری مُلّاؤں کی مزید حوصلہ افزائی کی۔ ''اسلام کے مستقبل'' کے موضوع پر اس کی اس دو گھنٹے کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ''سکولوں میں قرآن مجید کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ پاکستان میں کوئی ایک مسلمان بھی ایسا نہیں ہونا چاہیے جو قرآن مجید کے معنی سے نا آشنا ہو۔ قرآن مسلم قوم کی جسمانی اور روحانی زندگی کی اساس ہے۔''[2] گویا مرزا بشیر الدین محمود نے مسلمانوں کو مذہب کی بنیاد پر ایک قوم قرار دے کر خود ہی اپنے آپ کو اور اپنے فرقہ کو غیر مسلم ذمیوں کی صف میں شامل کر لیا تھا۔ جب اس نے یہ تقریر کی تھی تو اسے یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ احراری، دیوبندی، بریلوی اور دوسرے فرقوں کے علما اسے اور اس کے فرقہ کو مسلمان تصور ہی نہیں کرتے تھے۔ غالباً چند دن کے بعد اسے یہ احساس ہوا تو اس نے اپنی اس غلطی کا ازالہ کرنے کے لئے ایک انٹرویو میں اس تجویز کی حمایت کی کہ ''مسلم لیگ کی رکنیت کے دروازے غیر مسلموں کے لئے بھی کھلے رکھنے چاہئیں کیونکہ اس طرح ہندوستان کے ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں کے تحفظ کی ضمانت ملے گی۔ اگر ہم پاکستان میں غیر مسلموں کو گلے لگائیں گے تو ہندوستان کے غیر مسلم بھی مسلمانوں کے بارے میں اپنا معاندانہ رویہ ترک کر دیں گے۔'' اس کی رائے یہ تھی کہ پاکستان کی قومی جماعت میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی اور یہ اکثریت اس جماعت کے فیصلوں پر اثر انداز ہو گی۔ قومی جماعت کے اندر مسلم اکثریت کا نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ پاکستان میں اسلامی ریاست قائم ہو۔ اس نے تھیوکریٹک ریاستوں کے احیا کے خلاف دنیا کی رائے عامہ کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''اگرچہ مسلمانوں کو اسلام کے بنیادی احکامات سے کسی صورت انحراف نہیں کرنا چاہیے تاہم مجوزہ نئی قومی جماعت کے اغراض و مقاصد کی ٹیکنیکل سیاسی اصطلاحات کے ذریعے تشریح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہو گا۔ اسلام کے بنیادی احکامات کو بڑی آسانی سے

مقبول عام، معاشرتی، جمہوری اور بین الاقوامی اصولوں کی شکل میں ڈھالا جا سکتا ہے۔"[3] مرزا بشیر الدین محمود کے اس انٹرویو کا مطلب یہ تھا کہ وہ ایک مذہبی فرقہ کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے پاکستان میں مذہب کی بالا دستی چاہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی چونکہ اسے ان مولویوں سے ڈر لگتا تھا جو اس کے فرقہ کو مرتد اور واجب القتل قرار دیتے تھے اس لئے وہ سیکولر سیاست کا بھی خواہاں تھا۔ وہ بیک وقت دینداری اور لادینیت کی دو کشتیوں میں سوار تھا اس لئے اس کا اور اس کے فرقے کا پیشہ ور مُلّاؤں کا مذہبی عصبیت کے سمندر میں غرق ہونا لازمی تھا۔

فرقہ احمدیہ کے سربراہوں کی اس دوغلی پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب 25/مارچ 1948ء کو لاہور کی انجمن احمدیہ کا متذکرہ اشتہار شائع ہوا تو اس کے اگلے دن روزنامہ امروز میں ایک شخص بشیر احمد کا یہ خط شائع ہوا کہ "مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے مسلمانوں کے دلوں میں سچا اسلامی جذبہ پیدا کرنے کے لئے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ اس وقت جبکہ مغربی پاکستان میں بے شمار نئے رسائل و جرائد کا اجرا ہو چکا ہے، مسلمانوں کے لئے یہ اطلاع بہت تشویش اور حیرت کا موجب ہو رہی ہے کہ مولانا مودودی کے مفید رسالے "ترجمان القرآن" کا ڈیکلیریشن حکومت نے تاحال منظور نہیں کیا۔"[4] اس خط کا مطلب یہ تھا کہ ابوالاعلیٰ مودودی اپنے ماہنامے کے ذریعہ احمدیہ فرقہ اور مسلمانوں کے دوسرے فرقوں کے خلاف پھر سے بحث مباحثہ کرنے کا متمنی تھا۔ اس نے ان دنوں مذہبی نقطہ نگاہ سے اپنے سیاسی نظریات کی توضیح کے لئے مغربی پاکستان کے مختلف علاقوں کا دورہ شروع کر دیا تھا۔

پنجاب میں نواب ممدوٹ نے اپنی حکومت بچانے کے لئے اسلام کا استعمال کیا اور ایک اسلامی اکیڈمی کے لئے مُلّاؤں کی پلاننگ کمیٹی مقرر کر دی

ادھر بریلوی فرقہ کا مولوی عبدالستار نیازی جگہ جگہ یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ پاکستان میں قرآنی قوانین بلا تاخیر نافذ کئے جائیں۔ یہ مولوی 1946ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کا رکن منتخب ہوا تھا اور اب کراچی میں 1948ء کے اوائل میں قائم شدہ عبدالحامد بدایونی کی جمعیت العلمائے پاکستان سے وابستہ تھا۔ اس کی مذہبی سیاست کا نعرہ یہ تھا کہ لاہور میں سالانہ ایک لاکھ روپے خرچ سے ایک اسلامی کالج قائم کیا جائے۔ صوبہ کی ساری عدالتوں کے چھوٹے

بڑے ججوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ فقہ و شریعت کا مطالعہ کریں اور مذہبی سند حاصل کریں۔''[5] اس کی ایک اور تجویز یہ تھی کہ مغربی پنجاب میں آئمہ، محدثین، فقیہان اور مفتیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک اسلامی اکیڈمی قائم کی جائے۔ 31/مارچ کو حکومت مغربی پنجاب نے اس کی یہ تجویز اصولی طور پر منظور کر لی اور بتایا کہ وزیر اعلیٰ نواب ممدوٹ نے ڈائریکٹر محکمہ تعمیر اسلامی کو ہدایت کی ہے کہ وہ مقتدر عالموں اور ماہرین تعلیم کی ایک ایسی نمائندہ کمیٹی کا اجلاس طلب کرے جو ایک نئے دارالعلوم (اسلامی اکیڈمی) کی مفصل اور واضح سکیم تیار کرے۔ اس پلاننگ کمیٹی کا صدر مولانا شبیر احمد عثمانی ہوگا، ڈائریکٹر محکمہ تعمیر اسلامی اس کا کنوینر ہوگا اور یہ مندرجہ ذیل ارکان پر مشتمل ہوگی۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالعزیز المینی (مسلم یونیورسٹی) شمس العلما ڈاکٹر یو۔ ایم۔ داؤد پوتا ڈائریکٹر محکمہ تعلیم سندھ، ایم۔ اے۔ خٹک ڈائریکٹر محکمہ تعلیم سرحد، سید ابوالاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر حمید اللہ عثمانیہ یونیورسٹی، مولانا سید ابن حسن جارچوی لکھنؤ، مولانا ظفر احمد تھانوی ڈھاکہ، ڈاکٹر بی۔ اے۔ قریشی اورینٹل کالج لاہور، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا غلام رسول مہر، مولانا محمد علی ایم۔ اے (کینٹب) قصور، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ گورنمنٹ کالج لاہور، محمد ظفر احمد انصاری کراچی، مولانا محمد یوسف میر واعظ کشمیر، ڈاکٹر زبید احمد الٰہ آباد یونیورسٹی، پروفیسر محمد شفیع لاہور''[6] یکم اپریل کو یہ تجویز صوبائی اسمبلی میں پیش ہوئی تو اسے متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔

صوبائی اسمبلی میں اس تجویز کی منظوری کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ قائداعظم جناح نے اپنے دورہ مشرقی بنگال کے دوران اسلام اور مسلم قومیت کا جو چرچا کیا تھا اس سے پنجاب کے جاگیرداروں اور ان کے وظیفہ خوار مُلّاؤں کو اپنے رجعتی نظریات کے نفاذ کی کھلی چھٹی مل گئی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ان دنوں صوبائی حکومت کے وزیر اعلیٰ نواب ممدوٹ کے دھڑے اور وزیر خزانہ ممتاز دولتانہ کے دھڑے کے درمیان اقتدار کی زبردست کشمکش شروع ہو گئی تھی اور نواب ممدوٹ اس کشمکش میں دولتانہ کے دھڑے کو شکست دینے کے لئے مُلّاؤں کی حمایت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چونکہ ممتاز دولتانہ نے بیسویں صدی کے چوتھے عشرے کے عالمی معاشی بحران کے دوران لندن میں تعلیم حاصل کی تھی اس لئے وہ بعض اوقات اپنی سیاسی باتیں سوشلسٹ اصطلاحات میں کرتا تھا اور اس بنا پر دقیانوسی جاگیرداروں اور مُلّاؤں کی جانب سے اس پر کمیونسٹ کا الزام عائد کیا جاتا تھا اور تیسری وجہ یہ تھی کہ افتخار الدین نے قائداعظم جناح کی 26/مارچ کی چٹاگانگ کی تقریر کا حوالہ

دے کر اسلامی سوشلزم کا خطرناک پروپیگنڈا شروع کر دیا تھا۔

امروز کا مُلّاؤں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ پر احتجاج ......مُلّاؤں کا نفاذ اسلام کے لئے اور لیاقت کا کمیونسٹوں کے خلاف دھمکی آمیز بیان

افتخار الدین کے اخبار امروز کا کہنا یہ تھا کہ ''ابھی وقت نہیں آیا کہ جمہور کا معیار زندگی بلند کرنے کے لئے ہم سرمایہ داری، جاگیرداری اور کارخانہ داری کے غیر اسلامی نظام کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔ اگر ہم نے مسلمانوں کو مطمئن نہ کیا اور انہیں احساس نہ دلایا کہ اب فی الواقع حکومت انہی کی ہے اور وہ بھی اپنے خوشحال بھائیوں کی طرح زندگی کے آرام واطمینان کے حصہ دار ہیں تو ہم اپنی حکومت کی بنیادیں کس طرح مضبوط کریں گے اور کس کی مدد سے اور کیونکر ان اندرونی اور بیرونی خطرات کا مقابلہ کر سکیں گے جن سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہمارے دشمن بیتاب ہیں۔ ہم میاں افتخار الدین کے اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کے غیر اسلامی مفاد کی حفاظت کا خیال چھوڑ کر ان کی املاک اور آمدنی کا بیشتر حصہ ضرورت مند مہاجرین اور عامتہ الناس میں تقسیم کرنے کی طرف متوجہ ہوں۔ زمین خدا کی ملکیت ہے، ہر مسلمان کو صرف جائز حد تک اس سے مستفید ہونے کا حق حاصل ہے۔ بڑی بڑی جاگیریں اور زمینداریاں اسلام سے اور اسلامی نظام حیات سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ موجودہ نظام سراسر غیر اسلامی ہے۔ لازم ہے کہ ہم صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دیں تاکہ تقسیم دولت کا اسلامی نظام جو تمام مسلمانوں کی اقتصادی مساوات کے اصول پر مبنی ہے، جلد سے جلد بروئے کار آسکے تا آنکہ غریب مسلمانوں اور غریب الوطن مہاجروں کو اس بات کا احساس ہونے لگے کہ ہم نے اپنا سب کچھ کھو کر بھی بہت کچھ پالیا ہے۔''[7]

چونکہ افتخار الدین اور اس کے اخبار کا نجی جائیداد کے متعلق نظریہ شبیر احمد عثمانی، ابوالاعلیٰ مودودی اور بعض دوسرے مُلّاؤں کے نظریے کے سراسر خلاف تھا، اس لئے جب اسمبلی میں اسلامی اکیڈمی کی تجویز اصولی طور پر منظور کر لی گئی تو اس پر امروز کا تبصرہ یہ تھا کہ ''جب تک اس بات کی وضاحت نہ کر دی جائے کہ اس سے حکومت کا تعلق کس حد تک ہوگا اور اس کی زمام انتظام کن لوگوں کے ہاتھ میں رہے گی، یہ کہنا مشکل ہے کہ اس اکیڈمی سے مسلمانوں کو کس قدر فائدہ

پہنچے گا......اگر اس اکیڈمی پر حکومت کا تسلط رہا تو بہت ممکن ہے کہ بعض ارکان حکومت اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کریں اور اسلام کے نام پر بعض غیر اسلامی مسائل کو ہمارے دماغوں میں ٹھونسنے کی کوشش کی جائے۔ یہ اسلامی اکیڈمی تو اسی طرح صحیح معنوں میں اسلامی بن سکتی ہے کہ حکومت کا اس سے کوئی سروکار نہ ہو۔ گرانٹ کے بارے میں کوئی شرط نہ لگائی جائے اور اس کا انتظام اہل علم کی ایک جماعت کے سپرد کر کے انہیں اس بات کی آزادی دے دی جائے کہ وہ جس نہج پر چاہیں اس جامعہ کی بنیاد ڈالیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جامعہ کے دستور العمل اور اس کے نصاب کی ترتیب کے معاملے میں دوسرے اسلامی ممالک خصوصاً علمائے مصر کے مشوروں سے بھی پوری طرح فائدہ اٹھایا جائے۔"[8] لیکن امروز کی اس تجویز پر عمل درآمد کی کوئی گنجائش نہیں تھی کیونکہ اس وقت ملک کے اندر ایسی قوتیں روز بروز زور پکڑ رہی تھیں جو مذہب کی آڑ لے کر جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے مفادات کا تحفظ کرنا چاہتی تھیں۔

جس دن امروز کا یہ تبصرہ شائع ہوا اسی دن راولپنڈی میں مدرسہ تعلیم القرآن کے زیر اہتمام جمعیت استحکام پاکستان کی سہ روزہ کانفرنس ختم ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں مولانا نصیر الدین غور غشی، مولانا احمد علی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عنایت اللہ شاہ اور دوسرے علما نے اپنی تقریروں میں یہ واضح کیا کہ مملکت خداداد پاکستان کا استحکام، مذہب اسلام اور قانون قرآن ہی سے ہوسکتا ہے۔ اس کانفرنس کے آخر میں متفقہ طور پر یہ تجویز منظور ہوئی کہ حکومت پاکستان کا مذہب اسلام ہوگا اور اس میں قرآن حکیم ہی کا قانون نافذ ہوگا۔ کانفرنس کے ایک خصوصی اجلاس میں سرحد اور پنجاب کے 29 علما نے اس امر کا تحریری عہد کیا کہ "جب تک جمعیت استحکام پاکستان کے ہر دو مقاصد، کہ پاکستان کا مذہب اسلام اور قانون قرآن ہوگا، پایہ تکمیل کو نہ پہنچیں گے۔ ہم اپنی سعی و کوشش جاری رکھیں گے۔"[9]

علما کی اس کانفرنس کے اگلے دن وزیر اعظم لیاقت علی خان نے راولپنڈی کے ایک جلسہ عام میں یقین دلایا کہ پاکستان کا آئین قرآن کریم اور شریعت کی بنیادوں پر بنایا جائے گا۔ اس نے رائے عامہ کے بعض عناصر کو متوجہ کیا کہ "حکومت پاکستان ہماری نوزائیدہ مملکت کی بیخ کنی کرنے والی سرگرمیوں کو ہرگز برداشت نہیں کرے گی۔" اس نے کہا کہ "ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد ہو چکی ہے لیکن نظریاتی اختلافات کے باوجود پاکستان میں

کمیونسٹوں کی سرگرمیوں کا سختی سے نوٹس نہیں لیا گیا۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ حکومت کی اس نرمی سے فائدہ اٹھا کر پاکستان میں کمیونسٹ عناصر اپنی ملک دشمن سرگرمیاں بڑھا رہے ہیں اور حکومت کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ اس معاملے کا سختی سے نوٹس لے۔''[10] لیاقت علی خان کی اس تقریر کا ایک دوسرا پس منظر تو یہ تھا کہ قائداعظم جناح نے اپنے دورہ مشرقی بنگال میں اسلام اور مسلم قومیت کا ذکر کر کے اور کمیونسٹوں کے خلاف انتشار انگیز سرگرمیوں کا الزام عائد کر کے سرکاری پروپیگنڈا کے لئے لائن کا تعین کر دیا تھا۔ دوسرا پس منظر یہ تھا کہ سندھ، پنجاب اور مشرقی بنگال میں بے زمین کسانوں کی تحریکیں شروع ہونے کے آثار نظر آنے لگے تھے اور تیسرا پس منظر یہ تھا کہ مارچ 1948ء میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے مسئلہ کشمیر کے بارے میں جو قرارداد منظور کی تھی وہ پاکستان کے حق میں نہیں تھی اور اس بنا پر حکومت پاکستان وزیر خارجہ ظفر اللہ خان کی اس تجویز پر غور کر رہی تھی کہ جموں و کشمیر کا جو علاقہ اس وقت ہندوستان کی تحویل میں نہیں ہے اس کے دفاع کے لئے پاکستان کی باقاعدہ فوجیں استعمال کی جائیں۔ مزید برآں کراچی کی سندھ سے علیحدگی کے فیصلے کے بعد صوبہ سندھ میں وزیر اعلیٰ ایوب کھوڑو کی زیر قیادت سندھیوں کے حقوق کی تحریک شروع ہو چکی تھی جسے دبانے کے لئے نہ صرف اسلامی نعرہ ضروری تھا بلکہ یہ نعرہ بھی ضروری تھا کہ کمیونسٹ عناصر مغربی پاکستان میں انتشار پھیلا رہے ہیں۔

مودودی کا پردہ کے بارے میں موقف اور مولویوں کی پردہ مہم کے خلاف بے پردہ عورتوں کا احتجاج

جب لیاقت علی خان اور دوسرے ارباب اقتدار اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اس قسم کے نعرے لگاتے تھے تو انہیں مشکل یہ پیش آتی تھی کہ ان کے ان نعروں سے زیادہ فائدہ ان مُلّاؤں کو پہنچتا تھا جو پاکستان کے معاشرے کو قرون وسطیٰ کے خلافتی عہد میں واپس لے جانا چاہتے تھے اور جدیدیت کی ہر علامت کو کفر قرار دے کر اسے جہنم واصل کرتے تھے۔ ان مُلّاؤں کی جانب سے نہ صرف جمہوری نظام حکومت کی مخالفت کی جاتی تھی اور نہ صرف غیر مسلموں سے جزیہ وصول کرنے پر اصرار کیا جاتا تھا بلکہ پاکستان میں مسلمان عورتوں کی بے پردگی کی بھی زور شور سے مذمت کی جاتی تھی۔ ابوالاعلیٰ مودودی کا کہنا یہ تھا کہ ''جو لوگ ایک طرف مغربی تمدن کی پیروی کرنا

چاہتے ہیں اور دوسری طرف اسلامی نظم معاشرت کے قوانین کو اپنے لئے سود مند بتاتے ہیں وہ کس قدر سخت فریب میں مبتلا ہیں یا دوسروں کو مبتلا کر رہے ہیں۔ اسلامی نظم معاشرت میں تو عورت کے لئے آزادی کی آخری حد یہ ہے کہ حسب ضرورت ہاتھ اور منہ کھول سکے اور اپنی حاجات کے لئے گھر سے باہر نکل سکے مگر یہ لوگ اپنی آخری حد کو اپنے سفر کا نقطہ آغاز بتاتے ہیں۔ جہاں پہنچ کر اسلام رک جاتا ہے وہاں سے چلنا شروع کرتے ہیں اور یہاں تک بڑھ جاتے ہیں کہ حیا اور شرم بالائے طاق رکھ دی جاتی ہے۔ ہاتھ اور منہ ہی نہیں بلکہ خوبصورت مانگ نکلے ہوئے سر اور شانوں تک کھلی ہوئی باہیں اور نیم عریاں سینے بھی نگاہوں کے سامنے پیش کر دیئے جاتے ہیں اور جسم کے باقی ماندہ محاسن کو بھی ایسے باریک کپڑوں میں ملفوف کیا جاتا ہے کہ وہ چیز ان میں سے نظر آ سکے جو مردوں کی شہوانی پیاس کو تسکین دے سکتی ہے...... عورتوں کو خانہ داری کے ماسوا دوسرے امور میں حصہ لینے کی جو مقید اور مشروط آزادی اسلام میں دی گئی تھی اس کو حجت بنایا جاتا ہے، اس غرض کے لئے کہ مسلمان عورتیں بھی فرنگی عورتوں کی طرح گھر کی زندگی اور اس کی ذمہ داریوں کو طلاق دے کر سیاسی و معاشی اور عمرانی سرگرمیوں میں ماری ماری پھریں اور عمل کے ہر میدان میں مردوں کے ساتھ دوڑ دھوپ کریں...... ہمارے بعض نئے تعلیم یافتہ مسلمان بھائی کہتے ہیں کہ اسلام کے قوانین میں حالات زمانہ کے لحاظ سے ترمیم اور تخفیف کی تو کافی گنجائش ہے۔ پس ہماری خواہش صرف اس قدر ہے کہ اس گنجائش سے فائدہ اٹھایا جائے۔ موجودہ زمانے کے حالات پردہ میں تخفیف کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مسلمان عورتیں مدرسوں اور کالجوں میں جائیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں جس سے وہ ملک کے تمدنی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اس کے بغیر مسلمان زندگی کی دوڑ میں ہمسایہ قوموں سے پیچھے رہ جاتے ہیں اور آگے چل کر اندیشہ ہے کہ وہ زیادہ نقصان اٹھائیں گے...... یہ جتنے خطرات بیان کئے جاتے ہیں ہم ان سب کو جوں کا توں تسلیم کرتے ہیں بلکہ اگر خطرات کی فہرست میں اس سے دس گنا اور اضافہ ہو جائے تب بھی مضائقہ نہیں بہرحال اس نوعیت کے کسی خطرے کی بنا پر بھی اسلام کے قانون میں ترمیم یا تخفیف جائز نہیں ہو سکتی...... عورت کے معاشی استقلال نے اس کو مرد سے بے نیاز کر دیا ہے۔ وہ قدیم اصول کہ مرد کمائے اور عورت گھر کا انتظام کرے اب اس نئے قاعدہ سے بدل گیا ہے کہ عورت اور مرد دونوں کمائیں اور گھر کا انتظام بازار کے سپرد کر دیا جائے۔

اس انقلاب کے بعد دونوں کی زندگی میں بجز ایک شہوانی تعلق کے اور کوئی ربط ایسا باقی نہیں رہا جو ان کو ایک دوسرے سے ساتھ وابستہ ہونے پر مجبور کرتا ہو اور ظاہر ہے کہ محض شہوانی خواہشات کا پورا کرنا کوئی ایسا کام نہیں ہے جس کی خاطر مرد اور عورت لامحالہ اپنے آپ کو ایک دائمی تعلق ہی کی گرہ میں باندھنے میں اور گھر بنا کر مشترک زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔ جو عورت اپنی روٹی آپ کماتی ہے، اپنی تمام ضروریات کی خود کفیل ہے، اپنی زندگی میں دوسروں کی حفاظت اور اعانت کی محتاج نہیں ہے وہ آخر محض اپنی شہوانی خواہش کی تسکین کے لئے کیوں ایک مرد کی پابند ہو۔ کیوں اپنے اوپر بہت سی اخلاقی اور قانونی بندشیں عائد کرے۔ کیوں ایک خاندان کی ذمہ داریوں کا بار اٹھائے خصوصاً جبکہ اخلاقی مساوات کے تخیل نے اس کی راہ سے وہ تمام رکاوٹیں بھی دور کر دی ہوں جو اسے آزاد شہوت رانی کا طریقہ اختیار کرنے میں پیش آسکتی تھیں تو وہ اپنی خواہشات کی تسکین کے لئے آسان اور پرلطف اور خوشحالی کا راستہ چھوڑ کر قربانیوں اور ذمہ داریوں کے بوجھ سے لدا ہوا پرانا دقیانوسی راستہ کیوں اختیار کرے۔"[11]

مسلمان عورتوں کی بے پردگی اور معاشی و معاشرتی آزادی کی یہ مذمت صرف کتابوں، رسالوں اور مساجد تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ عبدالستار نیازی جیسے عناصر صوبائی اسمبلی میں بھی بے پردہ اور فیشن ایبل عورتوں پر بڑے رکیک حملے کرتے تھے۔ قائداعظم جناح کے دورۂ مشرقی بنگال کے بعد اسمبلی کے اندر اور باہر مُلّاؤں کے یہ حملے اتنے شدید ہو گئے کہ جدیدیت پسند عورتوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ چنانچہ 3 / اپریل کو لاہور میں بیگم لیاقت علی خان کی زیر صدارت ان عورتوں کا اجتماع ہوا جو مُلّاؤں کے تصور کے مطابق پردہ نہیں کرتی تھیں اور ملک کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی میں آزادی سے حصہ لیتی تھیں۔ اس اجتماع میں مفاد پرست عناصر کی طرف سے عورتوں کے خلاف منظم پروپیگنڈے کی مذمت کی گئی اور عورتوں کی انفرادی اور شہری آزادیوں کے تحفظ کے لئے متحدہ محاذ بنانے کا فیصلہ کیا گیا اور ایک قرارداد میں بیگم لیاقت علی خان اور مس فاطمہ جناح سے گزارش کی گئی کہ وہ عورتوں کے حقوق کا چارٹر مرتب کرنے کے لئے معروف خاتون کارکنوں کی ایک کانفرنس بلائیں اور حکومت مغربی پنجاب سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ صوبہ میں عورتوں کی شہری آزادیوں کا تحفظ کرے۔ تیسری قرارداد میں اس غیر پارلیمانی اور ہتک آمیز زبان کی سخت مذمت کی گئی جو اسمبلی میں عورتوں کے بارے میں استعمال کی گئی تھی۔ اس موقع

پر بیگم لیاقت علی خان نے اپنی تقریر میں بعض مفاد پرست حلقوں کی طرف سے جاری کردہ پردہ مہم کی زبردست مخالفت کی اور مطالبہ کیا کہ عورتوں کی نقل وحرکت کی آزادی کے حق کو تسلیم کیا جائے تاکہ وہ پاکستان کے استحکام کے کام میں حصہ لے سکیں۔ اس نے طنزاً کہا کہ "تحریک پاکستان کے دوران لوگ ہمیں کہتے تھے کہ باہر نکلو، مظاہرے کرو اور جیلوں میں جاؤ مگر اب جبکہ ہم اپنی مصیبت زدہ بہنوں کی خدمت کے لے باہر نکلی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ برقع میں واپس چلی جاؤ۔"[12]

پھر 15 ر اپریل کو بیگم لیاقت علی خان نے روزنامہ امروز کے نامہ نگار سے ایک انٹرویو میں مُلاّؤں کی اس تحریک کی پرزور مخالفت کی کہ عورتوں پر پردہ کو لازمی قرار دیا جائے۔ اس نے کہا کہ "مردوں کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ عورتوں کو زبردستی قید و بند میں دھکیل کر بالکل مفلوج کر دیں۔ ملک وقوم کی بہبودی کے لئے عورتوں کو بھی جدوجہد کی اتنی ہی آزادی ملنی چاہیے جتنی مردوں کو حاصل ہے اگر حکومت پردہ کو لازمی قرار دینے کے لئے کوئی قانون تیار کر دیتی ہے تو سب سے پہلی عورت میں ہوں گی جو اس غیر منصفانہ قانون کی خلاف ورزی کر کے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کروں گی اور اس قسم کے تمام قوانین کو توڑ کے دم لوں گی۔"[13]

لیکن جب بیگم لیاقت علی خان نے یہ انٹرویو دیا تھا تو اسے احساس نہیں تھا کہ مُلاّ اسے بورژوا نقطہ نگاہ سے اسلام کی تعبیر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ ابوالاعلیٰ مودودی کے نزدیک کسی قیمت پر بھی اسلام کے قانون میں ترمیم یا تخفیف جائز نہیں تھی۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد عورتوں کی بے پردگی کے خلاف مُلاّؤں کی اس مہم نے بیگم لیاقت علی خان کے خلاف بڑی تلخ مہم کی صورت اختیار کر لی۔ سیالکوٹ کے ایک مُلاّ کا کہنا یہ تھا کہ جو مسلمان عورتیں پردہ نہیں کرتیں وہ سب طوائفیں ہیں۔ مُلاّؤں کی اس پروپیگنڈا مہم میں حاضرین کی کوئی کمی نہیں ہوتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مُلاّ اپنے وعظ میں بے پردہ مزدور اور کسان عورتوں کا کوئی ذکر نہیں کرتا تھا۔ وہ صرف اونچے طبقے کی فیشن ایبل عورتوں کی بے پردگی، بے حیائی، عریانی، فحاشی اور شہوت رانی کا کچھ اس طرح نقشہ کھینچتا تھا کہ جواں سال غریب حاضرین کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ کوئی شہوت انگیز فلم دیکھ رہے ہیں۔ مُلاّ اپنے خطبہ میں شہوانی محرکات، ہیجانی ماحول، عریاں تصویروں، ولولہ انگیز گیتوں، برانگیختہ کرنے والے ناچ، عشق ومحبت کے فلم، دل چھین لینے والے زندہ مناظر، صنف مقابل سے ہر وقت کی مڈبھیڑ، خوبصورت مانگ نکلے ہوئے سروں، شانوں تک کھلی ہوئی بانہوں، نیم عریاں

سینوں، ننگی رانوں اور بوس و کنار کا ضرور ذکر کرتا تھا۔ مُلاّ کے اس قسم کے شہوت انگیز خطبوں سے نہ صرف غریب عوام کی جنسی خواہش کی قدرے تکمیل ہو جاتی تھی بلکہ ان کی طبقاتی نفرت کی بھی کسی نہ کسی حد تک تسکین ہو جاتی تھی۔

مودودی مسلمان اکثریت کو مسلمان نہیں سمجھتا تھا، اس کے فوٹو گرافی، موسیقی، حور وغلمان، نا بالغ لڑکی سے شادی، لونڈی و غلام اور دجال کے بارے میں خیالات

مذکورہ مُلاّؤں میں ایک مُلاّ ابوالاعلیٰ مودودی تھا جس کا قیام پاکستان سے پہلے موقف یہ تھا کہ برصغیر کے مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان ہی نہیں ہیں اس لئے ان کی کوئی تحریک اور کوئی جماعت اس کی ہمدردی کی مستحق نہیں تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ''یہ انبوہ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے 999 فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں، نہ ان کا اخلاقی نقطہ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آ رہا ہے اس لئے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر اسے قبول کیا ہے نہ باطل کو باطل مان کر اسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرت رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے میں چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابل داد ہے۔''[14] اس نے مزید لکھا کہ ''جو لوگ روح و اخلاق کے اعتبار سے مسلم نہ ہوں بلکہ محض اصطلاحی و نسلی حیثیت سے مسلمان ہوں، ان کو اگر بیرونی اثرات و اقتدار سے کامل آزادی نصیب بھی ہو جائے اور اگر ان کے جمہور کو خود اپنی پسند کے مطابق نظام حکومت قائم کرنے کا پورا اختیار بھی حاصل ہو تب بھی حکومت الٰہیہ وجود میں نہیں آ سکتی۔ وہ اپنے دنیوی مفاد کے پرستار ہوتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان میں حق اور صداقت کے لئے اپنے مفاد کو قربان کرنے کی طاقت نہیں ہوتی بلکہ اس کے برعکس جب کبھی ان کی اغراض دنیوی سے حق اور صداقت کا تصادم ہوتا ہے وہ حق کو چھوڑ کر ہمیشہ اس طرف جاتے ہیں جس طرف ان کی اغراض پوری ہوتی ہیں۔ جہاں ایسے لوگوں کی اکثریت ہو وہاں کبھی یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ عام انتخابات میں ان کے

ووٹوں سے وہ صالحین منتخب ہوں گے جو منہاج نبوت پر حکومت کرنے والے ہوں''[15] اس نے یہ بھی لکھا کہ ''بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک روز غیر اسلامی طرز ہی کا سہی مسلمانوں کا قومی سٹیٹ قائم ہو جائے، پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے اس کو اسلامی سٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن العمل سمجھتا ہوں اور یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔''[16] مزید یہ کہ ''وہ قومی حکومت'' جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوگا انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری اور بیباک ہوگی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے، ''مسلم قومی حکومت'' اس کی سزا پھانسی اور جلاوطنی کی صورت میں دے گی اور پھر اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمتہ اللہ علیہ ہی رہیں گے۔''[17]

لیکن اب اپریل 1948ء میں جبکہ کراچی اور پنجاب کے طول وعرض میں مُلّاؤں کا لاؤڈ سپیکر بول رہا تھا۔ اس شخص نے یکا یک قلابازی کھائی اور یہ اس موقف کا علمبردار بن گیا کہ پاکستان کی حکومت کے ذریعے معاشرے میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے اس شخص کا مطالبہ یہ تھا کہ ''(1) عوام الناس کی حاکمیت کی بجائے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو تسلیم کیا جائے۔ (2) یہ تسلیم کیا جائے کہ پاکستان کا دستور شریعت کی بنیاد پر بنایا جائے گا۔ (3) غیر اسلامی قوانین میں ترمیم کی جائے گی اور شریعت کے منافی کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا۔ (4) حکومت پاکستان شریعت کی حدود میں رہ کر اپنے اختیارات کا استعمال کرے گی۔ اس نے کہا کہ ہم ان مطالبات کے حق میں رائے عامہ کو منظم کریں گے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ معاشرے کو خالص اسلامی بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔''[18]

یہ شخص جو مسلمان معاشرے کے 999 فی ہزار افراد کو صحیح معنوں میں مسلمان ہی نہیں سمجھتا تھا، جو کہتا تھا کہ ان مسلمانوں کے اجتماع سے جو کام بھی ہوگا وہ اسلامی نہیں ہوگا اور جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے، بڑا ہی برخود غلط شخص تھا۔ اس کی علمیت مضحکہ خیز حد تک سطحی تھی۔ لیکن یہ اپنے صحافیانہ زور قلم سے مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کے نیم تعلیم یافتہ لوگوں کو متاثر کرتا تھا۔ مزید برآں برصغیر کے مسلمان نوابوں، تعلقہ داروں، جاگیرداروں اور زمینداروں میں بھی اس کا چرچا ہوتا تھا کیونکہ یہ ان کے مفادات کے تحفظ کے

لئے نظریاتی بنیاد مہیا کرتا تھا۔ وہ اس کے نظریات کی تشہیر کے لئے اسے فراخدلانہ مالی وسائل کے علاوہ دوسری بہت سی سہولتیں مہیا کرتے تھے۔ چنانچہ یہ پہلے خود اپنے آپ کو اور پھر چند حواریوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوا تھا کہ یہ اسلام کا ''مفکر اعظم'' ہے۔ اس کے فریب نفس کی انتہا یہ تھی کہ یہ اپنے آپ کو جلیل القدر حتیٰ کہ امام مہدی منوانے کا بھی خواب دیکھتا تھا۔ اسے عصر جدید کے تقاضوں کا کوئی شعور نہیں تھا۔ یہ مغرب کے صنعتی معاشرے کی ہر چیز کو محض اپنی انشا پردازی کے ذریعے باطل قرار دیتا تھا اور اس کے سیاسی و مذہبی نظریات ناقابل یقین حد تک وحشیانہ اور دقیانوسی تھے۔ مثلاً یہ کہتا تھا کہ ''جس علاقے میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظام اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانین اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجبات دینی کے احترام پر انہیں مجبور کیا جائے گا اور پھر جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔''[19] مزید یہ کہ ''اس نوعیت کی سٹیٹ ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کر سکتی، یہ ہمہ گیر اور کلی سٹیٹ ہے۔ اس کا دائرۂ عمل پوری انسانی زندگی پر محیط ہے۔ یہ تمدن کے ہر شعبے کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ اور اخلاقی پروگرام کے مطابق ڈھالنا چاہتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ سٹیٹ فاشسٹی اور اشترا کی حکومتوں سے ایک گونہ مماثلت رکھتی ہے۔''[20]

مودودی فوٹو گرافی کے پیشے کو اسلام کی رو سے حرام قرار دیتا تھا اور کہتا تھا کہ ''لیڈروں کی تصویریں اور جلسوں اور جلوسوں کی تصویریں کسی طرح بھی جائز اور حقیقی ضرورت کی تعریف میں نہیں آتیں۔ خصوصاً لیڈروں کی تصویریں تو بندگان خدا کو اس خطرہ سے بہت ہی قریب پہنچا دیتی ہیں جس کی وجہ سے تصویر کو حرام قرار دیا گیا ہے...... یہ سب بت پرستی کی جڑیں ہیں...... میں تو چھوٹے بچوں کی تصویریں لینے کو بھی اسی لئے حرام سمجھتا ہوں کہ معلوم نہیں ان بچوں میں آگے چل کر کس کو خدا بنا لیا جائے اور اس کی تصویر فتنہ کا موجب بن جائے۔''[21] وہ موسیقی کے آلات کو بنانے اور بیچنے اور بجانے کو بھی حرام قرار دیتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ''شادی بیاہ ہو یا کچھ اور باجے بجانا کسی حال میں درست نہیں...... جب کسی نکاح کی تقریب میں موسیقی شروع ہو تو نہایت نرمی اور

شرافت کے ساتھ یہ کہہ کر دوستوں اور عزیزوں سے رخصت چاہی جائے کہ جہاں تک تمہارے جائز کاموں کا تعلق ہے ہم تمہاری مسرت میں دل سے شریک ہیں اور جہاں تک ناجائز کاموں کا تعلق ہے، ہم ان میں نہ خود شریک ہونا پسند کرتے ہیں نہ یہ گوارا کرتے ہیں کہ تم ان خرابیوں میں مبتلا ہو۔''[22] مذہبی رواداری کے بارے میں اس کا رویہ اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کہتا تھا ''چونکہ ہندوستان میں گائے کو معبود اور مقدس سمجھا جاتا ہے اس لئے میں یہاں گائے کی قربانی کو واجب سمجھتا ہوں اور اس کے ساتھ میرے نزدیک کسی نو مسلم ہندو کا اسلام اس وقت تک معتبر نہیں ہے جب تک وہ کم از کم ایک مرتبہ گائے کا گوشت نہ کھائے۔''[23] مزید یہ کہ ''اصلی مسئلہ قربانی گاؤ کا نہیں ہے بلکہ عقیدۂ توحید کی حفاظت کا ہے۔''[24]

جنت میں حور و غلمان کے بارے میں اس شخص کے خیالات یہ تھے کہ ''میرا قیاس ہے کہ جنت میں جو حوریں ہوں گی وہ کفار کی نسل سے پیدا ہوئی ہوں گی اور کم سنی میں وفات پا گئی ہوں گی۔''[25] ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ ''بعید نہیں کہ وہ لڑکیاں ہوں جو دنیا میں سن رشد کو پہنچنے سے پہلے مر گئی ہوں اور جن کے والدین جنت میں جانے کے مستحق نہ ہوئے ہوں۔ یہ بات اس قیاس کی بنا پر کہی جا سکتی ہے کہ جس طرح ایسے لڑکے اہل جنت کی خدمت کے لئے مقرر کر دیئے جائیں گے اور ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے اسی طرح ایسی لڑکیاں بھی اہل جنت کے لئے حوریں بنا دی جائیں گی اور وہ ہمیشہ نوخیز لڑکیاں ہی رہیں گی۔ واللہ اعلم بالصواب۔''[26] مزید یہ کہ ''رہیں حوریں تو وہ اپنے کسی حسن عمل کے نتیجے میں خود اپنے استحقاق کی بنا پر جنتی نہیں بنیں گی بلکہ اللہ تعالیٰ جنت کی دوسری نعمتوں کی طرح انہیں بھی اہل جنت کے لئے ایک نعمت کے طور پر جوان اور حسین و جمیل عورتوں کی شکل دے کر جنتیوں کو عطا کر دے گا تا کہ وہ ان کی صحبت سے لطف اندوز ہوں۔ لیکن بہرحال یہ جن یا پری کی قسم کی مخلوق نہ ہو گی کیونکہ انسان کبھی صحبت ناجنس سے مانوس نہیں ہو سکتا اس لئے اغلب یہ ہے کہ وہ معصوم لڑکیاں ہوں گی جو نابالغی کی حالت میں فوت ہو گئیں اور ان کے والدین جنت کے مستحق نہ ہوئے کہ وہ ان کی ذریت کی حیثیت سے جنت میں ان کے ساتھ رکھی جائیں۔''[27] مزید لکھتا ہے ''اہل جنت کی بیویاں ان کے ساتھ حجروں میں رہیں گی اور ان کی سیر گاہوں میں جگہ جگہ خیمے لگے ہوں گے جن میں حوریں ان کے لئے لطف و عزت کا سامان فراہم کریں گی۔''[28]

بعض دوسرے معاملات کے بارے میں اس کے خیالات یہ تھے کہ ''نابالغ لڑکیوں

سے نہ صرف نکاح جائز ہے بلکہ شوہر کا ان کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔''[29] اگر زنا کا مجرم مریض ہو اور اس کے صحت یاب ہونے کی امید نہ ہو یا بہت بوڑھا ہو تو اسے سو کوڑے لگانے کے بجائے سو شاخوں والی ایک ٹہنی یا سو تیلیوں والی ایک جھاڑو لے کر صرف ایک دفعہ مار دینی چاہیے تا کہ قانون کا تقاضا پورا کر دیا جائے۔''[30] لونڈی اور غلام کے بارے میں اس کا کہنا یہ تھا کہ ''نظام شریعت میں جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے کی اجازت ہے۔غلاموں کی خرید وفروخت ہو سکتی ہے اور لونڈیوں سے جنسی تعلقات قائم کئے جا سکتے ہیں۔لونڈیوں سے تمتع کے لئے تعداد کی کوئی قید نہیں۔''[31] ''حقیقی مسیح کے نزول کی جگہ ہندوستان یا افریقہ یا امریکہ میں نہیں بلکہ دمشق میں ہوگی کیونکہ یہی مقام اس وقت عین محاذ جنگ پر ہوگا...... دجال 70 ہزار یہودیوں کا لشکر لے کر شام میں گھسے گا اور دمشق کے سامنے جا پہنچے گا۔ٹھیک اس نازک موقع پر دمشق کے مشرقی حصے میں ایک سفید مینار کے قریب حضرت عیسیٰ ابن مریم صبح دم نازل ہوں گے اور نماز فجر کے بعد مسلمانوں کو اس کے مقابلے کے لئے لے کر نکلیں گے۔ان کے حملے سے دجال پسپا ہو کر اسرائیل کی طرف پلٹے گا اور وہ اس کا تعاقب کریں گے۔آخر کار لد کے ہوائی اڈے پر پہنچ کر وہ ان کے ہاتھ سے مارا جائے گا۔اس کے بعد یہودی چن چن کر قتل کئے جائیں گے اور ملت یہود کا خاتمہ ہو جائے گا۔ عیسائیت بھی حضرت عیسیٰ کی طرف سے اظہار حقیقت کے بعد ختم ہو جائے گی اور تمام ملتیں ایک ہی ملت میں ضم ہو جائیں گی۔''[32]

قیام پاکستان کے مخالف مودودی اور احراری مولویوں کو اسلام کی آڑ میں جاگیرداروں و سرمایہ داروں کے تحفظ کے حوالے سے نئے ملک میں سیاسی فضا سازگار ملی

ظاہر ہے کہ جو شخص اس قسم کے سیاسی نظریات و مذہبی نظریات کا حامل تھا اس کی بلند نامی اس کے افکار یا نظریات کی بلندی کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ اس وجہ سے تھی کہ مسلمان نوابوں، تعلقہ داروں، جاگیرداروں اور زمینداروں کے علاوہ درمیانہ طبقہ کے بعض مفاد پرست عناصر نے اسے بلند بام پر بٹھایا ہوا تھا جو لوگ قیام پاکستان کے بعد متروکہ جائیدادوں کے ذریعے دولت مند

بننا چاہتے تھے وہ بھی اس کے افکار و نظریات کو اپنے لئے بہت منافع بخش سمجھتے تھے۔ اپریل 1948ء کے اوائل میں اس کے کھل کر منظر سیاست پر آنے کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی۔ اس نے گزشتہ دو تین مہینوں میں مختلف حلقوں سے روابط قائم کر کے دیکھ لیا تھا کہ پاکستان کی سیاسی فضا اس کے لئے سازگار ہو گئی ہے۔ ایک طرف شبیر احمد عثمانی، عبدالحامد بدایونی اور عبدالستار نیازی جیسے عناصر نے خلافتی نظام کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھایا ہوا تھا تو دوسری طرف وزیر اعظم لیاقت علی خان، وزیر مواصلات عبدالرب نشتر اور وزیر داخلہ فضل الرحمان شب و روز اس یقین دہانی میں مصروف تھے کہ پاکستان میں اسلامی نظام رائج ہوگا۔

ڈان کو مذکورہ انٹرویو دینے سے پہلے مودودی نے لاہور کمشنری کی جماعت اسلامی کے اجتماع میں تقریر کی تھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "ہماری قوم نے اپنے لیڈروں کے انتخاب میں غلطی کی تھی اور اب یہ غلطی نمایاں ہو کر سامنے آ گئی ہے۔ ہم چھ سال سے چیخ رہے تھے کہ محض نعروں کو نہ دیکھو بلکہ سیرت اور اخلاق کو بھی دیکھو۔ اس وقت لوگوں نے پرواہ نہ کی لیکن اب زمام کاران لیڈروں کو سونپنے کے بعد ہر شخص پچھتا رہا ہے کہ واہگہ سے دہلی تک کا بڑا علاقہ اسلام کے نام سے خالی ہو چکا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان جس خوف و حزن کی زندگی بسر کر رہے ہیں اس کی مثال سسلی اور سپین کی تاریخ میں بھی نہیں ملتی۔ اگر حالات یہی رہے تو ہندوستان میں دس سال کے اندر مسلمانوں کو پہچاننا ممکن نہیں رہے گا۔ اب اسلام کا مستقبل صرف پاکستان پر موقوف ہے۔ اگر یہاں اسلام کے مطابق طرز عمل اختیار کیا جائے تو نہ صرف یہاں اسلام قائم رہ سکتا ہے بلکہ مشرقی پنجاب میں بھی از سر نو اسلام پھیل سکتا ہے۔ ہندوستان میں بھی اس کے قدم جم سکتے ہیں لیکن اگر یہاں ترکی اور ایران کی پیروی کی گئی تو 20، 25 سال کے اندر معاذ اللہ اسلام پاکستان سے رخصت ہو جائے گا۔"[33] گویا مودودی کے نزدیک مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا تھا وہ اکالیوں کے کسی منصوبے کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اس کی ذمہ داری مسلم لیگی لیڈروں پر تھی۔ اس نے فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں اپنا یہی نظریہ ایک سال قبل اپریل 1947ء میں جماعت اسلامی کے ایک اجتماع میں بھی، جس میں گاندھی موجود تھا، پیش کیا تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ چونکہ مسلمان اسلام اور نیشنلزم کو خلط ملط کر رہے ہیں (یعنی پاکستان کی نیشنلسٹ تحریک کو اسلامی تحریک سمجھتے ہیں) اس لئے ان کی اس کج خیالی کا نتیجہ نواکھلی، بہار اور پنجاب کے افسوس ناک واقعات

کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔"[34]

7 اپریل کو ابوالاعلیٰ مودودی نے کراچی میں سندھ، بلوچستان اور بہاولپور کے حلقوں کی جماعت اسلامی کی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے حکومت پاکستان پر سخت نکتہ چینی کی اور کہا کہ "ہمارا ملک مضبوط بنیادوں پر صرف اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے اگر یہاں اسلامی اصولوں پر حکومت قائم کی جائے۔ ہندوستان میں اسلام کے مستقبل کا انحصار پاکستان کے آئین پر ہے۔ اگر پاکستان نے اسلامی آئین کو اختیار نہ کیا تو ہماری ہزار سال سے زائد عرصے کی تاریخ تاریکی کی چادر میں ملفوف ہو جائے گی۔ اگر پاکستان کا آئین اسلامی بنیادوں پر نہ بنا تو نہ صرف پاکستان تباہ ہو جائے گا بلکہ ہندوستان کے مسلمان بھی ختم ہو جائیں گے۔"[35] وزیر اعظم لیاقت علی خان نے مودودی کی اس نکتہ چینی کا فوراً ہی نوٹس لیا اور اس نے 8 اپریل کو لاہور میں پولیس کی ایک پریڈ کو خطاب کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر یقین دلایا کہ "حکومت کی بنیادیں احکام قرآنی پر ہی استوار کی جائیں گی۔ یہ پہلا موقع ہے کہ اس براعظم کے مسلمانوں کو اپنی حکومت قائم کرنے کا موقع ملا ہے۔ مسلمان بادشاہ جو دو صدی قبل تک ہندوستان پر حکومت کرتے آئے تھے عوام کے جذبات و رجحانات کی آئینہ داری نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ مطلق العنان فرمانروا تھے جو اسلامی جمہوریت کے منافی ہے۔ اب جبکہ ہم اپنا قومی وطن حاصل کر چکے ہیں تو اسے ایک ایسے نمونے پر تعمیر کریں گے جس سے تمام دنیا پر ثابت ہو جائے کہ اسلام کا سکھایا ہوا سبق آج اتنا ہی جدید اور تازہ ہے جتنا چودہ سو برس پہلے تھا۔"[36]

لیاقت علی خان کی اس تقریر سے قبل 5، 6 اور 7 اپریل کو ملتان میں مجلس احرار اسلام کی مجلس عاملہ کا اجلاس تاج الدین انصاری کی زیر صدارت منعقد ہو چکا تھا جس میں موجودہ بے چینی اور طبقاتی کشمکش پر غور و خوض کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ "مجلس احرار اسلام ملک کی معاشی اور اقتصادی بدحالی اور غیر شرعی اونچ نیچ کے خلاف اسلام کی روشنی میں ضروری جدوجہد اپنا فرض سمجھتی ہے لیکن ساتھ ہی اپنے اس بنیادی عقیدہ کا اعلان ضروری تصور کرتی ہے کہ مسلمانوں کے لئے قابل قبول صرف وہی نظام اور پروگرام ہو سکتا ہے جس کی بنیاد قرآن کریم پر ہو اور جس میں حاکمیت حقیقی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہو۔ مجلس کے سامنے احیائے دین اور استحکام پاکستان کے اہم مقاصد ہیں جن کے لئے مجلس احرار ملک کی تمام جماعتوں اور سر برآوردہ

افراد سے اپیل کرتی ہے کہ وہ ذاتیات اور جماعتی عصبیت سے بالاتر ہو کر زیادہ سے زیادہ قریب ہوں اور وقت کے اہم تقاضوں کا ساتھ دیں تا کہ ملک کے عوام کی بے چینی اور بے اطمینانی جلد از جلد رفع ہو سکے۔''[37]

احراری اس سے قبل نومبر اور دسمبر 1947ء میں بھی خان گڑھ اور لاہور میں اپنی عاملہ کے اجلاس کر چکے تھے مگر اس میں مجلس کے آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا تھا۔ اب اپریل 1948ء میں ان کے اس فیصلے کے اعلان کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ اسلام کے نام پر پھر میدان سیاست میں آنے کے لئے پر تول رہے تھے۔ لیکن مجلس احرار اور جماعت اسلامی کے رویوں میں فرق یہ تھا کہ مجلس احرار بظاہر تحریک پاکستان کی مخالفت سے تائب ہو کر وقتی طور پر مسلم لیگ سے اشتراک و تعاون کرنے پر آمادہ تھی۔ اس کے برعکس جماعت اسلامی کا امیر ابوالاعلیٰ مودودی اپنے اس موقف پر مصر تھا کہ اس کی جماعت نے تحریک پاکستان کی جو مخالفت کی تھی اسلامی نقطہ نگاہ سے بالکل صحیح تھی۔ پاکستان کے ارباب اقتدار میں 99 فیصدی بددیانت اور ناقابل اعتماد لوگ ہیں۔ اگر پاکستان میں اس کے تصور کے مطابق اسلامی نظام نافذ نہ ہوا تو نہ صرف پاکستان تباہ ہو جائے گا بلکہ ہندوستان کے مسلمان بھی ختم ہو جائیں گے۔

ان دنوں دوسرے کانگرسی مولویوں کی جمعیت کا بھی ملتان میں مولانا احمد علی لاہوری کی زیر صدارت اجلاس ہوا تھا جس میں حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ جلد یہ اعلان کرے کہ ''حکومت خداداد پاکستان کا مذہب اسلام اور قانون قرآن ہوگا۔'' لیکن اس کے ساتھ ہی جمعیت نے جماعت اسلامی کے برعکس یہ اعلان بھی کیا تھا کہ ''چونکہ تقسیم ہند سے پاکستان ایک حقیقت واقعی بن چکا ہے اور قیام پاکستان سے اختلافات ختم ہو چکے ہیں اس لئے جمعیت العلما کی خدمات استحکام پاکستان کے لئے وقف ہوں گی۔''[38]

قدامت پرست اور جمہوریت دشمن مُلّاؤں کی اس یلغار سے ملک کے جدیدیت پسند حلقوں کا متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ چنانچہ ایک شخص نے روزنامہ انقلاب میں ان مذہبی رہنماؤں کی اسلام فروشی پر بڑا تند و تلخ مضمون لکھا جس میں اس نے پہلے تو یہ یاد دلایا کہ پنجاب مسلم لیگ نے 1946ء کے اوائل میں جس منشور کی بنیاد پر انتخابات میں کامیابی حاصل کی تھی اس میں صنعت، زراعت، تعلیم اور دوسرے ہر شعبہ زندگی میں بنیادی تبدیلی کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس وقت معترضین

نے اس ہمہ گیر پروگرام پر کمیونزم کی تہمت تراشی کی تاکہ مذہب کی ابلیسانہ توضیح سے عوام صراط مستقیم سے ہٹ جائیں اور لیگ کا منشور تشنہ تکمیل رہ جائے۔ لیکن توضیح بے سود ہو چکی تھی۔ اب کوئی پروپیگنڈا لوگوں کو ان کے نصب العین سے منحرف نہیں کر سکتا تھا۔ کمیونزم کے الزامات کی بوچھاڑ جاری رہی مگر قومی امیدوں کا قافلہ اپنی منزل پر گامزن رہا حتیٰ کہ ان امیدوں اور آرزوؤں کے پروان چڑھنے کے سامان پیدا ہو گئے ہیں یعنی پاکستان منصۂ شہود پر آ گیا ہے۔ اس کے ساتھ جو زہرہ گداز تباہی آئی وہ بے شک ایسی تھی جو دنیا کے بڑے سے بڑے انقلاب کے ساتھ بھی نہیں ہوئی لیکن اس تباہی نے لیگ کے انقلابی پروگرام کے فوری اور کلی نفاذ کی فوری تصدیق کر دی...... لیکن اب بھی اگر کسی سمت سے ضروری اصلاح کی آواز اٹھتی ہے تو اس پر کمیونزم کا بہتان تراشا جاتا ہے۔ گویا عوام کی بہبود اور خیر سگالی کے طلب گار ہمیشہ کمیونسٹ اور حکومت کی سہل انگارانہ حکمت عملیوں کے عذر خواہ ہمیشہ پکے مومن اور اسلام کے صحیح محافظ و نگران...... ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ وہ علما اور مشائخ جو ہمیشہ سومنات اقتدار کے بچاری رہے اب بھی محرکات شرعیہ اور اسلامی اقدار کی اس انداز سے تفسیر و تشریح فرما رہے ہیں جس سے حکومت کو سہولتیں بہم پہنچ سکیں۔ اب ایک سمت سے پیہم یہ آواز آ رہی ہے کہ لوگوں کو اپنے اندر خود اصلاح پیدا کرنی چاہیے یعنی گھر بیٹھے بغیر کسی خارجی اثر کے ہر بندہ بشر کو نیک صالح اور متدین ہو جانا چاہیے۔ لوگ سود اور رشوت چھوڑ دیں اور صوم و صلوٰۃ کے پابند ہو جائیں، صداقت اور راستی کو اختیار کر لیں، قرآن و حدیث کے اسرار و رموز کے محرم ہو جائیں۔ اگر امت کا ہر فرد یہ سب کچھ کرے تو حکومت الٰہیہ خود بخود بن جائے گی اس اسلوب گفتار میں کتنے مقدس مغالطے مضمر ہیں...... ہمارے مذہبی لیڈروں نے اپنے عمل سے معاش کو مذہب سے تو نکال ہی دیا ہے تاکہ لوگوں کو پیچ در پیچ تاویلات کے چکر میں ڈال کر عمرانی شعور سے محروم رکھیں۔ یہ اس وضع داری کی دسیسہ کاریوں کا نتیجہ ہے کہ صوم و صلوٰۃ کی پابندی اور قرآن و حدیث کے چرچے کے باوجود معیشت اور معاشرت میں مساوات و توازن مفقود ہے اور اس کے فقدان پر کسی کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ بجائے خود اسلامی تعلیمات کی شدید خلاف ورزی ہے۔ جب تک اسلامی روح معاشرت میں جلوہ گر نہیں ہوتی اسلام فلسفہ ہو کر رہ جاتا ہے۔"[39]

لیکن انقلاب کے اس مضمون نگار کی نحیف آواز کسی نے نہ سنی۔ پاکستان اس وقت تک مُلّاؤں کا ایک ایسا نقار خانہ بن چکا تھا کہ جس میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی ترقی کی کوئی آواز نہیں

سنی جاسکتی تھی۔ ان مُلاّؤں کا سب سے بڑا مطالبہ یہ تھا کہ پاکستان میں قرآنی قوانین نافذ کئے جائیں یعنی چوروں کے ہاتھ کاٹے جائیں، زانیوں کو سنگسار کیا جائے، شرابیوں کو درے لگائے جائیں اور عورتوں کے لئے پردہ لازمی قرار دیا جائے۔ ان مُلاّؤں کے نزدیک عورتوں کی بے پردگی معاشرے کی ساری خرابیوں کی جڑ تھی۔ چنانچہ یہ ہر مذہبی اجتماع میں اس مسئلہ پر بہت زور دیتے تھے۔ اس مقصد کے لئے 15 اپریل کو وزیر آباد کے چوک لاہوری دروازہ میں نماز عشا کے بعد ایک جلسہ ہوا جس میں مولوی بہا الحق قاسمی امرتسری نے پردے کے مسئلہ پر قرآن و حدیث کی روشنی میں سیر حاصل تبصرہ کیا اور پھر متفقہ طور پر یہ قرارداد منظور ہوئی کہ ''مسلمانان وزیر آباد کا یہ جلسہ بیگم لیاقت علی خان اور ان کی دوسری مغرب زدہ ساتھیوں کی ان تقریروں کی جو انہوں نے 3 اپریل کو لاہور میں کیں، پرزور مذمت کرتا ہے۔ اس جلسے کی رائے میں اس قسم کی تقریریں اسلامی تعلیمات سے جہالت و بے خبری اور اینگلو۔ محمڈن مردوں کی انگیخت اور سازش کا نتیجہ ہے اور اس قسم کی تقریریں مسلمانان پاکستان میں سخت انتشار پیدا کر کے پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کا موجب بنیں گی۔ یہ جلسہ عام حکومت سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ وہ جمعیت العلمائے اسلام لاہور کی ان قراردادوں کو جو قانون شریعت کے نفاذ، شراب کی بندش اور پردہ اور نماز کو لازمی قرار دینے اور دوسرے امور کے متعلق ہیں فوراً منظور کر کے ان کو عملی جامہ پہنائے اور مغرب زدہ لوگوں کی تباہ کن روش سے متاثر ہوئے بغیر اسلام کے تقاضوں کو پورا کرے۔''[40] اس قرارداد کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان کے ارباب اقتدار نے گزشتہ چند ماہ میں اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر مُلاّئیت کے جس اژدہا کو دودھ پلایا تھا وہ اب انہی کو ہڑپ کرنے کے لئے لپک رہا تھا۔ قائداعظم، وزیراعظم لیاقت علی خان اور دوسرے مرکزی ارباب اقتدار نے تو اسلامی جمہوریت اور مسلم قومیت کا ذکر محض اس لئے کرنا شروع کیا تھا کہ اس طرح وہ اندرون ملک روز افزوں قومیتی اور طبقاتی تضادات پر قابو پا کر پاکستان میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی استحکام پیدا کر لیں گے۔ وہ بورژوا نقطہ نگاہ سے اسلام کی کچھ اس طرح ترقی پسندانہ تعبیر کرتے تھے کہ اسلام میں اور جدید جمہوریت میں کوئی تصادم نہیں ہے۔ جدید جمہوریت کا تصور وہی ہے جو اسلام نے 1300 سال پہلے پیش کیا تھا لیکن مُلاّؤں کی جانب سے اسلام کی تفسیر و تشریح اس سے بالکل مختلف ہوتی تھی۔ وہ عوام الناس کی بجائے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا تصور پیش کر کے قرون وسطیٰ کے

آمرانہ خلافتی نظام کی تبلیغ کرتے تھے اور اسلام کے صرف تعزیری پہلو پر زور دیتے تھے۔ بالفاظ دیگر یہ علمائے کرام مغرب زدہ عناصر کے ہاتھوں سے عنان اقتدار چھین کر خلافتی نظام کے تحت حکومت کی باگ ڈور خود سنبھالنا چاہتے تھے۔ یہ سیدھی سادی سیاسی اقتدار کی رسہ کشی تھی جس میں بالآخر مُلّاؤں کی جیت لازمی تھی۔ جدیدیت پسند عناصر مُلّاؤں کی وکٹ پر کھیل رہے تھے اس لئے ان کا کلین بولڈ ہونا لازمی تھا۔ اگر قائداعظم جناح اپنی 11 راگست 1947ء کی تقریر پر ثابت قدم رہتے اور دوسرے مرکزی اور صوبائی ارباب اقتدار بھی اس تقریر پر عمل پیرا ہوتے اور قومیتی و طبقاتی تضادات کو ترقی پسندانہ نقطہ نگاہ سے حل کرنے کی کوشش کی جاتی تو اس امر کا قوی امکان تھا کہ مُلّائیت کو قیام پاکستان کے بعد بھی بالکل اسی طرح شکست فاش ہوتی جس طرح کہ تحریک پاکستان کے دوران اسے ہوئی تھی۔

کشمیر میں فوج بھیجنے کے فیصلے اور سوویت یونین سے دوستانہ مراسم کی عارضی فضا قائم ہوتے ہی قائداعظم کو اسلام کا نام استعمال کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی

لیکن اب اپریل 1948ء میں مُلّائیت کے اس پھنیر سانپ کو دوبارہ پٹاری میں ڈالنا آسان نہیں تھا۔ اگرچہ پاکستان کے ارباب اقتدار کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ یہ زہریلا سانپ بالآخر مملکت خداداد پاکستان کو تباہ و برباد کرسکتا ہے۔ بظاہر یہی وجہ تھی کہ جب قائداعظم جناح نے 12 راپریل سے لے کر 18 راپریل تک صوبہ سرحد کا دورہ کیا تو انہوں نے اپنی تقاریر میں اسلام اور مسلم قومیت کا اس طرح ذکر نہ کیا جس طرح کہ انہوں نے مارچ میں اپنے دورۂ مشرقی پاکستان کے دوران کیا تھا۔ ان دنوں صوبہ سرحد میں بھی قومیتی تضاد اتنا ہی شدید تھا جتنا کہ مشرقی بنگال میں تھا۔ خان عبدالغفار خان پاکستان کی یونین میں صوبہ سرحد کو ایک خودمختار سوشلسٹ جمہوریہ بنانے کا مطالبہ کررہا تھا مگر اس کے باوجود جناح نے اس صوبہ میں کمیونسٹوں اور ففتھ کالمنسٹوں کے تخریبی عزائم کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا بلکہ نوائے وقت کی اطلاع کے مطابق انہوں نے سرخ پوشوں اور مسلم لیگ کے حامیوں کے اختلافات دور کرانے کی کوشش بھی کی تھی اور انہوں نے اس سلسلے میں ڈاکٹر

خان صاحب اور خان عبدالغفار خان سے امید افزا ملاقاتیں بھی کی تھیں۔ [41] حالانکہ یہ دونوں اعلانیہ طور پر نہ صرف پختونستان بلکہ سوشلسٹ نظام حکومت کے علمبردار تھے اور لندن ٹائمز کی رائے یہ تھی کہ جب تک غفار خان حکومت پاکستان سے صلح نہیں کرے گا، تحریک پختونستان ختم نہیں ہوگی۔ پشاور میں وزیراعلیٰ عبدالقیوم خان کی بدعنوانیوں پر پردہ ڈالنے کی اس طرح کوشش نہیں کی تھی جس طرح انہوں نے ڈھاکہ میں وزیراعلیٰ ناظم الدین کی بدعنوانیوں پر پردہ ڈالا تھا۔اس کے برعکس انہوں نے پشاور کے عوام کو یقین دلایا تھا کہ ''مجھے معلوم ہے کہ ہم میں ایسے اشخاص بھی ہیں جو بدعنوانی، رشوت ستانی اور اقربا نوازی کے مجرم ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حکومت عیب وخطا سے پاک ہے۔ یقیناً ہم پوری طرح ہوشیار ہیں۔تمہاری حکومت تمہارا صوبہ تمہاری وزارت اور تمہارے سرکاری ملازمین، ہماری نظر میں ہیں۔سب کچھ ہم پر پوری طرح روشن ہے اوراس امر میں کوئی شک وشبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم بہت جلد اس کا تجزیہ کرنے کے قابل ہو جائیں گے اور اپنے جسد سیاست سے اس زہر کو باہر نکال پھینکیں گے۔لیکن تمہیں صبر وتحمل سے کام لینا چاہیے اور ہمیں موقع اور معقول وقت دینا چاہیے۔'' [42]

جناح کے صوبہ سرحد میں اس رویے کا ایک بین الاقوامی پس منظر یہ تھا کہ مارچ میں برطانیہ کی تحریک پر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے مسئلہ کشمیر کے بارے میں جو غیر تسلی بخش قرارداد منظور کی تھی اس کے بعد پاکستان کے وزیر خارجہ ظفر اللہ خان نے پہلا کام تو یہ کیا کہ وزیراعظم لیاقت علی خان کو یہ تار بھیجا کہ کشمیر کا فیصلہ کشمیر میں ہوگا، نیویارک میں نہیں۔لہٰذا ہندوستان کی فوجی تیاری کے پیش نظر یہ لازم ہے کہ ہم اپنی باقاعدہ فوج محاذ پر بھیج دیں۔(چنانچہ جناح کے اس دورۂ سرحد کے فوراًبعد پاکستانی افواج کو کشمیر کے محاذ پر بھیج دیا گیا تھا) اور دوسرا کام یہ کیا تھا کہ اس نے اقوام متحدہ میں مستقل سوویت نمائندہ سے ملاقات کر کے سوویت یونین اور پاکستان کے درمیان سفارتی تعلقات قائم کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا جس کا مطلب یہ سمجھا گیا تھا کہ اب پاکستان اینگلو۔امریکی بلاک سے مایوس ہو کر سوویت یونین سے دوستانہ مراسم قائم کرنے کا متمنی ہے۔ چنانچہ اسی تاثر کے تحت پنجاب کے بعض عناصر کو یہ کہنے کی جرأت ہوئی تھی کہ ''برطانیہ کی تجویز کے مطابق اسلامی ممالک کے درمیان اتحاد محض روس سے ٹکر لینے کے لئے نہیں ہونا چاہیے۔روس سے ٹکر لینے سے نقصان کے سوا کچھ نہ ہوگا بلکہ بعض اسلامی ممالک توصفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے۔'' [43]

معاشی و معاشرتی مسائل سے بے نیاز مُلّاؤں کی طرف سے لوگوں کے ''اخلاق درست کرنے'' اور انہیں ''صحیح مسلمان'' بنانے کی بھرپور مہم......

پردہ لیگ کا قیام

مگر اسلام فروشوں کو اس صورت حال سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ نہ تو حالات حاضرہ پر نظر رکھنے کی ضرورت محسوس کرتے تھے اور نہ ہی مستقبل کی جانب دیکھتے تھے۔ ان کی نگاہیں صرف ماضی پر جمی رہتی تھیں۔ چنانچہ لاہور کے خلافت پاکستان گروپ کے ایک رکن حکیم انور بابری نے اپریل میں ایک پمفلٹ شائع کیا جس کا عنوان تھا ''پاکستان کی لاج رکھنی ہے تو مسلم لیگ سے اینگلو۔محمڈن نوابوں کا راج ختم کرو۔'' اس پمفلٹ میں نہ صرف مسلم لیگی قائدین کے غیر اسلامی کردار کو قابل ملامت قرار دیا بلکہ ان کی بے پردہ اور فیشن ایبل بیگمات پر بھی رکیک حملے کئے۔ چنانچہ حکومت مغربی پنجاب نے 19/اپریل کو یہ پمفلٹ ضبط کرلیا۔ لیکن اس سے اگلے دن 20/اپریل کو ایک ایسی خبر شائع ہوئی کہ پنجاب کی تعلیم یافتہ عورتوں میں کھلبلی مچ گئی۔ خبر یہ تھی کہ ''انجمن غیرت اسلام کے صدر مولوی علم الدین صاحب کو پولیس نے عورتوں کو تنگ کرنے کے الزام میں پکڑلیا ہے۔ مولوی صاحب ہاتھ میں قینچی پکڑ کر بازاروں کا چکر کاٹا کرتے تھے تاکہ بے پردہ عورتوں کے بال کاٹ دیئے جائیں۔ انہی مولوی صاحب نے حال ہی میں کئی تقریروں میں عورتوں کی بے پردگی پر بہت لے دے کی تھی۔''[44] پھر 20/اپریل کو ٹیکسلا سے یہ خبر شائع ہوئی کہ ''جمعیت استحکام پاکستان کے حضرت مولانا احمد علی نے ایک جلسہ عام میں یہ پرزور مطالبہ کیا ہے کہ حکومت پاکستان دستور ساز اسمبلی میں یہ اعلان کرے کہ پاکستان کا مطلب اسلام اور قانون قرآن ہے اور مولانا غلام خان نے آیات قرآنی سے واضح کیا کہ مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان بن جائیں تو خدا وند تعالیٰ کی پوری تائید آج بھی انہیں حاصل ہوسکتی ہے''۔[45] 22/اپریل کو لاہور میں یوم اقبال کی تقریب میں سر عبدالقادر نے کہا کہ علامہ اقبال قرآنی تعلیمات کی بنیاد پر زندگی کی تعمیر نو کے خواہاں تھے اور پھر 23/اپریل کو مصر کے سفیر خطیب الحسینی نے اسی تقریب میں کہا کہ ''عربی سارے عالم اسلام کی مشترکہ زبان ہونی چاہیے۔''

26 اپریل کو اس قسم کی خبروں سے جل بھن کر روزنامہ انقلاب کے ایک مضمون نگار نے پاکستان کے علما اور مشائخ کو اسلام کا حقیقی دشمن قرار دیا۔ اس نے لکھا کہ ''اب اس وقت مروجہ اسلام یعنی وہ اسلام جو معروف دینی مراکز اور علما اور مشائخ کی طرف سے پیش ہو رہا ہے اس کی شکل وہ ہے جو یورپ میں اشتراکی انقلاب سے پہلے عیسائیت کی تھی۔ ادھر غربا میں بغاوت کی وہی روح بیدار ہو رہی ہے جس نے اشتراکیت کو یورپ میں پیدا کیا تھا۔ اس کو روکنے کے لئے دینی اجارہ دار وہی کچھ کر رہے ہیں جو یورپ میں پادریوں نے کیا تھا یعنی بجائے اصلاحی اقدام کرنے کے انقلابی رو کو لا مذہبیت کے الزام سے ضعیف کرنا چاہتے تھے۔ وہ اسلامی مساوات و مؤاخات کے قائل بھی ہیں۔ مگر اس کے لئے جو تحریک کی جائے اس کو کمیونزم کہہ کر ختم کرنا چاہتے ہیں۔ گویا اسلام کا معاشی مساوات کا اقرار محض ابلہ فریبی ہے اور عوام کو موجودہ نکبت وادبار سے وابستہ رکھنے کا ایک ڈھنگ ہے...... انہوں نے بے عملی سے اسلام کی تعلیم کو چیستان بنا دیا ہے۔ پھر اس پر بھی ناراض ہوتے ہیں کہ مصیبت زدہ مخلوق ان سے زیادہ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہے جو اقتصادی فلاح کا دعویٰ کرتے ہیں۔ چونکہ مذہبی رہنما معاشی ہمواری کے ان داعیوں پر کمیونسٹ ہونے کا فتویٰ صادر کر چکے ہیں اس واسطے وہ متمنی ہیں کہ لوگ ان کی حلقہ بگوشی کو اپنی معاشی خوشحالی پر ترجیح دیں اور اس کو ہی اسلام سمجھیں۔ اگر پاکستان میں کمیونزم کو فروغ ہوا تو اس کے ذمہ دار وہ مذہبی رہنما ہوں گے جو اسلام کو اصلاح کے راستے میں حائل کر رہے ہیں اور اس کے لئے اسلامی تاریخ کے دوروں کا حوالہ دیتے ہیں جب امت مسلمہ پر سلاطین مسلط ہو گئے اور ان کے تسلط کو جائز ثابت کرنے کے لئے ان جیسے عصری علما اسلامی تعلیمات کو اپنی بے جا تعبیروں سے گھائل کر رہے تھے۔ ان رہنماؤں کو اسلام کی اتنی فکر نہیں جتنی اپنی اجارہ داریوں کی ہے، اس طرز حکومت کی جو جاگیرداری اور سرمایہ داری کی پشت پناہ ہے۔''[46] اس مضمون کی اشاعت کے اگلے دن ڈھاکہ کے ایک جلسہ عام سے افتخار الدین کی یہ تقریر شائع ہوئی کہ پاکستان کے دفاع کے لئے طاقتور فوج کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس ملت کی تعمیر اسلامی مساوات اور اسلامی سوشلزم کے اصولوں پر کی جائے۔ اسی جلسہ میں حسین شہید سہروردی کی تقریر یہ تھی کہ پاکستان کے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے ملک کو تباہی سے بچانے کے لئے اقلیتوں کا بہر قیمت تحفظ کریں۔

مشرقی بنگال میں ہندو اقلیت کی آبادی تقریباً ایک کروڑ پچاس لاکھ تھی۔ اتنی بڑی آبادی کے جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کا مسئلہ دراصل پاکستان کی سلامتی کے تحفظ کا مسئلہ تھا لیکن مغربی پاکستان کے علما اور مشائخ کو اللہ تعالیٰ نے اتنی سی بات سمجھنے کی توفیق نہیں دی ہوئی تھی۔ انہیں پاکستان کے مفلوک الحال عوام کی معاشی و معاشرتی فلاح و بہبود میں بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ پاکستان میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے وجود کا اسلامی جواز پیش کرنے کے لئے بعض صحابۂ کرام کی جائیدادوں کے گوشوارے پیش کرتے تھے۔ وہ شب وروز یہ مطالبہ کرتے تھے کہ مذہب اسلام ہو اور قانون قرآن ہو۔ ان میں سے ابوالاعلیٰ مودودی جیسے علما مزید تاکید کرتے تھے کہ ہر شخص اپنے خارجی حالات سے بے تعلق ہو کر انفرادی حیثیت سے اپنے اخلاق کی اصلاح کرے۔ وہ کہتے تھے کہ اسلام نے سب سے زیادہ زور انفرادی اصلاح اور نفس کی پاکیزگی پر دیا ہے کیونکہ نفس کی پاکیزگی نہ ہو تو بہتر سے بہتر قانون کو برے رنگ میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ افراد کے متعلق جو اسلامی احکام ہیں اگر افراد ان پر عمل نہ کریں تو کبھی بھی ملک میں اسلامی آئین جاری نہیں ہو سکتا۔ اسلامی حکومت کے لئے اسلامی سوسائٹی بننی ضروری ہے۔ ابوالاعلیٰ مودودی اپنے اس موقف کی وضاحت کے لئے مسلمان عورتوں کی پردہ داری پر بہت زور دیتا تھا۔ چنانچہ اس نے 30/اپریل کو لاہور کی اسلامیہ کالج گراؤنڈ میں پاکستان پردہ لیگ کے زیر اہتمام ایک ''عظیم الشان جلسہ عام'' کو خطاب کرتے ہوئے اسلامی پردہ پر ''پر معارف'' تقریر کی۔ اس جلسہ میں خواتین کے لئے پردہ کا خاص انتظام تھا۔ ابوالاعلیٰ مودودی کی طرح مولانا محمد علی قصوری بھی انفرادی اصلاح کا قائل تھا۔ اس کی ایک مضمون میں تجویز یہ تھی کہ ''مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کے لئے اس کی رکنیت کے دروازے صرف ان افراد کے لئے کھولے جائیں جو صوم وصلوٰۃ کے پابند ہوں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہوں۔''47

3/مئی کو عبدالستار نیازی کے خلافت ربانی گروپ کے زیر اہتمام باغ بیرون موچی دروازہ میں جلسہ ہوا جس میں نیازی نے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام کے دردناک حادثات کو قوم کے اعمال شنیعہ کی سزا گردانتے ہوئے کہا کہ ''جب ایک طرف ترشے ہوئے لاشے مرکز میں پہنچ رہے ہوں اور دوسری طرف چھنا چھن اور کھنا کھن کی صداؤں میں رمضان

کی ستائیسویں رات کا تقدس گم ہو رہا ہو تو اللہ تعالیٰ سے فضل پیہم کی امید کیونکر کی جا سکتی ہے۔''
اس نے علم و عرفان بھری تقریریں نشر کر سکنے والے آلے سے سارا سارا دن گانے نشر ہوتے رہنے کی بھی شکایت کی۔ بے پردگی اور بے حیائی کو فروغ دینے والوں کی تائید اور اسلامی شعائر پر عمل کرنے والوں کی قانونی گرفت کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہا کہ پبلک سیفٹی ایکٹ عوام کے فائدے کے لئے ہرگز نہیں بلکہ یہ پولیس سیفٹی ایکٹ ہے۔ آخر میں اس نے گورنر جنرل سے مطالبہ کیا کہ وہ پاکستان میں فوراً تمام شرعی قوانین نافذ کرے۔''[48] اس جلسہ میں لاہور کے ایک بڑے ہی اشتعال انگیز مُلّا ابراہیم علی چشتی نے بھی بڑی ہی زہریلی تقریر کی۔ اس نے پاکستان میں معاشی صنعتی تعلیمی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کی قرآن مجید کی روشنی میں تعبیر کے لئے دس نکاتی پروگرام پیش کیا اور الزام عائد کیا کہ پاکستان کے مسلم عوام اینگلو۔محمڈن نوابوں اور سرمایہ دار کمیونسٹوں کے زوردار شکنجے میں کچلے جا رہے ہیں۔''[49] ان دونوں مُلّاؤں کی طرح ابوالاعلیٰ مودودی اور بعض دوسرے علما بھی اپنی تحریروں اور تقریروں میں جب مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے قتل عام کا ذکر کرتے تھے تو یہ نہیں کہتے تھے کہ یہ عظیم المیہ اکالی دل، راشٹریہ سیوک سنگھ اور سکھ والیان ریاست کی باہمی سازش کا نتیجہ تھا بلکہ وہ اسے قوم کی بداعمالی، بدکرداری اور بداخلاقی کی سزا قرار دیتے تھے۔ مشرقی پنجاب میں جو لاکھوں مسلمان قتل ہوئے تھے اور جن ہزاروں عورتوں کا اغوا ہوا تھا ان کی بہت بھاری اکثریت کا تعلق غریب کسان طبقہ سے تھا۔ یہ طبقہ کھیتوں میں صبح سے شام تک محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتا تھا۔ اس طبقہ کو شہروں کے بالائی طبقہ کے چھنا چھن اور کھنا کھن سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا لیکن اس کے باوجود ان مُلّاؤں کے بقول ''قوم'' کے اعمال شنیعہ کی سزا ان لاکھوں غریبوں کی ملی تھی اور جو مٹھی بھر لوگ چھنا چھن اور کھنا کھن کرتے تھے وہ بحفاظت پاکستان پہنچ کر کوٹھیوں اور دوسری متروکہ جائیدادوں پر قابض ہو گئے تھے۔ یہ مُلّا نٹے یہ کبھی نہیں کہتے تھے کہ مزدوروں اور کسانوں کے مصائب بیرونی سامراجیوں اور مقامی جاگیرداروں و سرمایہ داروں کے استحصال کا نتیجہ ہیں بلکہ وہ ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ ان غریب عوام کی ساری مصیبتیں ان کے اپنے ''گناہوں'' کی سزا ہیں۔ حالانکہ ان غریب عوام کا گناہ صرف یہ تھا کہ یہ محنت و مشقت سے حلال کی روزی کمانے کی کوشش کرتے تھے۔

مُلاّؤں کی نفاذ اسلام مہم کا توڑ کرنے کے لئے لیاقت علی اور دوسرے مسلم لیگی رہنماؤں نے بھی یہ نعرہ اختیار کیا کہ پہلے لوگ صحیح مسلمان بنیں تب ہی اسلامی نظام نافذ ہوسکتا ہے

وزیراعظم لیاقت علی خان بھی ان مُلاّؤں کی طرح پاکستان کے کروڑوں غریب مسلمانوں کو صحیح مسلمان نہیں سمجھتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جب تک ہم صحیح مسلمان نہ بنیں محض اسلامی قانون نافذ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہمیں چاہیے کہ ہر غیر اسلامی فعل اور حرکت چھوڑ دیں اور اس کے بعد اسلامی اور شرعی قانون کے نفاذ کا مطالبہ کریں۔ ہم نے پاکستان کا مطالبہ اس لئے کیا ہے کہ ہم اس ملک میں ان اصولوں پر عمل کرنا چاہتے ہیں جو آج سے چودہ سو سال پہلے ہمیں پڑھائے گئے تھے۔ ہم دنیا میں ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انسانیت کی بہتری کے لئے اسلام کے اصول آج بھی اتنے ہی تازہ اور کارآمد ہیں جتنے آج سے 1400 سال پہلے تھے۔ ہم انہیں بتانا چاہتے ہیں کہ ان کی تمام مصیبتوں اور صعوبتوں کا حل اس میں ہے کہ وہ اسلامی اصولوں کی پیروی کریں نہ کہ مغربی تہذیب کے پیچھے دوڑیں جیسا کہ وہ آج کل کر رہے ہیں۔ عالمگیر مساوات اور محبت کے جو سبق اسلام نے ہمیں دیئے ہیں ان پر چل کر ہم پاکستان میں صحیح معنوں میں اسلامی حکومت بنا سکتے ہیں۔ ہمیں ایسے حالات پیدا کرنے چاہئیں کہ امیر و غریب میں کوئی فرق نہ رہے اور دونوں کو برابر کے حقوق حاصل ہوں۔"[50]

پاکستان مسلم لیگ کا صدر چودھری خلیق الزماں بھی اس سلسلے میں لیاقت علی خان سے متفق تھا۔ اب وہ بھی کہتا تھا کہ "اس وقت ہمارے عوام میں اکثر لوگ بے تاب ہیں کہ پاکستان میں شرعی احکام کا نفاذ جلد از جلد کیا جائے۔ اس مسئلے کے متعلق ہم بھی بے خبر نہیں ہیں۔ لیکن موجودہ ماحول میں شرعی احکام کی ترویج اکثر صورتوں میں محض نقصان کا باعث ہوگی۔ شرعی احکام اور اسلامی آئین کے نفاذ سے پہلے ہماری ذہنیتوں میں انقلاب پیدا کرنا لازمی ہے۔ ملک سے رشوت ستانی اور اس قسم کی دوسری برائیاں دور کرنے کے لئے جدوجہد ضروری ہے۔"[51] لیاقت علی خان، چودھری خلیق الزماں اور دوسرے مرکزی ارباب اقتدار نے اپریل، مئی 1948ء میں اس قسم کی

باتیں اس لئے کرنا شروع کر دی تھیں کہ وہ مُلاّؤں کے اس مطالبے کو ٹالنا چاہتے تھے کہ ان کے تصور کا اسلامی نظام فوری نافذ کیا جائے۔ چونکہ مُلاّ کے تصور کا اسلامی نظام دور جدید میں نا قابل عمل تھا اس لئے ان کے پاس اس مطالبہ کا اس کے سوا کوئی جواب نہیں تھا کہ پہلے صحیح مسلمان بنو تو پھر اسلامی شرعی قانون کے نفاذ کا مطالبہ کرو۔ لیکن ان کو اس بات کا احساس نہیں تھا کہ ان کا یہ عذر ان کے ہی خلاف جاتا تھا کیونکہ مُلاّؤں کی جانب سے شب و روز یہ پروپیگنڈا جاری تھا کہ پاکستان کے ارباب اقتدار کے افعال و اعمال غیر اسلامی ہیں اور ان کی بیگمات بے پردگی اور بے حیائی کی مرتکب ہوتی ہیں۔ ابوالاعلیٰ مودودی کی مسلم لیگ کی قیادت کے بارے میں بہت پہلے سے صحیح یا غلط رائے یہ تھی کہ ''لیگ کے قائداعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطہ نظر سے پرکھتا ہو'' اور یہ کہ ''عامتہ المسلمین کی قیادت و رہنمائی ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں چلی گئی ہے جو دین کے علم سے بے بہرہ ہے اور محض قوم پرستانہ جذبہ کے تحت اپنی قوم کے دنیوی مفاد کے لئے کام کر رہا ہے۔ دین کا علم رکھنے والا عنصر اس گروہ میں اتنا بھی نہیں جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے...... اس گروہ کے خیالات، نظریات اور طرز سیاست اور رنگ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔ ان کا یہ حال ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے مسائل سے لے کر بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملہ میں بھی انہیں قرآن کا نقطہ نظر نہ تو معلوم ہی ہے اور نہ ہی اسے تلاش کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ انہیں نور ہدایت صرف مغربی قوانین و دساتیر ہی میں ملتا ہے۔''[52] گویا ابوالاعلیٰ مودودی کی رائے کے مطابق لیاقت علی خاں وغیرہ جو خود صحیح مسلمان نہیں تھے وہ دوسروں کو صحیح مسلمان بننے کی تلقین کرتے تھے۔ بیگم لیاقت علی خان، مس فاطمہ جناح اور بیگم خلیق الزماں اور دوسری مسلم لیگی بیگمات پردہ نہیں کرتی تھیں اس لئے وہ بھی مودودی کی 30 اپریل کی تقریر کے مطابق دائرہ اسلام سے خارج تھیں۔

لیاقت علی خاں اینڈ کمپنی کے لئے مشکل یہ تھی کہ اگرچہ وہ ملک کے اندر قومیتی اور طبقاتی مشکلات پر قابو پانے کے لئے اسلام کا نام استعمال کرتے تھے اور مُلاّؤں کی حمایت چاہتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ مُلاّؤں کو اقتدار میں حصہ دار بھی نہیں بنانا چاہتے تھے۔ اس لئے کہ نہ صرف مُلاّؤں کے تصور کا اسلامی نظام نا قابل عمل تھا بلکہ اس سے مشرقی بنگال کے ایک کروڑ پچاس

لاکھ ہندوؤں میں خوف وہراس پھیلتا تھا اور ہندوستان میں تین کروڑ پچاس لاکھ مسلمانوں کا مستقبل خطرے میں پڑتا تھا۔ لیاقت علی خان کو عبدالستار نیازی کے اس موقف پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا تھا وہ قوم کے اعمال شنیعہ کا نتیجہ تھا۔ اسے جمعیت العلمائے اسلام کے مولوی داؤد غزنوی کا یہ بیان بھی اچھا لگتا تھا کہ ''زمین کو قومی ملکیت بنانے کی صورت میں خونریز طبقاتی جنگ ہوگی اور اس سے پناہ گزینوں کا مسئلہ حل نہیں ہوگا کیونکہ مغربی پنجاب میں 500 روپے سے زائد لگان دینے والے بڑے بڑے زمینداروں کی تعداد صرف 1900 ہے۔''[53]

چودھری خلیق الزماں مُلّاؤں سے کہتا تھا کہ ''اسلامی نظام کے فوری نفاذ کا مطالبہ نہ کرو۔ شرعی قانون کا فوری نفاذ ناممکن ہے اگرچہ پاکستان کی حکومت کا فرض ہے کہ وہ اسلامی قانون عمل میں لائے مگر یہ مسئلہ آسان نہیں اور آہستہ آہستہ عمل میں لایا جائے گا۔''[54] وہ پاکستان کے علما و مشائخ سے صرف وہی کام لینا چاہتا تھا جو ایک جاگیردار اپنے گاؤں کے مُلّا سے لیتا تھا۔ یعنی یہ کہ علما و مشائخ پاکستان کے غریب مزدوروں و کسانوں کو صبر و تحمل اور قناعت کا درس دیتے رہیں اور سندھ، سرحد، بلوچستان اور مشرقی بنگال کے پسماندہ عوام کو مسلم قومیت کی رسی سے باندھے رکھیں اور جو کوئی روٹی کپڑے یا علاقائی حقوق کا مطالبہ کرے اس کے خلاف اسلام دشمنی اور کمیونزم کا فتویٰ صادر کریں۔

علما و مشائخ اقتدار میں حصہ مانگتے تھے...... سرحد میں پیر مانکی اور قیوم خان کے مابین کشمکش میں پیر مانکی نے اسلام کا نام استعمال کیا

لیکن اب پاکستان میں علما و مشائخ یہ کردار صرف اسی صورت میں ادا کرنے پر آمادہ تھے کہ انہیں اقتدار میں حصہ دار بنایا جائے۔ چنانچہ 12 رمئی کو صوبہ سرحد کے پیر مانکی شریف نے مسلم لیگ کے اندر اپنے ایک شریعت گروپ کی تشکیل کا اعلان کرتے ہوئے چودھری خلیق الزماں کے اس بیان کی مذمت کی کہ نفاذ شریعت سے پہلے عوام کو پابند شریعت بننا چاہیے۔ پیر مانکی نے کہا کہ نفاذ شریعت سے پہلے شرعی سوسائٹی کا نعرہ ان وزیروں نے عوام کو گمراہ کرنے کے لئے بلند کیا ہے جو شریعت کا بوجھ اپنے گلے سے اتار کر پبلک کے سر منڈھنا چاہتے ہیں۔ یہ نعرہ صریحاً مغالطہ

پر مبنی ہے۔ شرعی سوسائٹی نفاذ شریعت کے بغیر نہیں بن سکتی۔ اگر بن سکتی تو پاکستان کی ضرورت کیا تھی؟ علاوہ ازیں ایک دفعہ شرعی سوسائٹی بن گئی تو پھر نفاذ شریعت کی حاجت کیا باقی رہ جاتی ہے؟ شریعت صرف ہاتھ کاٹنے اور درے لگانے کا نام نہیں۔ دوسرے شرعی نظام میں سب سے پہلے ایسے حاکم اور وزیر سزایاب ہوں گے جو بے گناہوں کے ہاتھ کاٹنا چاہیں گے۔ مطالبہ مکمل شرعی نظام کا ہے۔ یہ تو نہیں کہ قانون شرعی ہو اور حاکم غیر شرعی ہوں۔'' 55

پیر مانکی کے اس بیان کا پس منظر یہ تھا کہ وہ پاکستان مسلم لیگ کے فروری میں منظور شدہ آئین کے تحت صوبہ سرحد کی مسلم لیگ کا صدر بننے کا متمنی تھا لیکن وہاں کا وزیر اعلیٰ عبدالقیوم خان اس کی تمنا کے راستے میں حائل تھا اور لیاقت علی خان و چودھری خلیق الزماں اس کشمکش میں عبدالقیوم خان کا ساتھ دے رہے تھے۔ دوسرا پس منظر یہ تھا کہ پیر مانکی پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں ابوالکلام آزاد کی خالی کردہ نشست کے لئے امیدوار تھا لیکن عبدالقیوم خان نے اپنی سازشی سیاست سے اس کی اس امید پر پانی پھیر دیا اور تیسرا پس منظر یہ تھا کہ وہ صوبائی کابینہ میں اپنے دو ایک وزرا کو شامل کروانا چاہتا تھا مگر عبدالقیوم خان نے قائداعظم جناح کی منظوری سے ایک سابق کانگرسی رکن اسمبلی میاں جعفر شاہ کو اپنی کابینہ میں شامل کر لیا تھا۔ عبدالقیوم خان کا یہ آخری فیصلہ پیر مانکی اور صوبہ سرحد کے دوسرے مذہبی حلقوں کے لئے اس قدر مایوس کن تھا کہ 12 رمئی کو ہی پشاور کی جمعیت العلمائے اسلام نے ایک بیان میں اس پر بہت احتجاج کیا۔ جمعیت کا بیان یہ تھا کہ ''سرحد کی مسلم لیگی حکومت کا طرز عمل مشکوک اور غیر مناسب ہے باشندگان سرحد کی طرف سے جب قانون شریعت اسلامیہ کے اجرا کا مطالبہ کیا گیا تو اس کا جواب دیا گیا کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ مرکزی آئین ساز جماعت نظام نامہ مرتب کرنے میں سرگرمی سے مصروف عمل ہے۔ جب تک مرکز کی طرف سے قانون مرتب نہیں ہوتا اس وقت تک ہم اس کو رائج نہیں کر سکتے۔ اس پر مطالبہ کیا گیا کہ چونکہ وزارت سرحد میں ایک یا دو وزیروں کا اضافہ ہو رہا ہے لہٰذا جب تک جدید قانون مرتب نہیں ہوتا اس وقت تک وزارت میں ایسے حضرات کو لیا جائے جو متقی پرہیزگار اور خصوصاً علوم دینیہ سے واقف ہوں۔ مگر مسلمانوں نے خلاف توقع یہ خبر سنی کہ سرحد کے وزیر اعلیٰ نے اسمبلی پارٹی میں سے میاں جعفر شاہ کو وزارت کے لئے موزوں سمجھا۔ چنانچہ اس کے تقرر کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ ہم وزیر اعلیٰ کی نظر انتخاب پر تنقید نہیں کرنا چاہتے لیکن اتنا عرض

ضرور کریں گے کہ رائے عامہ کو زیادہ دیر تک ٹھکرایا نہیں جا سکتا۔ سرحد کا مسلمان اس وقت تک برابر اپنے مطالبے پر قائم رہے گا جب تک کلی طور پر شریعت اسلامیہ کا نفاذ نہیں کیا جاتا یا کابینہ سرحد میں ان حضرات کو خدمت کا موقع نہیں دیا جاتا جن پر عوام کو اعتماد ہو۔''[56] پیر مانکی اور جمعیت العلما اسلام کے ان اعلانات کے پیش نظر صوبہ سرحد کے احراریوں میں حوصلہ پیدا ہوا اور انہوں نے مولوی غلام غوث کی زیر صدارت ایک غیر رسمی میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا کہ قرآن کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے ایک عظیم الشان نفاذ شریعت کانفرنس منعقد کی جائے گی جس میں تمام جماعتوں کے اراکین وعلمائے کرام کو دعوت دی جائے گی۔[57]

جوں جوں قائداعظم کی صحت گرتی گئی، احراری مولویوں، لیگی مولویوں اور قدامت پسند درمیانہ طبقہ کے مابین نفاذ اسلام کی دوڑ میں اضافہ ہوتا گیا

جب صوبہ سرحد کے احراریوں کے اس فیصلے کی خبر کراچی پہنچی تو مولانا شبیر احمد عثمانی کے کان کھڑے ہو گئے اور اس نے فوراً ایسوسی ایٹڈ پریس کے نمائندے کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا کہ پاکستان کا اسلامی آئین مرتب کرنے کے لئے ممتاز علما کا ایک کنونشن بلایا جائے گا۔ اس نے مزید بتایا کہ ''میں نے دستور ساز اسمبلی میں اس مضمون کی قرارداد پیش کرنے کا نوٹس دے رکھا ہے کہ علما اور مفکرین کی ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو اسلامی اصولوں کی بنیاد پر آئین کی ترتیب کے لئے سفارشات پیش کرے۔ حیرت ہے کہ اسمبلی کے دو سیشن ہو چکے ہیں لیکن اس قرارداد کو زیر بحث نہیں لایا گیا۔ جب کبھی میں ارباب اختیار کو یاددہانی کراتا ہوں تو مجھے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اولین موقع پر یہ قرارداد پیش کر دی جائے گی لیکن میرا خیال ہے کہ اسمبلی کا جو سیشن عنقریب منعقد ہونے والا ہے اس میں بھی اسے پیش نہیں کیا جائے گا۔''[58] مولانا عثمانی نے اپنے اس انٹرویو میں یہ نہیں بتایا تھا کہ یہ قرارداد پیش نہ ہونے کی اصلی وجہ یہ تھی کہ قائداعظم جناح اسمبلی میں اس قسم کی قرارداد کو زیر بحث لانے کے خلاف تھے۔ وہ ایک سے زیادہ مرتبہ کہہ چکے تھے کہ پاکستان میں مُلّائیت کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہو گی۔ اب مئی میں جناح کی صحت بہت خراب ہو چکی تھی اور سب کو معلوم تھا کہ آئندہ وہ اسمبلی کی صدارت نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ عثمانی نے بھی اسلامی آئین کی ترتیب کے لئے علما کی کمیٹی کی تشکیل کے فیصلے کا اعلان کر دینا مناسب سمجھا۔ جس رفتار سے قائداعظم جناح

کی صحت گرتی جارہی تھی اسی رفتار سے مُلاّؤں کے حوصلے بلند ہوتے جا رہے تھے۔

لاہور کا روزنامہ نوائے وقت شرعی نظام اور اسلامی آئین کی دوڑ میں مُلاّؤں سے چند قدم آگے ہی تھا اس لئے اس نے شبیر احمد عثمانی کے اس فیصلے کی فوراً تائید کی۔ اس نے لکھا کہ "اس مجوزہ کمیٹی میں علمائے دین اور دستور و آئین کے ایسے ماہرین شامل کئے جائیں جن کی نظر اسلامی دستور و آئین کے علاوہ دوسرے ملکوں کے نظام حکومت پر بھی ہو۔ اگر اس مقصد کے لئے دوسرے ممالک کے علما یا قانون دانوں کی خدمات حاصل کرنے کی ضرورت ہو تو اس سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیے...... ہماری رائے میں دنیا کے سب ملکوں سے زیادہ پاکستان کی فضا اسلامی حکومت کے قیام کے لئے سازگار ہے۔ پاکستان اس مسئلہ کو حل کرنے اور اس میدان میں باقی دنیا کو راہ ہدایت دکھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر ہمارا یہ تجربہ کامیاب ہو جائے تو پاکستان صحیح معنوں میں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کی حیثیت سے عالم اسلام کا قائد بن جائے۔"[59]

نوائے وقت علما اور ماہرین کی کمیٹی کا تقرر اس لئے چاہتا تھا کہ کم از کم یہ بات تو طے ہو جائے کہ اسلامی حکومت کے بنیادی اصول کیا ہونے چاہئیں لیکن روزنامہ انقلاب کا مطالبہ یہ تھا کہ پاکستان کی عنان اقتدار فوراً علما کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ اس اخبار کا اداریہ یہ تھا کہ "اسلامی نظام حکومت کے متعلق ارباب اختیار کی پریشانیاں ہر لحظہ بڑھ رہی ہیں۔ وہ کبھی کہتے ہیں کہ پاکستان کے لئے جو آئین بنے گا اس کی روح اسلامی ہوگی۔ کبھی فرماتے ہیں کہ پاکستان میں بہرحال اسلامی اشتراکیت جاری ہوگی۔ کبھی کہتے ہیں کہ پورے نظام کو اسلامی بنانے میں تو شاید بہت وقت لگ جائے لیکن اس نظام کی بنیادوں کا تو جلد فیصلہ ہو جانا چاہیے۔ ہمارے نزدیک یہ ساری باتیں حقیقتاً اسلامی تقاضوں کو نہ سمجھنے اور روح اسلامیت سے معرا ہونے کا نتیجہ ہے...... ہماری رائے یہ ہے کہ اکثر لوگ اس وقت تک صراط مستقیم پر قائم نہیں رہ سکتے جب تک قانون اور پرسش کا خوف ان پر مسلط نہ ہوا ہو لیکن یہ حالت اس معاشرہ میں بالخصوص عام ہوتی ہے جہاں عوام کی اخلاقی اصلاح کے لئے کوئی مؤثر کام نہ ہوا ہو۔ لیکن اخلاقی اصلاح کے لئے بھی صحیح اور سازگار فضا اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ اوپر جو نظام مسلط ہو وہ صالح ہو اور اس کی بنیاد درست ہو۔ وہی نظام جو ہمارے عقیدے ہی نہیں بلکہ ایک دنیا کے اعتراف کے مطابق بہترین ہے۔ نیز سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود ہمارے لیڈروں نے اب تک اسلامی ماحول پیدا کرنے کی لئے کیا کیا؟ ہم نے انہیں

دورے کرتے دیکھا۔ انہوں نے دربار لگائے، ان کی تصویریں اتاری گئیں، ان کی پیشوائی کے سلسلے میں سجاوٹوں اور آرائشوں پر جگہ جگہ ہزاروں لاکھوں روپے صرف ہوئے، ان میں سے بڑے بڑے آدمی ہزاروں روپے تنخواہ لیتے رہے، انہوں نے دورے فرمائے، فوجوں کی سلامیاں لیں، جلسے منعقد کئے، کیمپوں کے معائنے فرمائے۔ کیا دو چار دس مثالیں ایسی بھی پیش کی جاسکتی ہیں کہ وہ مسجدوں میں گئے اور جا کر دیکھا کہ نمازیوں کی کیا کیفیت ہے؟ پہلے کے مقابلے میں ان کی تعداد کتنی بڑھی ہے؟ کیا یہ بھی کبھی دیکھا کہ عام مسلمانوں کی اخلاقی اصلاح کس قدر ہوئی ہے؟ ہمارے سامنے تو ایسی مثالیں آتی رہی ہیں کہ اونچے درجے کے دولت مند گھرانوں نے عام اور غریب مسلمانوں کے سامنے جو طرزِ عمل پیش کیا وہ اسلامی طریق سے سراسر متصادم تھا۔ بلکہ ایک محترم خاتون کی زبان سے تو ہم نے یہ بھی سنا کہ اگر یہاں پردہ رائج کیا گیا تو میں سب سے پہلے سول نافرمانی کروں گی۔ وہ خاتون پاکستان کے بڑے ہی بلند پایہ عہدیدار کی بیگم ہے۔ لیکن ہم نے آج تک نہیں سنا کہ اس حکم کو واپس لیا گیا ہو یا کسی بااختیار آدمی نے واپس لینے پر اصرار کیا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس طرح تو اسلامی ماحول قیامت تک پیدا نہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی ماحول اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا جب تک نظام حکومت اسلامی نہ ہو اور سچے، مخلص، نیک اور اسلامیت کے شیدا اس کے کارفرما نہ ہوں۔ اگر بیمار ہوں تو طبیب حاذق ہی کے پاس جائیں گے۔ انجینئر یا فوجی میجر کے پاس نہیں جائیں گے۔ اسلامی نظام کی طلب صحیح معنوں میں اس وقت پوری ہوسکتی ہے کہ اس نظام کو سمجھنے والے لوگ سامنے آئیں نہ کہ وہ لوگ کہ جن کے نزدیک بڑی بڑی تنخواہیں اور مغربیوں کا انداز معاشرت اس دنیا کی سب سے بڑی رفعت ہے۔ اگر یہ رفعت اسلام کے نام لے کر حاصل ہو سکتی ہے تو ضرور حاصل کر لینی چاہیے اور افسوس کی بات ہے کہ مغربیت کی بھی صرف وہ چیزیں انہوں نے لیں جو عیوب میں شمار ہونے کے قابل تھیں۔ مغربیوں کی مستعدی، فرض شناسی، محنت اور احساس ذمہ داری سے وہ بالکل بے بہرہ رہے۔ ملت کی طلب اور اس کے لئے ملت کی تڑپ بالکل درست اور ہر لحاظ سے قابل قدر ہے لیکن مریضوں کا علاج طبیب ہی کریں گے۔ انجینئروں سے رجوع بالکل بے سود اور بے نتیجہ رہے گا۔ ارباب اختیار کے لئے دو راستے ہیں۔ اول خلوص کے ساتھ اپنی زندگیوں کو سراپا اسلامی بنانا اور اسلامی نظام کو جلد از جلد جاری کرنا۔ دوم اختیار و اقتدار کو ان افراد کے حوالے کر دینا جو اپنے ذاتی اعمال اور صلاحیتوں کی بنا پر پیش نظر مقصد کو پورا کر سکتے ہوں۔ تیسرا راستہ کوئی نہیں

اور تذبذب یا بے عملی کی موجودہ حالت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔''[60]

اس اداریے میں کوئی بات مبہم نہیں تھی۔ صرف ایک بات نہیں لکھی تھی اور وہ یہ کہ قائداعظم جناح، لیاقت علی خان اور دوسرے مغرب زدہ، جھوٹے، منافق، بداعمال اور اسلامیت سے بے بہرہ ارباب اقتدار کو جمہوری طرز کی حکومت سے علیحدہ ہونا چاہیے اور ان کی جگہ شبیر احمد عثمانی، ابوالاعلیٰ مودودی اور دوسرے ایسے علما کو خلافتی نظام حکومت کی باگ ڈور دینی چاہیے جو سچے، مخلص، نیک اور اسلامیت کے شیدا ہیں۔

چودھری رحمت علی کی پاکستان آمد......اس نے قائداعظم کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا کیا اور پاکستان کو دوبارہ سے بنانے کی تحریک کا اعلان کیا

جب انقلاب کا مذکورہ اداریہ لکھا گیا تھا ان دنوں چودھری رحمت علی بھی لاہور آیا ہوا تھا جس نے 1932ء میں لندن کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے دوران چلہ کر کے حکم الٰہی کے مطابق پاکستان کی سکیم کے بارے میں ایک پمفلٹ لکھ کر اسے 1933ء کے اوائل میں مسلمان لیڈروں میں تقسیم کیا تھا۔ یہ شخص ساڑھے سترہ سال انگلستان قیام کرنے کے بعد لاہور آیا تھا۔ یہ برصغیر کی تقسیم کے بارے میں 3 رجون 1947ء کے پلان کے سخت خلاف تھا اور برصغیر میں مسلمانوں کے اقتدار کے لئے ازسرنو جدوجہد کرنے کا عزم رکھتا تھا۔ وہ قائداعظم جناح پر اس وجہ سے بدکلامی کی حد تک نکتہ چینی کرتا تھا کہ انہوں نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کو منظور کر لیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ہم ہندوستان کے ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ اس نے 19 رمئی کو لاہور میں ایک انٹرویو کے دوران کہا کہ ''میں پورے پاکستان سے اپنے دوستوں اور ہمدردوں کی عنقریب ایک میٹنگ بلاؤں گا اور اس طرح میں اس نصب العین کے لئے کچھ کر جانے یا مر جانے کے عہد کی تجدید کروں گا جس میں ''پاکستان کی قومی آزادی کی تحریک'' کے لئے لائحہ عمل مرتب کروں گا۔ میری تحریک کے تین مقاصد ہوں گے۔ اول یہ کہ پاکستان کو علاقائی لحاظ سے ازسرنو یکجا کرنا، دوئم یہ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو قومی ریاستوں کی صورت میں خودمختاری دلوانا اور سوئم یہ کہ بنی نوع انسان کے مسائل کے حل کے لئے اسلامی برادری کی تنظیم۔ اس نے کہا کہ مجھے پاکستان کی پارلیمانی سیاسیات میں کوئی دلچسپی نہیں کیونکہ میں غیر مسلم بادشاہ کی وفاداری کا حلف نہیں اٹھا سکتا۔[61]

اس چودھری رحمت علی نے اگرچہ ساڑھے سترہ سال انگلستان کے جدید صنعتی معاشرے میں گزارے تھے لیکن اس کے ذہنی ارتقا کی سطح قرون وسطیٰ کے مُلّاؤں سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ سمجھتا تھا کہ اس نے جنوری 1933ء میں پاکستان کی سکیم کے بارے میں چار صفحات پر مشتمل جو پمفلٹ شائع کیا تھا اس سے اس نے مسلمانان ہند کی تقدیر کا فیصلہ صادر کر دیا تھا۔ اگرچہ اس کی اس سکیم میں افغانستان اور ایران کا ذکر تو موجود تھا لیکن بنگال کے مسلمانوں کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ پھر 1940ء میں قرارداد لاہور کی منظوری کے بعد اس نے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا اس کا نقشہ یہ تھا کہ برصغیر میں مسلمانوں کی تین ریاستیں ہونی چاہئیں۔ ایک پاکستان جس میں پنجاب، افغانیہ (صوبہ سرحد) کشمیر، ایران، سندھ (بشمول کچھ اور کاٹھیاواڑ) افغانستان اور بلوچستان شامل ہوں گے۔ دوسری بانگ اسلام (بنگال و آسام) اور تیسری عثمانستان (حیدر آباد دکن) جہاں مسلمانوں کی آبادی صرف 9 فیصدی تھی)۔ لیکن جب 3/جون 1947ء کے پلان کے مطابق پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے بعد 14/اگست 1947ء کو پاکستان بن گیا اور اس کے بننے کا سہرا صرف قائداعظم جناح کے سر پر باندھ دیا گیا تو یہ بہت برہم ہوا۔ اول اس لئے کہ یہ پاکستان اس کے عظیم الشان منصوبے کے مطابق نہیں تھا اور دوئم اس لئے کہ حکومت پاکستان نے اسے بابائے قوم کا وہ بلند و بالا مقام نہیں دیا تھا جس کا وہ اپنے آپ کو مستحق سمجھتا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسے پاکستان کے ایوان اقتدار میں تھوڑی سی جگہ بھی نہیں دی گئی تھی۔ چنانچہ مئی 1948ء میں جب قائداعظم جناح بہت بیمار ہو چکے تھے اور مختلف وجوہ کی بنا پر پاکستان کے ارباب اقتدار کی سیاسی ساکھ کو کاری ضرب لگ چکی تھی تو اس نے انگلستان سے یہاں آ کر لاہور اور پنجاب کے دوسرے شہروں میں جناح کے خلاف تحریری اور تقریری طور پر سخت زہر افشانی کی جس کی وجہ سے دقیانوسی مُلّاؤں کی خلافتی مہم کو بہت فائدہ پہنچا۔

جماعت اسلامی کا محکمہ دفاع کے افسروں میں اثر و رسوخ اور مودودی کا فتویٰ کہ کشمیر کی جنگ جہاد نہیں ہے

جماعت اسلامی کا امیر ابوالاعلیٰ مودودی ان دنوں پشاور کے دورے پر تھا۔ وہ قبل ازیں پنجاب اور کراچی کا بھی دورہ کر چکا تھا جس کے دوران اسے یہ احساس ہوا تھا کہ پاکستان کی

سیاسی فضا مسلم لیگی ارباب اقتدار کے لئے بڑی تیزی سے ناسازگار ہورہی ہے۔ وہ اس سیاسی فضا سے دوطرح کے فائدے اٹھانا چاہتا تھا۔ پہلا یہ کہ اگست 1947ء سے پہلے اسے تحریک پاکستان کی مخالفت میں جو ناکامی ہوئی تھی اس کا انتقام لیا جائے اور دوسرا یہ کہ اگر موقع ملے تو پاکستان کے امیر المومنین کی مسند پر بھی قبضہ کیا جائے۔ چنانچہ اس نے جنوری 1948ء کے بعد راولپنڈی سے لے کر کراچی تک اپنی تقریروں میں حکومت پاکستان کے خلاف مذہب کے نام پر اتنا زہر اگلا تھا کہ کراچی کے روزنامہ انجام کی 16 رمئی کی ایک خبر میں یہ بتایا گیا تھا کہ ''مولانا مودودی امیر جماعت اسلامی کی سرگرمیاں حکومت پاکستان کے لئے تشویشناک بن گئی ہیں اور حکومت کو یقین ہے کہ یہ ریاست کے بہترین مفادات کے حق میں مضرت رساں ثابت ہورہی ہیں۔ چنانچہ ان کی حرکات وسکنات کی نگرانی کے لئے خفیہ پولیس مامور کردی گئی ہے، نیز حکومت کے مختلف شعبہ جات میں مولانا مودودی کے پیروؤں کے خلاف بھی خفیہ ہدایات جاری کر دی گئی ہیں۔ گزشتہ دنوں حکومت پاکستان کے ایک اہم ترین محکمے کے چند ملازمین نے، جو جماعت اسلامی کے پیروکار ہیں، یہ مطالبہ کیا تھا کہ تمام انگریزوں کو محکمہ سے نکال دیا جائے، انگریزی کی جگہ اردو رائج کی جائے اور محکمہ کا نظم ونسق خالص اسلامی طریق کار پر چلایا جائے۔ اس واقعہ نے حکومت کی توجہ مولانا مودودی کی جانب مبذول کرائی اور اب ان اور ان کی جماعت کے خلاف انتہائی سخت کاروائی کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ مولانا مودودی حکومت الٰہیہ کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے جماعت اسلامی کی تاسیس کی ہے جس کے پیروؤں کی تعداد روز افزوں ترقی پر ہے۔ گزشتہ ماہ مولانا کراچی بھی تشریف لائے تھے۔ اس کے بعد سے کراچی میں ان کی جماعت کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئیں اور حکومت پر نکتہ چینیاں عام ہوگئیں۔ اس جماعت کی طرف سے کچھ پوسٹر بھی چسپاں کئے گئے ہیں جن میں مجلس دستور ساز سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ مملکت کے لئے اسلامی آئین وضع کرے۔''[62] اس خبر میں حکومت کے جس اہم ترین محکمہ میں سے انگریزوں کو نکالنے اور محکمہ کا نظم ونسق خالص اسلامی طریق کار پر چلایا جانے کے سلسلے میں جماعت اسلامی کے پیروؤں کے مطالبہ کا ذکر ہے وہ محکمہ دفاع تھا۔ اس محکمہ کے تینوں شعبوں میں انگریز افسروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان انگریز افسروں کے ماتحت پاکستانی افسران سے بہت ناخوش تھے۔ اولاً اس لئے کہ بری فوج کے انگریز کمانڈر انچیف

جنرل گریسی (Gracey) نے اکتوبر 1947ء میں کشمیر میں فوجی کاروائی کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ثانیاً اس لئے کہ ان انگریزوں کی موجودگی کی وجہ سے پاکستانی افسروں کی ترقیاں رکی ہوئی تھیں۔ غالباً جماعت اسلامی نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر اس محکمہ میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کی کوشش کی تھی جسے حکومت پاکستان برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

چنانچہ اس خبر کی اشاعت کے چند دن بعد حکومت آزاد کشمیر کے محکمہ نشر واشاعت کا سربراہ نبی بخش نظامی پشاور میں ابوالاعلیٰ مودودی کے پاس پہنچا اور اس سے استفسار کیا کہ کشمیر میں ہندوستانی افواج کے خلاف جو لڑائی ہو رہی ہے وہ اسلامی نقطہ نگاہ سے جہاد ہے یا نہیں؟ اس پر مودودی نے جواب دیا کہ جب تک حکومت پاکستان اور حکومت ہند کے درمیان معاہدانہ تعلقات ہیں اس وقت تک مسلمانان پاکستان کے لئے اس میں حصہ لینا جائز نہیں۔ نبی بخش نظامی نے مودودی کا یہ جواب فوراً ہی بعض اخبارات میں چھپوا دیا تو پورے ملک میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ان دنوں پاکستان کی باقاعدہ افواج کشمیر کے محاذ پر ہندوستانی افواج سے نبرد آزما ہو چکی تھیں کیونکہ حکومت پاکستان کو خدشہ تھا کہ ''ہندوستان موسم گرما میں کشمیر کے اس علاقے پر بڑا دھاوا بول دے گا اور اگر اس نے اوڑی، پونچھ اور نوشہرہ پر قبضہ کر لیا تو پاکستان مزید ساڑھے ستائیس لاکھ خانماں برباد مہاجرین کے سنگین مسئلے سے دوچار ہو جائے گا۔ ہندوستان پاکستان کی دہلیز پر آ بیٹھے گا اور جب چاہے گا پاکستان میں داخل ہو جائے گا۔ پاکستان کے سول اور ملٹری ادارے اعتماد نفس سے محروم ہو جائیں گے، پاکستان کے اندر تخریبی قوتیں فروغ پائیں گی۔''[63]

جب مودودی کے اس جواب پر ہنگامہ بہت بڑھ گیا تو جماعت اسلامی کے سیکرٹری میاں طفیل محمد نے مئی کے آخری ہفتے میں روزنامہ انقلاب کے نام ایک خط میں اس مسئلہ پر جماعت اسلامی کے موقف کی وضاحت کی۔ اس نے لکھا کہ ''اصل واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے اس مسئلہ سے متعلق پشاور میں یا کسی دوسری جگہ تقریر نہیں فرمائی۔ مولانا کے گزشتہ دنوں کے قیام کے دوران ایک کشمیری صاحب ان سے ملاقات کے لئے تشریف لائے اور انہوں نے مسئلہ کشمیر کے بارے میں بہت سے سوالات کئے۔ ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ آیا جنگ کشمیر جہاد ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ جہاں تک ریاست جموں وکشمیر کے مسلمان باشندوں کا تعلق ہے ان کے لئے یہ جنگ جہاد کے حکم میں ہے کیونکہ ریاست نے ان پر ظلم وستم

کیا، انہیں مٹانے اور جلاوطن کرنے کی کوشش کی اور پھر انڈین یونین اپنی فوجیں لے کر ان پر حملہ آور ہو گئی۔ اس کے خلاف یہ مظلوم لوگ اپنے جان و مال اور آبرو کی حفاظت کے لئے لڑنے کا اخلاقی، قانونی اور شرعی ہر لحاظ سے جواز رکھتے ہیں۔ لیکن جہاں تک اہل پاکستان کا تعلق ہے وہ اپنے مظلوم بھائیوں کے ساتھ خواہ کتنی ہمدردی رکھتے ہوں بہر حال وہ اس جنگ میں حصہ لینے کا شرعاً اور اخلاقاً کوئی حق نہیں رکھتے کیونکہ ان کی نمائندہ حکومت کا حکومت ہند سے معاہدہ قائم ہے اور اس نے باقاعدہ اعلان جنگ نہیں کیا ہے۔ پاکستان کے شہریوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی حکومت کے کئے ہوئے معاہدات کی خلاف ورزی سے پرہیز کریں۔"[64] طفیل محمد کا یہ بیان عذر گناہ بدتر از گناہ کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ اس میں کشمیر کے محاذ پر پاکستانی افواج سے کہا گیا تھا کہ وہ ہندوستان کے خلاف یہ غیر اسلامی لڑائی نہ لڑیں۔

ابوالاعلیٰ مودودی اور اس کے سیکرٹری کو پاکستان کے قومی مفاد کے خلاف اس طرح کے فتوے صادر کرنے کی جرأت اس لئے ہوئی تھی کہ گزشتہ تین چار ماہ سے پاکستان میں اسلامی نظام کے علمبرداروں نے مرکزی ارباب اقتدار کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ جمعیت العلمائے اسلام، جمعیت العلمائے پاکستان، جمعیت استحکام پاکستان، خلافت ربانی گروپ، شریعت گروپ، جماعت اسلامی اور مجلس احرار اسلام کے علاوہ مُلّاؤں کے دوسرے بہت سے گروہوں کا شب و روز مطالبہ یہ تھا کہ پاکستان میں شرعی قوانین کا فوری نفاذ کیا جائے اور پاکستان کے ارباب اقتدار کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بھڑوں کے اس چھتے سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ جب ابوالاعلیٰ مودودی پشاور میں تھا تو ایبٹ آباد میں مجلس احرار اسلام کا مطالبہ یہ تھا کہ "پاکستان میں اسلامی نظام قائم کیا جائے کیونکہ قرآنی قانون کے سوا کسی دوسرے قانون کا نفاذ سراسر ناجائز اور ناقابل عمل ہے۔"[65] اور پھر چند دن بعد مسلم لیگ کے اندر شریعت گروپ کے قائد پیر مانکی کا لاہور میں اعلان یہ تھا کہ "آج ہماری تکلیفوں اور مصیبتوں کا باعث رشوت خور، بے دین، بدچلن اور نالائق حاکم ہیں بلکہ یہ غیر اسلامی آئینی حکومت ہے جو رشوت خور، بے دین، بدچلن اور نالائق ہے...... ہمارے لیڈر کوتاہ اندیش اور ناسمجھ ہیں۔ ان کو تو اس قسم کے جھگڑوں سے فرصت نہیں ملتی کہ فاتح کشمیر کا لقب زید کو عطا ہوتا ہے یا بکر کو۔ آج بھی یہ لوگ بعض مسائل میں غفلت کر رہے ہیں۔ میں نے ان لیڈروں کے خلاف گروپ نہیں بنایا۔ میں خود ان کی جگہ نہیں لینا چاہتا لیکن میں مسلم لیگ

کے اندر رائے عامہ کو ایسا منظم کرنا چاہتا ہوں کہ جب یہ اپنے احمقانہ فیصلوں پر قوم کو قربانی کا بکرا بنانا چاہیں تو ان کو ایسا کرنے سے باز رکھا جائے۔ یہ کوشش تبھی کامیاب ہو سکتی ہے جب عام مسلمان مسلم لیگ میں جوق در جوق شامل ہو کر شریعت کو پاکستان کا آئین بنانے کا مطالبہ کریں۔"[66]

26 مئی کو نوشہرہ میں جامع مسجد کے خطیب مولوی محمد عبدالستار کی زیر صدارت ایک جلسہ میں مطالبہ کیا گیا کہ "دستور ساز اسمبلی اس امر کا اعلان کرے کہ (1) پاکستان کا دستور اساسی شریعت اسلامی پر مبنی ہوگا۔ (2) پہلے سے جاری شدہ غیر شرعی قوانین منسوخ کر دیئے جائیں گے۔ اور (3) آئندہ کوئی خلاف شرع قانون نافذ نہیں کیا جائے گا۔"[67] 27 مئی کو لاہور کے ایک سابق کانگرسی مولوی احمد علی نے ایک بیان میں اپنی جمعیت استحکام پاکستان کے اس مطالبے کا اعادہ کیا کہ پاکستان کے آئین میں یہ الفاظ شامل کئے جائیں کہ "پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا اور قرآن حکیم کو قانون سازی کی بنیاد بنایا جائے گا۔"[68] اسی دن شیخوپورہ میں نماز عشا کے بعد ایک جلسہ میں پیر مانکی نے آل پاکستان مسلم لیگ شریعت گروپ کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ "ہمیں موجودہ غیر اسلامی نظام بدلنا ہے۔ ہمیں شریعت کو پاکستان کا آئین بنانا ہے۔" مولوی عبدالستار نیازی نے اس جلسہ میں کہا کہ "پاکستان کسی جغرافیائی قطعہ ارض کا نام نہ تھا۔ پاکستان زندگی کے کسی ایک مسئلہ کا حل نہ تھا۔ پاکستان تو ایک ضابطہ حیات، ایک نظام سلطنت اور زندگی کے ہر مسئلہ کے حل کا نام تھا۔ دو قومی نظریہ کا مطلب ہی یہی تھا کہ پاکستان کا آئین شریعت اسلامیہ ہوگا۔"[69]

سول اور ملٹری بیوروکریسی کو مولویوں کی سرگرمیوں پر تشویش اور ممدوٹ حکومت کی حمایت میں نوائے وقت کا مولویوں کے خلاف اداریہ

چونکہ شرعی نظام کی اس بحث میں جماعت اسلامی اور مجلس احرار اسلام کے مُلّاؤں کے علاوہ بہت سے ایسے کانگرسی مولوی پیش پیش تھے جن کا مقصد محض یہ نہیں تھا کہ قومیتی اور طبقاتی مشکلات پر قابو پانے کے کام میں اسلام کا نام لے کر حکومت کی امداد کی جائے بلکہ جن کا اصلی مقصد اپنی سیاسی رقابت کے پرانے جذبہ کے تحت مسلم لیگ کی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے لئے مشکلات پیدا کر کے اپنے لئے اقتدار کی راہ ہموار کرنا تھا، اس لئے پنجاب کے تعلیم یافتہ

درمیانہ طبقہ کے بعض عناصر بالخصوص سول، ملٹری اور جوڈیشل بیوروکریسی کے ارکان، ان مولویوں کی سرگرمیوں کے بارے میں مرکزی حکومت کی تشویش کو جائز سمجھتے تھے۔ ان عناصر کو بجا طور پر خدشہ تھا کہ مختلف فرقوں کے مولویوں نے شرعی نظام کی جو مہم شروع کر رکھی ہے اس کی وجہ سے پاکستان میں مسلمانوں میں افتراق و انتشار پھیلے گا کیونکہ شیعہ، سنی، وہابی، بریلوی، دیوبندی، احمدی اور مودودی فرقہ کے مولوی شرعی نظام کے کسی ایک اصول پر بھی متفق نہیں ہو سکیں گے۔ مزید برآں جماعت اسلامی کے امیر ابوالاعلیٰ مودودی نے حکومت پاکستان کو غیر اسلامی قرار دینے کی مہم کے دوران محکمہ دفاع میں اپنا اثر پھیلانے کی جو ابتدا کی تھی وہ درمیانہ طبقہ کے بہت سے لوگوں کے نزدیک فی الحقیقت خطرناک تھی اور اسی طرح مجلس احرار اسلام نے ضلعی سطح پر بعض مسلم لیگیوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے جو ''تبلیغی سرگرمیاں'' شروع کی تھیں وہ خطرے سے خالی نہیں تھیں۔ چنانچہ پنجاب کے اس درمیانہ طبقہ کے ترجمان اخبار نوائے وقت نے مئی کے اواخر میں اس خطرے کا نوٹس لیا۔ اس کا ادارتی تبصرہ یہ تھا کہ ''بعض اہل غرض اسلامی حکومت کے قیام کی آڑ لے کر قوم، ملک اور حکومت کی راہ میں مشکلات پیدا کر رہے ہیں۔ ان میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو قیام پاکستان سے پہلے خضر حیات یا کانگرس کے اجیر تھے اور 15 راگست 1947ء تک پاکستان کے خلاف سرگرم عمل رہے۔ آج بھی یہ لوگ دل سے پاکستان کے خیر خواہ نہیں۔ ان لوگوں نے بھی اپنی بگڑتی ہوئی ساکھ بنانے اور مسلمانوں میں اپنے لئے جگہ پیدا کرنے کے لئے اس نعرہ کو اپنایا۔ کاش یہ لوگ سچے دل سے اسلامی حکومت کے حامی ہوتے۔ مگر جو لوگ مسلمان حکومت کے وفادار نہیں وہ اسلامی حکومت کے قیام کے کیوں کر مؤید ہو سکتے ہیں۔ ان کھوٹے سکوں کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ کسی طرح ان کی لیڈری کی دکان چل نکلے۔'' کہنے والے کو مت دیکھو۔ یہ دیکھو یہ کیا کہتا ہے۔'' عام حالات میں یہ فارمولا ٹھیک ہے مگر اس معاملے میں ''کہنے والے کو دیکھنا'' نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ سرے سے امر متنازعہ ہی نہیں۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ اسے کس نیت سے کہہ رہا ہے۔ یہ انتباہ نہ صرف اس لئے ضروری ہے کہ مسلمان عوام ان لوگوں سے خبردار رہیں جو اس نعرہ کی آڑ میں اپنی اغراض پوری کرنا چاہتے ہیں بلکہ ہم اس خطرے کا سد باب بھی کرنا چاہتے ہیں کہ کہیں ان غلط عناصر کی منافقانہ تائید اصل مقصد عزیز کو نقصان پہنچانے کا موجب ثابت نہ ہو۔''[70] نوائے وقت کی جانب سے اس انتباہ کی

ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان دنوں پنجاب کی حکومت میں وزیراعلیٰ نواب ممدوٹ اور وزیرخزانہ ممتاز دولتانہ کے دھڑوں کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ ممتاز دولتانہ اور شوکت حیات خاں نے صوبائی کابینہ سے استعفیٰ دے دیا تھا اور خیال تھا کہ آئندہ مدیر نوائے وقت کے ممدوح نواب ممدوٹ کو دولتانہ دھڑے کی حمایت کے بغیر ہی حکومت چلانا پڑے گی۔ اس وقت تک لیاقت علی خان اور نواب ممدوٹ کے دھڑے کے درمیان تضاد میں بظاہر زیادہ شدت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ نوائے وقت نہیں چاہتا تھا کہ ایسی صورت میں جماعت اسلامی، مجلس احرار اسلام وغیرہ شرعی نظام کے نعرے کے زور سے نواب ممدوٹ کی انتظامیہ کے لئے مشکلات پیدا کریں۔ مجلس احرار کے مولویوں نے لائل پور (فیصل آباد) میں اپنی پہلی کانفرنس میں مسئلہ ختم نبوت کا ذرا دھیمے لہجے میں ذکر شروع کر دیا تھا اور جماعت اسلامی نے پاکستانی افواج اور پولیس اور دوسرے چھوٹے بڑے سول ملازمین کی حب الوطنی کی بیخ کنی کی ابتدا کر دی تھی۔

احراری اور کانگرسی مولوی اور مودودی نفاذ شریعت کی مہم چلانے حکومت کے خلاف میدان عمل میں نکل آئے، بیمار قائداعظم زیارت میں صاحب فراش ہو گئے

تاہم نوائے وقت کے مذکورہ انتباہ کا ان دونوں جماعتوں نے کوئی اثر قبول نہ کیا۔ 31رمئی 1948ء کو احراریوں نے بعض دوسرے مولویوں کے ساتھ مل کر مظفر گڑھ کے عیدگاہ میدان میں ایک جلسہ کر کے یہ اعلان کیا کہ ''اگر اسلام کے بغیر کوئی دستور حکومت تیار کر کے پاکستان میں نافذ کیا گیا تو نہ یہ صرف خدا سے کھلی بغاوت ہوگی بلکہ پوری قوم کے ساتھ وعدہ خلافی اور ارباب اقتدار کی فرض ناشناسی اور پاکستان کے حقیقی مفاد سے صریح دشمنی ہوگی۔ اس جلسہ میں اس مطالبہ کا اعادہ کیا گیا کہ دستور ساز اسمبلی اعلان کرے کہ ''(1) پاکستان کی بادشاہی صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور پاکستان گورنمنٹ کی حیثیت سوا اس کے نہیں کہ وہ اپنے مالک کی مرضی اس کے ملک میں پوری کرے۔ (2) پاکستان کا بنیادی قانون اسلامی شریعت ہے۔ (3) خلاف شریعت تمام احکام وقوانین منسوخ کئے جاتے ہیں۔ (4) پاکستان گورنمنٹ اپنے اختیارات شرعی

حدود کے اندر استعمال کرے۔''[71] 7/جون کو پیر محل کے جلسے میں بھی بالکل یہی مطالبات کئے گئے۔ 9/جون کو چنیوٹ کی شاہی مسجد میں یہی مطالبات دہرائے گئے اور حکومت پاکستان پر واضح کیا گیا کہ ''مسلمان کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ تمام آفات و مصائب کا واحد علاج اسلام ہے۔ اس لئے مشکلات کے اس دور میں اسلام کی اطاعت مملکت پاکستان کا واحد حل ہے۔ اس سے مسلمانان پاکستان ایک نقطے پر متحد ہو سکتے ہیں لہٰذا اس مطالبہ کو جلد از جلد منظور کر کے مسلمانان پاکستان کو اندرونی خلفشار سے بچایا جا سکتا ہے۔''[72]

اسی قسم کے بہت سے جلسے پنجاب کے دوسرے چھوٹے بڑے شہروں میں بھی ہوئے جن میں اسی مضمون کی قراردادیں منظور کی گئیں اور جو اس حقیقت کے مظہر تھے کہ احراریوں اور دوسرے کانگرسی مولویوں نے بڑے ہی منظم طریقے سے یہ مہم شروع کی تھی اور اس مہم کو صوبہ سرحد کے پیر مانکی کے شریعت گروپ سے اور پنجاب کے عبدالستار نیازی کے خلافت گروپ سے بڑی تقویت ملتی تھی۔ پنجاب میں ان دونوں گروپوں کے مشترکہ جلسے ہوتے تھے جن میں بیشتر مسلم لیگی لیڈروں کو اسلام و عوام کا دشمن قرار دیا جاتا تھا اور جملہ عالمان دین و سجادہ نشینوں کی خدمت میں گزارش کی جاتی تھی کہ وہ حسب سابق میدان عمل میں نکلیں اور مسلم لیگ کی زمام اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے کر پاکستان میں قرآنی نظام رائج کریں۔ 10/جون کو جہلم کے ایک جلسے میں پیر مانکی کی تقریر کی تان اس انتباہ پر ٹوٹی تھی کہ ''اگر پاکستان میں قانون شریعت نافذ نہ کیا گیا تو صوبہ سرحد میں پانسہ پلٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ جو لوگ عبدالغفار خان کو بے اثر سمجھ رہے ہیں وہ خیالی بہشت میں رہ رہے ہیں۔ حکومت افغانستان بھی در پردہ پاکستان کے خلاف زہر پھیلا رہی ہے اور فقیر ایپی ہمارے زبردست مخالف ہیں اور ان سب باتوں سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ سرحد کے عوام الناس ڈاکٹر خان صاحب کی حکومت کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔''[73]

احراریوں اور دوسرے کانگرسی مولویوں کے علاوہ جماعت اسلامی کا امیر ابوالاعلیٰ مودودی بھی مزید کھل کر میدان میں آ گیا تھا۔ اس کی وجہ بظاہر یہ تھی کہ چونکہ حکومت پاکستان نے کشمیر کی لڑائی کے بارے میں اس کے مخالفانہ فتوے پر کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا اس لئے خان عبدالغفار خان کی طرح اس کی بھی یہی رائے تھی کہ پاکستان ایک ریت کی دیوار ہے جسے وہ ایک ٹھوکر مار کر گرا سکتا ہے۔ پاکستان میں اس کے ماہنامہ ترجمان القرآن کا پہلا شمارہ جون 1948ء

میں شائع ہوا تو اس میں اس نے پاکستان کے آبرو باختہ مسلم لیگی قائدین کے ماضی و حال کی بداعمالیوں پر بڑی بے رحمی سے نکتہ چینی کی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ ''یہ عین وہی لوگ ہیں جو اپنی پوری سیاسی تحریک میں اپنی غلط سے غلط سرگرمیوں میں اسلام کو ساتھ ساتھ گھسیٹتے پھرے ہیں۔ انہوں نے قرآن کی آیتوں اور حدیث کی روایتوں کو اپنی قوم پرستانہ کشمکش کے ہر مرحلے میں استعمال کیا ہے۔ انہوں نے پاکستان کے معنی لا الہ الا اللہ بیان کئے ہیں...... لیکن افسوس کہ ان کی محبت اسلام کے، ان کی خدا ترسی کے، ان کی حب رسالت کے، ان کی قرآن دوستی کے اور ان کی لا الہ نوائی کے جو عملی مناظر پاکستان کے دس ماہ کی تاریخ کے عجائب خانے میں آراستہ ملتے ہیں ان کو دیکھ کر ہر حساس مسلمان کی گردن شرم سے جھکی جاتی ہے۔ کسی ملک و قوم کی انتہائی بدقسمتی یہی ہو سکتی ہے کہ نا اہل اور اخلاق باختہ قیادت اس کے اقتدار پر قابض ہو جائے...... اگر حالات معمولی نہ ہوں بلکہ ایک قوم کی تعمیر کا آغاز ہو رہا ہو اور یہ آغاز بھی نہایت ساز گار دور کے درمیان ہو رہا ہو، ایسے حالات میں کسی غیر صالح قیادت کو ایک منٹ کے لئے بھی گوارا کرنا خلاف مصلحت ہے۔ ایک غلط قیادت کی بقا کے لئے کسی طرح کی کوشش کرنا ملک و قوم کے ساتھ سب سے بڑی غداری اور غلط قیادت سے نجات دلانے کی فکر کرنا اس کی سب سے بڑی خیر خواہی ہے۔''

مودودی نے اپنے ماہنامے کے اس شمارے میں کشمیر کی لڑائی کے بارے میں بھی اپنے فتوے پر اظہار پشیمانی نہ کیا بلکہ اس نے قرآن مجید کی سورہ انفال کا حوالہ دے کر لکھا کہ ''اس آیت میں یہ بات صاف کر دی گئی ہے کہ اگر ہماری سرحد کے باہر کسی مسلمان آبادی پر ظلم ہو رہا ہو اور وہ ہم سے مدد مانگے تو ہم اس صورت میں مدد کو جا سکتے ہیں جبکہ ظلم کرنے والی قوم کے ساتھ ہمارے (قومی حیثیت سے) معاہدانہ تعلقات نہ ہوں۔ لیکن اگر ظالم قوم کے ساتھ ہمارا معاہدہ ہو تو ہمارا دل خواہ اپنے مظلوم بھائیوں کی مصیبت میں کتنا ہی کڑھتا ہو ہم ان کی حمایت میں انفرادی یا اجتماعی طور پر کوئی جنگی کاروائی نہیں کر سکتے۔''[74] بادی النظر میں ابوالاعلیٰ مودودی کا یہ اصرار اس کی سیاسی مصلحت کے خلاف تھا کیونکہ پنجاب کا درمیانہ طبقہ اس کے اس موقف کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم اس نے یہ اصرار محض یہ ثابت کرنے کے لئے کہ میں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلے کے مقابلے میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔

26 رجون 1948ء کو روزنامہ انقلاب نے مجلس احرار، جماعت اسلامی اور جمعیت

العلمائے اسلام، خلافت ربانی گروپ، شریعت گروپ کے مُلّاؤں اور پیروں کی جانب سے جاری کردہ شرعی نظام کی اس زوردار مہم کی تائید میں ایک زوردار اداریہ لکھا جس میں اس نے نوائے وقت کے اس موقف کو غلط قرار دیا کہ ''جو لوگ کل تک پاکستان کے مخالف تھے اور لیگ کی تنظیم سے الگ رہے بلکہ انہوں نے انتخابات میں لیگ کے امیدواروں کی مخالفت کی وہ نظام شرعی کے حامی بنے ہوئے ہیں اور پاکستان کو ناکام بنانے کے لئے مذہب کی آڑ لے رہے ہیں۔'' اور پھر لکھا کہ ''اگر نظام شرعی کا اجرا نیک اور مستحسن کام ہے اور یقیناً ہر مسلمان کا عقیدہ اور ایمان یہی ہونا چاہیے تو کیا اس نیک اور مستحسن کام کی حمایت کے ثواب سے ان لوگوں کو محروم رکھنے کی آرزو جائز ہے جو کل تک لیگ کے مخالف تھے؟ کیا بھائی چاہتے ہیں کہ وہ لوگ بدستور غلطیوں میں مبتلا رہیں اور اگر ان کی زبانوں پر کوئی نیک کلمہ جاری ہو تو غصے اور غیظ سے مضطرب ہو کر شور مچانے لگیں کہ ان سے بچو کیونکہ یہ پہلے سے مسلمانوں کے ساتھ نہ تھے۔ مسلمانوں کی شان یہ تھی کہ وہ جس کسی مخالف کو اپنا ہمنوا پاتے تھے تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ لیکن آج یہ حالت ہے کہ مسلمانوں کے ایک طبقے کو رنج ہوتا ہے کہ دوسرا کیوں نیکی میں ہمارا ہمنوا بنا۔ مخالف کیوں نہ رہا تاکہ اس کی مذمت کرتے۔ جس گروہ کو دنیا کی ہدایت پر نہیں بلکہ گمراہی پر خوشی ہو اس کے اسلامیت یقیناً محل نظر سمجھنی چاہیے۔ سب سے بڑھ کر حیرت اس بات پر ہے کہ شرعی نظام کے اجرا سے پاکستان کی ناکامی کے اسباب کیونکر بروئے کار آجاتے ہیں؟ اگر کارفرمایان پاکستان شرعی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں اور عام مسلم لیگی مسلمانوں کے ساتھ وہ لوگ بھی اس کی تائید کرتے ہیں جو پہلے لیگ کے ساتھ نہیں تھے تو یہ فضا تو عین کامیابی اور فائز المرامی کی فضا ہے جو ہر شخص کو مطلوب ہونی چاہیے...... اس سلسلے میں ''مذہب کی آڑ'' کا طعنہ بالکل نازیبا ہے۔ اگر کسی گروہ کو شرعی نظام کے اجرا سے اختلاف ہے تو اس کے لئے معذرت آرائیوں اور بہانہ جوئیوں کی ضرورت نہیں۔ دوسروں پر تعریض کے تیر برسانے سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ صاف اقرار کیجئے کہ یہ چیز منظور نہیں یا پھر ہمت کیجئے اور جو کچھ مطلوب ہے اس کو پورا کر دیجئے اور جو لوگ اس مطالبے میں شریک ہیں ان سب کا یکساں خیر مقدم کیجئے...... اصلیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس قسم کی باتیں اضطرار کی حالت میں تراشی جاتی ہیں...... یہ کہ نہ شرعی نظام سے انکار کی جرأت ہے اور نہ اسے نافذ کرنے کا حوصلہ ہے۔''[75]

انقلاب کے اس اداریے کا پس منظر یہ تھا کہ یہ اخبار پنجاب کے ان یونینسٹ مسلمان جاگیرداروں کی ترجمانی کرتا تھا جنہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد یہ جاگیردار کچھ عرصہ تک تو گوشہ نشینی میں رہے لیکن جب 1948ء کے اوائل میں شرعی نظام کی مہم نے زور پکڑنا شروع کیا تو یہ بھی زور شور سے مُلاّؤں کی ہمنوائی کرنے لگے تھے۔ ان کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ وہ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھا کر اور مذہب کی آڑ لے کر پھر میدان سیاست میں آنا چاہتے تھے اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ وہ مُلاّؤں کی مذہبی حمایت سے اپنی زرعی جائیدادوں کی حفاظت کرنا چاہتے تھے اور یہ موقع اس لئے بھی زیادہ غنیمت تھا کہ جون 1948ء میں جب مُلاّ نفاذ شریعت کا جھنڈا اٹھا کر حکومت کے خلاف میدان میں نکل آئے تھے تو انہی دنوں بابائے قوم قائداعظم جناح شدید علالت کی حالت میں زیارت جیسے دور افتادہ مقام پر چلے گئے تھے۔ مولویوں اور جاگیرداروں کی یہ امید بے جا نہیں تھی کہ عمر رسیدہ، ضعیف اور بیمار بانی پاکستان اب تھوڑے عرصہ کے مہمان ہیں۔

باب:4

جناح بستر مرگ پر
اور ملاؤں کی مسند اقتدار کے لئے دوڑ

تحریک پاکستان کے کارکنوں اور درمیانہ طبقہ کے بعض روشن خیال عناصر کی جانب سے ملاؤں کی مخالفت

جن دنوں قائداعظم زیارت میں بستر مرگ پر موت وحیات کی کشمکش سے دوچار تھے، ملاؤں کی جانب سے مسلم لیگی قیادت کو غیر اسلامی قرار دیتے ہوئے نفاذ شریعت کی زوردار مہم چلائی گئی تو درمیانہ طبقہ کے ان مسلم لیگیوں کے لئے جنھوں نے تحریک پاکستان میں سرگرمی سے حصہ لیا تھا یہ صورت حال قابل برداشت نہ رہی۔ چنانچہ خانیوال مسلم لیگ کے ایک ایسے ہی سیکرٹری نے روزنامہ ''امروز'' کے نام ایک مراسلے میں یہ شکایت کی تھی کہ'' جناب پیر صاحب مانکی شریف اور مولانا عبدالستار صاحب نیازی خانیوال تشریف لائے۔ ہر دو صاحبان کی مقبولیت میں کسی کو شک وشبہ کی گنجائش نہیں مگر مسلم لیگ کے ہر مخلص کارکن اور عام مسلمانوں کو یہ دیکھ کر بے حد دکھ ہوا کہ یہ دونوں اصحاب سردار خضر حیات خان کے ایک شکست خوردہ اور بدنام رفیق کے مہمان کی حیثیت سے تشریف لائے اور انہیں کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ یہ رہبران قوم ایک ایسی ٹی پارٹی میں بھی بحیثیت معزز مہمان کے دیکھے گئے جس کے میز بان خان بہادر ہیبت خان ڈاھا شکست خوردہ ایم۔ ایل۔ اے۔ وسابق یونینسٹ لیڈر تھے۔ یہ صاحب ابھی تک خان بہادر ہیں اور انہوں نے اب تک اپنی وہ پٹیشن بھی واپس نہیں لی جو محض اس بنیاد پر دائر کی گئی کہ مسلم لیگ نے عوام کو دھوکا دے کر اور خدا اور قانون فطرت کا غلط واسطہ دے کر مسلمانوں سے پاکستان کے

حق میں ووٹ حاصل کئے تھے۔[1] امروز نے یہ خط اس لئے چھاپا تھا کہ یہ اخبار افتخار الدین کی ملکیت تھا جس کا ان دنوں پبلک جلسوں میں سیاسی نعرہ یہ تھا کہ پاکستان میں معاشی و معاشرتی مساوات کا نظام رائج کرنے کے لئے زمینوں اور صنعتوں کو قومی ملکیت میں لیا جائے۔ اس نعرے کی بنیاد پر امروز کا اداریہ یہ تھا کہ ''اگر کوئی جماعت یہ چاہتی ہے کہ پاکستان میں موجودہ ''فرنگی ''نظام حکومت کی بجائے ''اسلامی'' نظام حکومت رائج ہو تو اس کا فرض ہے کہ وہ جمہور کو بتائے کہ اس کا پیش کردہ اسلامی نظام، آج روزمرہ زندگی کے جن بڑے بڑے مسائل سے جمہور کو سابقہ پڑ رہا ہے ان کا حل کیا پیش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر من جملہ اور مسائل کے اس وقت ایک بڑا مسئلہ زمین کا ہے جس کی وجہ سے پاکستان کے ہر صوبے میں آج ہنگامہ بپا ہے اور کروڑوں کسان اس امر کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ جس زمین کو وہ جوتتے ہیں اس کا حاصل ان کو ملے نہ کہ ان زمینداروں اور جاگیرداروں کو جو کچھ بھی نہیں کرتے اور اس کے باوجود زمین کی آمدنی پر اپنا حق جتلاتے ہیں۔ اسلامی نظام کے حامیوں کا فرض ہے کہ وہ اس اہم قومی مسئلے کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر کی وضاحت کریں اور مسلمان جمہور کو بتاسکیں کہ اسلامی نظام کے قیام کے بعد کیا سلوک کیا جائے گا۔ آیا ''الارض للہ'' کے اسلامی اصول کو تسلیم کیا جائے گا یا آج کے ''فرنگی نظام'' کی طرح زمین ایسے ہی زمینداروں اور جاگیرداروں کے پاس رہنے دی جائے گی کہ جب ان کا جی چاہے کسانوں کو لوٹیں کھسوٹیں اور ان کے خون سے اپنی عشرت کی کھیتیاں سیراب کریں۔''[2]

اسی موضوع پر امروز میں ایک صاحب سید علی عباس بخاری کا ''پاکستان اور شریعت اسلامی'' کے زیر عنوان ایک طویل مضمون شائع ہوا جس میں بڑی صاف گوئی سے بڑی سچی باتیں کہی گئی تھیں۔ یہ ایسی باتیں تھیں کہ جن کا ملاؤں کے پاس کوئی معقول جواب نہیں تھا۔ اس فکر انگیز مضمون کے بعض اقتباسات یہ تھے کہ ''ظاہر پرستی کے نقطہ نگاہ کے ماتحت آج کل پاکستان میں شرعی قوانین و حدود کے نفاذ پر مریضانہ زور دیا جا رہا ہے اور جوش مطالبہ میں زمانے کے صحت مند رجحانات اور جاندار سیاسی، معاشی اور عمرانی قدروں کو پس پشت ڈالا جا رہا ہے۔ یہ لوگ اسلام کی انقلابی روح سے بے خبر ہیں۔ ہمارے ملک کے کونے کونے میں معاشی بے انصافی قائم ہے۔ مقتدر طبقہ کے چند افراد کروڑوں کسانوں اور مزدوروں کے حقوق کو پاؤں تلے کچلتے رہیں۔ حکومت کے محکموں میں رشوت ستانی اور کنبہ پروری کی لعنت برقرار رہے۔ قربانی کا وقت آئے تو

امرا محفوظ رہیں اور عامۃ الناس موت کے گھاٹ اترا کریں۔ رؤسا کے نالائق لڑکوں کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور دے دی جائے اور غریبوں کے قابل بچے اعلیٰ تعلیم کی دولت سے محروم رہ کر گلیوں کی خاک چھانتے پھریں، ان کی بلا سے۔ یہ تو اس ہٹ پر قائم ہیں کہ ہمیں گلی کوچوں میں ایسے آدمی کیوں دکھائی نہیں دیتے جن کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے ہوں۔ شرعی قوانین کی ترویج میں اور دقت بھی ہے جس پر بہت کم غور کیا جاتا ہے کہ آخر کون سے مذہب کا شرعی دستور نافذ کیا جائے۔ بظاہر یہ احمقانہ سوال ہے کیونکہ ہر ایک کہے گا کہ شرعی دستور تو مذہب اسلام کا ہی نافذ ہوتا ہے مگر ہمارے علما اپنے مباحثہ میں مذہب کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد اسلام سے نہیں ہوتی بلکہ چاروں آئمہ میں سے کسی ایک کے مسلک سے ہوتی ہے۔ کسی سے پوچھا جائے کہ آپ کا مذہب کیا ہے تو اس جواب سے، کہ میرا مذہب اسلام ہے، پوچھنے والے کی تسکین نہیں ہوتی۔ وہ دوبارہ پوچھتا ہے آپ امام اعظم کا مذہب رکھتے ہیں یا کسی دوسرے امام کا۔ گویا اپنے آپ کو مسلمان ثابت کرنے کے لئے اتنا ہی کافی نہیں کہ میں جناب محمدﷺ عربی کی امت سے ہوں بلکہ کہنا پڑتا ہے کہ میں امام ابوحنیفہ کا پیرو ہوں یا امام شافعی کا مذہب رکھتا ہوں۔ اس کے علاوہ پاکستان میں اہل تشیع کی جماعت ہے جو امامیہ، اسماعیلیہ، زیدیہ وغیرہ کئی فرقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ پھر غیر مقلد ہیں، اہل قرآن ہیں۔ اہل حدیث ہیں۔ دیوبندی ہیں، بریلوی ہیں۔ سب سے زیادہ تعداد جاہل پیر پرستوں کی ہے جو اپنے پیر کو قاضی الحاجات سمجھتے ہیں۔ انہیں نہ کسی امام کی پرواہ ہے اور نہ کسی مجتہد کی۔ اور پھر پیرزادے بھی کئی مسلک رکھتے ہیں۔ کوئی چشتی ہے، کوئی نقشبندی، کوئی قادری ہے کوئی سہروردی۔ بڑے بڑے فرقے بے شمار چھوٹی چھوٹی شاخوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان سب میں عقائد کے علاوہ معمولی شرعی مسائل کے معاملہ میں بھی شدید اختلافات ہیں جن کی بنا پر وہ مخالف کا سر پھوڑنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ان اختلافات کے پیش نظر کس مذہب کے قانون کو اختیار کیا جائے۔ حنفی کو، مالکی کو، حنبلی کو، شافعیہ کو، امامیہ کو، غیر مقلدوں کے طریقے کو یا پیروں کے دستور کو۔ بعض حضرات فوراً جواب دیں گے پاکستان میں امام اعظم کے پیرو سب سے کثیر تعداد میں ہیں لہٰذا ان کے مذہب کا دستور شریعت نافذ ہونا چاہیے۔ مگر ستم یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے پیرو بھی کئی چھوٹی چھوٹی شاخوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ امام موصوف کی وفات کے بعد ان کے دو مقتدر شاگردوں محمد اور ابو یوسف میں اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ کچھ عرصہ بعد تو یہ

حالت ہوئی کہ امام اعظم کے جتنے مقلد تھے اتنے ہی قوانین فقہ رائج تھے۔

''اس کے علاوہ امام اعظم عجمی النسل تھے۔ عرب ممالک کے مسلمان شافعی یا مالکی مذاہب کے پیرو ہیں۔ ان کے خیال میں یہ حضرات عربی النسل ہونے کی وجہ سے قرآن اور حدیث کو زیادہ اچھی طرح سمجھتے تھے۔ عربوں کی پیروی میں کیوں نہ امام مالک یا امام شافعی کے مذہب کو پاکستان میں رواج دیا جائے۔ پھر چاروں آئمہ میں بنیادی اختلافات ہیں۔ مثال کے طور پر غنا یا گانے بجانے کو لیں۔ امام اعظم اس کے شدید مخالف ہیں۔ چشتیہ خاندان کے صوفیا اور امام شافعی کے نزدیک سماع یا گانا جائز ہے۔ یوم اقبال کی تقریب پر مجھے ایک جلسہ میں شرکت کا موقع ملا۔ جلسہ میں ہارمونیم کے ساتھ چند لڑکیوں نے اقبال کی غزلیات گا کر سنائیں۔ ایک مولوی صاحب بھی شریک محفل تھے، بہت جز بز ہوئے۔ چند دن بعد جمعہ کے خطبہ میں فرمانے لگے کہ امام اعظم کے خیال کے مطابق جو حضرات سرود کو جائز سمجھتے ہیں یا اس میں دلچسپی لیتے ہیں ان پر ان کی بیویاں حرام ہو جاتی ہیں اور ملت کو حق حاصل ہے کہ ان کی بیویاں زبردستی ان سے چھین کر ''مستحقین'' میں بانٹ دی جائیں۔ جو حضرات ریڈیو پر گانا سنتے ہیں یا ریکارڈ بجاتے ہیں خبردار رہیں۔ زمانہ حال میں ماہرین نفسیات نے موسیقی کے اثرات کو جاں بخش اور روح افروز قرار دیا ہے۔ چنانچہ بعض ذہنی عوارض کا علاج موسیقی سے کیا جاتا ہے۔ اگر پاکستان میں حنفی فقہ کا نفاذ ہوا تو ریڈیو پر موسیقی کا پروگرام یقیناً بند ہو جائے گا اور لوگ ایک فن لطیف کی برکات سے محروم ہو جائیں گے۔ دوسری مثال نظام زمینداری کی لیں۔ امام اعظم کے نزدیک زمینداری یا مزارعت، جس میں چند شرائط کے ماتحت زمین مزارعوں کو دے دی جاتی ہے، قطعاً ناجائز ہے، مگر دوسرے آئمہ اسے جائز قرار دیتے ہیں۔ اگر حنفی فقہ کے ماتحت بڑے زمینداروں کو اراضی سے محروم کیا گیا تو وہ لامحالہ دوسرے آئمہ کے عقائد کی آڑ لیں گے۔ ان سب باتوں کو چھوڑیئے۔ سوال یہ ہے کہ جو مجلس پاکستان کے لئے شرعی قوانین کا دستور مرتب کرے گی وہ کن مذاہب کے نمائندوں پر مشتمل ہوگی۔ کیا اس میں مقلدوں کے علاوہ غیر مقلدوں اور اہل تشیع کو بھی نمائندگی دی جائے گی۔ اگر نہیں دی جائے گی تو کیوں؟ اگر دی جائے گی تو دستور شریعت کا مرتب ہونا معدوم۔ دوسرے فرقوں کے علاوہ اگر بریلوی اور دیوبندی عقائد کے دو مولوی صاحبان اکٹھے ہو گئے تو مسلح افواج کی موجودگی میں مذاکرات جاری رکھنے پڑیں گے چہ جائیکہ سارے فرقوں کے شرعی اور فقہی

عقائد کو زیر بحث لا کر ایک مشترکہ شرعی قانون مرتب کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ شرعی قانون کا اطلاق تعزیرات، وراثت، بیع وسزا وغیرہ چیدہ چیدہ مسائل پر نہیں ہوگا بلکہ روزمرہ کی زندگی کے معمولات اور عبادت کے جزئیات کو بھی ایک مرکز پر لانا ہوگا۔ جہاں جزئیات کی بحث چھڑے گی وہاں فتنوں کا دروازہ کھل جائے گا اور ایک وقت وہ بھی آ جائے گا جب قلیل التعداد فرقوں کو گزشتہ ایام فساد کی طرح اکثریت کے خلاف دفاعی مورچے باندھ کر لڑنا پڑے گا...... ان حقائق کے پیش نظر بہتر یہ ہوگا کہ پاکستان کے تمام فرقوں کو حکمت اسلام کے بنیادی اصولوں پر، جن پر سب کا اتفاق ہے، کاربند ہونے کی دعوت دی جائے اور فقہی معاملات میں سب کو اپنے اپنے حالات پر چھوڑ دیا جائے۔ جس حد تک قانون کا تعلق ہے پاکستان کے مروجہ قانون کو برقرار رکھا جائے۔ یہ قانون اٹل نہیں۔ سماج کی ضروریات اور زمانے کی مقتضیات کے ماتحت اس میں ہر وقت ترمیم کی جا سکتی ہے۔ نفسیات نے جرم وسزا پر جو روشنی ڈالی ہے اس کے پیش نظر سزا کا مقصد اب عوام کو عبرت دلانا نہیں رہا بلکہ مجرم کی اصلاح بن گیا ہے۔ اب مجرم کو ہمدرد اور مشفق ماہرین نفسیات کی جدید تحقیقات کے ماتحت ردوبدل کیا جا سکتا ہے۔ شرعی قوانین کے مطالبہ کا جواب ارباب حکومت کی طرف سے یہ دیا جا رہا ہے کہ لوگوں کی موجودہ اخلاقی حالت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اس وقت شرعی قانون کا نفاذ کیا جائے۔ یہ ایک بودی دلیل ہے لیکن قرین مصلحت ضرور ہے۔ اگر شرعی قوانین وحدود کا نفاذ ہو گیا تو جس بے دردی سے ہندوؤں کا مال واسباب، جو مہاجرین کا حق تھا، لوٹا گیا ہے اس کے پیش نظر پاکستان کے شہروں اور قصبوں کے گلی کوچوں میں لنجوں اور لولے لنگڑوں کے سوا کوئی شخص دکھائی نہ دے گا۔“ [3]

سید علی عباس بخاری کے مضمون کے ان اقتباسات میں سے صاف دکھائی دیتا تھا کہ اس شخص کے سینے میں حب الوطنی کا بے پناہ جذبہ موجزن تھا۔ یہ خلوص دل سے چاہتا تھا کہ ملک وقوم کی سالمیت اور یکجہتی قائم رہے۔ ان کی آزادی وخودمختاری کو کوئی گزند نہ پہنچے اور غریب عوام قدامت پرست علما ومشائخ کے چنگل سے نکل کر ترقی وخوشحالی کی راہ پر گامزن ہوں۔ لیکن اس کی مشکل بھی وہی تھی جو ملک کے دوسرے ترقی پسند عناصر کی تھی اور وہ یہ تھی کہ اس شخص میں بھی امروز اخبار کے مالک افتخار الدین کی طرح یہ جرأت ایمانی نہیں تھی کہ ببانگ دہل کہے کہ پاکستان میں

قائداعظم جناح کی 11راگست 1947ء کی تقریر کے مطابق مذہب کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ مذہب ذاتی ایمان وایقان کا معاملہ ہے ہر شخص کو اپنی نجی زندگی میں اپنے صحیح یا غلط مذہبی عقائد پر عمل کرنے کی مکمل آزادی ہونی چاہیے۔ کسی کو یہ اجازت نہیں ہونی چاہیے کہ وہ اپنی ذاتی اغراض پوری کرنے کے لئے مذہب کی آڑ لے کر سیاسی کاروبار کرے اور اس طرح ملک کی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی فضا کو مکدر کرے۔ سید علی عباس بخاری وغیرہ بورژوا نقطہ نگاہ سے اسلام کی ترقی پسندانہ یا انقلابی تعبیر کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ ان کی تعبیر عصر جدید کے تقاضوں کے مطابق ہے اور عوام الناس کے اجتماعی مفاد میں ہے اس لئے اس کی کامیابی ہوگی۔ لیکن یہ ان کی بہت بڑی بھول تھی اور ان کی اس بھول نے ملک وقوم کو فائدہ پہنچانے کی بجائے بہت نقصان پہنچایا۔ وہ ملاؤں کے ساتھ تقریباً اسی طرح کا مناظرہ کرتے تھے جس طرح کا مختلف فرقوں کے علما اور مشائخ کے درمیان سینکڑوں سال سے جاری تھا۔ بالفاظ دیگر وہ اس طرح اسلام میں ایک اور نئے ''فرقہ جدیدیہ'' کا اضافہ کر کے عوام الناس کو مزید ذہنی الجھن میں مبتلا کرتے تھے۔ وہ اس حقیقت کا احساس نہیں کرتے تھے کہ پاکستان میں کسی بھی نقطہ نگاہ سے مذہبی بحث سے ملائیت کو تقویت ملتی تھی۔ اسلام کی تفسیر وتعبیر کی اجارہ داری سینکڑوں سال سے علماو مشائخ کے پاس تھی اور عوام الناس انہی کی تفسیر وتعبیر کو صحیح ماننے کے عادی تھے۔ ان کے لئے داڑھی منڈھے اور سوٹ بوٹ میں ملبوس مغرب زدہ عناصر کی ترقی پسندانہ یا انقلابی تعبیر قابل قبول نہیں ہوسکتی تھی۔ علاوہ بریں مذہب کی اپنی اغراض کے مطابق تفسیر وتعبیر کرنا علماو مشائخ کا ہمہ وقتی پیشہ تھا۔ وہ اپنی ضروریات زندگی کی تکمیل کے لئے کوئی محنت ومشقت نہیں کرتے تھے بلکہ وہ دوسروں کے حلوے مانڈے پر گلچھرے اڑا کر مساجد میں اپنے فن خطابت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ان ہمہ وقتی پیشہ ور ملاؤں کا مذہبی پلیٹ فارم پر ترقی پسند عناصر مقابلہ نہ کرسکتے تھے اور نہ کرسکے۔

قائداعظم جناح نے اپنی 11راگست 1947ء کی تقریر میں پاکستانی قومیت کو مذہب وملت سے بالاتر مقام دے کر اور مذہب انسان کا نجی معاملہ قرار دے کر پاکستان کی سیاست کی بالکل صحیح بنیاد رکھی تھی۔ مگر بدقسمتی سے بعض داخلی وخارجی عوامل کی کارفرمائی کی وجہ سے وہ اپنے اس موقف پر زیادہ دیر تک قائم نہ رہے اور انہوں نے محض سیاسی مصلحت کے تحت 30راکتوبر 1947ء سے جب پھر اسلام اور مسلم قومیت کا نام لینا شروع کر دیا تو انہوں نے نادانستہ طور پر

سیاست کا میدان از خود ان دقیانوسی ملاؤں کے حوالے کر دیا جن میں سے بیشتر نے 14 راگست 1947ء سے قبل تحریک پاکستان کی مذہب کے نام پر سرتوڑ مخالفت کی تھی اور پھر وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اولاً اپنے جاگیردارانہ طبقاتی مفاد کی بنا پر ثانیاً حیدرآباد دکن اور یو۔پی کے مفاد پرستوں کے زیر اثر اور ثالثاً پنجاب کے یونینسٹ جاگیرداروں کے ساتھ سیاسی گٹھ جوڑ کی وجہ سے ملاؤں کو بہت تقویت پہنچائی۔نوائے وقت جیسے اخبارات نے محض پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے مفاد پرست عناصر کے تحفظ وفروغ کے لئے اسلام اور مسلم قومیت کے نعرے لگا کر ملاؤں کی اس تخریبی قوت میں دو چند اضافہ کیا تھا اور اس طرح پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کا رخ ابتدا ہی میں قرون وسطیٰ کے استبدادی دور کی طرف کر دیا گیا۔اگر چہ ملاؤں کا یہ کہنا صحیح تھا کہ 46-1945ء کی انتخابی مہم کے دوران مسلم لیگی لیڈروں اور کارکنوں نے مذہبی نعرے لگائے تھے لیکن یہ محض نعرے تھے۔ان انتخابات سے پہلے مسلم لیگ کی کسی ایک قرارداد میں بھی یہ نہیں کہا گیا تھا کہ برصغیر کی جغرافیائی تقسیم کے بعد مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل جو آزاد و خود مختار ریاستیں قائم ہوں گی ان میں شرعی نظام نافذ کیا جائے گا۔ان انتخابات کے بعد اپریل 1946ء میں ارکان اسمبلی کے کنونشن میں 3 رجون کے پلان کی منظوری کے بارے میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے 10 رجون کو جو قرارداد منظور کی تھی اس میں بھی یہ نہیں کہا گیا تھا کہ پاکستان میں اسلامی نظام رائج ہوگا حالانکہ 3 رجون کے پلان میں کانگرس کی خواہش کے مطابق قرار دیا گیا تھا کہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم مذہب کی بنیاد پر ہوگی۔مسلمانان ہند نے ہندوؤں کے سیاسی،معاشی،معاشرتی اور ثقافتی غلبہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے برصغیر کی جغرافیائی تقسیم کروائی تھی۔ عام خیال یہ تھا کہ چونکہ ہندوستان اور پاکستان ممالک میں مسلمان اور ہندو اقلیتیں ہوں گی،اس لئے دونوں ہی ممالک میں اقلیتوں سے ظلم وستم روا نہیں رکھا جائے گا۔ یہ بات کسی کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھی کہ برصغیر کے شمال مغربی علاقے میں آبادی کا اتنے پیمانے پر جبراً تبادلہ ہوگا اور نتیجتاً ان ملاؤں کو جنہوں نے تحریک پاکستان کی مذہب کے نام پر مخالفت کی، پاکستان کے اندر مذہب کے نام پر ہی اپنی انتقامی سیاست کو فروغ دینے کا موقع ملے گا۔

سید علی عباس بخاری کی طرح پاکستان میں بعض دوسرے لوگ بھی تھے جو اسلام کی ترقی پسندانہ یا انقلابی تعبیر کر کے علما اور مشائخ کی انتشار انگیز اور تخریبی سرگرمیوں کا سدباب کرنا

چاہتے تھے۔ان میں ایک شخص غلام جیلانی برق بھی تھا جس نے مارچ 1948ء کے دوسرے ہفتے کے نوائے وقت میں ایک مضمون کے ذریعے محب الوطن عناصر کو متنبہ کیا تھا کہ اگر ان ملاؤں کو مذہبی مناظروں کی کھلی چھٹی ملی رہی تو پوری قوم فرقہ پرستی اور انتشار کا شکار ہو کر تباہ و برباد ہو جائے گی۔اس نے اپنے اس مضمون میں ملاؤں کے 30 فرقے گنوائے تھے اور ان فرقوں کے متضاد عقائد کا ذکر کر کے یہ واضح کیا تھا کہ پاکستان میں ملائیت کا فتنہ تباہ کن ہوگا اور آخر میں امید ظاہر کی تھی کہ ''ہمارے علما ان چھوٹے موٹے اختلافات سے بلند رہ کر اپنی تمام تر توجہ قوم کی اخلاقی اصلاح پر صرف فرمائیں گے۔ان کا صحیح منصب یہی ہے۔''[4]

ایک اور شخص عین الملک کے نام سے روزنامہ انقلاب میں بھی اس موضوع پر بڑی دردمندی سے خامہ فرسائی کرتا تھا۔یہ پنجاب مسلم لیگ کے 1945ء کے انتخابی منشور کا حوالہ دے کر اسلام کی انقلابی تعبیر کرتا تھا اور اس امر پر بڑے دکھ کا اظہار کرتا تھا کہ ''ہمارے علما و مشائخ اسلام کی اس طرح تفسیر و تعبیر کرتے ہیں کہ جس سے صرف سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو فائدہ پہنچے۔اور ہر اس شخص کو کمیونسٹ قرار دیتے ہیں جو غریبوں کی فلاح و بہبود کا ذکر کرتا ہے اور عوام الناس کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ خارجی اثرات سے بالاتر ہو کر صالح اور متدین بنیں۔ہمارے ان مذہبی لیڈروں نے اپنے عمل سے معاش کو مذہب سے نکال ہی دیا ہے تاکہ لوگوں کو پیچ در پیچ امر تاویلات کے چکر میں ڈال کر عمرانی شعور سے محروم رکھیں۔یہ ان مذہبی رہنماؤں کی دسیسہ کاریوں کا نتیجہ ہے کہ صوم وصلوٰۃ کی پابندی اور قرآن وحدیث کے چرچے کے باوجود معیشت و معاشرت میں مساوات و توازن مفقود ہے۔''[5] اس نے مزید لکھا کہ ''ہمارے یہ دینی اجارہ دار وہی کچھ کر رہے ہیں جو یورپ میں پادریوں نے کیا تھا یعنی بجائے اصلاحی اقدام کرنے کے انقلابی رو کو لامذہبیت کے الزام سے ضعیف کرنا چاہیے۔وہ اسلامی مساوات و مواخات کے قائل بھی ہیں مگر اس کے لئے جو تحریک کی جائے اس کو کمیونزم کہہ کر ختم کرنا چاہتے ہیں۔گویا اسلام کی معاشی مساوات کا اقرار محض خود فریبی ہے اور عوام کو موجودہ نکبت و ادبار سے وابستہ رکھنے کا ایک ڈھونگ ہے۔''[6] اور مزید لکھا کہ ''چونکہ مشائخ کے خود ساختہ ''جہالت کے جزیرے'' سماجی زندگی کے ساکن پانیوں ہی میں قائم رہ سکتے ہیں اس واسطے جہاں کہیں بھی سماج کی سطح پر معمولی سی لہر بھی اٹھے اور فکر و عمل کی ڈگر میں ذرا سا بھی تغیر رونما ہو، سب سے زیادہ خوف ان مشائخ پر طاری ہوتا

ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی عظمت کا مینار بصیرت پر نہیں بلکہ خاص قسم کی مسلسل ترغیب وتربیت پر ہے۔ اس واسطے وہ سمجھتے ہیں کہ انقلاب کا معمولی سا جھونکا ان کے ''قصر ریگ'' کو پیوند خاک کر دے گا۔ اس واسطے معاشی انقلاب کے سب سے بڑے دشمن یہ لوگ ہوتے ہیں۔ چونکہ اس مذموم مشن کے لئے عقل سازگار نہیں ہوتی اس واسطے وہ قرآن وحدیث کی جناتی تعبیروں سے تنقید کو کند کرنے کی کوشش کرتے ہیں...... یہ مشائخ اپنے فرسودہ ہتھیاروں سے مسلح ہو کر میدان میں اترے ہوئے ہیں۔ الحاد الحاد کے نعرے لگا کر لوگوں کو متنبہ کر رہے ہیں حالانکہ ان کی اپنی زنبیل کا اسلام اس مزعومہ الحاد سے زیادہ الحاد خیز ہے کیونکہ اس اسلام میں ان کے اپنے لئے اور اپنے ''عشیرۃ الاقربین'' کے لئے تو راحت وآرام ہے مگر مریدوں کے لئے وعدہ فردا۔''[7]

سید علی عباس بخاری، غلام جیلانی برق اور عین الملک وغیرہ کی طرح پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان اور دوسرے ارباب اقتدار بھی اسلام کی ملاؤں سے مختلف تعبیر کرتے تھے لیکن ان کی ترقی پسندانہ تعبیر صرف نظام حکومت تک محدود ہوتی تھی۔ وہ جب 1300 سال پہلے کے اسلام کے جمہوری اصولوں کا ذکر کرتے تھے تو ان کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اسلامی جمہوریت اور بورژوا جمہوریت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جہاں تک معاشی مسئلہ کا تعلق تھا وہ بھی علما اور مشائخ کی طرح اس کو مذہب سے الگ رکھتے تھے وہ جب اسلامی مساوات اور اخوت کا ذکر کرتے تھے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ ملک کے نظام معیشت میں مساوات کا اصول رائج کرنا چاہتے تھے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا تھا کہ محمود اور ایاز کو مسجد میں ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی اجازت ہوگی اور ہر شخص کو رائے دہندگی کا حق حاصل ہوگا۔ وہ ملاؤں کی اس خطرناک مہم سے بہت پریشان تھے کہ ملک میں شرعی نظام یا خلافتی یا شرعی قوانین کا فوری نفاذ کیا جائے بلکہ وہ کہتے تھے کہ ''پاکستان میں قانون شریعت کے فوری نفاذ کا مطالبہ قبل از وقت ہے اور اس صورت میں پاکستان کو نہایت خطرناک حالات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ قانون شریعت کے فوری نفاذ کا مطلب یہ ہوگا کہ عوام حکومت پاکستان کے خلاف ہو جائیں گے جسے پہلے ہی گوناگوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس وقت ہمارا اولین فرض یہ ہے کہ پاکستان میں ایسے مطالبات پیش کرنے کی بجائے اسے صحیح معنوں میں مضبوط مملکت بنائیں۔ قانون شریعت کی علمبرداری کرنے والوں نے آج تک اپنے نظریے کی وضاحت کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔

قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں اسلامی مملکت کے لئے تمام اسلامی ممالک کے خلیفہ کا وجود ضروری ہے۔ پاکستان میں اسلامی مملکت کا مطالبہ کرنے سے پہلے تمام اسلامی ممالک کی فیڈریشن کے قیام کا مطالبہ کرنا ضروری ہے۔ جب تک دوسرے مسلم ممالک قرآنی نظام کو نہیں اپنائیں گے پاکستان میں اسلامی مملکت قائم کرنے کا مطالبہ بے سود ہوگا۔"[8]

ڈاکٹر غلام جیلانی برق حکومت پاکستان کے شرعی قوانین کے فوری نفاذ کے خلاف اس نقطہ نگاہ سے متفق تھا۔ وہ اس سلسلے میں حکومت کی حمایت اس دلیل کے ساتھ کرتا تھا کہ مختلف فرقوں کے علما و مشائخ کسی شرعی مسئلہ پر متفق نہیں ہو سکتے۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ "شریعت کیا چیز ہے؟ اس کے متعلق علما کے مختلف گروہ ہیں۔ (1) ایک گروہ کا تصور یہ ہے کہ اگر ہر آدمی کو نماز پڑھنے اور داڑھی رکھنے پر مجبور کر دیا جائے تو شریعت کا منشا پورا ہو جائے گا۔ (2) ایک گروہ کا خیال ہے کہ زانی کو دروں اور چور کو قطع ید کی سزا دینے سے شریعت کا نفاذ عمل میں آجائے گا۔ (3) ایک گروہ یہ چاہتا ہے کہ وزرا حضرت عمر کی طرح گشت کیا کریں اور بدکار کو قلمرو پاکستان میں کہیں پناہ نہ لینے دیں۔ وہ حکام کا محاسبہ کریں، ان کے اعمال کی پوری پوری نگرانی کریں اور جہاں کہیں کسی سے لغزش ہوا سے فوراً سزا دیں۔ (4) ایک اور جماعت یہ چاہتی ہے کہ حکومت "شیخ الاسلام" کے منصب کو پھر زندہ کرے اور ساری سلطنت میں سرکاری وکلا کی جگہ مفتیان دین مقرر ہوں جو عدالتوں کو قرآن وسنت کے منشا سے آگاہ کرتے رہیں۔ الغرض جتنے مولوی، لفظ شریعت کی اتنی ہی تاویلیں۔ اگر آج حضرت قائداعظم پیر مانکی کے تصور کے مطابق شرعی نظام نافذ کر دیں تو مجھے یقین ہے کہ سینکڑوں دیگر علما پوری طاقت سے اس کی مخالفت کریں گے اور اس وقت تک چین نہیں لیں گے جب تک مناصب حکومت میں انہیں مناسب حصہ نہیں مل جائے گا۔"[9] آگے چل کر اس نے لکھا کہ "سلطنت کو بنے سال نہیں ہوا لیکن علما کی ایک خاص جماعت تخریب میں مصروف ہوگئی ہے۔ اگر یہ فتنہ کار علما اپنی حرکات سے باز نہ آئے تو ہم قوم کو یہ بتانے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ہمارے نام نہاد علما نے کتنی ہزار مرتبہ کتنے بڑے بڑے محشر اٹھائے۔ اسلامی سلطنت کو کتنی دفعہ تباہ کیا اور اب کی مرتبہ ان کے ارادے کیا ہیں...... شریعت شریعت پکارنے والوں میں ایک صاحب ایسے بھی ہیں جو ہمیشہ پاکستان کے خلاف کام کرتے رہے۔ جنہوں نے پچھلے دنوں جہاد کشمیر کو فساد قرار دیا تھا۔ آج جب پاکستان ایک حقیقت ثابتہ بن چکا ہے تو وہ خدائی شریعت کا لبادہ اوڑھ کر

پاکستان کو کمزور کرتے پھرتے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمان ان کے عزائم سے پوری طرح آگاہ ہیں اور وہ اس ہمرنگ زمین دام میں کبھی نہیں پھنسیں گے...... مولوی کے نزدیک ضیافت کے لئے ہاتھ دھونا، پورا مرغا پیٹ بھر کر ڈکار لینا اور ساتھ ہی الحمداللہ پڑھنا مذہب، نکاح اور ختنہ مذہب، داڑھی بڑھانا مذہب، فطرانہ وصول کرنا مذہب، لیکن مذہب نہیں تو قوت و ہیبت کے اسرار تلاش کرنا، پہاڑوں کے دل چیر کر زغال اور فولاد باہر لانا اور برق و باد کے رخش سرکش کو لگام دے کر نیلگوں فضاؤں پر حکومت کرنا۔ یعنی ملا یہ چاہتا ہے کہ آپ کی دوڑ صرف مسجد تک ہو، آپ کے تمام معاملات، اعتقادات، اطلاعات اور سیاسیات کا ماخذ مُلاّ ہو۔"[10]

غلام جیلانی برق کا یہ مضمون نوائے وقت میں دو قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ مضمون میں فتنہ پرور ملاؤں میں سے کسی مُلاّ کا نام نہیں لیا گیا۔ ایک مُلاّ جس کی طرف واضح اشارے موجود تھے وہ امیر جماعت اسلامی ابوالاعلیٰ مودودی تھا جسے مضمون نگار کے بقول عالم اسلام کا امیر القوم بننے اور حکومت پر قبضہ کرنے کی ہوس چین نہیں لینے دیتی تھی، جو سلطنت کا خطرناک دشمن تھا لیکن شریعت کے شور مچانے والے انبوہ میں اس طرح خلط ملط ہو گیا تھا کہ اسے کیفر کردار تک پہنچانا بہت دشوار تھا، جو جہاد کشمیر کو فساد قرار دیتا اور خدائی شریعت کا لبادہ اوڑھ کر پاکستان کو کمزور کرتا پھرتا تھا۔

مودودی کے جہاد کشمیر کے خلاف فتویٰ کے رد میں دوسرے مولویوں کے فتوے

اس مضمون کی اشاعت سے چند دن قبل نوائے وقت میں ہی حکومت آزاد کشمیر کے وزیر دفاع کرنل سید علی احمد کا ایک خط شائع ہوا تھا جس میں ابوالاعلیٰ مودودی کے مئی 1948ء کے اس فتوے کی، کہ کشمیر کی لڑائی مسلمانان پاکستان کے لئے جہاد نہیں ہے، کئی دوسرے مولویوں کے حوالے سے تردید کی گئی تھی۔ یہ جوابی فتویٰ لاہور کے مولانا مختار اللہ میرک شاہ نے لکھا تھا اور اس میں کہا گیا تھا کہ "چونکہ کشمیر کے کمزور مسلمان مرد، عورتیں، بچے کفار سے عاجز ہو کر فریاد کر رہے ہیں، ان کی رہائی اور اسلام کے اعزاز اور کفر کے استیصال کے لئے باقاعدہ اجازت کے ماتحت ایک باقاعدہ اسلامی فوج یہ جنگ کر رہی ہے لہٰذا قرآن مجید کی رو سے اس کے جہاد شرعی ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔" ابوالحسنات مولانا محمد احمد قادری، مولانا احمد علی اور مولانا سید

نورالحسن بخاری نے اس فتویٰ پر تائیدی دستخط کئے تھے۔"[11] اسی طرح حضرت شہزادہ باچہ صاحب امیر شریعت قبائل محسود وزیرستان کا بھی ایک چودہ نکاتی فتوی شائع ہوا جس میں اعلان کیا گیا تھا کہ کشمیر کی موجودہ لڑائی بہمہ وجوہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اس فتوے کا تیرھواں نکتہ یہ تھا کہ "ترک جہاد کا کلمہ منہ سے نکالنا اور لوگوں کو جہاد سے باز رکھنا بہت بڑا گناہ ہے۔"[12] صوبہ سرحد کے پیر مانکی کو شہزادہ باچہ سے اتفاق تھا۔ اس نے جولائی کے پہلے ہفتے میں بنوں، لاچی اور ڈیرہ اسماعیل خان میں پبلک جلسوں کو خطاب کرتے ہوئے دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا تھا کہ "جنگ آزادیٔ کشمیر جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ مسلمانان سرحد و آزاد قبائل کو بیش از بیش اس جہاد میں حصہ لینا چاہیے۔"[13] انہی دنوں کوئٹہ سے مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کا بھی فتویٰ موصول ہوا۔ اس کا اعلان یہ تھا کہ "جہاد کشمیر میں شرکت مسلمانوں پر فرض ہے۔ اس لئے میں عاجز قرآن و حدیث کی روشنی میں اپنی پوری ذمہ داری کو پوری طرح سمجھتے ہوئے بآواز بلند کہتا ہوں کہ جو علما اس وقت جہاد کشمیر سے منع کرتے ہیں قرآن سے ناواقف ہیں۔ سیرت نبوی ﷺ اور سیرت صحابہؓ سے بے خبر ہیں۔"[14]

روزنامہ نوائے وقت میں اس قسم کے فتاویٰ اور اعلانات کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہونے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ پنجاب کا درمیانہ طبقہ کشمیر کی لڑائی کے خلاف ابوالاعلیٰ مودودی کے فتوے پر فی الحقیقت بہت برہم ہوا تھا۔ لیکن ایک وجہ اور بھی تھی اور وہ یہ تھی کہ 3 ر جون 1948ء کو پنجاب میں نواب ممدوٹ کی کابینہ کی تشکیل نو ہو چکی تھی۔ ممتاز دولتانہ اور شوکت حیات کی جگہ میجر مبارک علی شاہ، میاں نوراللہ اور عبدالحمید دستی کو نئی کابینہ میں شامل کیا گیا تھا۔ چنانچہ قدرتی طور پر مدیر نوائے وقت کی خواہش یہ تھی کہ شرعی نظام کے علمبرداروں کی جانب سے اس کے ممدوح کی حکومت کے راستے میں مشکلات حائل نہ کی جائیں۔ خود نواب ممدوٹ ان فتنہ پرور ملاؤں سے بہت پریشان تھا۔ اس نے 3 ر جولائی کو لائل پور (فیصل آباد) میں ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے ان افراد اور جماعتوں پر سخت نکتہ چینی کی جنہوں نے تحریک پاکستان کی آخر وقت تک مخالفت کی تھی اور جنہوں نے اب پاکستان میں پناہ گزین ہونے کے باوجود اپنے طور طریقے ترک نہیں کئے تھے۔ اس نے حاضرین کو تلقین کی تھی کہ "ان لوگوں سے خبردار رہو، یہ پاکستان کے دشمنوں، ایجنٹوں اور سازشیوں کا ٹولہ ہے۔"[15]

نوائے وقت نے نواب ممدوٹ کی حکومت بچانے کی خاطر مودودی کی نفاذ اسلام مہم کی سخت مخالفت کی

نواب ممدوٹ کا اشارہ واضح طور پر جماعت اسلامی کے امیر ابوالاعلیٰ مودودی کی طرف تھا اس لئے کہ ایک دن قبل نوائے وقت اس شخص کے خلاف ایک تنقیدی اداریہ لکھ چکا تھا۔ یہ اداریہ نوائے وقت کے 4رجولائی کے شمارے میں شائع ہوا تھا اور اس کا مرکزی پیراگراف یہ تھا کہ ''ہم ان لوگوں کے حامی نہیں جو محض اپنی لیڈری کی دکان چمکانے کے لئے شریعت کا نعرہ بلند کر رہے ہیں اور ایسے لوگوں کی تعداد کچھ کم نہیں۔ ان میں سے ایک گروہ ایسے افراد کا ہے جو مختلف ناموں اور مختلف وجوہ سے 15راگست 1947ء تک پاکستان کی مخالفت کرتے رہے تھے اور آج بھی ان کی رائے یہی ہے کہ مسلم لیگ نے مسلمانوں کے سامنے پاکستان کا نصب العین رکھ کر غلطی کی۔ مگر چونکہ عامتہ المسلمین پاکستان کے خلاف کوئی بات سننے کے روادار نہیں اور یوں بھی پرانی پالیسی اب خالی از خطر نہیں، اس لئے یہ بزرگ نئے بھیس بدل کر مسلمانوں کے سامنے آرہے ہیں۔ بقول کسے جن لوگوں کے نزدیک کل تک ایک مسلمان حکومت کے قیام کا مطالبہ بھی غلط تھا آج وہ اسلامی حکومت کے داعی اور علمبردار ہیں۔ مگر مسلمانوں اور اسلام کی خدمت نہ پہلے ان کا مقصد تھا اور نہ آج ان کا مقصد ہے۔ ان بزرگوں نے نہ کبھی مسلمانوں کی جدوجہد میں حصہ لیا اور نہ آج حصہ لے رہے ہیں۔ ان کی حیثیت پہلے بھی نکتہ چین تماشائیوں کی یا دشمن کے خیمہ برداروں کی تھی اور آج بھی وہ دوراز کار موشگافیوں میں مشغول اور مین میخ نکالنے کو ہی قوم کی سب سے بڑی خدمت سمجھتے ہیں۔''[16] اس اداریے میں نوائے وقت کا مسلم لیگ کے حامیان دین مبین اور مفتیان شرع متین کو مشورہ یہ تھا کہ وہ محض صدارت اور وزارت میں دلچسپی کی وجہ سے ان ملاؤں کے ہاتھوں میں نہ کھیلیں اور جلسوں اور جلوسوں کا ڈھونگ نہ رچائیں کیونکہ ''اگر مقصد عوام کو شریعت اور اسلام کے نام پر گمراہ کر کے لیڈری، صدارت اور وزارت حاصل کرنا ہیں تو صحیح طریق یہ تھا کہ شہر بہ شہر جلسوں میں مسلم لیگ اور قائداعظم کو گالیاں اور ہر شخص اور ہر جماعت کے متعلق سوقیانہ تقریروں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے علما اور ماہرین قانون و دستور ساز کی مدد سے اسلامی نظام حکومت کا ایک خاکہ مرتب کیا جاتا اور اسے قائداعظم اور دستور اسمبلی کے سامنے رکھا

جاتا۔" گویا نوائے وقت کے اس پیراگراف کا اشارہ پیر مانکی اور مولانا عبدالستار نیازی وغیرہ کی طرف تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ لوگ شرعی نظام کی آڑ میں کوئی تحریک چلا کر نواب ممدوٹ کی حکومت کے لئے مشکلات پیدا کریں۔

نوائے وقت میں اس موضوع پر دوسرا اداریہ 15 رجولائی کو شائع ہوا جس میں لکھا تھا کہ "ہم فتنہ پرور اور خود غرض عناصر کو اس کی اجازت دینے کے لئے تیار نہیں کہ وہ اسلام اور اسلامی حکومت کے نعرہ کی آڑ لے کر پاکستان کو کمزور کرنے کی کوشش کریں۔ اسلامی حکومت کے قیام کا انحصار پاکستان کے استحکام پر ہے۔ اگر پاکستان ہی باقی نہ رہا تو اسلامی حکومت کیا ہوا میں قائم ہو گی؟...... ہماری دعا ہے کہ خدا ہمیں پاکستان میں اسلامی حکومت کے قیام کی جدوجہد میں حصہ لینے کی توفیق بخشے۔ لیکن اس کے ساتھ ہماری دعا یہ بھی ہے کہ خدا پاکستان کو مذہب اور اسلام کے نام پر فتنہ پروری کرنے والوں سے بھی محفوظ رکھے۔ تاریخ کے ہر دور میں اسلام اور مذہب کے نام پر مختلف فتنے کھڑے کئے گئے ہیں، اس نئے فتنہ کو محض اس لئے موجب خیر قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اس پر اسلامی کا لیبل چسپاں ہے۔ کیا یہ غلط ہے کہ آج خان عبدالغفار اور جی۔ ایم۔ سید بھی اسلامی حکومت کے داعی بنے ہوئے ہیں؟ (یہ غلط تھا کیونکہ خان عبدالغفار اور جی۔ ایم۔ سید نے مئی میں اپنی جس پیپلز پارٹی کے قیام کا اعلان کیا تھا اس میں سوشلسٹ نظام حکومت کا مطالبہ کیا گیا تھا اور اس کے بعد جون میں خان عبدالغفار خان کو کوہاٹ میں گرفتار کر کے اسے فوراً ہی فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز کے تحت تین سال قید کی سزا دے دی گئی تھی۔ مرتب) کیا یہ غلط ہے کہ بعض ایسے عناصر جو پاکستان کی مخالفت میں ہمیشہ پیش پیش رہے آج حکومت اسلامی کے نعرے لگا رہے ہیں؟ (بالکل صحیح تھا۔ مرتب) کیا یہ غلط ہے کہ کل تک جن بزرگ کا اپنی جماعت کو یہ حکم تھا کہ اگر کہیں ہندو۔ مسلم فساد یا تصادم ہو تو غیر جانبدار رہیں اور آج بھی جن کا فتویٰ یہ ہے کہ کشمیری مسلمانوں کی جنگ آزادی کو جہاد نہیں قرار دیا جا سکتا اور پاکستانی مسلمانوں پر کشمیری مجاہدین کی حمایت فرض نہیں۔ وہ اسلامی حکومت کے قیام کے بہت بڑے علمبرداروں میں سے ہیں؟ (یہ بزرگ ابوالاعلیٰ مودودی تھا اور اس پر یہ الزام مبنی بر صداقت تھا۔ مرتب)۔ ہمیں یہ نصیحت کی جائے گی کہ یہ مت دیکھو کہ کہنے والا کون ہے۔ یہ سنو کہ کہتا کیا ہے، بجا ارشاد ہوا۔ لیکن تاریخ کا کوئی معمولی طالب علم بھی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ بعض اوقات نہایت اچھی باتیں مخصوص اغراض کے ماتحت

کہی گئیں اوران کا نتیجہ ملت کے حق میں بربادی کی صورت میں ظاہر ہوا؟ قرون اولیٰ میں بھی خوارج جو بات کہتے تھے کیا وہ بظاہر نہایت اچھی اور نہایت خوشنما نہ تھی...... جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پورا اسلامی نظام حکومت پہلے سے مرتب موجود ہے وہ یا تو جاہل ہیں یا جھوٹ بول رہے ہیں۔ صحیح معنوں میں مکمل اسلامی نظام حکومت جسے ہم موجودہ آئین کی جگہ دے کر حکومت کی گاڑی کو فوراً اس لائن سے اس لائن پر روانہ کر سکیں، کہیں بھی موجود نہیں اور واقعی ذی علم علما سے زیادہ اس مشکل سے کوئی باخبر نہیں۔ جلسے کرنا اور نعرے لگانا آسان کام ہے لیکن ملک کے لئے ایسا دستور یا آئین مرتب کرنا جو آنے والی نسلوں پر بھی اثر انداز ہوگا بچوں کا کھیل نہیں۔ محض نعروں سے متاثر ہو کر جلد بازی میں کوئی قدم اٹھایا گیا تو آج جس غلطی کا قبل از وقت تدارک آسان ہے اس کے آئین میں داخل ہو جانے کے بعد اس کی اصلاح کے لئے کم از کم پچاس سال درکار ہوں گے۔''[17] لیکن ستم ظریفی یہ تھی کہ اسی نوائے وقت نے 31/ اکتوبر 1947ء کو اسلام کی آڑ لے کر قائداعظم جناح کی جلیل القدر شخصیت پر حملہ کرنے کے بعد 22/نومبر 1947ء کو ابو الاعلیٰ مودودی کی جماعت اسلامی کے اسلامی نصب العین اور اسلامی لائحہ عمل کی تائید کی تھی۔ البتہ اس کی ''ناقص رائے یہ تھی کہ ''پاکستان بن جانے اور جماعت اسلامی کے ارکان کے پاکستان پہنچ جانے کے بعد بھی اس پر اصرار اور اس کا اعلان کہ تحریک پاکستان غلط تھی، نامناسب ہے۔''

ڈپٹی کمشنر جھنگ نے ضلع میں شرعی نظام کے نفاذ کا اعلان کر دیا۔ مذہبی جنون کی فضا میں بعض لوگوں نے عجیب و غریب خیالات پیش کئے

نوائے وقت نے مذکورہ اداریے میں اپنے اس موقف کا اظہار بڑی دیر کے بعد کیا تھا کہ ''صحیح معنوں میں مکمل اسلامی نظام حکومت جسے ہم موجودہ آئین کی جگہ دے کر حکومت کی گاڑی کو فوراً اس لائن سے اس لائن پر روانہ کر سکیں کہیں بھی موجود نہیں'' 15/ جولائی 1948ء تک ہر فرقہ کے دقیانوسی ملاؤں نے، عوام دشمن جاگیرداروں نے اور خود نوائے وقت نے شب و روز شرعی نظام کے نعرے لگا کر مذہبی جنون کو اتنا آگے بڑھا دیا تھا کہ اب اس پر قابو پانا آسان نہیں تھا۔ اس مذہبی جنون کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ جولائی کے دوسرے ہفتے میں ضلع جھنگ کے ڈپٹی کمشنر نواب زادہ فتح اللہ خان نے ایک سرکلر کے ذریعے اپنے ضلع کی حکومت کی گاڑی کو فوراً اس لائن سے

اس لائن پر کرنے کی کوشش کی تھی۔نوائے وقت کی رپورٹ کے مطابق اس سرکلر کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر کسی سرکاری نوکر نے نماز جمعہ کچہری کی مسجد میں ڈپٹی کمشنر موصوف کی اقتدا میں ادا نہ کی تو اس ملازم پر ایک روپیہ جرمانہ کیا جائے گا۔ ڈپٹی کمشنر کی عدم موجودگی میں پولیس لائن کے مولوی صاحب امامت کے فرائض انجام دیا کریں گے۔'' اس رپورٹ میں مزید یہ بتایا گیا تھا کہ مسٹر عزیز مسعود کپتان پولیس عملہ پولیس کے ساتھ باقاعدگی سے نماز جمعہ ادا کرتے ہیں۔ ڈاک خانہ اور تار کے حکام اور نہر کے محکمہ جات بھی اس حکم کو احترام کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور کثرت سے شریک نماز ہوتے ہیں۔ ڈپٹی کمشنر جھنگ کے اس حکم سے چند نمائشی نمازی بھی پر پرزے نکال رہے ہیں۔[18]

اس رپورٹ پر روزنامہ انقلاب کا طنز آمیز تبصرہ یہ تھا کہ 'جھنگ کے متقی اور متشرع ڈپٹی کمشنر صاحب نے کم از کم ضلع جھنگ میں دینی حکومت قائم کر لی ہے۔ آپ کا حکم ہے کہ جو مسلمان بغیر عذر شرعی روزہ ترک کرے گا اس کے خلاف استغاثہ دائر کیا جائے گا اور اسے جرمانہ کی سزا دی جائے گی۔ جرمانہ ادا نہ کرے گا تو اس کا منہ کالا کر کے اسے شہر بھر میں تشہیر کیا جائے گا۔ ہر مسجد کے امام کو ''امیر شریعت حضرت ڈپٹی کمشنر صاحب'' کی طرف سے حکم موصول ہوا ہے کہ اپنے مقتدیوں کی فہرست تیار کرے اور جو مسلمان نماز میں غیر حاضر ہیں ان کو پکڑ کر حاکم کے سامنے پیش کیا جائے تا کہ اسے سزا دی جائے (یعنی منہ کالا کیا جائے، جوتے لگائے جا سکیں، درے مارے جا سکیں، گدھے پر الٹا سوار کرا کر شہر کے لونڈوں سے اس کا جلوس نکلوایا جا سکے)۔ ہمارے دل میں نوابزادہ فتح اللہ خان صاحب کی شریعت پروری کا بڑا احترام ہے۔ خدا کرے ہمارے تمام حاکم دین کے لئے ایسے ہی غیور ہو جائیں۔ لیکن گستاخی معاف۔ یہ ''دین'' نہیں بلکہ ''ڈپٹی کمشنری مذہب'' ہے۔ جس کا دائرہ صرف ایک ضلع تک محدود ہے...... اب پاکستان قائم ہو گیا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب نے دینی احکام کی ترویج شروع کر دی اس لئے کہ دنیاوی حکومت کچھ بھی کہے اللہ اور رسول ﷺ کے احکام پر نافذ ہو کر رہیں گے...... انگریز کے دور میں نواب صاحب نے ایسی سزاؤں کا اعلان کرنے کی کبھی جرأت نہیں کی کیونکہ وہ انگریز کی حکومت تھی۔ نواب صاحب کو یہ حکومت الٰہیہ مبارک ہو لیکن ایک گزارش نہایت ضروری ہے کہ اس قسم کے احکام کسی ایک ضلع میں نافذ نہ ہونے چاہئیں بلکہ مرکزی حکومت کی طرف سے ساری مملکت پاکستان میں ان کا نفاذ ضروری ہے۔ یہ نہایت مہمل اور شرمناک بات ہو گی کہ ایک ضلع میں نماز اور روزہ ترک کرنے والے کا منہ

کالا کر کے گدھے پر سوار کیا جا رہا ہے اور دوسرے ضلع کے حکام اور عوام دونوں ہی بے نماز اور روزہ شکن ہیں جنہیں کوئی پوچھتا تک نہیں حالانکہ دونوں اضلاع پاکستان میں واقع ہیں اور دونوں پر ''حضرت قائداعظم محمد علی جناح'' کا راج ہے۔ لاہور اور کراچی میں جوان جہان مسلمان لڑکیاں روزانہ مرد فوجیوں سے پریڈ کرنا اور رائفل چلانا سیکھ رہی ہیں اور اخباروں میں ان کی تصویریں چھپ رہی ہیں جن میں خواتین ننگے سر، خوبصورت چوٹیاں لٹکائے، دوپٹے گلے میں ڈالے، سینے ابھارے، قطار میں کھڑی ہیں یا کمر کے بل زمین پر ''چت'' پڑی ہوئی میجروں اور کپتانوں سے تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ کراچی میں اکابر پاکستان کے ''ڈنروں'' کی جو تفصیلات ہمارے پاس پہنچی ہیں وہ بڑی دردناک ہیں۔ خود ضلع جھنگ میں ہماری اطلاعات کے مطابق غلط الاٹمنٹیں، زمین کے بڑے بڑے ٹکڑوں پر ناجائز قبضے، بلیک مارکیٹ، خود رمضان المبارک کی وجہ سے بعض اشیائے ضروری میں منافع اندوزی اور رشوت ستانی برابر جاری ہے۔ لیکن ساری آفت نماز اور روزہ کے تارک پر ہی ٹوٹ رہی ہے اور وہ بھی صرف ضلع جھنگ میں۔ ہم پھر یہی گزارش کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو نماز اور روزہ پر مجبور کرنا بالکل صحیح اور مستحسن ہے لیکن یہ پالیسی پورے اسلامی ملک پر نافذ ہو۔ مرکزی اسلامی حکومت ڈپٹی کمشنروں کے نام احکام صادر کرے کہ نماز اور روزہ کی پابندی کراؤ...... یہ نہ ہو کہ نوابزادہ فتح اللہ خان کے ضلع میں نماز روزہ اور مثلاً مسٹر ظفر الاحسن کے ضلع میں کچھ بھی نہیں۔ ممکن ہے کہ اس کا اثر یہ ہو کہ جو بدنصیب نماز روزہ میں اس جبر کو پسند نہ کرتے ہوں وہ ضلع جھنگ سے ہجرت کر کے کسی اور ضلع میں آباد ہو جائیں۔'' [19]

مذہبی جنون کا یہ عارضہ صرف نوابزادہ فتح اللہ خان جیسے معدودے چند افراد تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ ملائیت کے جراثیم نے کم از کم پنجاب اور سرحد میں تو اسے تقریباً ایک وبائی حد تک پہنچا دیا تھا۔ چنانچہ ایبٹ آباد کے میر ولی اللہ کے ایک مضمون میں رائے یہ تھی کہ مسلمانوں پر کچھ عرصے سے جو عذاب نازل ہو رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ ''خدا اور خدا کا رسول ﷺ دونوں بے حد غیور ہیں اور کسی رنگ میں بھی یہ برداشت نہیں کرتے کہ ان کی تضحیک کی جائے۔ تضحیک واستہزا کا وہ انتقام ضرور لیتے ہیں اور نہایت ہی شدید و الیم انتقام۔ جو قوم مسلمان کہلاتے ہوئے بھی قرآن چھوڑ دینے کی گستاخی کرتی ہے اس کی یہی سزا ہے۔ جو لوگ قرآن کو درأ ظہور پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں انہیں چاہیے کہ مسلمانی کو بھی ساتھ ہی

چھوڑ دیں۔قرآن کو اپنی زندگی کا ضروری جزو بنائے بغیر مسلمانی زندگی کا تصور ہی ذہن میں نہیں آ سکتا۔"[20] یہ میر ولی اللہ چونکہ پیشہ کے لحاظ سے وکیل تھا اس لئے بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی۔تو ضرور تھا لیکن مذہبی جنون نے اسے اس قدر جہل مرکب بنا رکھا تھا کہ اسے اتنی سی بات معلوم نہیں تھی کہ 1948ء میں پاکستان کی کم از کم 85 فیصدی آبادی بالکل ان پڑھ تھی۔ان غریب عوام کو کبھی کسی نے قرآن مجید نہیں پڑھایا تھا اس لئے ان کی جانب سے قرآن کو چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔جو چیز انہوں نے کبھی پکڑی نہیں تھی اسے چھوڑا کیسے جا سکتا تھا۔لیکن اس کے باوجود وہی غریب عوام ہر قسم کے عذاب میں مبتلا تھے۔غربت، بیماری اور جہالت ان کے مقدر میں تھی اور شہروں کی کوٹھیوں میں رہنے والے نوابوں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں، اور اعلیٰ افسران نے جنہوں نے فی الحقیقت قرآن کو چھوڑ دینے کی گستاخی کی ہوئی تھی، گلچھرے اڑا رہے تھے اور علما اور مشائخ بھی صبح و شام ثابت مرغ کھا کے ڈکار مار رہے تھے جو ہمہ وقت لوگوں کو قرآن پکڑانے کی تلقین کرتے تھے لیکن خود عملی طور پر قرآن چھوڑے ہوئے تھے۔میر ولی اللہ نے اپنے مضمون میں نہیں بتایا تھا کہ بقول اس کے خدا اور رسولﷺ کا انتقامی عذاب صرف مزدوروں اور غریب کسانوں پر ہی کیوں نازل ہو رہا تھا جنہوں نے قرآن چھوڑنے کا کبھی کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔اس نے اپنے مضمون میں فی الفور اور بلا تاخیر بغیر کسی خرچ کے پاکستان میں قرآنی سیاست اور قرآنی قانون نافذ کرنے کے لئے ایک پانچ نکاتی فارمولا پیش کیا تھا۔

1۔ پاکستان کے تمام سکولوں اور کالجوں میں عربی زبان کو لازمی مضمون قرار دیا جائے۔

2۔ عربی زبان کے نصاب میں قرآن جزو لازم قرار دے دیا جائے اور جو طالب علم قرآن کے پرچے میں فیل ہو وہ باوجود تمام مضامین میں پاس ہو جانے کے فیل سمجھا جائے۔

3۔ حکم دے دیا جائے کہ آج سے چھ مہینے کے بعد سرکاری ملازمتوں کے لئے جتنے مقابلے کے امتحان ہوں گے سب میں ایک پرچہ قرآن ہوگا اور جو امیدوار قرآن کے پرچے میں فیل ہوگا وہ کسی صورت میں ملازمت میں نہ لیا جائے گا۔

4۔ فیصلہ کر دیا جائے کہ اسمبلیوں کے آئندہ انتخابات میں ہر امیدوار کو قرآن فہمی کا امتحان دینا ہوگا جو امیدوار اس امتحان میں ناکام رہے گا اس کا پرچہ نامزدگی مسترد کر

دیا جائے گا۔

5۔ تجویز چہارم کے تحت امتحان میں جس ایم۔ ایل۔ اے نے ساٹھ فیصدی سے کم نمبر لئے ہوں گے وہ کسی صورت میں وزیر نہیں بنایا جائے گا۔

لیکن اس فارمولے میں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ جو 80،90 فیصدی بچے سکول میں جاتے ہی نہیں ہیں اور جو 80،90 فیصدی لوگ ان پڑھ ہیں ان پر اس فارمولے کا اطلاق کیسے ہوگا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ مضمون نگار کی نگاہ میں پاکستانی قوم صرف درمیانہ اور بالائی طبقوں کے دس پندرہ فیصدی لوگوں پر ہی مشتمل تھی۔ اس قسم کے مذہبی جنونی پاکستان کے غریب عوام کی معاشی اور معاشرتی حالت سدھارنے کی کبھی بات نہیں کرتے تھے اور یہ کبھی نہیں بتاتے تھے کہ ان غریب عوام نے وہ کون سے گناہ کئے ہیں کہ جن کی سزا کے طور پر ان پر غریبی اور بیماری کا عذاب نسل در نسل نازل ہو رہا ہے اور جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے کون سی نیکیاں کی ہیں کہ ان کے لئے عیش وعشرت کے سارے دروازے کھلے ہیں۔

مودودی کا مطالبہ کہ چونکہ قائداعظم اسلام سے بہت دور ہیں اور تقسیم کے دوران مسلمانوں کے قتل عام کے ذمہ دار ہیں اس لئے ان کو قیادت سے ہٹا کر اسے قائد بنا دیا جائے

جماعت اسلامی کے امیر ابوالاعلیٰ مودودی کو بھی پاکستان کے ان 80 فیصدی ان پڑھ غریب عوام کے مسائل سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ انہیں نسلی مسلمان کہتا تھا اور انہیں چڑیا گھر کے جانوروں سے اونچا درجہ نہیں دیتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ جو موٹر پر آیا ہے وہ موٹر پر چلے، جو پیدل آیا ہے وہ پیدل چلے اور جو لنگڑا آیا ہے وہ لنگڑا کر ہی چلے۔ تاہم جولائی 1948ء میں جب کہ قائداعظم محمد علی جناح کوئٹہ کے نزدیک زیارت کے مقام پر ایک چھوٹے سے ریسٹ ہاؤس میں بستر مرگ پر پڑے ہوئے تھے، ابوالاعلیٰ مودودی پاکستان کی قیادت عظمیٰ کا خواب دیکھ رہا تھا اور اس نے اپنی اس تمنا کا اظہار اپنے ماہنامے ترجمان القرآن کے جولائی 1948ء کے شمارے میں کر بھی دیا۔ اس نے لکھا کہ ''اسی حل کو مسلمانوں نے قبول کیا (یعنی پاکستان کو) اور اپنی

ساری قومی طاقت، اپنے تمام ذرائع اور اپنے جملہ معاملات اس قیادت کے حوالے کر دیئے جوان کے قومی مسئلہ کو اس طرح حل کرنا چاہتی تھی۔ دس برس کے بعد آج اس کا پورا کارنامہ ہمارے سامنے ہے اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس نے کس طرح، کس صورت میں ہمارے مسئلہ کو حل کیا۔ جو کچھ ہو چکا وہ توانمٹ ہے اب اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ (اگر بدلا جا سکتا تو مودودی اس کا پھر اکھنڈ بھارت کر دیتا)۔ اس پر اس حیثیت سے بحث بیکار ہے کہ یہ کیا جاتا تو کیا ہوتا۔ البتہ اس حیثیت سے اس پر بحث کرنا ضروری ہے کہ جو مسائل اب ہمیں درپیش ہیں کیا ان کے حل کے لئے بھی وہی قیادت موزوں ہے جو اس سے پہلے ہمارے قومی مسئلہ کو اسی طرح حل کر چکی ہے؟ کیا اس کا اب تک کا کارنامہ یہی سفارش کرتا ہے کہ اب جو بڑے بڑے اور نازک مسائل ہمارے سر پر آ پڑے ہیں جن کا بیشتر حصہ خود اسی قیادت کی کارفرمائیوں کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے انہیں حل کرنے کے لئے ہم اس پر اعتماد کریں۔"

نوائے وقت نے مودودی کے اس مضمون پر اپنے ادارتی تبصرے میں اس لئے ناخوشی کا اظہار کیا کہ "حضرت مولانا نے 10 سال کے عرصے میں پہلی مرتبہ دل کی بات کھل کر کہی اور صاف لفظوں میں مسلمانوں سے کہا کہ محمد علی جناح کی جگہ مجھے قائداعظم مانو۔ اب صرف اتنا کرم فرمائیں کہ مسلمانوں کو یہ بتا دیں کہ آپ کا ٹھوس سیاسی پروگرام کیا ہے؟ اب یہ پروگرام مسلمانوں کے حق میں بہتر ہوگا تو مسلمان قائداعظم کو چھوڑ کر آپ کو اپنا لیڈر مان لیں گے۔ اپنا پروگرام نہ بتانا اور محض نعروں ہی سے مسلمانوں کا دل بہلانا یا قائداعظم کو "احمق" "غلط کار" اور "دین میں ہلکا" ثابت کرنے کی کوشش میں لگے رہنا ہرگز آپ کے شایان شان نہیں۔ قائداعظم کو مسلمان آزما چکے ہیں اور ان کا ریکارڈ قوم کے سامنے ہے۔ آپ کو ابھی قوم نے آزمانا ہے۔ جب تک آپ مسلمانوں کو اپنا ٹھوس پروگرام نہیں بتائیں گے آپ قائداعظم کو ہزار گالیاں دیجئے مسلمان آپ کے دست مبارک پر بیعت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔"[21] نوائے وقت نے اپنے اس اداریے میں ملا مودودی کے اس مضمون کا یہ اقتباس نہیں دیا تھا کہ تحریک پاکستان کے "اجزا ترکیبی میں مومن اور کھلے کھلے ملحد سب شامل تھے بلکہ دین میں جو جتنا ہلکا تھا وہ اتنا ہی اوپر آیا۔ اس میں اخلاق کی سرے سے کوئی پوچھ نہ تھی۔ عام کارکنوں سے لے کر بڑے بڑے ذمہ دار لیڈروں تک انتہائی ناقابل اعتماد سیرت کے لوگ موجود تھے۔ بلکہ تحریک کا قدم جتنا آگے بڑھا اس قسم کے

عناصر کا تناسب بڑھتا ہی چلا گیا۔ اسلام کو اتباع کے لئے نہیں بلکہ صرف عوام میں مذہبی جوش پیدا کرنے کے لئے فریق جنگ بنایا گیا تھا۔ کبھی ایک دن کے لئے بھی اس کو یہ حیثیت نہیں دی گئی کہ وہ حکم دے اور یہ اسے مانیں اور کوئی قدم اٹھاتے وقت یہ اس سے استصواب کریں۔''

مودودی کی اس تحریر میں ''اسلام کے اتباع'' ''اسلام کے حکم'' اور ''اسلام سے استصواب'' کے جو الفاظ استعمال کئے گئے تھے ان کا مطلب صرف یہ تھا کہ چونکہ تحریک پاکستان ابوالاعلیٰ مودودی کی زیر قیادت نہیں تھی، چونکہ اس تحریک میں اس سے حکم نہیں لیا گیا تھا اور چونکہ اس سے کوئی استصواب بھی نہیں کیا گیا تھا اس لئے یہ غیر اسلامی تھی اور محمد علی جناح محض اس لئے قائداعظم بنا تھا کہ وہ ''دین میں ہلکا'' تھا۔ ''اخلاق سے عاری'' تھا اور اس کی سیرت نا قابل اعتماد تھی۔ ملاؤں کی اس قسم کی تحریروں اور تقریروں میں جس مرکزی نکتہ کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی تھی وہ یہ تھی کہ یہ مُلّا جب اسلام کی سربلندی، اللہ کی حاکمیت، رسول ﷺ کی تابعداری، شرعی نظام، حکومت الٰہیہ، خلافت الٰہیہ اور شرعی قوانین، قرآن، سنت کی تفسیر اور قرآنی قانون کی اصطلاحات استعمال کرتے تھے تو ان سب کا مطلب صرف ایک ہی ہوتا تھا کہ عنان اقتدار براہ راست ہمیں دو اور اگر کسی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتے تو کم از کم یہ تو کرو کہ ہمیں ایسا مقام تو دو کہ ارباب اقتدار ہمارے آستانے پر حاضر ہو کر ہدایت و رہنمائی حاصل کریں کیونکہ ہم اسلام کے اجارہ دار ہیں۔ ہم اللہ کے احکام کو سمجھتے ہیں اور اس بنا پر اس کی خلافت کے اہل ہیں۔ ہم رسول ﷺ کے مزاج شناس ہیں اس لئے اس کی لغت کے اصلی مفہوم کو جانتے ہیں۔ ہمیں اسلامی فقہ پر عبور حاصل ہے اس لئے اسلامی قوانین کی تشکیل و ترتیب ہماری زیر ہدایت ہونی چاہیے۔ ہم متدین، متشرع، پرہیز گار اور دینی علوم کے ماہر ہیں اس لئے خلافت الٰہیہ کے عہدے پر صرف ہمارا ہی حق ہے۔

ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے ماہنامے کے جون 1948ء کے شمارے میں بھی قائداعظم جناح پر اسی قسم کا حملہ کر کے بین السطور میں اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ قیادت عظمیٰ میرے سپرد کر دی جائے۔ اس نے لکھا تھا کہ ''دس سال سے مسلمانوں کی قیادت عظمیٰ جس لائحہ عمل پر چل رہی ہے وہ سلطان عبدالحمید خان کی سیاست سے ملتا جلتا تھا۔ جس طرح وہ 33 سال تک محض دول یورپ کی باہمی رقابت سے فائدہ اٹھا کر جیتے رہے اور اس دوران میں خود ٹرکی کی کوئی طاقت انہوں نے نہ بنائی جس کے بل بوتے پر وہ جی سکتا۔ اسی طرح اس قیادت کا

بھی سارا سیاسی کھیل بس انگریز اور کانگرس کی کشمکش سے فائدہ اٹھانے تک محدود تھا۔ پورے دس سال میں اس نے خود اپنی قوم کی اخلاقی، مادی اور تنظیمی طاقت بنانے اور اس کے اندر قابل اعتماد سیرت پیدا کرنے کی کوشش نہ کی۔ جس کی بنا پر وہ اپنے کسی مطالبہ کو خود اپنی طاقت سے منوا سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جونہی انگریز اور کانگرس کی باہمی کشمکش ختم ہوئی اس قیادت عظمیٰ نے اپنے آپ کو ایسی حالت میں پایا جیسے اس کے پاؤں تلے زمین نہ ہو۔ اب وہ مجبور ہوگئی کہ جو کچھ بھی، جن شرائط پر بھی طے ہوا اسے غنیمت سمجھ کر قبول کر لے۔ بنگال و پنجاب کی تقسیم اسے بے چون و چرا ماننی پڑی، سرحدوں کے تعین جیسے نازک مسئلے کو اس نے صرف ایک شخص کے فیصلے پر چھوڑ دیا۔ انتقال اختیارات کے لئے جو وقت اور جو طریقہ تجویز کر دیا گیا اسے بھی بلا تامل اس نے مان لیا۔ حالانکہ یہ تینوں امور صریح طور پر مسلمانوں کے حق میں مہلک تھے۔ انہی کی وجہ سے ایک کروڑ مسلمانوں پر تباہی نازل ہوئی اور انہی کی وجہ سے پاکستان کی عمارت اول روز ہی سے متزلزل بنیادوں پر اٹھی۔'' یہ شخص جب محض صحافیانہ زورِ قلم کے ساتھ اس قسم کی باتیں لکھتا تھا تو اس سے یوں لگتا تھا کہ تاریخ اور سیاست کے بارے میں اس کے علم و شعور کی سطح ایک ان پڑھ پان فروش سے زیادہ نہیں تھی یا پھر یہ بڑا ہی بد دیانت، متعصب، کینہ پرور اور منافق آدمی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ان خارجی و داخلی حالات و اسباب کا صحیح تجزیہ کرنے کی توفیق نہیں بخشی تھی جن کے تحت برطانوی سامراج برصغیر کی تقسیم پر مجبور ہوا اور کانگرس اور مسلم لیگ نے اسے منظور کیا تھا۔☆ قائداعظم جناح منزہ عن الخطا نہیں تھے۔ وہ ایک بورژوا سیاسی لیڈر تھے اس لئے کئی مواقع پر اور کئی مسائل کے بارے میں غلطیاں ہوئیں لیکن چونکہ بحیثیت مجموعی ان کی سیاست مسلمانان ہند کے مفاد میں تھی اس لئے انہوں نے ان کی غلطیوں کے باوجود ان کو بجا طور پر اپنا قائداعظم بنایا تھا۔ لیکن اب جب ملا مودودی کی طرف سے قائداعظم کو ایک کروڑ مسلمانوں کی تباہی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا تو اس سے یہی تاثر ملتا تھا کہ یہ مُلّا برخود غلط، خود پسند، متکبر اور جہل مرکب ہے۔ اس پر مسلمانانِ عالم کا امیر یا امام مہدی یا مجدد اعظم بننے کا جنون سوار ہے اور اس کے اس عارضہ کا کوئی علاج نہیں ہے۔ حیدر آباد دکن، یو۔ پی اور پنجاب کے مفاد پرست نوابوں، تعلقہ داروں اور جاگیرداروں نے اس کا دماغ بالکل خراب کر دیا تھا۔

☆ تفصیل کے لیے دیکھئے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ جلد 1 اور 2۔ پاکستان کیسے بنا؟

جماعت اسلامی نے جہاد کشمیر کے خلاف فوج کے ریکروٹنگ اضلاع میں جو کشمیر کی سرحد پر تھے، باقاعدہ مہم شروع کر دی......رائے عامہ اور اخباروں میں اس کی مخالفت

چونکہ یہ برخود غلط مُلاّ صرف اپنے آپ کو یا اپنے مٹھی بھر حواریوں کو ہی صحیح مسلمان سمجھتا تھا اور باقی سارے مسلمانوں کو ایک ایسا انبوہ عظیم قرار دیتا تھا جو حق و باطل میں تمیز سے نا آشنا تھا۔ اس لئے اس نے مئی میں جنگ آزادیٔ کشمیر کے خلاف جو فتویٰ دیا تھا یہ پاکستان کی مسلم رائے عامہ کی سخت برہمی کے باوجود اس پر قائم رہا اور اس جماعت کے کارکن مسلسل اس فتوے کا پروپیگنڈا کرتے رہے۔ چنانچہ نوائے وقت نے اگست 1948ء کے اوائل میں ''حضرت مولانا مودودی کی خدمت بابرکت میں'' ایک اداریہ پیش کیا جس میں لکھا تھا کہ ''حضرت مولانا مودودی کی جماعت اسلامی کے ارکان اور مولانا صاحب نے جہاد کشمیر کے متعلق جو روش اختیار کی ہے وہ ملک کے لئے بے حد نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے۔ مولانا صاحب کا خیال ہے کہ کشمیر کی جنگ جہاد نہیں اور پاکستان کے مسلمانوں پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ وہ ڈوگرہ استبداد کے ماتحت کچلے گئے کشمیری مسلمانوں کو ڈوگروں، سکھوں اور ہندوستانی فوجوں کے پنجہ ستم سے رہا کرانے کے لئے ان کی امداد کریں......حضرت مولانا کو اپنے اجتہاد اور فکر و بصیرت پر بڑا ناز ہے۔ یہ معمولی نکتہ ان کی وسیع نظر سے مخفی نہ ہوگا کہ اگر کشمیر میں مسلمان ختم ہو گئے اور کشمیر دوسرا پٹیالہ بن گیا تو پاکستان کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ لیکن اس کے باوجود حضرت مولانا کی مسلمانانِ پاکستان کو یہی تلقین ہے کہ وہ پاکستان کو اس مہیب خطرہ سے محفوظ رکھنے کے لئے بھی مطلق کوئی جدوجہد نہ کریں۔ جہاں تک اس مسئلہ کے اخلاقی، سیاسی اور مذہبی پہلوؤں کا تعلق ہے انہیں بارہا اجاگر کیا جا چکا ہے اور ہم یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں کہ حضرت مولانا مودودی ایسے صاحب فکر و نظر لوگ ابھی تک اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکے۔ مگر رنج اور افسوس کا مقام ہے کہ ان کے پیرو اور ان کی جماعت کے کارکن ابھی تک اس پروپیگنڈا میں منہمک ہیں کہ کشمیر کی جنگ جہاد نہیں اور اس میں شرکت مسلمانوں پر فرض نہیں، افسوس بالائے افسوس یہ ہے کہ اس پروپیگنڈا کا زیادہ تر زور پشاور،

سیالکوٹ، گجرات اور راولپنڈی میں ہے۔ ان شہروں اور اضلاع کی اہمیت محتاج بیان نہیں۔ مگر مولانا کے کارکنوں نے انہی شہروں کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا ہے، پچھلے دنوں راولپنڈی کی ایک مسجد میں حضرت مولانا مودودی کے ایک مرید نے ایک ایسی افسوس ناک تقریر کی کہ ہمارے لئے اس کے اقتباسات نقل کرنا بھی ممکن نہیں۔ ہم بحث کا دروازہ نہیں کھولنا چاہتے۔ ہاتھ جوڑ کر مولانا مودودی سے درخواست کرنا چاہتے ہیں کہ وہ نزاکت وقت کا احساس کریں اور اپنے پیروؤں کو اس زہریلے پروپیگنڈے سے باز رکھیں۔ کشمیر کا مسئلہ مسلمانان پاکستان کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ وہ اس وقت ہمیں لفظی موشگافیوں میں نہ الجھائیں۔ مسلمانوں میں اور بہت سی خرابیاں اور برائیاں ہیں، جماعت اسلامی ان کی اصلاح پر متوجہ ہو اور کشمیر کے مسلمانوں اور ان کے پاکستانی ہمدردوں کو ان کے حال پر چھوڑ دے۔ مسلمانوں کی بڑی خوش قسمتی ہوتی اگر جماعت اسلامی کے سچے اور نیک مسلمان مجاہدین کی حیثیت سے جنگ کشمیر میں مسلمانوں کا ہاتھ بٹاتے لیکن اگر یہ ممکن نہیں تو خدا کے لئے اس روش سے ہندوستان کو فائدہ پہنچ رہا ہے اور مجاہدین کا محاذ کمزور ہو رہا ہے۔''[22]

نوائے وقت کے اس اداریے میں مُلّا مودودی پر ملک وقوم سے غداری کا کوئی الزام عائد نہیں کیا گیا تھا۔ اس پر ایسی تنقید نہیں کی گئی تھی جیسی کہ ایک غدار قوم پر ہونی چاہیے تھی اور نہ ہی اسے سزا کا مستحق قرار دیا گیا تھا جو کہ ایک غدار قوم کو بالعموم ملتی ہے۔ مدیر نوائے وقت کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ مُلّا 15 اگست 1947ء سے قبل تحریک پاکستان کی کس معاندانہ طریقے سے اور کتنی زیادہ مخالفت کرتا رہا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ قیام پاکستان کے بعد بھی اپنے اس موقف پر مصر رہا تھا کہ تحریک پاکستان غلط تھی، مسلم لیگ اوپر سے لے کر نیچے تک اخلاق باختہ افراد کا ایک ٹولہ تھا جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا اور جس کی وجہ سے کروڑوں مسلمانوں پر عذاب نازل ہوا تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ مُلّا کسی ٹھوس سیاسی پروگرام کے بغیر محض اسلامی نعروں کے زور سے پاکستان کا قائداعظم بننے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس مدیر شہیر نے حضرت مولانا مودودی کی خدمت بابرکت میں ہاتھ جوڑا اور محض یہ استدعا کی کہ خدارا جنگ آزادئ کشمیر کی مخالفت نہ کیجئے۔ اس کے برعکس جب جون 1948ء میں صوبہ سرحد کے بے ضمیر وزیراعلیٰ عبدالقیوم خان نے اسی قسم کے الزام میں خان عبدالغفار خان کو فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز کے تحت فوراً

تین سال قید کی سزا دے دی تھی تو نوائے وقت نے ''صوبہ سرحد کے مرد آہن'' کے اس آمرانہ تعزیزی اقدام کا پر جوش خیر مقدم کیا تھا اور لکھا تھا کہ ''غداران وطن کو ایسی ہی سزا ملنی چاہیے تھی۔ مدیر نوائے وقت کے ایک ہی قسم کے مسئلہ پر اختیار کردہ رویے میں اس تضاد کی وجہ نا قابل فہم نہیں تھی۔ وجہ یہ تھی کہ ابوالاعلیٰ مودودی، اسلام اور مسلم قومیت کے نعروں کے سٹیم رولر سے قومیتی اور طبقاتی تضاد کو کچلنے کے حق میں تھا۔ وہ نجی جائیداد کی کوئی حد مقرر کرنے کی تجویز کو غیر اسلامی قرار دیتا تھا اور اسلام کے نام پر جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو غریب کسانوں اور مزدوروں کے استحصال کی کھلی چھٹی دیتا تھا۔ اس کے برعکس خان عبدالغفار خان نے جی۔ ایم۔ سید وغیرہ کے ساتھ مل کر مئی 1948ء میں پیپلز پارٹی بنائی تھی۔ اس کے منشور میں نہ صرف سوشلسٹ معیشت بلکہ مختلف صوبوں کی آزاد سوشلسٹ جمہوریتوں کا بھی ذکر تھا۔ لہٰذا امیر جماعت اسلامی ''حضرت مولانا مودودی'' اپنی کھلم کھلا غداری کے باوجود واجب الاحترام تھا۔ لیکن سرخ پوش تنظیم کا لیڈر خان عبدالغفار خان، وزیر اعلیٰ عبدالقیوم خان کے عائد کردہ جھوٹے یا مبالغہ آمیز الزامات کی بنا پر واجب القتل تھا۔ مدیر نوائے وقت اگر چہ اس وقت تک خود سرمایہ دار نہیں تھا بلکہ محض جاگیرداروں کا طفیلی تھا لیکن وہ جلد از جلد سرمایہ دار یا ''بڑا آدمی'' بننے کا عزم ضرور رکھتا تھا اور ملا مودودی اس کے عزم کی تکمیل میں مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔

جب نوائے وقت نے یہ اداریہ شائع کیا، اس کے چند دن بعد مُلّا مودودی نے ''تسنیم'' کے نام سے ایک روزانہ اخبار نکالا۔ اس اخبار کے پہلے ہی پرچہ میں ایک میدان جنگ کا نقشہ دکھایا گیا تھا جس میں ایک طرف اسلامی فوجیں تھیں اور دوسری طرف غیر اسلامی افواج۔ اسلامی فوجوں میں روزنامہ تسنیم اور سہ روزہ کوثر تھے اور غیر اسلامی افواج میں پاکستان ٹائمز، امروز اور زمیندار وغیرہ تھے۔ تسنیم اور کوثر کا رخ مدینے کی جانب تھا جبکہ پاکستان ٹائمز اور امروز کا رخ ماسکو کی طرف اور روزنامہ زمیندار کا رخ لندن کی جانب۔ نوائے وقت ان دونوں افواج میں کسی میں بھی شامل نہیں تھا۔ وہ نہ کافروں میں شامل تھا اور نہ ہی مسلمانوں میں۔ لیکن جب نوائے وقت میں یہ اداریہ چھپ گیا تو سہ روزہ کوثر کے ایک نقشے میں اسے بھی غیر اسلامی لشکر میں شامل کر دیا گیا کیونکہ اس کا رخ کراچی کی غیر اسلامی حکومت کی طرف تھا۔ اس پر نوائے وقت کا تبصرہ یہ تھا کہ ''ہم تو سمجھے تھے کہ جماعت اسلامی کا کام نامسلمانوں کو مسلمان بنانا ہے۔ مگر یہاں سارا زور مسلمانوں

کو غیر مسلم بنانے پر صرف کیا جا رہا ہے۔ اگر حضور کے پیش نظر یہی کام ہے تو نام بھی بدل کر جماعت ''مکفرین'' رکھ لیجیے۔''[23] اور امروز کا 12 راگست کو تبصرہ یہ تھا ''شروع شروع میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اور ان کے ساتھی ممبریوں اور وزارتوں پر قبضہ کرنا نہیں چاہتے بلکہ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ پہلے تبلیغ کے ذریعے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنائیں اور پھر سیاست کا پورا ڈھانچہ ہی بدل ڈالیں۔ لیکن اب جو ان کا اور ان کی جماعت کا انداز ہو چلا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی بھی سیاسیات میں حصہ لینا چاہتی ہے۔''[24] اور پھر 14 راگست کو مولانا چراغ حسن حسرت نے اپنے فکاہیہ کالم میں لکھا کہ ''ہمارے معاصر ''تسنیم'' کے نزدیک پاکستان کی حکومت غیر اسلامی اصول ونظریات پر قائم ہے اور پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا اس لئے جماعت اسلامی سیاسیات میں حصہ لینا حرام سمجھتی ہے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ جماعت اسلامی غیر اسلامی حکومت کو ''مسلمان کرنے'' کی بجائے مسئلہ جہاد پر خواہی نہ خواہی زور دے رہی ہے اور مولانا بار بار یہ فرما رہے ہیں کہ اگر پاکستان ہندوستان سے معاہدہ توڑ کر کشمیر میں اپنی فوجیں بھیج دے تو کشمیر کی لڑائی جہاد بن جائے گی۔ جس حکومت کو آپ غیر اسلامی سمجھتے ہیں، اس کے سیاسی معاملات میں حصہ لینا حرام سمجھتے ہیں وہ اگر ہندوستان سے معاہدہ توڑ کے کشمیر میں لڑنا بھی شروع کر دے تو یہ لڑائی جہاد کیسے بن جائے گی۔ ہمیں ڈر ہے کہ آپ کل کلاں یہ فتویٰ نہ دے دیں کہ ہندوستانی فوجیں کشمیر میں ''جہاد'' فرما رہی ہیں کیونکہ مہاراجہ کشمیر ہندوستان میں شامل ہو چکا ہے۔''[25] امروز کے اسی شمارے میں شاہی مسجد کے امام مولانا غلام مرشد کا خطبہ شائع ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ ''امام ابن تیمیہ کے زمانے میں بھی اسی قسم کی صورت حال پیش آئی تھی یعنی غیر مسلموں کی سلطنت میں، جن سے مسلمان سلطنتوں نے معاہدے کر رکھے تھے جب ظلم ہونے لگا تو شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ نے جہاد کا فتویٰ دے دیا تھا۔''

مولانا غلام مرشد نے بطور سرکاری امام یہ خطبہ 7 راگست کو عید کے موقع پر دیا تھا۔ لیکن مُلّا مودودی نہ مانا اور اس نے اخبار میں ایک بیان چھپوایا جس میں اس نے بدستور اصرار کیا کہ قرآن مجید کی سورہ انفال کی بعض آیات کے مطابق مسلمانان پاکستان کے لئے کشمیر کی لڑائی میں حصہ لینا جائز نہیں۔ نوائے وقت نے دو دن تک اس بیان پر کوئی تبصرہ نہ کیا لیکن تیسرے دن اس نے ''کج بحثی پر افسوس ناک اصرار'' کے عنوان سے جو اداریہ لکھا اس میں حضرت مولانا مودودی

کی خدمت بابرکت میں ہاتھ جوڑ کر التجا نہیں کی گئی تھی بلکہ پہلی مرتبہ یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ مودودی کوئی عالم دین نہیں ہے۔ اس لئے اس کی رائے کو کوئی وقعت نہیں دینی چاہیے۔ اداریہ یہ تھا کہ ''مودودی صاحب مصر ہیں کہ پاکستان کے مسلمانوں کو مجاہدین کشمیر کی امداد نہیں کرنی چاہیے کیونکہ کشمیر کی جنگ مولانا کے نزدیک پاکستانیوں کے لئے جہاد نہیں بلکہ اس لڑائی میں پاکستانی مسلمانوں کا لڑنا از روئے قانون ناجائز ہے۔ مودودی صاحب عالم دین کے لحاظ سے کوئی زیادہ ممتاز شخصیت نہیں ہیں۔ آپ ایک اچھے انشا پرداز اور ادیب ہیں مگر دین کے متعلق آپ کا علم کچھ زیادہ قابل اعتماد نہیں۔ اس لئے خیال تھا کہ اگر آپ سے بہتر اور فاضل تر آپ کو سمجھا دیں گے کہ اس معاملے میں آپ سے غلطی ہوئی ہے تو آپ اس پر اصرار نہیں کریں گے۔ مگر بدقسمتی سے مودودی صاحب علم و ادب میں ہستی ہونے کے دعویدار نہیں ''امارت'' کے مدعی بھی ہیں۔ اس لئے آپ برابر اس پر اصرار کئے جا رہے ہیں کہ باقی سب کی رائے غلط ہے اور جو میں کہتا ہوں وہی صحیح ہے۔ قرآن کی رو سے بھی مولانا صاحب کے موقف کو مقتدر علما نے غلط قرار دیا مگر مولانا مصر ہیں کہ رائے میری ہی درست ہے۔ ہم نے مایوس ہو کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ مولوی صاحب کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے کیونکہ بحث جاری رکھنے کا نتیجہ یہی تھا کہ زیادہ نہ سہی چند لوگ ہی مولانا کے غلط استدلال سے گمراہ ہو کر مجاہدین کی امداد سے دست کش ہو جائیں گے۔''[26] مولانا غلام مرشد کے خطبے کے بعد نوائے وقت کے اس اداریے میں ملا مودودی کے بارے میں یکایک لائن بدلنے کا مطلب یہ تھا کہ اب کراچی اور پنجاب کے حکمران طبقوں کو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ یہ مُلّا اپنے ''اسلامی تصور'' سے ان کے مفادات کا تحفظ کرنے کی بجائے انہیں نقصان پہنچانے کے درپے تھا۔ اب یہ حضرت مولانا مودودی نہیں تھا بلکہ محض مودودی صاحب اور مولوی مودودی بن گیا تھا۔

جہاد کشمیر کے خلاف مودودی کی اپنے فتویٰ پر ہٹ دھرمی، حکومت کا جماعت اسلامی کے خلاف کاروائی کا فیصلہ...... ''تسنیم اور کوثر پر پابندی

پھر دو تین دن کے بعد نوائے وقت نے اس مسئلہ پر جو اداریہ لکھا اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ اب ملا مودودی کی خیر نہیں ہے۔ کراچی اور پنجاب کے ارباب اقتدار نے جنوری 1948ء کے بعد اسے اس امید میں کھلی چھٹی دی تھی کہ یہ اپنا زور قلم اور فن خطابت مسلمانوں کے انبوہ عظیم کو

صحیح معنوں میں مسلمان بنانے پر صرف کرے گا اور سیاسیات کے پھڈے میں ٹانگ نہیں اڑائے گا۔ پھر جب مئی 1948ء میں اس نے جنگ کشمیر کے خلاف فتویٰ دیا تو بھی اس کے خلاف کوئی تعزیری اقدام نہ کیا گیا بلکہ جون اور جولائی کے مہینوں میں اسے ماہنامہ ترجمان القرآن اور روزنامہ تسنیم نکالنے کی اجازت دے دی گئی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں وزیراعظم لیاقت علی خان اور قائداعظم جناح کے درمیان تضاد بہت شدید ہو چکا تھا۔ جناح تپ دق کے باعث زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا تھے اس لئے لیاقت علی خان کے لئے یہ بات ناگوار نہیں تھی کہ ملا مودودی اسلام کی آڑ لے کر مسلم لیگ اور پاکستان کی قیادت عظمیٰ پر سوقیانہ حملے کر کے اس کے سیاسی عزائم کی تکمیل کے لئے راہ ہموار کرے۔ ادھر پنجاب میں وزیراعلیٰ نواب ممدوٹ بھی نجی محفلوں میں قائداعظم جناح کے خلاف بدکلامی کرتا تھا کیونکہ مئی 1948ء میں جب صوبائی حکومت کے اندر اقتدار کی کشمکش اپنی انتہا کو پہنچ گئی تو قائد نے نواب کے حق میں فیصلہ صادر نہیں کیا تھا۔ انہوں نے بڑی بیزاری کے ساتھ یہ تنازعہ برائے تصفیہ گورنر موڈی کے سپرد کر دیا تھا جس کی نظر عنایت کا رخ ممتاز دولتانہ کی طرف تھا۔ اب اگست میں جب خود قائداعظم اپنی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے اور ان کا معالج بھی ناامیدی کا اظہار کر چکا تھا تو مودودی کے خلاف کچھ نہ کچھ کرنا ضروری سمجھا گیا۔ اس طرح ان ملاؤں کو بھی تنبیہ کرنا مقصود تھا جنہوں نے گزشتہ کئی ماہ سے ''شرعی نظام'' کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ یہ ملا صرف شرعی نظام کا مطالبہ ہی نہیں کرتے تھے بلکہ پاکستان کے ارباب اقتدار کی بیگمات پر سوقیانہ حملے کرتے تھے اور مُلّا مودودی کی طرح قائداعظم جناح کو مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے قتل عام کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔ قبل ازیں 15 رجولائی 1948ء کو اسی بنا پر مجلس احرار اسلام کے سیکرٹری مخدوم شاہ بنوری کو پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کیا جا چکا تھا۔

نوائے وقت کے 18 راگست 1948ء کے اداریے کا عنوان تھا ''تخریبی سرگرمیاں'' اور اس میں لکھا تھا کہ ''اس پاکستان میں آپ کو ایسے لوگ بھی مل جائیں گے جن کی تقریر و تحریر کا زور یہ ثابت کرنے پر صرف ہو رہا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد مسلمان مضبوط نہیں ہوئے بلکہ کمزور ہو گئے ہیں اور ان کی اس مصیبت کی ذمہ داری قائداعظم کی لیڈرشپ پر عائد ہوتی ہے۔ قائداعظم نے پے در پے مہلک غلطیاں کیں اور مسلمانوں کو تباہی و بربادی کے اس غار میں لا پھینکا جس کا نام

پاکستان ہے اور پاکستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس کے باشندوں کو یہ اجازت ہے کہ کشمیر میں ڈوگروں، سکھوں اور ہندوستانی فوجوں کی انتہائی ظالمانہ اور فسطائی سرگرمیوں کو دیکھنے کے باوجود کھلم کھلا یہ پروپیگنڈا کریں کہ کشمیر کی لڑائی جہاد نہیں اور اگر پاکستان کے مسلمان کشمیری مسلمانوں کو اس جنگ میں مدد دیں گے تو گناہ کے مرتکب ہوں گے۔سوال یہ ہے کہ ان عناصر کی ایسی تخریبی سرگرمیوں سے کب تک اغماض کیا جائے گا؟ صوبہ سرحد کے وزیر اعظم خان عبدالقیوم خان مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنے صوبہ میں غداروں کی کڑی نگرانی رکھی اور کسی فتنہ کو ابھرنے کا موقع نہیں دیا...... اگر آزادی کا تحفظ مقصود ہے تو غداروں کے خلاف کارروائی ضروری ہے۔ہم اس معاملہ میں خان عبدالقیوم خان کی مذمت، مخالفت سے انکار ہی نہیں کرتے بلکہ پنجاب کے وزیر اعظم سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وزیر اعظم سرحد سے سبق سیکھیں۔شرافت اچھی چیز ہے مگر اسی حد تک جب اس کا دوسرا نام کمزوری نہ ہو جائے۔قوم اور ملک کے مفاد مقتضی ہیں کہ وہ غداروں کے متعلق اپنی نرم پالیسی کو بدلیں اور ملک وملت کی حفاظت کے لئے غداروں کی سرگرمیوں کا استیصال کرنے کے لئے موثر تدابیر اختیار کریں۔"[27]

اس اداریے کے آخر میں وزیر اعظم نواب ممدوٹ کو جو نصیحت کی گئی تھی وہ دراصل محض رسمی تھی۔ مُلاّ مودودی کے خلاف غداری اور تخریبی سرگرمیوں کے الزام میں کوئی نہ کوئی تعزیری کارروائی کرنے کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا اور مدیر نوائے وقت کو اس کا پتہ تھا۔تاہم اس اداریے کا ایک مقصد تو مُلاّ مودودی کے خلاف رائے عامہ کو تیار کرنا تھا اور دوسرا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ مدیر نوائے وقت بڑا زوردار ایڈیٹر ہے۔وہ واقعی وزیر اعظم نواب ممدوٹ کا مشیر خاص ہے اور پنجاب کی صوبائی حکومت اس کی ہدایت کے مطابق چل رہی ہے۔جس دن نوائے وقت میں یہ اداریہ شائع ہوا اسی دن اخبارات میں لاہور مسلم لیگ کے ایک ''ممتاز اور پرخلوص کارکن'' چودھری عبدالکریم نے محاذ کشمیر سے واپس آ کر یہ بیان شائع کرایا تھا کہ آزاد فوجوں میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے اس فتوے سے بڑا غم وغصہ پھیلا ہوا ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ پاکستانی مسلمانوں کو کشمیر کی جنگ آزادی میں ہرگز کوئی حصہ نہ لینا چاہیے۔شیخ عبداللہ اس فتوے سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں اور تحریر وتقریر اور ریڈیو سے برابر یہ پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے کہ مجاہدین کشمیر اس فتوے کی رو سے لٹیرے اور ڈاکو ہیں۔اور لوگوں کو متاثر کیا جا رہا ہے کہ وہ ان کے ساتھ

اچھا سلوک نہ کریں۔ اس فتوے کا ذکر کرتے ہوئے ایک مجاہد نے کہا کہ حکومت پاکستان کا فرض ہے کہ وہ موقع محل کی نزاکت پہچانے اور اس قسم کے پانچویں کالم والوں کے خلاف سخت سے سخت کاروائی کرے۔ اگر اس قسم کا فتویٰ جمعیت العلمائے ہند نے دیا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی اور اس کا اثر بھی نہ ہوتا کیونکہ وہ تو ہمیشہ ہی سے کانگرس کے گن گاتے رہے ہیں لیکن مُلاّ مودودی کا فتویٰ کچھ نہ کچھ اہمیت تو رکھتا ہے کیونکہ وہ پاکستان میں ہے اور اس طرح پنڈت نہرو کے ہاتھ اور مضبوط کرتا ہے۔ مسلمان بڑے کڑے دور سے گزر رہے ہیں اور اگر ہم کو پاکستان کو بنانا ہے تو ایسے لوگوں سے ہمیں بچنا چاہیے۔''[28] اس سے اگلے دن پیر صاحب تونسہ شریف نے ایک انٹرویو میں کہا کہ ''مجھے بہت افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ جہاد کشمیر کے بارے میں مولانا مودودی کے غیر اسلامی، بے ضابطہ اور غیر ضروری فتویٰ سے جو انہوں نے حال ہی میں دیا ہے اور جس سے سادہ لوح عوام میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلنا قدرتی امر ہے اور مجاہدین میں خاص طور پر وسوسے پیدا ہو رہے ہیں۔ میں نے دوسرے اکابر اسلام کو بھی اس طرف متوجہ کیا ہے اور امید ہے کہ وہ بہت جلد اس فتوے کی تردید کریں گے۔ میں بڑی شدومد کے ساتھ اس گمرہ کن فتوے کے اثرات کو دور کرنا چاہتا ہوں کیونکہ اس سے ہزاروں مسلمانوں کے ذہنی شوق اور جذبہ جہاد پر ضرب لگنے کا اندیشہ ہے۔ عوام اور حکومت کو ایسے گمراہ کن پروپیگنڈا کا تدارک کرنا چاہیے۔''[29]

23/اگست کو نوائے وقت نے ایک اور اداریہ لکھا جو اس اخبار کے اس شمارے میں شائع ہوا جس پر 25/اگست کی تاریخ لکھی ہوئی تھی۔ اس اداریے میں مودودی کے اخبار تسنیم میں قائداعظم کے خلاف زہریلے پروپیگنڈے کی مہم کی مذمت کرتے ہوئے یہ لکھا گیا کہ ''بظاہر یہ جماعت یہ کہتی ہے کہ ہم قائداعظم کے خلاف پروپیگنڈا نہیں کر رہے ہیں لیکن اگر ہمیں معاف کیا جائے تو ہم یہ کہیں گے کہ یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ قیادت کو مسلمانوں کی تباہی کا ذمہ دار ٹھہرانا اور اسے نااہل کہنا دراصل قائداعظم اور صرف قائداعظم کی ذات پر ہی حملہ ہے۔ مودودی صاحب کے اخبار کو چاہیے کہ وہ منافقت کو چھوڑ کر کھلم کھلا یہ کہے کہ ہمارا اعتراض قائداعظم کی قیادت پر ہے اور ہم اسے بدلنا چاہتے ہیں...... مودودی صاحب نے اور ان کے تتبع میں ان کے اخبار نے ہم سے یہ پوچھا ہے کہ کیا موجودہ قیادت مامور من اللہ ہے اور اس پر نکتہ چینی ناجائز ہے؟ ہمیں افسوس ہے کہ انہوں نے ایسا طرز استدلال اختیار کیا ہے جو اسلامی انقلاب کی

دعوت کے مدعیوں کے شایان شان نہیں۔ وہ خود ہی ایک غلط بات کو فرض کر کے اس مفروضہ کو دوسروں سے منسوب کر دیتے ہیں اور پھر اس کے متعلق دوسروں سے جواب طلبی کرتے ہیں۔ کس کو یہ دعویٰ ہے کہ موجودہ قیادت مامور من اللہ ہے اور نکتہ چینی سے بالاتر ہے...... مودودی صاحب جہاد کشمیر کو جہاد نہیں سمجھتے اور پاکستانی مسلمانوں کو اس جہاد میں شرکت سے روکتے ہیں۔ وہ یہ فرماتے ہیں کہ یہ میری ذاتی رائے ہے مگر عجیب بات ہے کہ ان کی جماعت کے ہر فرد کی یہی رائے ہے اور کوئی شخص بھی جو ان کی جماعت سے متعلق ہے اس سے اختلاف کی ہمت نہیں رکھتا۔"[30]

اسی دن نوائے وقت میں راولپنڈی کے کسی شخص کا یہ مراسلہ چھپا کہ "ضلع راولپنڈی میں مولانا مودودی کی جماعت کے ارکان پاکستان کے خلاف گمراہ کن پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ کچھ عرصہ سے تو پروپیگنڈا کی مشینری کو اور تیز کر دیا گیا ہے۔ بعض سرکاری ملازمین بھی باقاعدہ تخریبی پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ اس پاکستان دشمن جماعت کی تخریبی سرگرمیوں کا انسداد کرے۔ ورنہ شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔"[31]

چنانچہ اسی دن یعنی 23 راگست کو ہی حکومت مغربی پنجاب نے پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت جماعت اسلامی کے روزنامہ تسنیم اور سہ روزہ کوثر کی اشاعت پر چھ ماہ کے لئے پابندی عائد کر دی۔ اس سلسلے میں سرکاری پریس نوٹ میں یہ الزام عائد کیا گیا کہ "یہ اخبارات پاکستان کے بعض نہایت اہم قومی مقاصد کو نقصان پہنچانے کی غرض سے کھلم کھلا پروپیگنڈا کر رہے تھے۔ ان قومی مقاصد میں یہ مقصد بھی شامل ہے کہ پاکستان کو درپیش مسئلہ کشمیر کو آزاد منصفانہ استصواب کے ذریعے حل کرانے کے لئے کشمیری مسلمانوں کی امداد کرنے کی مساعی کر رہی ہے۔ مزید برآں یہ اخبارات اس مقصد کے تحت بھی پروپیگنڈا کر رہے تھے کہ عوام میں پاکستان اور اس کے لیڈروں بالخصوص قائداعظم ایم۔ اے۔ جناح کے خلاف بیزاری اور نفرت کے جذبات پیدا ہوں اور ملک کے اندر ایسے موقع پر انتشار اور تفرقہ پیدا کیا جائے جبکہ ملک کی سلامتی کی سب سے بڑی امید قوم کے اتحاد اور اس کے نظم وضبط سے وابستہ ہے۔"[32]

ابوالاعلیٰ مودودی نے اسی دن ایک انٹرویو میں صوبائی حکومت کے اس اقدام کی مذمت کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ "یہ اقدام بعض مفاد پرست عناصر کی ہدایت کے تحت کیا گیا ہے کیونکہ تسنیم کی روز افزوں اشاعت سے ان کو سخت نقصان پہنچ رہا تھا۔ حکومت کا یہ اقدام، جو اس

نے اپنے ان احمق دوستوں کے کہنے پر کیا جو اپنے ادنیٰ تجارتی مفادات کو ہر چیز سے بالاتر سمجھتے ہیں، کوتاہ اندیشی، غیر دانشمندی اور بدنیتی پر مبنی ہے اور تباہ کن ہے۔ انشااللہ وزارتی حاشیہ بردار حق کی آواز کو خاموش کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔"[33] مودودی کے اس انٹرویو کا اشارہ مدیر نوائے وقت کی طرف تھا جس نے بقول اس کے، اپنے ادنیٰ تجارتی مفاد کی خاطر جماعت اسلامی کے اخبارات کو بند کروادیا تھا۔ لیکن اس سے اگلے دن مودودی نے اس سلسلے میں جو بیان جاری کیا اس میں اس نے حکومت کو متنبہ کیا کہ "اگر اسے واقعی عوام کی فلاح میں دلچسپی ہے اور ملک کو انقلاب سے محفوظ رکھنے کی خواہاں ہے تو اسے اپنے شہریوں کو افکار، اظہار اور نقل و حرکت کی مکمل آزادی دینی چاہیے۔ میری رائے میں "تسنیم" اور "کوثر" نے ملک اور اس کی قیادت کے خلاف کبھی پروپیگنڈا نہیں کیا۔ ان کی نکتہ چینی کو کسی صورت بھی ملک دشمن پروپیگنڈا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر حکومت دیانتداری سے یہ باور کرتی ہے کہ یہ اخبارات معقول نکتہ چینی کی حدود سے باہر نکل گئے تھے یا انہوں نے قومی مفادات کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کی تھیں تو اس نے کھلی عدالت میں ان پر یہ الزام کیوں نہیں عائد کیا...... اگر عوام کی آزادیوں میں مداخلت کرنے کی کوئی کوشش کی جائے گی تو اس کا صرف یہی نتیجہ نکل سکتا ہے کو جو لوگ پرامن طریقے سے اصلاح چاہتے ہیں اور آئینی طریقے سے سوچتے ہیں ان کے ہاتھ سے اقتدار اور قیادت کی باگ ڈور منتقل ہو کر معاشرے کے جوشیلے اور انقلابی عناصر کے پاس چلی جائے گی اور قوم کا کوئی خیر خواہ اس قسم کی تبدیلی کا خیر مقدم نہیں کرسکتا۔"[34]

حکومت نے سوشلسٹوں اور قوم پرستوں کے خلاف مُلّاؤں کو کھلی چھوٹ دی مگر اب مُلّا خود حکومت کے لئے خطرہ بن گئے

مُلّا مودودی کا مذکورہ بیان کراچی اور پنجاب کے حکمران طبقوں کے نقطہ نگاہ سے بے وزن نہیں تھا۔ انہوں نے جنوری 1948ء میں اسے کھلی چھٹی اسی خیال سے دی تھی کہ پنجاب میں افتخارالدین نے اور سندھ میں حیدر بخش جتوئی نے زمینداروں اور غریب کسانوں کے درمیان طبقاتی کشمکش کی جو ابتدا کر دی تھی اور سندھ اور صوبہ سرحد میں جی۔ ایم۔ سید اور خان عبدالغفار خان نے قومیتی حقوق کی جو تحریک شروع کی تھی وہ اسلام اور مسلم قومیت کے زور سے اس کا سدباب

کرے گا مگر یہ مُلاّ بہت برخود غلط تھا۔ یہ خود ہی امارت اور قیادت عظمیٰ کا مدعی بن بیٹھا۔نوائے وقت نے 6راگست 1948ء کو جب ''حضرت مولانا مودودی کی خدمت بابرکت میں'' دست بستہ التجا کی تھی کہ جنگ کشمیر کے بارے میں زہریلا پروپیگنڈا کرنے سے باز رہے تو اس کا مطلب بھی یہی تھا کہ ''حضرت مولانا'' ازراہ کرم امن پسندی، اصلاح پسندی اور آئین پسندی کا دامن نہ چھوڑیئے مگر مُلاّ کے دماغ میں ''امیر المومنین'' بننے کی خواہش کا کیڑا گھس گیا تھا اس لئے وہ نہ صرف جنگ کشمیر بلکہ پاکستان کی قیادت عظمیٰ کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا کرنے سے باز نہ آیا اور دوسرے مُلاّؤں نے شرعی نظام کے فوری نفاذ کے لئے جو مہم شروع کر رکھی تھی اس سے اس مُلاّ نے خوب فائدہ اٹھایا۔

''کوثر و تسنیم'' کی اس بندش پر پاکستان ٹائمز اور امروز نے اپنے اداریوں میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ لیکن نوائے وقت نے اس اقدام پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ البتہ پنجاب کے یونینسٹ جاگیرداروں کے ترجمان اخبار انقلاب نے، جو روزنامہ تسنیم کے اجرا سے قبل ابوالاعلیٰ مودودی کی سرگرمیوں کی تشہیر کیا کرتا تھا، صوبائی حکومت کی اسلام کے نام لیواؤں کے خلاف اس تعزیری کاروائی کی پرزور مذمت کی۔ اس نے لکھا ہے کہ ''ہم پوچھنا چاہتے ہیں وہ کون سے اہم قومی مقاصد ہیں جن کی مخالفت کوثر اور تسنیم نے کی؟ کیا پاکستان کا کوئی مقصد اس سے بھی اہم وافضل ہوسکتا ہے کہ یہاں اسلامی نظام جاری ہوجائے اور نظم و نسق کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھ میں آجائے جو اسلامی روح، ایثار و خدمت سے معمور ہوں؟ کوثر و تسنیم نے اس مقصد کے سوا اب تک کیا کیا؟ کیا پابندی دین کی دعوت دینے اور انہیں ہر حالت میں دین کے صراط مستقیم پر چلانے سے بزرگ تر مقصد بھی کوئی ہے؟ اگر ہے تو حکومت پنجاب اسے واضح کرے۔ اس سلسلے میں مسئلہ کشمیر کے متعلق بطور خاص ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے مقصود غالباً یہ ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اس مسئلے کے صرف ایک پہلو کی نسبت شرعی حیثیت واضح کی تھی۔ وہ بھی اس غرض سے نہیں کہ جہاد رک جائے۔ محض اس غرض سے کہ شرعی جہاد کی ساری شرطیں پوری ہوجائیں۔ یہ مسئلہ بھی خود بیان نہ کیا بلکہ کسی شخص نے بہ اصرار پوچھا تو اسے واضح کردیا۔ اس کے باوجود مسئلہ کشمیر کے تمام مقاصد سے مولانا کا نہ محض اتفاق بلکہ ان مقاصد کے لئے سرگرم سعی و کوشش کا معاملہ ہر شخص پر روز روشن کی طرح آشکارا ہے۔ کارفرمایان حکومت دینی امور سے واقف ہوں یا نہ ہوں لیکن وہ ان حقائق سے ناواقف نہیں ہوسکتے جنہیں ہم نے اپنے لفظوں میں بیان کردیا ہے۔ پھر ان کے الزام

کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟"[35] گویا انقلاب کی رائے میں مُلّا مودودی کے کوثر و تسنیم کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ پاکستان میں اسلامی نظام کا اجرا چاہتے تھے اور یہ بھی مطالبہ کرتے تھے کہ "ملک کے نظم و نسق کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھ میں آ جائے جو اسلامی روح، ایثار اور خدمت سے معمور ہوں۔" انقلاب کی یہ رائے بالکل بے بنیاد نہیں تھی۔ پاکستان کے ارباب اقتدار پاکستان میں شرعی نظام کے فوری نفاذ کی مہم سے واقعی بہت پریشان ہو گئے تھے اور اب جبکہ قائداعظم جناح جاں بلب تھے، کسی ابوالاعلیٰ مودودی کی جانب سے "امارت" کا دعویٰ بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کراچی کا مولانا شبیر احمد عثمانی پہلے ہی از خود شیخ الاسلام کا لقب اختیار کر چکا تھا۔

شرعی نظام کے فوری نفاذ کی مہم کے جواب میں لیاقت علی خان، راجہ غضنفر علی خان، ملک فیروز خان نون، خان عبدالقیوم خان، چودھری خلیق الزماں اور نواب ممدوٹ وغیرہ کا عذر یہ تھا کہ شرعی نظام فی الفور نافذ نہیں ہو سکتا۔ یہ کام بہت مشکل ہے اس لئے آہستہ آہستہ ہو گا۔ علما و مشائخ کا فرض ہے کہ وہ قوم کی اخلاقی اصلاح کریں۔ جب مسلمانوں کا انبوہ عظیم صحیح معنوں میں مسلمان بن جائے گا تو معاشرہ خود بخود شرعی ہو جائے گا۔ لیکن علما نہیں مانتے تھے۔ بالخصوص وہ علما جنھوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی، اس مطالبہ پر بضد تھے کہ اسلامی نظام فوراً نافذ کیا جائے اور عنان اقتدار دینداروں کے حوالے کی جائے۔ ان علما کو معلوم تھا کہ "شرعی نظام" کے میدان میں وہ اپنا سیاسی کھیل بڑی آزادی سے کھیل سکتے ہیں اور اس میدان میں ان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ وہ عبدالستار نیازی اور پیر مانکی جیسے ان علما و مشائخ سے اشتراک عمل کر رہے تھے جنھوں نے 46-1945ء میں تحریک پاکستان کی حمایت کی تھی۔ پنجاب میں مودودیوں، احراریوں اور مُلّا عبدالستار نیازی جیسے اسلام پسند مسلم لیگیوں نے دھما چوکڑی مچا رکھی تھی اور صوبہ سرحد میں غلام غوث ہزاروی، پیر مانکی اور ان کے حواریوں نے وزیر اعلیٰ عبدالقیوم خان کے لئے مشکل پیدا کی ہوئی تھی۔ چنانچہ حکومت پنجاب کی جانب سے کوثر و تسنیم کے خلاف تعزیری اقدام سے ہفتہ عشرہ قبل سرحد اسمبلی کے اسپیکر نوابزادہ اللہ نواز خان کا شریعت کے فوری نفاذ کا مطالبہ کرنے والوں کو مشورہ یہ تھا کہ "وہ پاکستان کے موجودہ داخلی و خارجی نازک حالات کے پیش نظر کوئی جامع پالیسی مرتب کریں تاکہ موجودہ پیچیدہ سیاسی حالات میں بھی شریعت کا نفاذ ممکن ہو سکے۔ محض ایک تخیل کے پروپیگنڈا کا نتیجہ پاکستان کے لئے خطرناک ہو گا۔ شریعت کے

فوری نفاذ کا مطالبہ کرنے والے اصحاب دنیا کے موجودہ سیاسی، اقتصادی، معاشی و صنعتی حالات کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ انہیں یہ احساس نہیں کہ اقوام عالم میں معزز مقام حاصل کرنے کے لئے پاکستان کو وقت کی رفتار کے ساتھ چلنا پڑے گا۔ دنیا سے بالکل علیحدہ رہ کر پاکستان زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجلس اقوام متحدہ کا رکن ہونے کی حیثیت سے پاکستان کے لئے ضروری ہے کہ وہ رائج الوقت جمہوری نظام پر عمل پیرا ہو۔ ایران، ترکی، افغانستان، عراق، مصر اور دوسرے اسلامی ممالک میں شریعت کا نفاذ ابھی تک نہیں ہوا۔ ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ان خود مختار ممالک نے کن مشکلات کے پیش نظر تاحال اسلامی قانون رائج نہیں کیا۔ ہمیں اپنی نوزائیدہ سلطنت پاکستان سے انصاف کر کے اسے مضبوط بنانا چاہیے تاکہ یہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کا ہم پلہ بن سکے۔"[36] اور پھر 25/اگست کو سید احمد بریلوی کی قائم کردہ جماعت مجاہدین کے ایک ممتاز رکن فضل الٰہی نے شریعت کے فوری نفاذ کا مطالبہ کرنے والوں کی مخالفت کی۔ اس نے کہا کہ "آج کل پاکستان میں مذہبی مناظروں اور مباحثوں کی ضرورت نہیں بلکہ عمل کی ضرورت ہے۔ اسلامی قانون آہستہ آہستہ نافذ ہونا چاہیے اور اس قسم کی انقلابی تبدیلیوں سے پہلے زمین ہموار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔"[37]

عنایت اللہ مشرقی کی جانب سے ہندوستان کو فتح کرنے کی مہم اور مُلاّ عبدالستار نیازی کا مطالبہ کہ مال غنیمت میں ہر مسلمان کو چار بیویاں مہیا کی جائیں گی

پاکستان کے ارباب اقتدار کے لئے شرعی نظام کے فوری نفاذ کی مہم صرف اسی لئے پریشان کن نہیں تھی کہ مُلاّؤں کے تصور کا یہ نظام عصر جدید میں ناممکن العمل تھا اور اس مہم سے ساری دنیا میں پاکستان کی رسوائی ہو رہی تھی بلکہ اس لئے بھی پریشان کن تھی کہ اس سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان طے شدہ 8/اپریل 1948ء کے اس معاہدے کی بھی خلاف ورزی ہو رہی تھی جس کے تحت دونوں ممالک میں اقلیتوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی ضمانت دی گئی تھی اور بلالحاظ مذہب و ملت سارے شہریوں کے لئے مساوی حقوق کا وعدہ کیا گیا تھا۔ شریعت کے فوری نفاذ کا مطالبہ کرنے والوں میں خاکسار جماعت کا لیڈر علامہ عنایت اللہ مشرقی بھی تھا

جس نے اگرچہ تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی لیکن قیام پاکستان کے بعد اس کے عزائم ابوالاعلیٰ مودودی سے بھی اونچے تھے۔ وہ نہ صرف پاکستان کی موجودہ حدود کے اندر بلکہ ہندوستان کے بہت سے علاقوں کو فتح کر کے ان میں بھی اسلامی نظام رائج کرنے کے عزم کا اعلان کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے اس مقصد کے لئے لاہور میں ایک انڈو۔ پاکستان اسلام لیگ قائم کی تھی جس کے اغراض ومقاصد میں یہ کہا گیا تھا کہ یہ تنظیم دہلی، اجمیر، یو۔ پی، بہار، بمبئی اور برار وغیرہ کے علاقوں کو ہندوؤں سے آزاد کروا کر انہیں پاکستان میں شامل کرے گی۔ اس کے ان اغراض ومقاصد کی تشہیر کے لئے جو اشتہار اور رکنیتی فارم چھپے تھے وہ برائے تقسیم ہندوستان میں بھی بھیجے گئے تھے۔ چنانچہ حکومت ہندوستان نے حکومت پاکستان سے پرزور مطالبہ کیا تھا کہ وہ اس قسم کے پروپیگنڈے کو بند کروائے۔ انڈو۔ پاکستان اسلام لیگ کے خلاف مناسب اقدام کرے۔[38] چنانچہ حکومت مغربی پنجاب کی خفیہ پولیس نے فیروز پور روڈ پر انڈو۔ پاکستان اسلام لیگ سے وابستہ 22 افراد کے گھروں پر چھاپے مارے اور وہاں سے بہت سا قابل اعتراض لٹریچر برآمد کیا۔ اس کے بعد صوبائی حکومت نے یہ حکم صادر کر دیا کہ آئندہ انڈو۔ پاکستان اسلام لیگ یا اس کے کسی رکن کو کوئی پمفلٹ یا اشتہار چھاپنے اور تقسیم کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔''[39]

مُلاّ عبدالستار نیازی کے خلافت گروپ کے منشور میں بھی کچھ اسی قسم کے مذہبی جنون کا عنصر شامل تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے اخبارات نے اس منشور میں اپنی طرف سے بھی ملاوٹ کی اور پھر اس کا حوالہ دے کر پاکستان کے خلاف خوب معاندانہ پروپیگنڈا کیا۔ ان میں سے ایک اخبار ''جے ہند'' کی لاہور سے ارسال کردہ رپورٹ یہ تھی کہ ''مسٹر محمد شفیع ایم۔ اے اور میاں عبدالستار نیازی ایم ایل اے نے خلافت شریعت گروپ کے مینی فیسٹو میں لکھا ہے کہ پاکستان میں شرعی نظام نافذ ہونے کی صورت میں زوجہ اندوزی کی طرف خاص توجہ دی جائے گی اور مسلمانوں کے لئے چار بیویاں حاصل کرنے کے لئے خاص کوششیں کی جائیں گی۔ پاکستان میں رہنے والے ہندوؤں، سکھوں اور دیگر اقوام کے باشندوں سے فالتو عورتیں چھین لی جائیں گی اور وہ مسلمانوں میں تقسیم کر دی جائیں گی تا کہ ہر مسلمان کو چار بیویاں مل سکیں۔ اس مطلب کے لئے مسلمان دوسرے ملکوں پر حملہ کریں گے جہاں عورتیں مردوں سے زیادہ ہوں گی اور وہاں سے عورتیں لا کر انہیں مشرف بہ اسلام کیا جائے گا اور اس مقصد کے لئے ان کا اشارہ مشرقی پنجاب اور

ہندوستان کی طرف ہے۔ کیونکہ مینی فیسٹو میں کہا گیا ہے کہ صرف سکھوں میں 24 لاکھ عورتیں مردوں کی نسبت زیادہ ہیں۔ آگے چل کر خلافت گروپ کے دعویداروں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کو صرف وہی گوشت کھانا چاہیے جس سے انسانی قوت میں اضافہ ہوتا ہو۔ اس مطلب کے لئے انہوں نے بیلوں اور مرغوں کا گوشت کھانے کی تلقین کی ہے اور لکھا ہے کہ مرغ کا گوشت کھانے سے انسان جنگجو بنتا ہے۔ انہوں نے بھیڑ اور مرغیوں کا گوشت کھانے سے مسلمانوں کو منع کیا ہے کیونکہ ان کا گوشت کھانے سے انسان بزدل اور بددماغ بن جاتا ہے۔ انہوں نے مزید لکھا ہے کہ جونہی پاکستان میں شرعی نظام قائم ہو جائے گا ہر مسلمان کو ہر ہفتہ اپنا سر استرے سے منڈوانا پڑے گا اور پاکستانیوں کا قومی لباس ایک تہبند اور عبا (کھلی قمیض) پر مشتمل ہوگا۔ واضح ہو کہ شریعت گروپ اپنے آپ کو خدا اور رسولﷺ کے دین کا صحیح دعویدار کہتا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ غیر مسلمانوں کی دولت اور ان کا مال واسباب چھین لینے سے پاکستان مضبوط ہوگا۔''[40] اگرچہ ''جے ہند'' کی یہ انتہائی اشتعال انگیز خبر مبنی برصداقت نہیں تھی۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ اس زمانے میں مُلّا عبدالستار نیازی اور عنایت اللہ مشرقی جیسے جنونی موجود تھے جو دہلی کے لال قلعہ پر ہلالی پرچم لہرا کر پورے ہندوستان میں اسلام کا غلبہ قائم کرنے کے اعلانات کرتے تھے اور وہ اندرون ملک قرونِ وسطیٰ کا ایسا خلافتی نظام نافذ کرنے کے عزم کا اظہار کرتے تھے جس سے ساری دنیا میں اسلام اور پاکستان کے وقار کو نقصان پہنچتا تھا۔ ان عناصر کو عصر جدید کے تقاضوں اور جغرافیائی و تاریخی حقائق کا کوئی شعور نہیں تھا۔ انہیں محض اپنی لیڈری کی دکان چمکانے سے غرض تھی اور اس مقصد کے لئے وہ شرعی نظام کی لاٹھی سے پورے پاکستان کو داخلی اور خارجی طور پر لہولہان کر رہے تھے۔

احراری مُلّاؤں کا قائداعظم کے خلاف پروپیگنڈا ...... مودودی کا فتویٰ کہ مہاجروں نے ہجرت کر کے غیر اسلامی حرکت کی ہے۔ وہ بھگوڑے اور بزدل ہیں۔ ان کی جانی و مالی قربانی کی کوئی قیمت نہیں

مذہب کے نام پر اسلام اور پاکستان کو بدنام کرنے والوں میں مجلس احرار کے مولوی بھی ابو الاعلیٰ مودودی سے پیچھے نہیں تھے۔ مودودی جب اپنی تحریروں اور تقریروں میں قائداعظم جناح کو گالی دیتا تھا یا قیام پاکستان کو غلط قرار دیتا تھا تو الفاظ کا اس طرح ہیر پھیر کرتا تھا

کہ پڑھنے یا سننے والے کو فوری طور پر اشتعال نہیں آتا تھا۔لیکن احراری مُلّاؤں کی جانب سے مسلم لیگی لیڈروں کے خلاف محتاط یا مہذب الفاظ کا استعمال نہیں ہوتا تھا۔ اس قسم کے ایک احراری مُلّا صاحب زادہ فیض الحسن نے 27راگست کو ضلع شیخوپورہ کے موضع بھلیر میں سید امام علی کے عرس کے موقع پر ایک جلسہ میں بہت بدکلامی کی۔ اس نے کہا کہ ''بیگم لیاقت علی خان اور پاکستان کی وہ ساری عورتیں جو پردہ نہیں کرتیں رنڈیاں ہیں اور پھر الزام عائد کیا کہ مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں ایک لاکھ عورتوں کے اغوا کی وجہ یہ تھی کہ قائداعظم جناح پاکستان کا گورنر جنرل بننا چاہتا تھا۔''[41]

ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی جنوری 1948ء کے بعد اپنی تقریروں میں اور پھر جون 1948ء سے اپنی تحریروں میں مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام کی ذمہ داری قائداعظم پر عائد کی تھی۔ بے پردہ مسلمان عورتوں پر سوقیانہ حملے کئے تھے مگر اس نے اس مقصد کے لئے الفاظ کے انتخاب میں قدرے احتیاط سے کام لیا تھا۔ مودودی جون 1948ء میں اپنی اس پروپیگنڈا مہم کے سلسلے میں جھنگ بھی گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات ایک مقامی اخبار نویس سے ہوئی جس نے اس کی توجہ جماعت اسلامی کے ایک اشتہار کی طرف مبذول کرائی جس پر درج تھا کہ ''مسلمانو تم نے باطل اصولوں کی خاطر گھر بار چھوڑا۔ عزیز و اقارب کو ذبح کروایا...... یہ کیا...... وہ کیا'' تو مودودی نے کہا کہ 'میرے نزدیک کسی کو مہاجر کہنا از روئے شریعت ناجائز ہے کیونکہ مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کا یہ سفر ہجرت نہیں ہے۔ ہجرت اعلائے حکم اللہ کے لئے کی جاتی ہے۔ لیگ کی جنگ کفر و اسلام کی جنگ نہیں تھی۔ مسلم لیگ نے اب یہ نہیں کہا ہے کہ پاکستان کا خطہ اس لئے حاصل کیا جا رہا ہے کہ وہاں پر اسلامی خلافت چلائی جائے گی بلکہ یہ قومیت کی جنگ تھی۔ قومیت کی جنگ کو اسلام کی جنگ سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیگ کی قراردادوں کا جائزہ لیجئے، لیگ نے آج تک تسلیم نہیں کیا کہ پاکستان میں شریعت کا نفاذ ہوگا۔ حکومت پاکستان نے اب تک تسلیم نہیں کیا کہ اسلامی آئین نافذ کرے گی۔ میرے نزدیک مہاجرین کی جانی و مالی قربانیوں کی کوئی قیمت نہیں۔ وہ بھگوڑے اور بزدل ہیں۔ انہوں نے ایک غلط قدم اٹھایا تھا۔ قومیت کی جنگ لڑی تھی۔ جب اس کی سزا بھگتنے کی باری آئی تو مشکلات سے گھبرا کر راہ فرار اختیار کی۔ پاکستانی مسلمان جہاد کشمیر میں حصہ نہیں لے سکتے۔ کشمیریوں کے لئے جائز ہے۔ حکومت ہند اور پاکستان

کے تجارتی واقتصادی اور جنگی معاہدے ہیں۔ معاہدہ منسوخ کرنے کے بغیر پاکستانی عوام از روئے قرآن اس جنگ میں حصہ نہیں لے سکتے۔ اگر دوسرے علما اس سلسلے میں مجھ سے اختلاف کریں تو میں اپنی رائے نہیں بدلوں گا کیونکہ مجھے دوسرے لوگوں کے سیاسی شعور پر اعتماد نہیں۔ مجھے اپنی بات سے غرض ہے۔ مجھے حق بات کہنے میں باک نہیں۔''[42] گویا مُلاّ مودودی کے نزدیک مذہب محض برائے فن تھا۔ وہ اس فن کی پاکیزگی کو بہر صورت قائم رکھنے کا تہیہ کئے ہوئے تھا۔ خواہ اس سے مسلمانوں کو سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی لحاظ سے کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچتا ہو۔ اسلام کو محض ایک جامد و بے لچک عقیدہ بنانے کی اس سے بدتر کوشش اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ مذہب برائے مذہب کا اسی طرح قائل تھا جس طرح کہ یورپ میں بعض لوگ فن برائے فن کے قائل تھے۔ اسے عامتہ المسلمین کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ قرآن مجید کی سورہ انفال کی بعض آیات کی اپنی تعبیر پر مصر ہونے کو حق پسندی اور حق گوئی سمجھتا تھا اور یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اسے حق بات کہنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ جھنگ کے ڈپٹی کمشنر نواب زادہ فتح اللہ خان نے مولوی مودودی کے اس دورہ کے بعد اپنے دفتر کے ملازمین کو بذریعہ سرکلر حکم دیا تھا کہ وہ اس کی اقتداء میں نماز جمعہ ادا کریں ورنہ انہیں جرمانہ کیا جائے گا۔

جہاد کشمیر پر مودودی کے فتویٰ کا آل انڈیا ریڈیو سے پروپیگنڈا اور پنجاب میں مودودی کے خلاف غداری کا مقدمہ چلانے کا مطالبہ

مُلاّ مودودی کے جھنگ والے انٹرویو کی رپورٹ نوائے وقت کے 28 راگست کے شمارے میں چھپی تھی۔ یکم ستمبر کو اس اخبار نے سیالکوٹ کے ایک شخص محمد نواز کا ایک مراسلہ شائع کیا جس میں لکھا تھا کہ ''جموں ریڈیو سے ابھی تک مسلسل یہ پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے کہ پاکستان کے بہت بڑے جید عالم علامہ ابوالاعلیٰ مودودی نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ کشمیر کی لڑائی جہاد نہیں ہے اور پاکستان کے مسلمانوں کو اس میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ مودودی صاحب کے بعض مضمونوں کے ٹکڑے ریڈیو سے نشر کر کے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ پاکستان میں اسلام کی کوئی قدر نہیں اور اس کے لیڈروں کا کریکٹر اسلام پر شرمناک دھبہ ہے۔ یہ زہریلا پروپیگنڈا استصواب رائے کے وقت بہت خطرناک ثابت ہوگا اور سیدھے سادے کشمیری یہ سمجھنے لگیں گے کہ جب پاکستان میں اسلام

کی یہ قدر ہے اور اس کے لیڈروں کی زندگیاں کافرانہ ہیں تو ہندوستان اور پاکستان میں فرق ہی کیا اور ہم کیوں پاکستان میں شامل ہوں۔ علمائے کرام کا فرض ہے کہ وہ اس باطل پروپیگنڈے کا تریاق مہیا کریں اور آزاد کشمیر ریڈیو اور پاکستان ریڈیو سے مودودی صاحب کے گمراہ کن استدلال کو غلط ثابت کیا جائے۔''[43] اسی دن روزنامہ امروز کے دفتر میں یہ خبر موصول ہوئی کہ ''جماعت اسلامی نے حکومت پاکستان کے خلاف ایک باقاعدہ محاذ قائم کر دیا ہے اور اپنی سرگرمیوں کو تمام صوبوں میں تیز تر کرنے کی مہم شروع کر دی ہے۔ تمام شاخوں کو خفیہ ہدایات روانہ کردی گئی ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی نے صوبہ سرحد میں جماعت کے کارکنوں کی گرفتاری کی وجہ سے بہت شاخوں کو خاص احکامات بھیجے ہیں جن میں سب کارکنوں کو گرفتاری کی صورت میں ضروری ہدایات جاری کردی گئی ہیں۔ جماعت اسلامی نے تہیہ کرلیا ہے کہ وہ اپنے مشن کو اس وقت تک جاری رکھے گی جب تک کامیابی حاصل نہ ہو جائے۔ مولانا مودودی کی چند ہدایات یہ ہیں: (1) گرفتاری سے بچنے کی ہرگز کوشش نہ کریں۔ نہ رہا ہونے کے لئے ضمانت دیں نہ کوئی جرمانہ ادا کریں اور نہ کسی ظلم وستم، بے عزتی سے خوفزدہ ہو کر کمزوری دکھائیں۔ (2) اگر کسی پر مقدمہ چلایا جائے تو وکیل نہ کریں بلکہ خود ہی مدافعت کریں۔ (3) اگر انہیں عدالت کے سامنے مجرم قرار دینے کی کوشش کی جائے تو ہمارے کارکنوں کو صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ (4) گرفتاری کے بعد جماعت کے کسی فرد کو حکومت سے کسی رعایت کا مطالبہ نہ کرنا چاہیے۔ وہ پورے صبر وسکون کے ساتھ ہر چیز کو برداشت کرے۔ جماعت کے ارکان اور اس کے ہمدردوں کو دل شکستہ ہو کر اپنے نصب العین کی جدوجہد میں مت گھبرانا چاہیے۔''[44]

پھر نوائے وقت میں جہلم کے ایک شخص کا یہ خط چھپا کہ ''گزشتہ چند ماہ سے جماعت اسلامی کی تخریبی سرگرمیاں بہت تیز ہوگئی ہیں۔ اس جماعت کے کارکن ہر شہر میں مختلف سوانگ رچائے نظر آتے ہیں۔ رنگارنگ کے اشتہارات اور پمفلٹ تقسیم کرتے ہیں اور جب دریافت کیا جائے کیا کہ یہ روپیہ کہاں سے آتا ہے تو آئیں بائیں کرنے لگتے ہیں۔ عوام مسئلہ کشمیر کو پاکستان کی موت وحیات کا مسئلہ قرار دیتے ہیں مگر اس جماعت کے لیڈر رائے عامہ کے خلاف اور محض ہندوستان اور غدار اعظم (شیخ عبداللہ) کی خوشنودی کے لئے اسے غیر شرعی کہتے ہیں۔ خان ممدوٹ کی خدمت میں عرض ہے کہ زیادہ شرافت کمزوری کا دوسرا نام ہے۔ زہریلے ناگوں کا سر

فوراً کچلا جاتا ہے۔حکومت پاکستان کے خلاف تخریبی سرگرمیوں میں حصہ لینے والوں کا ٹھکانہ جیل اورصرف جیل ہے۔آپ بھی خان عبدالقیوم کی طرح پاکستان کے دشمنوں کو کچلنے میں بالکل دیر نہ کریں۔''[45] اس مراسلے میں کوئی ابہام نہیں تھا۔اس میں کھلم کھلا مطالبہ کیا گیا تھا کہ مُلّا مودودی اوراس کے حواری ملک وقوم کے غدار ہیں۔انہیں جیل میں ڈالا جائے اوراگر اس مُلّا کی غداری کے الزام کے بارے میں کوئی شبہ تھا تو وہ 2رستمبر 1948ء کو دور ہوگیا جبکہ نوائے وقت میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ''سول سیکرٹریٹ کے ایک اسسٹنٹ کو اس بنا پر معطل کر دیا گیا ہے کہ اس نے حکومت پاکستان سے وفاداری کا حلف اٹھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اس صورت میں پاکستان کا وفادار رہ سکتا ہوں جس صورت میں اس کا نظام حکومت شرعی ہو۔''

نوائے وقت نے اگلے دن اس خبر پر اپنے ادارتی تبصرے میں الزام عائد کیا کہ مودودی کی سرگرمیوں اور ارشادات کا اصل مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی نوزائیدہ مملکت کی جڑیں کھوکھلی کی جائیں۔تبصرہ یہ تھا کہ ''ہمیں افسوس ہے کہ مودودی صاحب کا فتنہ اب اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ سرکاری اہلکار حکومت ومملکت کی وفاداری کا حلف اٹھانے سے انکار کرنے لگے ہیں۔ جب تک انگریزوں کی حکومت تھی تو مودودی صاحب کے ہمدرد ومعاون اور معتقد سرکاری افسر اور اہلکار انگریزوں کی حکومت کی وفادارانہ خدمت کرتے رہے اور مودودی صاحب نے انہیں اس سے نہ روکا۔نمائشی پروپیگنڈا دوسری چیز ہے مگر کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے بعض اعلیٰ افسر مودودی صاحب کے معاون وسرپرست تھے اور مودودی صاحب کو ان سے مالی اعانت بھی ملتی رہی۔حیرت ہے کہ جب تک انگریزی راج تھا مودودی صاحب نے نہ تو یہ فتویٰ دیا کہ لڑائی کے لئے فوج میں بھرتی حرام ہے اور نہ یہ اعلان کیا کہ میرے معاونوں اور مریدوں کو انگریزی حکومت سے بغاوت کا اعلان کر دینا چاہیے لیکن پاکستان کی مشکلات کے انتہائی نازک دور میں بھی انہوں نے جہاد کشمیر میں پاکستانی مسلمانوں کی شرکت کو حرام قرار دینا ضروری سمجھا اور کھلم کھلا یہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ سرکاری ملازموں کو پاکستان کی وفاداری کا حلف نہیں اٹھانا چاہیے کیونکہ مسلمان صرف خدا اور رسول ﷺ کا وفادار ہے کسی اور کا وفادار نہیں ہوسکتا......مودودی صاحب کا طرز استدلال سخت گمراہ کن ہے۔وہ پوری بات اولاً ایک وقت میں نہیں کہتے۔ان کا پہلا ارشاد یہ ہے کہ ''مسلمان صرف خدا اور رسول ﷺ کا

وفادار ہے۔ ہم صرف اس حد تک پاکستان کے وفادار ہیں جس حد تک کہ اس کا نظام اور اس کے احکام شرعی ہیں...... ان کی دوسری بات یہ ہے کہ ''جسے وہ بار بار کہہ چکے ہیں اور ان کے اخبارات اور مریدوں نے ہزاروں مرتبہ دہرایا ہے کہ پاکستان کا نظام غیر اسلامی اور کافرانہ ہے۔ اب دو اور دو جمع کیجئے تو نتیجہ چار ہی نکلے گا۔

پہلا ارشاد...... مسلمان پر پاکستان کی وفاداری اسی حد تک فرض ہے جس حد تک پاکستان کا نظام شرعی ہو۔

نتیجہ:۔ پاکستان کی حکومت ایک غیر شرعی اور کافرانہ حکومت ہے چنانچہ مسلمان پر پاکستان کی وفاداری فرض نہیں۔

بظاہر مودودی صاحب کے ارشادات اپنی اپنی جگہ بڑے معصومانہ ہیں اور عام طور پر ایک نیک دل مسلمان یہی سمجھے گا کہ حضرت مولانا پکے اور سچے مسلمان ہیں۔ اس لئے وہ اس قسم کی باتیں کہتے پھرتے ہیں۔ لیکن ان کے سب ارشادات پر بیک وقت غور کیا جائے تو بے وقوف سے بے وقوف آدمی بھی یہ سمجھ جائے گا کہ حضرت کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنی نوزائیدہ مملکت سے جس کے لئے پانچ لاکھ مسلمان شہید ہوئے ہیں، بدظن کر کے اس مملکت کی جڑیں کھوکھلی کی جائیں۔ اس کا فیصلہ ہم مودودی صاحب کے دوستوں پر ہی چھوڑتے ہیں کہ اسلامی حکومت کے لئے ایک مضبوط پاکستان کا وجود ضروری ہے یا اسلامی حکومت کے قیام کے امکانات ایک ایسے کمزور اور کھوکھلے پاکستان میں زیادہ ہیں جس کے اپنے شہری ہی اس سے متنفر ہوں اور جس کی یہ حالت ہو کہ ہندوستان جب چاہے اسے ہڑپ کر لے۔''[46] نوائے وقت نے مودودی صاحب کے جن دوستوں اور گورنمنٹ آف انڈیا کے جن اعلیٰ افسروں کی سرپرستی و مالی اعانت کا ذکر کیا تھا ان میں حکومت پاکستان کا سیکرٹری جنرل چودھری محمد علی بھی شامل تھا۔ مُلّا مودودی نے چند سال بعد اس حیثیت کا اعتراف اپنے اخبار روزنامہ تسنیم میں اس طرح کیا تھا کہ چودھری محمد علی صاحب سے میرے ذاتی تعلقات پندرہ سولہ برس پرانے ہیں اور برادرانہ حد تک ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے ہی وہ میرے ہاں تشریف لاتے تھے اور میں ان کے ہاں جاتا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی وہ ہمیشہ مجھ سے ملتے رہے۔ ان کی سرکاری پوزیشن اور میری سیاسی پوزیشن کبھی ان تعلقات میں مانع نہیں ہوئی۔''[47]

پاکستان میں ابوالاعلیٰ مودودی کے سیاسی طور پر بے لگام ہو جانے کی ایک وجہ اس کے اور چودھری محمد علی کے ان ''برادرانہ تعلقات'' میں بھی مضمر تھی۔ چودھری محمد علی حکومت پاکستان کا ایک تجربہ کار افسر تھا اور اس حیثیت سے وہ پہلے قائداعظم جناح کا اور پھر وزیر اعظم لیاقت علی خان بڑا معتمد تھا۔ حکومت پاکستان نے اپریل 1948ء میں کشمیر کے محاذ پر پاکستان کی باقاعدہ فوجیں بھیجنے کا جو فیصلہ کیا تھا اس میں وزیر خارجہ ظفر اللہ خان کے علاوہ چودھری محمد علی کے مشورے کا بھی بڑا دخل تھا۔ یہ فیصلہ 20/اپریل کو پاکستان کے کمانڈر انچیف جنرل گریسی کی ایک رپورٹ کی وصولی کے بعد ہوا تھا اور 21/اپریل کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے یہ قرارداد منظور کی تھی کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے اقوام متحدہ کی نگرانی میں استصواب کرایا جائے گا اور اقوام متحدہ کا ایک کمیشن ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں سے بات چیت کر کے کشمیر میں جنگ بندی کرائے گا۔ مگر انہی دنوں مودودی کی مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ ''چونکہ موجودہ حکومت پاکستان غیر اسلامی ہے اس لئے ہم مسلمانوں کو اس کی فوج یا ریزرو دستوں میں بھرتی ہونے کا مشورہ نہیں دے سکتے۔'' پھر مئی 1948ء میں جبکہ پاکستان کی باقاعدہ بری فوج کشمیر کی لڑائی میں ملوث ہو چکی تھی اور یہ تجویز زیر غور تھی کہ پاکستان کی ہوائی فوج کو بھی اس جنگ میں مصروف کیا جائے تو مودودی کا پشاور میں فتویٰ یہ تھا کہ از روئے قرآن مسلمانان پاکستان کے لئے جنگ آزادی کشمیر جہاد نہیں ہے۔ جولائی کے اوائل میں جب اقوام متحدہ کا کمیشن پاکستان پہنچا تھا تو اس وقت ملک کے طول و عرض میں مُلّا مودودی کی جانب سے شروع کیا ہوا یہ مذہبی مباحثہ زور شور سے جاری تھا کہ از روئے قرآن کشمیر کی جنگ جہاد ہے یا نہیں؟

نوائے وقت کے اس مسئلہ پر 15/جولائی، 31/جولائی اور 6/اگست کے اداریوں کا پس منظر یہی تھا کہ اس عرصے میں اقوام متحدہ کا کمیشن پاکستان اور ہندوستان کے درمیان پہلے جنگ بندی کرانے اور پھر استصواب کرانے کے انتظامات کے لئے گفت و شنید میں مصروف تھا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ ظفر اللہ خان نے 7/جولائی کو کراچی میں اس کمیشن سے پہلی ہی ملاقات میں یہ اعتراف کر لیا تھا کہ پاکستان کی باقاعدہ فوجیں 8/مئی سے کشمیر کے محاذ پر ہندوستانی فوجوں سے نبرد آزما ہیں۔ پھر اگست کے اوائل میں ظفر اللہ خان نے کمیشن کے روبرو یہ بھی اعتراف کر لیا تھا کہ آزاد کشمیر کی فوجیں بھی پاکستان کے آپریشنل کنٹرول کے تحت سرگرم عمل ہیں۔ پھر

13 راگست کو کمیشن نے کشمیر میں جنگ بندی اور استصواب کے بارے میں قرارداد منظور کی تھی اور پھر 23 راگست کو حکومت مغربی پنجاب نے مودودی کے اخبارات ''کوثر'' اور ''تسنیم'' پر پابندی عائد کر دی تھی۔ اسی مہینے کے ترجمان القرآن میں مودودی نے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام کی خونچکاں داستان کو دہرایا اور لکھا تھا کہ ''اس پورے گروہ میں ایک کو بھی نہ تھا جو بازی کھو دینے کے بعد سر دے سکتا۔ یہ ساری جماعت بازی گروں سے پٹی پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشہ دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندے بنے ہوئے تھے۔''[48] اور پھر 2 رستمبر کو پنجاب کے سول سیکرٹریٹ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک اسسٹنٹ نے اس بنا پر حلف وفاداری اٹھانے سے انکار کر دیا کہ پاکستان کا نظام حکومت شرعی نہیں تھا۔

3 رستمبر کو اس خبر پر نوائے وقت کا اداریہ شائع ہوا تو 9 رستمبر کو ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک بیان کے ذریعہ جنگ کشمیر کے بارے میں قلابازی کھانے کی کوشش کی۔ اس نے جموں ریڈیو کے اس پروپیگنڈے کو کہ جنگ کشمیر جہاد نہیں ہے جھوٹ قرار دیا اور کہا کہ کشمیری مسلمانوں کی سلامتی پاکستان کے ساتھ ان کے الحاق سے وابستہ ہے۔ اس لئے جماعت اسلامی نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر استصواب ہوا تو اپنے سارے اثر ورسوخ اور اپنے سارے وسائل کے ذریعے کشمیری مسلمانوں کو ترغیب دے گی کہ وہ اپنے مفاد کی خاطر پاکستان کے حق میں ووٹ دیں۔ اس نے کہا کہ نہ صرف جغرافیائی، تاریخی، معاشی، ثقافتی اور مذہبی لحاظ سے بلکہ تمام دوسرے ممکنہ پہلوؤں سے کشمیر پاکستان کا جزو ہے۔ اس کے ہندوستان اور اس کے عوام سے کسی قسم کے کوئی روابط نہیں ہیں۔ کشمیر اور پاکستان کا ایک دوسرے کے ساتھ رشتہ اس قدر مربوط و مضبوط ہے اور ان کا ایک دوسرے پر اس قدر انحصار ہے کہ یہ ایک دوسرے کے بغیر اپنے وجود کو قائم نہیں رکھ سکتے ہیں۔ کشمیر کی جنگ کے بارے میں میں نے پاکستانی عوام کے رویے کے بارے میں شرعی نقطہ نگاہ کی جو تعبیر کی ہے اس کی اصلی اہمیت یہ ہے کہ حکومت پاکستان کو صورتحال کی سنگینی کا احساس کر کے ہندوستان سے سارے معاہدات ختم کر دینے چاہئیں تا کہ پاکستان کے سارے عوام شریعت کی حدود کی خلاف ورزی کئے بغیر کشمیر کی جدوجہد میں حصہ لے سکیں۔ میری اب بھی رائے یہ ہے کہ اگر قوم کے راستے میں معاہدات حائل نہ ہوتے تو اب تک کشمیر آزاد ہو گیا ہوتا۔ جتنی جلدی یہ

رکاوٹ دور کردی جائے اتنا ہی سب کے لئے بہتر ہوگا۔‘‘[49]

ابوالاعلیٰ مودودی کشمیر کی جنگ کے جذباتی مسئلہ کے بارے میں مئی میں مخالفانہ فتویٰ دے کر اور پھر جون اور جولائی میں اس پر اصرار کر کے جس سیاسی مشکل میں پھنس گیا تھا روزنامہ امروز نے 12 راگست کو اسے اس کے تباہ کن سیاسی نتائج سے متنبہ کیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ جس طرح چوتھے عشرے میں مجلس احرار اسلام نے مسجد شہید گنج کے مسئلہ پر ایک غلط موقف اختیار کر کے اپنا سیاسی خاتمہ کر لیا تھا اسی طرح ’’ہمارے خیال میں مودودی صاحب نے مسئلہ کشمیر کے متعلق جو روش اختیار کی ہے اس سے نہ صرف انہیں بلکہ جماعت اسلامی کو سخت نقصان پہنچے گا اور مودودی صاحب جتنا اپنی بات پر اصرار کریں گے عوام اتنے ہی ان کے مخالف ہو جائیں گے۔‘‘ لیکن کئی دن تک مودودی کو اس مشکل سے نکلنے کی کوئی راہ نظر نہ آئی۔ بالآخر 26 راگست کو روزنامہ انقلاب نے اسے راہ دکھائی۔ اس نے مودودی کی صفائی میں لکھا کہ ابوالاعلیٰ مودودی نے اس مسئلے کے صرف ایک پہلو کی نسبت شرعی حیثیت واضح کی تھی۔ وہ بھی اس غرض سے نہیں کہ جہاد رک جائے بلکہ محض اس غرض سے کہ شرعی جہاد کی ساری شرطیں پوری ہو جائیں۔‘‘ چنانچہ مودودی نے چند دن بعد 4 رستمبر کو انقلاب کی سمجھائی ہوئی یہی راہ اختیار کی اور کہا کہ ’’میں کشمیر کے جہاد کے خلاف نہیں ہوں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ پاکستان ہندوستان کے ساتھ اپنے معاہدے توڑ کر جہاد کشمیر کے لئے ساری شرائط کو پوری کر دے۔‘‘ مودودی نے جب یہ بیان دیا تھا اس وقت غیر ملکی اخبارات میں یہ چیز چھپ چکی تھی کہ پاکستان کے وزیر خارجہ ظفر اللہ خان نے اقوام متحدہ کمیشن کے سامنے یہ اعتراف کر لیا ہے کہ پاکستان کی باقاعدہ بری فوج 8 رمئی سے کشمیر کے محاذ پر مصروف پیکار ہے اور آزاد کشمیر فوج کا آپریشنل کنٹرول پاکستان کے پاس ہے۔

سرحد اور پنجاب کی حکومتوں کی جانب سے احراریوں، ترقی پسندوں اور شرعی نظام کا نعرہ لگانے والے سیاسی مخالفوں کے خلاف اقدامات

ابوالاعلیٰ مودودی کی اس قلابازی سے مُلّا عبدالستار نیازی کے خلافت گروپ، پیر مانکی کے شریعت گروپ، عطا اللہ بخاری کی مجلس احرار اور داؤد غزنوی کی جمعیت استحکام پاکستان نے بھی سکھ کا سانس لیا کیونکہ مودودی کے جہاد کشمیر کے متعلق خیالات کی وجہ سے سیاسی طور پر ان

جماعتوں کو بھی نقصان پہنچ رہا تھا۔ اگر چہ ان جماعتوں کا مودودی کی جماعت اسلامی سے کوئی رسمی متحدہ محاذ نہیں تھا تاہم چونکہ یہ اپنے سیاسی مقاصد کے لئے شرعی نظام کا ایک ہی نعرہ لگا رہے تھے اس لئے مودودی کے علاوہ ان کے متعلق بھی شبہات پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ مجلس احرار اس وقت تک اپنا سیاسی حربہ یعنی مسئلہ ختم نبوت عوامی سطح پر اٹھا چکی تھی اور اس کے نفاذ شریعت کے لئے جو جلسے ہوئے تھے ان میں احمدیوں کو کافر قرار دینے اور ظفر اللہ خان کو حکومت سے نکالنے کا ذکر ہوتا تھا۔ تاہم مودودی کی اس قلابازی کے باوجود صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ عبدالقیوم خان نے مولویوں کے بارے میں عوام کے مخالفانہ جذبات سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے پہلے تو 29 راگست کو یہ الزام عائد کیا کہ پیر مانکی کا گروپ حکومت کی مخالفت کر کے اپنے آپ کو سرخپوشوں کی صف میں کھڑا کر رہا ہے اور اس نے چارسدہ کی گڑبڑ میں سرخپوشوں کا ساتھ دیا ہے۔ پھر اس نے یکم ستمبر کو پشاور شہر، پشاور چھاؤنی اور نواحی بستیوں میں دفعہ 144 نافذ کر کے جلسوں اور جلوسوں پر پابندی کر دی۔ اور پھر دو ستمبر کو یہ اعلان کیا کہ مجلس احرار کے زیر اہتمام پشاور میں 3 رستمبر سے جو سہ روزہ نفاذ شریعت کانفرنس ہو رہی ہے وہ غیر قانونی ہوگی۔ اس نے اپنے اس اعلان میں کہا کہ ”جن لوگوں نے ہمیشہ پاکستان کی مخالفت کی ہے انہیں کوئی حق نہیں کہ پاکستانی عوام کی رہنمائی کریں۔“

2 رستمبر 1948ء کو حکومت مغربی پنجاب نے اردو کے تین رسالوں ادب لطیف، نقوش اور سویرا کی اشاعت پر چھ ماہ کے لئے پابندی عائد کر دی اور پاکستان مسلم لیگ خلافت گروپ کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹ بعنوان، ففتھ کالم کون ہے، کو سیفٹی ایکٹ کے تحت ضبط کر لیا۔ ان رسالوں کے خلاف الزام یہ تھا کہ یہ حکومت پاکستان کے خلاف نفرت پھیلانے والا مواد شائع کرتے تھے۔ نقوش کے جولائی کے شمارے میں سعادت حسن منٹو کا افسانہ ”کھول دو“ شائع ہوا تھا اور پمفلٹ کی ضبطی کی وجہ یہ تھی کہ اس میں مدیر نوائے وقت کے خلاف یہ الزام تھا کہ وہ تحریک پاکستان کے دوران پنجاب کی یونینسٹ حکومت کا وظیفہ خوار رہا تھا۔[50]

5 رستمبر کو حکومت مغربی پنجاب نے مجلس احرار کے روزنامہ ”آزاد“ کے ایڈیٹر کو حکم دیا کہ وہ آئندہ کسی مذہبی فرقہ کے خلاف قلم نہ اٹھائے۔ اس حکم کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی تھی کہ احراری مولوی اپنی نفاذ شریعت سے متعلقہ مہم کو اب اینٹی احمدیہ تحریک کی شکل دینے لگے تھے اور یہ اخبار ان مولویوں کی تقریروں کی تشہیر کرتا تھا اور ان تقریروں پر تبصروں اور مضامین میں احمدی

فرقہ کے خلاف عامتہ المسلمین کے مذہبی جذبات کو ابھارتا تھا۔ لاہور کے روزنامہ انقلاب نے مجلس احرار پر اس قسم کی پابندیوں کو ناپسند کیا۔ اس نے عبدالقیوم خان کے اس اعلان پر کہ جو لوگ پاکستان کے مخالف رہے ہیں انہیں اب یہاں کے عوام کی رہنمائی کا کوئی حق نہیں، سخت اعتراض کیا اور لکھا کہ ''خود مسٹر عبدالقیوم خان 1946ء تک کانگرس کے ساتھ تھے۔ انہیں تو آج ہر فیصلے کا حق ہے، ہر قیادت کا حق ہے لیکن دوسروں کو کوئی حق نہیں۔''[51] بظاہر انقلاب کا یہ استدلال ٹھیک تھا۔ لیکن اس نے یہ موقف اس لئے اختیار نہیں کیا تھا کہ وہ کسی اصول کے تحت اسے صحیح لیتا تھا بلکہ اس لئے اختیار کیا تھا کہ اس طرح اس کے اپنے ماضی و حال کی بھی پردہ پوشی ہوتی تھی۔ وہ خود بھی اگست 1947ء سے قبل یونینسٹ جاگیرداروں کے ترجمان کی حیثیت سے تحریک پاکستان کی مخالفت کرتا رہا تھا اور اب شرعی نظام کی آڑ لے کر پاکستان کے ارباب اقتدار کے لئے مشکلات پیدا کر رہا تھا اور ارباب اقتدار نے نوائے وقت کے 18 راگست کے اداریے مشورے کے مطابق یہ فیصلہ کیا تھا کہ آئندہ اس قسم کے عناصر کی ''غداری'' کے ڈنڈے سے سرکوبی کی جائے گی۔

10 رستمبر کو پیر مانکی نے لاہور میں ایک پریس کانفرنس کو بتایا کہ صوبہ سرحد میں عبدالقیوم خان اپنے سیاسی نکتہ چینوں کے خلاف ''غداری'' کی لاٹھی کو بڑی بے رحمی سے استعمال کر رہا ہے۔ وہاں مسلم لیگ کے ان ممبروں کو گرفتار کیا جا رہا ہے جو پاکستان میں شرعی نظام کے علمبردار ہیں اور وزارت پر جائز نکتہ چینی کرتے ہیں۔ شریعت کے حامی ڈیرہ اسماعیل خان، نوشہرہ اور پبی میں پکڑے گئے ہیں۔ اب مجھ پر غلط اور گمراہ کن الزامات لگا کر گرفتاری کے لئے بہانے تراشے جا رہے ہیں تاکہ مسلم لیگ کے انتخابات میں نہ کوئی شریعت کا نام لیوا آ سکے اور نہ وزارت پر نکتہ چینی کرنے والا۔ میرے خلاف قیوم خان جو یہ الزام عائد کر رہا ہے کہ میرے ایجنٹوں نے چارسدہ کی گڑبڑ میں سرخپوشوں کا ساتھ دیا تھا، اس کی چھان بین کے لئے ایک آزاد ٹربیونل مقرر کیا جائے اور اگر میرا جرم ثابت ہو جائے تو مجھے گولی سے اڑا دیا جائے۔ میں نے جب سے شرعی نظام کا نعرہ بلند کیا ہے خان عبدالقیوم خان مجھے اپنے نوابی اقتدار کا مخالف سمجھنے لگا ہے حالانکہ اگر میں ایسا نعرہ بلند نہ کرتا تو شریعت کے نام پر قربانیاں دینے والے عوام حکومت کے مخالف عناصر سے مل جاتے۔''[52] پیر مانکی کے اس بیان سے ظاہر تھا کہ اب ارباب اقتدار نے مُلّاؤں کے خلاف ''غداری'' کی جو لاٹھی گھمائی تھی وہ مؤثر ثابت ہو رہی تھی۔ صوبہ سرحد کے مسلم لیگیوں میں پیر مانکی

کا سیاسی وقار خاصا بلند تھا۔ اس نے جولائی 1947ء کے ریفرنڈم میں گراں قدر خدمات سرانجام دی تھیں بلکہ جنگ کشمیر میں قبائلیوں کو ملوث کرنے کے سلسلے میں بھی اس نے خاصا کام کیا تھا لیکن اس کے باوجود عبدالقیوم خان اسے سرخپوشوں کے ساتھ نتھی کر کے ''غداری'' کی لاٹھی کی زد میں لے آیا تھا۔ اس سیاسی حربے سے قیوم خان کا مقصد یہ تھا کہ پیر مانکی شرعی نظام کا پرچم اٹھا کر صوبائی لیگ پر قبضہ کرنے کی جو کوشش کر رہا تھا اسے ناکام کیا جائے۔ اگر پیر مانکی صوبہ لیگ کا صدر منتخب ہو جاتا تو سرحد میں قیوم خان کی سکھا شاہی زیادہ دیر نہیں چل سکتی تھی۔ پیر مانکی کا بجا طور پر الزام یہ تھا کہ ''پاکستان مسلم لیگ کے کنوینر چودھری خلیق الزماں نے قیوم خان سے گٹھ جوڑ کر لیا ہے اور اس بنا پر سرحد مسلم لیگ کے انتخابات منصفانہ نہیں ہوں گے۔''

قائداعظم کا انتقال اور حیدرآباد (دکن) پر بھارتی حملہ......حکومت کے مخالفین وقتی طور پر گوشہ نشین ہو گئے

جب 11 رستمبر 1948ء کو قائداعظم جناح کا انتقال ہوا اور اس سے اگلے دن ہندوستانی افواج نے حیدرآباد دکن پر حملہ کر دیا تو پیر مانکی جیسے ان عناصر کی سیاسی پوزیشن اور بھی خراب ہو گئی جو شرعی نظام کی آوازیں لگا کر اپنا سیاسی کاروبار کرتے تھے۔ چونکہ قائداعظم کی علالت عوام الناس سے خفیہ رکھی گئی تھی اس لئے جب اچانک ان کے انتقال کی خبر آئی تو پورے ملک میں سناٹا چھا گیا اور اس سے اگلے دن جب پتہ چلا کہ ہندوستان نے حیدرآباد (دکن) پر حملہ کر دیا ہے تو عوام کے اندوہ وغم نے خوف و ہراس کی صورت اختیار کر لی۔ نتیجتاً حکومت کے سارے مخالفین وقتی طور پر گوشہ نشین ہو گئے۔

مودودی نے قائداعظم کے انتقال پر نہ کوئی تعزیتی بیان جاری کیا اور نہ مس فاطمہ جناح سے اظہار افسوس کیا

17 رستمبر کو نوائے وقت میں سیالکوٹ کے ایک شخص مولانا محمد صادق کا ایک طویل مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا کہ ''قرآن وحدیث کے صریح حکم کے ہوتے ہوئے رائے اور اجتہاد سے فتویٰ دینا حرام ہے۔'' اس مضمون میں بتایا گیا تھا کہ نزول قرآن کے زمانے سے لے کر

آج تک کسی صحابی، تابعی، تبع تابعی، محدث، مجتہد اور امام نے سورہ انفال کی متعلقہ آیت کو مظلوم مسلمانوں کی امداد کے عدم جواز کے لئے پیش نہیں کیا۔ سینکڑوں علما نے مودودی صاحب کے فتوے کی تردید و تغلیط میں بہت سی آیات و احادیث پیش کیں اور ثابت کیا کہ مودودی صاحب نے آیت کی تفسیر بالرائے کر کے گمراہ کن فتویٰ دیا ہے۔ مودودی صاحب کو چاہیے تھا کہ اب خاموش رہتے بلکہ اپنے کئے پر نادم ہو کر فتوے سے رجوع کر لیتے لیکن مودودی صاحب نے علما کو مخاطب کرنا یا ان کے پیش کردہ دلائل کے رد و قدح کو اپنی شایان شان نہ سمجھا اور اپنے شمس اجتہاد کو ہمیشہ کے لئے نصف النہار پر سمجھتے ہوئے ایک علمی تنقید کو آسمان تصور پر بے نور کر دیا...... آخر میں ایک گلہ بھی سن لیجئے۔ قائداعظم کی وفات حسرت آیات پوری ملت اسلامیہ کے لئے ایک المناک حادثہ ہے۔ کوئی آنکھ ایسی نہیں جو پرنم نہیں، کوئی دل نہیں جو پارہ پارہ نہیں...... مگر افسوس صد افسوس کہ کشمیر کے معاملہ پر تو مودودی کا اشہب قلم سرپٹ دوڑ رہا ہے مگر ملت اسلامیہ کے محبوب قائد کی وفات پر ہمدردی، غم اور تقویت کے دو رسمی کلمے بھی آپ کے قلم سے نہ نکالے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔"[53] اسی دن جھنگ کے نمائندہ نوائے وقت کی اطلاع یہ تھی کہ "میں نے جماعت اسلامی کے مخلص کارکن اور ممتاز عہدیدار محترم مولانا عظمت اللہ پانی پتی سے ملاقات کی تو مولانا صاحب نے مسئلہ کشمیر پر مولانا مودودی کی فلسفیانہ بحث کو نقصان دہ قرار دیا اور کہا کہ امیر جماعت اسلامی کا اقدام انتہائی مضرت رساں ثابت ہوا ہے۔ اس سے جماعت اسلامی کے مشن کو دھچکا لگا ہے اور اسلامی نظام کے قیام کی دعوت کی رفتار ماند پڑ گئی ہے۔ موصوف نے وعدہ کیا کہ وہ مودودی صاحب سے فوری طور پر اس مسئلے کے متعلق رجوع کریں گے اور ان پر زور دیں گے کہ اپنی لغزش فکر و نظر کا کھلے طور پر اعتراف کر لیں تا کہ جماعت اسلامی کے وقار کو صدمہ نہ پہنچے۔"[54]

مودودی اور اس کی جماعت پر مولانا محمد صادق کا یہ حملہ بہت کاری تھا کہ اس نے اور اس کی جماعت نے بابائے قوم قائداعظم جناح کے انتقال پر کوئی اظہار تعزیت نہیں کیا۔ مودودی واقعی بہت شقی القلب، اور منتقم المزاج تھا۔ اس نے قائداعظم جناح کو ان کے انتقال کے بعد بھی معاف نہیں کیا تھا۔ اس لئے کہ وہ خود "دین میں بھاری" ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو مسلمانوں کی قیادت عظمیٰ کا حقدار سمجھتا تھا لیکن جناح نے "دین میں ہلکا" ہونے کے باوجود یہ اعزاز حاصل کر لیا تھا۔ لیکن اس زمانہ میں سیاسی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ اس حملے کا کوئی نہ کوئی جواب دیا

جائے۔ پہلے جنگ کشمیر کے بارے میں اس کی سنگین غلطی اور پھر اس پر متکبرانہ اصرار سے اس کے سیاسی مشن کو بہت دھچکا لگا تھا اور اب مولانا صادق کے اس حملے سے اسے اپنے مشن کے مکمل خاتمہ کا خطرہ تھا۔ چنانچہ دو دن بعد جماعت اسلامی کے قیم طفیل محمد نے نوائے وقت کو اطلاع دی کہ ''جس دن قائد اعظم کے انتقال کی خبر آئی اس دن جامعہ حنفیہ ٹیمپل روڈ میں صبح ساڑھے آٹھ بجے جماعت اسلامی کا ہفتہ وار اجتماع تھا اور جناب مودودی صاحب نے اپنی ہفتہ وار تقریر میں دعائے مغفرت کر دی تھی اور کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کے نیک اعمال کو قبول فرمائے اور ان کی خطاؤں سے درگزر کرے۔'' گویا اس شخص نے یہ صحیح یا غلط اطلاع بھی اپنے قیم کی وساطت سے اخبار میں دی کیونکہ اس کی خاموشی کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہو چکی تھی۔ اس نے خود کوئی تعزیتی بیان جاری کرنا مناسب نہ سمجھا اور نہ ہی مس فاطمہ جناح کے نام کوئی تعزیتی پیغام بھیجا۔ باوجود اس کے کہ اس وقت تک اس سلسلہ میں اس کی خاموشی پر صدائے احتجاج بلند ہو چکی تھی۔

باب:5

جہاد کشمیر کے لئے حکومت نے اسلام کا نام استعمال کر کے مُلّاؤں کو دبالیا، جنگ بندی کے بعد مُلّاؤں نے اقتدار کے حصول کے لئے پھر یلغار کردی

مودودی کی جہاد کشمیر کے بارے اپنے فتوے سے مکمل قلابازی، مگر کارکنوں کے ذریعہ بدستور وہی پروپیگنڈا جاری رکھنے پر غداری کا الزام اور گرفتاری

مودودی نے 17ر ستمبر 1948ء کو اخبارات کو اپنے ایک خط کی نقل برائے اشاعت بھجوائی جو اس نے جنگ کشمیر کے بارے میں مولانا شبیر احمد عثمانی کو لکھا تھا کہ ''پاکستان ٹائمز مؤرخہ 7ر ستمبر میں مجلس اقوام متحدہ کے کشمیر کمیشن کا یہ بیان میری نظر سے گزرا کہ حکومت پاکستان نے سرکاری طور پر حدود کشمیر میں اپنی فوجوں کی موجودگی کا اقرار کیا ہے پھر 8ر ستمبر کو وہ اصل مراسلت شائع ہوئی جو حکومت پاکستان اور کمیشن کے درمیان ہوئی تھی اور 9ر ستمبر کو سر ظفر اللہ خان کا بیان شائع ہوا لیکن میں نے اپنی رائے کے اظہار میں اس لئے تاخیر کی کہ 15ر ستمبر کو جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کا اجلاس ہونے والا تھا اور میں ضروری سمجھتا تھا کہ اب اس سلسلے میں جو قدم بھی اٹھاؤں وہ مجلس کے مشورے سے اٹھاؤں چنانچہ کل اور آج مجلس میں اس مسئلے پر پوری طرح غور خوض کر لیا گیا اور جو بات طے ہوئی اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

''حکومت پاکستان کے اس اقرار اور اظہار اور حکومت ہند کے اس پر مطلع ہو جانے

کے بعد مسئلہ کی نوعیت شرعاً بالکل بدل چکی ہے۔ اب جو معاہدانہ تعلقات دونوں مملکتوں کے درمیان ہیں وہ دراصل اس معنی میں ہیں کہ ایک علاقہ میں جنگ کا قیام اور دوسرے علاقوں میں مصالحانہ روابط کی بقا، فریقین کی رضامندی سے ہے۔ لہٰذا دونوں صورتوں میں اب اہل پاکستان کے لئے جہاد کشمیر میں جنگی حصہ لینا بالکل جائز ہے۔

''اس کے ساتھ جماعت نے یہ بھی طے کیا ہے کہ اب وہ خود اس جنگ میں عملاً حصہ لے گی۔ جماعت اسلامی کا کام صرف مسئلہ بتانا نہیں ہے بلکہ اس پر عمل کرنا بھی ہے۔ کشمیر کی اہمیت سے ہم لوگ کبھی غافل نہ تھے بلکہ اس کو بچانا فرض سمجھتے تھے لیکن ہم اس کے قائل نہیں ہیں کہ جس کام کے شرعاً درست ہونے میں ہم کو شک ہو اسے کسی دنیوی غرض و مصلحت سے کر گزریں۔ اسی وجہ سے اب تک ہم عملاً اس فرض کی ادائیگی سے باز رہے۔ اب الحمدللہ وہ چیز باقی نہیں رہی جو مانع تھی۔ آپ کو یہ اطلاع اس غرض سے دے رہا ہوں کہ پچھلی بحث کو اب ختم سمجھیں۔''[1] مودودی کی اس مکمل قلابازی پر امروز کے ایک مراسلہ نگار کا تبصرہ یہ تھا کہ ''ہمارے محترم مولوی صاحب کو آئندہ یاد رکھنا چاہیے کہ اہم مسائل کے متعلق جلد بازی میں کسی رائے کا اظہار کر دینا بڑا مہنگا پڑتا ہے۔ اسی لئے تو بزرگ کہہ گئے ہیں کہ پہلے بات کو تولو اور پھر منہ سے بولو۔ چند افراد کی ایک جماعت بنا کر یہ سمجھ لینا کہ جو فتویٰ صادر کیا جائے گا لوگ اسے وحی الٰہی سمجھ کر آمنا و صدقنا کہہ دیں گے، کم از کم پاکستان میں تو یہ حربہ کارگر نہیں ہوگا۔

مُلّا مودودی کے عثمانی کے نام اس خط کا آخری جملہ یہ تھا کہ اس واضح بیان کے بعد وہ بحث ختم ہوتی ہے جس پر کچھ عرصے سے اخبارات میں مختلف آراء کا اظہار ہوا۔ لیکن اس نے یہ بحث ختم کرنے میں چند دن کی دیر کی تھی کیونکہ قائداعظم جناح کے انتقال کے بعد جب عنان اقتدار وزیراعظم لیاقت علی خان کے ہاتھ آئی تو اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس بحث کو ختم نہیں کیا جائے گا بلکہ وہ اس بحث کی آڑ لے کر مُلّا مودودی اور اس کی جماعت کے خلاف ایسے تعزیری اقدامات کرے گا کہ شرعی نظام کے فوری نفاذ کا مطالبہ کرنے والوں کی بیخ کنی ہو جائے۔ اسے اپنے اقتدار کے استحکام کے لئے اس قسم کی کاروائی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے اسی ضرورت کے تحت 11 ستمبر کے بعد چند ہی دنوں میں ڈاکٹر کے۔ ایم۔ اشرف، فیروز الدین منصور، مرزا ابراہیم اور ایرک سپرین کے علاوہ کئی دوسرے کمیونسٹ لیڈروں کو غداری اور تخریبی سرگرمیوں کے

الزام میں گرفتار کیا۔

پاکستان کا وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین ان دنوں لاہور میں تھا۔ 20 ستمبر 1948ء کو ابوالاعلیٰ مودودی نے اس کے ساتھ طویل ملاقات کر کے مسئلہ جہاد، استحکام پاکستان اور سرکاری ملازمین کے حلف وفاداری کے مسائل پر اپنی جماعت کے موقف کی وضاحت کی۔ وزیر داخلہ نے فوری طور پر مودودی کے موقف کو تسلیم نہ کیا اور ایک اعلیٰ افسر ایس۔ ایم۔ اکرام کو ہدایت کی کہ وہ جماعت کے لٹریچر کا مطالعہ کر کے اپنی رپورٹ پیش کرے۔[2] حکومت کو شکایت یہ تھی کہ جماعت نے مغربی پاکستان میں محلہ وار جلسوں کی ایک مہم شروع کر رکھی ہے جس میں اس کے تقریباً 150 ہمہ وقت مقررین حکومت کے خلاف نفرت پھیلاتے ہیں۔ جماعت کے کارکنوں کی تعداد 5000 تھی اور اس کے مسلح ارکان کی تعداد بھی تقریباً اتنی ہی تھی۔ مشرقی بنگال میں جماعت کے مقررین اور کارکنوں کی تعداد کم تھی لیکن وہاں کی جماعت اس لحاظ سے کامیاب تھی کہ اس نے مسلم لیگی علما، کانگرسی علما اور بعض دوسری جماعتوں کے ساتھ ایک مشترکہ محاذ قائم کر لیا تھا۔ ان سب نے جماعت اسلامی کی اس چار نکاتی قرارداد پر دستخط کر دیئے تھے جس میں اسلامی نظام کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

21 ستمبر کو مودودی نے وہ ساری قراردادیں اخبارات کو دے دیں جو اس کی مجلس شوریٰ کے حالیہ چار روزہ اجلاس میں منظور کی گئی تھیں۔ ان قراردادوں کا خلاصہ یہ تھا کہ "پاکستان کی فلاح و ترقی اور اس کے استحکام کے لئے اس کے ایک "اسلامی ریاست" ہونے کا جلدی سے جلدی آئینی طریقے سے اعلان کیا جائے۔ ایسا اعلان ہونے کے بعد دستوری اور قانونی تغیرات بتدریج اپنے وقت پر ہوتے رہیں گے...... جماعت کی کوشش یہ ہے کہ اس ملک کا نظام زندگی سراسر اسلام کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ اپنے اس مقصد کے لئے جماعت ایسے ذرائع اور طریقوں کا استعمال جائز نہیں سمجھتی جو صداقت اور دیانت کے خلاف ہوں یا جن سے بدنظمی اور بدامنی رونما ہو۔ وہ اصلاح و انقلاب کے لئے جمہوری طریقوں پر یقین رکھتی ہے یعنی تبلیغ و تلقین کے ذریعے سے اذہان اور سیرتوں کی اصلاح کی جائے...... جن قوانین پر ملک کا نظم و نسق اس وقت چل رہا ہے وہ ان کو توڑنا نہیں چاہتی۔ بلکہ اسلامی اصولوں کے مطابق بدلنا چاہتی ہے۔ جو لوگ ملک کا نظم و نسق چلا رہے ہیں انہیں ہٹانا یا خود ان کی جگہ لینا اس کے مدنظر نہیں ہے بلکہ وہ انہیں

ہم خیال بنانا چاہتی ہے اور اگر وہ اصلاح قبول نہ کریں تو پھر جمہوری طریقوں پر چلتے ہوئے ایسے لوگوں سے بدلنا چاہتی ہے جو اصلاح یافتہ رائے عامہ کے نزدیک صالح ہوں...... ہماری قوم چونکہ مسلمان ہے اس لئے ہم اسلام کی منشا کے مطابق اس کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ اس اصلاحی کوشش کے ساتھ ہماری روش یہ ہے کہ اپنی قوم کے تمام جائز مقاصد اور تمام جائز کاموں میں ہم اس کے شریک ہوں اور جس کام کو ہم اپنے علم میں خلاف شرع پاتے ہیں اس سے الگ رہتے ہیں لیکن خواہ مخواہ مزاحمت بھی نہیں کرتے الا یہ کہ دیانتاً ایسا کرنا بالکل ناگزیر ہو جائے...... چونکہ حکومت کے حلقوں میں جماعت اسلامی کے متعلق یہ شکایت پائی جاتی ہے کہ وہ سرکاری ملازموں کی وفاداری کو متزلزل کر رہی ہے۔ اس بارے میں بھی ہم اپنا موقف صاف صاف واضح کر دینا چاہتے ہیں۔ اسلام کی روح سے غیر مشروط وفاداری صرف اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ ہے۔ باقی ہر ایک کی وفاداری حتیٰ کہ خود اسلامی حکومت کی وفاداری میں بھی اصولاً اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وفاداری کے تقاضے خدا اور رسول ﷺ کی وفاداری کے تقاضوں سے متصادم نہ ہوں۔ اب جبکہ انگریزی اقتدار کا دور ختم ہو گیا ہے اور حکومت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو ہمارے دینی بھائی ہیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے حکمران مغربی نظریات کو چھوڑ کر اسلامی تصورات اختیار کریں۔ ریاست اور اس کے آئین کے لئے غیر مشروط وفاداری کا مطالبہ اپنی عین حقیقت ہی کے لحاظ سے مغربی نظریات پر مبنی ہے۔ اور یہ بھی انہی نظریات کا نتیجہ ہے کہ جو ملازم اس مطالبے کو خدا اور رسول ﷺ کی وفاداری کے ساتھ مشروط کرے اس کو شک کی نگاہ سے دیکھا جائے لیکن اسلامی نقطہ نظر سے اول تو ریاست کو ایسا مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے اور مزید برآں اگر کوئی مسلمان اس مطالبے کو اس شرط کے ساتھ مشروط کرے تو ایک صحیح اسلامی ذہنیت رکھنے والا حکمران کبھی اس کے اس فعل پر یہ شک نہیں کرے گا کہ ایسا ملازم اعتماد کے لائق نہیں ہے۔ اس کے برعکس وہ تو یہ محسوس کرے گا کہ جس ملازم نے یہ شرط لگائی ہے وہی سب سے بڑھ کر اعتماد کے قابل ہے کیونکہ یہ اس کی راست بازی اور اس کے ضمیر کی زندگی کا صحیح ثبوت ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ حکومت اس چیز کو بالکل غلط معنوں میں لے رہی ہے اور اس نے حلف وفاداری کے معاملے میں ایک ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس سے وہ ایسے لوگوں کے دائرہ ملازمت میں آنے اور رہنے کو تو نہیں روک سکتی جو وفاداری کا حلف لے کر بھی غداریاں کر سکتے ہیں لیکن ان لوگوں کی

خدمات سے قوم اور ریاست کو محروم کر دے گی جن کی دیانت اور اخلاص اور فرض شناسی پر کامل اعتماد کیا جاسکتا ہے۔"[3] ان قراردادوں سے واضح تھا کہ مودودی نے حکومت کے انتباہ اور عوام کے احتجاج کے باوجود اپنا پرنالہ وہیں رکھا تھا یعنی وہ نوائے وقت کے 3 ستمبر کے اداریے کے مطابق یہ کہتا تھا کہ:

1۔ پاکستان کی موجودہ ریاست اسلامی ریاست نہیں ہے۔

2۔ ہم ایسے کسی کام میں شریک نہیں ہوں گے جو ہمارے علم میں خلاف شرع ہوگا۔

3۔ ہم ریاست سے وفاداری کا حلف صرف اسی شرط کے ساتھ اٹھائیں گے کہ وفاداری کے تقاضے خدا اور رسول ﷺ کی وفاداری کے تقاضوں سے متصادم نہ ہوں۔

23 ستمبر کو ابوالاعلیٰ مودودی نے پنجاب کے وزیر اعلیٰ نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ سے اس کے دفتر میں ملاقات کر کے جہاد کشمیر، اسلامی نظام اور ملازمین کے حلف وفاداری کے مسائل کے بارے میں اپنی ان قراردادوں کی وضاحت کی لیکن اس کا کوئی مثبت نتیجہ نہ نکلا اور جماعت اسلامی کی پاکستان سے وفاداری حکومت کی نظر میں شک وشبہ سے بالاتر نہ ہوئی۔ چنانچہ 5 اکتوبر کو صوبائی حکومت نے جماعت کے ایک ممتاز رکن نعیم صدیقی کی ایک کتاب بعنوان "اسلام کا مطالبہ حق" کو ضبط کر لیا۔ الزام یہ تھا کہ "اس کتاب میں ایسا مواد موجود ہے جو حکومت پاکستان کے خلاف بے اطمینانی پیدا کر سکتا ہے۔"[4] اکتوبر کو جماعت اسلامی کے امیر ابوالاعلیٰ مودودی اور سیکرٹری طفیل محمد کو پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر لیا گیا اور اسی دن راولپنڈی میں جماعت کے ایک ممتاز لیڈر امین احسن اصلاحی کی گرفتاری عمل میں آئی۔ 5 اکتوبر کو پولیس نے لاہور میں جماعت کے اخبارات کوثر و تسنیم کے دفاتر کی تلاشی لی اور تسنیم کے وہ پرچے اپنے قبضہ میں لے لئے جن میں ایک قابل اعتراض مضمون شائع ہوا تھا۔ اسی دن جماعت کے قائم مقام امیر عبدالغفار خان احسن نے ایک بیان میں ابوالاعلیٰ مودودی اور دوسرے جماعتی لیڈروں کی گرفتاری پر احتجاج کیا اور رفقائے جماعت سے اپیل کی کہ "امیر جماعت کی سابقہ ہدایات کے مطابق کامل ضبط و نظم قائم رکھا جائے اور کوئی ایسی حرکت نہ کی جائے جو ہمارے وقار اور اسلام کے مسلک کے منافی ہو۔ کام کو تیز تر کر دیں، یہ سمجھ کر کہ جانے والوں کے کام کی ذمہ داری بھی باقی رہ جانے والوں پر پڑ گئی ہے۔" عبدالغفار خان کے اس بیان میں اس کی جماعت کے ارکان کی

طرف سے سینہ بہ سینہ عائد کردہ اس الزام کا ذکر نہیں تھا کہ مولانا مودودی اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری نوائے وقت کے ایما پر عمل میں آئی ہے اور یہ کہ نوائے وقت نے صوبائی حکومت کو یہ مشورہ اس لئے دیا تھا کہ جماعت اسلامی کی سرگرمیوں کی وجہ سے نواب ممدوٹ کی حکومت کے لئے مشکلات پیدا ہو رہی تھیں۔

7/اکتوبر کو صوبائی حکومت نے جماعت کی طرف سے پھیلائی گئی اس افواہ کا نوٹس لیا اور اپنے ایک اعلان میں بتایا کہ ''مولانا مودودی کی حراست کا حکم اس امر کا مکمل طور پر اطمینان کر لینے کے بعد دیا گیا ہے کہ وہ اور ان کے ساتھی عوام کو، بالخصوص اپنی جماعت کے ارکان کو یہ تلقین کر رہے تھے کہ پاکستان کا آئین ان کے خیال کے مطابق غیر شرعی ہے اور اس لئے ان کی رو سے قائم شدہ غیر اسلامی حکومت کی فوج میں بھرتی ہونا اور اس کے احکام سے تعاون کرنا ضروری نہیں ہے۔ ملکی مفاد کے تحفظ کے پیش نظر اس قسم کے پروپیگنڈے کے جاری رہنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ خاص کر موجودہ حالات میں جبکہ سرکاری حکام اور عوام کے درمیان مکمل تعاون پاکستان کے دفاع و سلامتی کے لئے انتہائی ضروری ہے۔''[4]

8/اکتوبر کو نوائے وقت کے دفتر میں یہ خبر موصول ہوئی کہ ''مولانا مودودی کی جماعت کے سرکردہ رکن مولانا امین احسن اصلاحی کی گرفتاری کے بعد بعض حیرت انگیز انکشافات ہوئے ہیں۔ جماعت اسلامی کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ملک کی دفاعی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے حق میں ہے مگر جماعت کے قیم یا سیکرٹری طفیل محمد نے امیر جماعت مودودی صاحب کی ہدایت کے مطابق اپنی جماعت کے ارکان کو جو تحریری ہدایات دیں وہ یہ ہیں کہ حکومت پاکستان ایک غیر اسلامی حکومت ہے اس لئے اس کی باقاعدہ فوج اور ریزرو آرمی میں بھرتی ہونا حرام ہے۔ قیم جماعت اسلامی طفیل محمد کے الفاظ یہ ہیں ''حکومت کی فوج یا ریزرو آرمی میں بھرتی کا مشورہ اس وقت تک دینے سے ہم معذور ہیں جب تک حکومت اپنے اسلامی ہونے کا اعلان نہ کرے۔'' معلوم ہوتا ہے کہ ایسے کئی خط جماعت اسلامی کی طرف سے لکھے گئے ہیں۔ حکومت نے یہ خط پکڑ لئے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ فوجیوں بالخصوص افسروں میں جماعت اسلامی ایک عرصہ سے اس قسم کا پروپیگنڈا کر رہی تھی جو فوج کے ڈسپلن کے لئے خطرناک تھا۔ امین احسن اصلاحی صاحب جماعت اسلامی کے ''دماغوں میں سے ایک'' ہیں۔ باخبر حلقے یہ بیان کرتے ہیں کہ پنجاب آنے سے پہلے

وہ بہار میں کام کرتے تھے اور ان کا تعلق نیشنلسٹ مسلمانوں کے اس ''گروہ'' سے تھا جو ''اصلاحی گروپ'' کے نام سے موسوم تھا۔ اس گروپ نے بہار کے انتخابات میں لیگ کی سخت مخالفت اور کانگرس کی حمایت کی تھی۔''[5]

9؍اکتوبر کو روزنامہ ''امروز'' کو معتبر ذرائع سے یہ معلوم ہوا کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی گرفتاری ایک خط کی بنا پر عمل میں لائی گئی ہے جو انہوں نے اپنی جماعت کے ایک شخص کے نام جوان کے مخلصین میں سے ہے، لکھا تھا اور سی آئی ڈی کے ہاتھ آ گیا۔ اس خط کی عبارت ہے:

''دفاع ملکی کے لئے عام مسلمانوں کو لازماً تیار ہونا چاہیے بلکہ اگر شریعت کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ایسے حالات میسر آ سکیں تو اپنے گھر کی عورتوں کو بھی اس کے لئے تیار کرنا چاہیے لیکن حکومت کی فوج یا ریزرو آرمی میں بھرتی کا مشورہ اس وقت تک دینے سے ہم معذور ہیں جب تک کہ حکومت اپنے اسلامی ہونے کا اعلان نہ کر دے۔''

''حکومت کے ایک نمائندے کے مطابق بعض حلقوں کا کہنا غلط ہے کہ مولانا مودودی کو بعض اخبارات کے ایما پر گرفتار کیا گیا ہے۔''[6]

10؍اکتوبر کو جماعت اسلامی کے نئے امیر مولانا عبدالجبار غازی کا بیان صفائی شائع ہوا جس میں صوبائی حکومت کے اس الزام کی تردید تو نہ کی گئی کہ مودودی اور اس کے ساتھی عوام اور بالخصوص اپنی جماعت کے ارکان کو یہ تلقین کرتے رہے ہیں کہ چونکہ پاکستان کا آئین ان کے خیال کے مطابق غیر شرعی ہے اس لئے اس کی رو سے قائم شدہ غیر اسلامی حکومت کی افواج میں بھرتی ہونا اور اس کے احکام سے تعاون کرنا ضروری نہیں ہے البتہ اس میں ملک کی دفاعی سرگرمیوں کو نقصان پہنچانے کے الزام کو غلط قرار دے کر یہ بتایا گیا کہ مجلس شوریٰ کی ایک قرارداد کے مطابق کارکنوں کو یہ واضح ہدایت دی جا چکی ہے کہ وہ ملک کی حفاظت کے لئے خود پوری طرح تیار ہوں اور دوسرے مسلمانوں کو اس تیاری کی ضرورت کا احساس دلائیں۔ ہم اس ملک کو اسلام کے لئے بچانا چاہتے ہیں۔ لہٰذا یہ ہمارا دینی فریضہ ہے اور اسی جذبے سے ہم کو اس کام کی طرف سب سے بڑھ کر توجہ کرنی چاہیے۔ تمام کارکنوں کو چاہیے کہ وہ ہوم گارڈز، اے آر۔ پی۔ اور دوسرے دفاعی کاموں کی تربیت کے لئے سرکاری طور پر جو انتظامات کئے گئے ہیں ان میں پورا

پورا حصہ لیں۔ نیز خود تربیت حاصل کر کے اپنے گھر کی خواتین کو بھی ان چیزوں کی تربیت دیں اور پھران کے ذریعے اپنے محلے اور بستی کی عورتوں کو بھی تربیت دینے کا انتظام کریں۔''[7] چونکہ اس ہدایت نامے میں اس امر کا کوئی ذکر نہیں تھا کہ جماعتی کارکنوں کو پاکستان کی فوج یا ریزرو آرمی میں بھرتی ہونے کی بھی ہدایت کی گئی ہے اس لئے رائے عامہ نے حکومت کے اس الزام کو صحیح تسلیم کیا کہ جماعت اسلامی کی سرگرمیاں واقعی پاکستان کے دفاع وسلامتی کے لئے نقصان دہ ہیں۔

نواب ممدوٹ نے اپنی کمزور حکومت بچانے کی خاطر مدیر نوائے وقت کے مشورے پر مودودی اوراس کی جماعت کے خلاف کاروائی کی تھی

جماعتی کارکن اپنے لیڈروں کے اس موقف پر مصر رہے کہ ابوالاعلیٰ مودودی اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری محض مدیر نوائے وقت کی خوشنودی کے لئے عمل میں آئی ہے۔ چنانچہ 10 ر اکتوبر کو انقلاب میں دریا خان ماڑی کے کسی جماعتی کارکن کی طرف سے بذریعہ تار ارسال کردہ یہ خبر شائع ہوئی کہ ''وزارت مغربی پنجاب کے حاشیہ برداروں نے موصوف کی گرفتاری کا مشورہ دے کر مملکت کے مفاد کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ آج پاکستان ہر طرف کے خطرات سے گھرا ہوا ہے۔ ایسے موقع پر مولانا کی گرفتاری عوام کے اعتماد پر ضرب ثابت ہوگی۔'' نوائے وقت نے اسی دن اس الزام کا اس طرح جواب دیا کہ ''جو لوگ پاکستان کے آئین میں ترمیم کے مطالبہ کی آڑ لے کر اور اسلام کو بہانہ بنا کر ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں مصروف ہیں وہ دانستہ یا نادانستہ ملک سے غداری کر رہے ہیں اور ان سے وہی سلوک ہونا چاہیے جو دنیا کے دوسرے ملکوں میں غداروں سے ہوتا ہے۔ اس وقت پاکستان کی جو حالت ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس حقیقت سے بھی کسی کو انکار نہیں کہ اگر خدانخواستہ پاکستان کا وجود خطرے میں پڑ گیا تو نہ صرف اس ملک میں نظام اسلامی کا قیام خواب بن کر رہ جائے گا بلکہ یہاں کے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو جائے گا۔ صرف یہی نہیں باقی اسلامی ملکوں کے استحکام اور بقا کے لئے بھی پاکستان کا مستحکم و مضبوط ہونا ضروری ہے۔ اگر پاکستان مضبوط اور مستحکم ہوگا تو انشاءاللہ نہ صرف اس ملک میں نظام اسلامی قائم ہو جائے گا، دوسرے ممالک بھی مضبوط ہو جائیں گے اور پاکستان کے زیر اثر وہاں بھی اسلام کی طرف لوٹنے کی تحریک قوت پکڑ جائے گی۔ لیکن اگر خدانخواستہ پاکستان ہی ختم ہو گیا تو طاغوتی

اقتدار کا سیلاب پشاور پہنچ کر ہی نہیں رک جائے گا۔ اس سے پرے اسلامی علاقے بھی اس کی زد میں آ جائیں گے۔ جو شخص مذکورہ بالا حقیقت کو سمجھتا ہے اس کی رائے لازمی طور پر یہ ہوگی کہ اس وقت اسلام کے ہر سچے حامی اور فدائی کا پہلا فرض ہے کہ وہ پاکستان کو مستحکم و مضبوط بنانے کی کوشش کرے کیونکہ اس ملک کا استحکام ہی دنیا میں اسلام کے فروغ کا ضامن ہے۔ ظاہر ہے کہ پاکستان کے استحکام و ترقی کے لئے یہ امر اشد ضروری ہے کہ اس کے سب باشندے اس کی مضبوطی کے لئے زیادہ سے زیادہ محنت کریں۔ اس سے محبت کو باقی تمام دنیاوی علایق پر ترجیح دیں اور اس کی بہتری کو اپنی بہتری پر مقدم رکھیں۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب اس ملک کے باشندوں بالخصوص مسلمانوں کو اس سے محبت ہو۔ وہ سمجھیں کہ اس ملک کی خدمت دراصل اسلام کی خدمت کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کے برعکس اگر مسلمانوں کے دل میں یہ بات بٹھائی جائے کہ اس ملک کا نظام حکومت اسلامی نہیں۔ اس کی حکومت غیر شرعی ہے۔ اس میں اور برطانوی حکومت میں کوئی فرق نہیں لہٰذا مسلمان اس ملک اور حکومت کی وفاداری کے مکلف نہیں تو ظاہر ہے کہ عامتہ المسلمین میں وہ جذبہ جو انہیں استحکام پاکستان کے لئے محبت اور قربانی پر ابھار سکتا ہے، مفقود ہو جائے گا۔ جب کسی ملک کے باشندوں میں یہ جذبہ مفقود ہو جائے تو وہ ملک دشمن کے مقابلے میں دو دن بھی تاب نہیں لا سکتا کیونکہ وہ جذبہ فوجوں اور سامان جنگ سے بھی زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ جو شخص مسلمانان پاکستان کے اس جذبہ کو ختم کرتا ہے وہ دشمن کا ایجنٹ ہے یا نہیں مگر اس کے کام کا نتیجہ یہی اور صرف یہی نکل سکتا ہے کہ دشمن کے ہاتھ مضبوط ہوں اور اپنا ملک کمزور ہو۔ ہم ایسے شخص کو ملک اور اسلام دونوں کا غدار کہنے میں ایک لمحہ بھی تامل نہیں کریں گے کیونکہ ہمیں پختہ یقین ہے کہ اسلام کے فروغ کو پاکستان کے استحکام سے بڑی مدد ملے گی خواہ اس کی یہ سرگرمیاں اسلام کے نام پر ہی کیوں نہ ہوں۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت عثمان ذوالنورینؓ اسلام کے نام پر ہی شہید کئے گئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو جام شہادت پلانے والے اسلام کے نام پر ہی میدان عمل میں اترے تھے اور خارجیوں کا نعرہ بھی اسلام ہی تھا۔''[8]

نوائے وقت کے اس اداریے کا مطلب یہ تھا کہ ایک طرف تو کراچی اور پنجاب کے ارباب اقتدار اسلام اور مسلم قومیت کے نعرے کے زور سے سندھ، سرحد، بلوچستان اور مشرقی بنگال کے عوام کے قومیتی اور طبقاتی حقوق کو کچلنے کے درپے تھے اور دوسری طرف وہ حب الوطنی

اور پاکستانی قومیت کے نعرے کے زور سے ان مُلاؤں کی سرکوبی کرنا چاہتے تھے جو شرعی نظام کے فوری نفاذ کی مہم چلا کر حکومت کی راہ میں مشکلات حائل کر رہے تھے۔ مُلاّ ابوالاعلیٰ مودودی نے ستمبر کے تیسرے ہفتے میں اپنی مجلس شوریٰ سے جو قراردادیں منظور کروائی تھیں وہ اس کی سیاسی بے بصیرتی اور ہٹ دھرمی کی آئینہ دار تھیں۔ ان دنوں قائداعظم جناح کی وفات، حیدرآباد دکن میں ہندوستانی افواج کی للکار، کشمیر میں ہندوستان کی پے در پے فتوحات اور اقوام متحدہ کی جانب سے پاکستان کی امداد کرنے میں ناکامی کی وجہ سے پورے ملک کے عوام بڑے ذہنی خلفشار بلکہ خوف وہراس میں مبتلا تھے۔ اس صورت حال میں پاکستان کے اسلامی ریاست ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ اٹھانے، مسلمان ملازمین کو اس ریاست کے مروجہ آئین کی وفاداری کا غیر مشروط حلف اٹھانے کی ممانعت کرنے اور عامتہ المسلمین کو پاکستان کی غیر اسلامی حکومت کی افواج میں بھرتی نہ ہونے کا مشورہ دینے کا نتیجہ یہی نکل سکتا تھا کہ مُلاّ مودودی اور اس کی جماعت پر اسلام اور پاکستان سے غداری کا ٹھپہ لگ جائے اور عوام الناس اس ٹھپہ کو صحیح سمجھیں۔ پاکستان کے عوام کا ہندوستان کے توسیع پسندوں سے قومی تضاد حقیقی تھا اور ستمبر 1948ء میں اس قومی تضاد کا مقام باقی سارے تضادات سے اونچا تھا۔ مُلاّ مودودی نے اپنے مذہبی نعرے کو قومی تضاد سے بالاتر کر کے عوام الناس کے جذبہ حب الوطنی کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ چنانچہ اس کو اس کی سزا مل گئی اور عوامی سطح پر اس کی گرفتاری کے خلاف کوئی قابل ذکر صدائے احتجاج بلند نہ ہوئی۔ اس کے برعکس بہت سے عوامی حلقوں کی طرف سے حکومت کے اس اقدام کی تائید وحمایت ہوئی۔ ان حمایت کرنے والوں میں سیالکوٹ کا ایک مولانا حکیم محمد صادق بھی تھا۔ اس کا مودودی کی گرفتاری پر ردعمل یہ تھا کہ ''قائداعظم کی ذات گرامی پر انگریز کا ایجنٹ ہونے کا الزام لگانے والے بندگان مال ومنال آپ ہی کے ہاتھوں انگریز کی روح نکلتے دیکھ کر عرق ندامت میں گر گئے۔ آپ کے نصب العین پاکستان کا مذاق اڑانے والے، پاکستان میں اپنی جانوں کو محفوظ دیکھ کر عرق ندامت میں گر گئے۔ دہلی میں کانگرس اسٹیج پر عباد الدینار، اپنی طویل وعریض داڑھیوں پر اجیر ہاتھ پھیر پھیر کر اپنے خداوند نعمت کو یہ کہہ کر خوش کرتے تھے کہ ''ہماری لاشوں پر پاکستان بنے گا۔'' اللہ اکبر! قائداعظم کی کرامت دیکھو کہ ان لوگوں کی چلتی پھرتی نعشیں آج پاکستان میں پناہ گزین ہیں۔ ''جناب مغفور'' کی قیادت عظمیٰ کو باطل اور گمراہ کن کہنے والے، تخلیق پاکستان کی فتووں سے مخالفت کرنے

والے سکھ کا چھرا دیکھ کر اپنے نام نہاد دارالاسلام کو اپنے ہاتھوں دارالکفر بنا کر ایسے بھاگے کہ سوائے پاکستان کے کہیں امان نہ ملی۔لیکن جاہلی تعصب کا برا ہو کہ انگریز کے سائے کے نیچے ایک مقام کو (ناجائز طور پر) دارالاسلام قرار دیا جا سکتا ہے پر قائداعظم کے آزاد پاکستان کے پارک کو دارالاسلام کہتے ہوئے دست رقابت کو عقرب جرارہ کاٹتا ہے۔رسی جل گئی، بل نہ گیا۔الحاصل خدائے لایزل نے قائداعظم کی صداقت کے آفتاب کو ایسا روشن کیا کہ باطل کی ظلمت ناپید ہو گئی۔الیکشن کے زمانہ میں اجیر مولویوں نے حضرت قائداعظم کو گنگا جل پی پی کر بہت کوسا۔10 کروڑ مسلمانوں میں صرف آپ ہی کا چہرہ ان کو بلا ریش نظر آیا اور مسئلہ ریش کے کانگرسی تیر سے دیباچہ ہمایوں کو ہدف بنایا۔شرع محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقے کے مطابق آپ کے مسنون نکاح کو سوداگران دین فروش نے ناجائز کہہ کر اپنا نامہ اعمال سیاہ اور قبر تاریک کی۔آئمۃ الکفر کی روٹی حلال کرنے اور مزید جلب زر کے لئے کئی مولویوں نے روغن عذر و نفاق سے ریش ہائے دراز تر کر کے یہ وعظ جھاڑا ''مجاہدو!، قائداعظم نہیں، سب کہو کافر اعظم، کیا تم بے ریش سول میرج کرنے والے کو ووٹ دو گے؟ ان بندگان دینار نے افترا و بہتان کا یہ بار عظیم اس لئے اٹھایا کہ لوگوں کو آپ کی ذات سے متنفر کر کے لیگ کے خلاف کانگرس کی اجیر جماعتوں کو انتخاب میں کامیاب بنایا جائے اور اس طرح کانگرس کے متحدہ قومیت کے دعوے کو درست ثابت کر کے ہندوستان میں ہندو راج قائم کریں۔ شمائل ترمذی میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ذات کے لئے کبھی انتقام نہیں لیا۔قائداعظم کو خدا نے آزاد پاکستان دیا۔پھر پاکستان کا گورنر جنرل کیا سرداری اور حکومت دی۔اگر آپ چاہتے تو ایسے سب مولویوں اور غداروں کو تختہ دار پر لٹکوا سکتے تھے پر اس رحمت وعفو کے پیکر نے اپنے پیارے رسول کریم الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کسی سے انتقام نہیں لیا۔''[9]

نوائے وقت اور جماعت اسلامی کے مابین محاذ آرائی......کیا جنگ کشمیر اور فوج میں بھرتی غیر اسلامی تھی؟

نوائے وقت نے پنجاب کی اس قسم کی رائے عامہ سے فائدہ اٹھا کر اس مسئلہ پر پے در پے مزید تین اداریے لکھے۔اس کا ایک اداریہ 11/اکتوبر کا تھا جس میں لکھا تھا کہ ''جماعت

کے ارکان یہ کہتے ہیں کہ جہاں تک دفاعی سرگرمیوں کا تعلق ہے وہ حکومت کے ساتھ تعاون کے لئے آمادہ ہیں مگر حکومت کی فوج اور ریزروآرمی میں بھرتی کا مشورہ دینے سے معذور ہیں۔ یہ پوزیشن بے حد احمقانہ اور خطرناک ہے۔ سوال یہ ہے کہ فوج کے بغیر ملک کے دفاع کی کیا تدبیر ممکن ہے؟ اور وہ کونسی حکومت ہے جو فوج یا ریزروآرمی کے بغیر ملک کو دشمن سے بچاسکتی ہے؟ یہ ارشاد کہ ہم دفاعی سرگرمیوں سے تو تعاون کریں گے مگر فوجی بھرتی کی مخالفت کریں گے، اس قدر مضحکہ خیز ہے کہ کوئی فاتر العقل ہی یہ عجیب وغریب پوزیشن اختیار کرسکتا ہے یا دوسری صورت یہ ہے کہ دیوانگی کی آڑ میں قوم سے دشمنی کی جارہی ہو...... جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم دفاعی سرگرمیوں سے تو تعاون کریں گے مگر چونکہ حکومت غیر اسلامی ہے اس لئے ہم اس کی فوج یا ریزروآرمی میں بھرتی کا مشورہ نہیں دے سکتے۔ ہم اس امر کا فیصلہ ان کے دوستوں، ہمدردوں اور جماعتیوں پر چھوڑ دیتے ہیں کہ یہ لوگ پاکستان کے دوست ہیں یا دشمن؟۔''[10]

چند دن کے بعد دوسرا اداریہ یہ تھا کہ ''مودودی صاحب پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ پاکستان کی فوج اور ریزروآرمی میں بھرتی ہونا حرام ہے۔ اس وقت پاکستان جن خطرات میں گھرا ہوا ہے اس کے پیش نظر پاکستان کے باشندوں بالخصوص مسلمانوں کو مذہب کے نام پر یہ مشورہ دینا کہ وہ پاکستان کی فوجوں اور ریزروآرمی میں بھرتی نہ ہوں، قوم کے حق میں سب سے بڑی دشمنی اور پاکستان کے خلاف کھلم کھلا غداری کے مترادف ہے۔ پاکستان کی آزادی اور بقا کے لئے دشمنوں کو پاکستان کے اندر سے ہزار طرح سے مدد پہنچائی جاسکتی ہے لیکن دشمن کی امداد کا سب سے مذموم اور پاکستان کے لئے سب سے خطرناک طریقہ یہی ہے کہ اہل پاکستان کو ملک کی فوجوں سے بے تعلق رکھ کر دفاعی انتظامات کو کمزور کرکے دشمن کے لئے راستہ صاف کیا جائے۔ اگر مودودی صاحب کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ انہوں نے یا ان کی جماعت نے واقعی مسلمانوں کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ پاکستان کی فوجوں میں بھرتی نہ ہوں تو بلاشبہ ان سے وہی سلوک ہونا چاہیے جو دوسرے آزاد ملک اپنے غداروں کے ساتھ کرتے ہیں اور جس کی اسلام اجازت دیتا ہے...... ملک کے دفاع کا مسئلہ پاکستان کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ دفاع کا پہلا اور مقدم کام فوجی خدمت ہے۔ اس لئے فوجی بھرتی کی مخالفت کرتے ہوئے دفاع میں تعاون کے اعلان کا کوئی مطلب نہیں۔ موجودہ

غیر معمولی حالات میں اس کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا کہ ہر فرد اپنی سعی و کوشش کی ہر متاع کو حکومت کے حوالے کر دے۔ ان غیر معمولی حالات میں جو شخص فوجی خدمات سے انکار کرتا ہے یا دوسروں کو روکتا ہے وہ قوم سے دشمنی کرتا ہے...... ہم نے جماعت کا خط اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ خط واقعی جماعت کے قیم یا سیکرٹری طفیل محمد صاحب نے ہی لکھا ہے اور اس میں مندرج رائے ان کی ذاتی رائے نہیں بلکہ امیر جماعت مودودی صاحب کی رائے ہے اور جماعت کے عام ممبر بھی فوجی بھرتی کے متعلق وہی رائے ظاہر کرتے ہیں جو اس خط میں ظاہر کی گئی ہے۔" [11]

26 / اکتوبر کو جماعت اسلامی کے نئے امیر عبدالجبار غازی صاحب کا ایک اور بیان اخبارات میں شائع ہوا جس میں اس نے وضاحت کی کہ "جماعت اسلامی کے متعلق یہ کہنا کہ وہ مسلمانوں کو فوجی بھرتی سے روکتی ہے، غلط ہے۔ دفاع کی تیاریوں میں پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لینا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ ہم مسلمانوں کو دفاع کی تیاریوں میں پوری سرگرمیوں کے ساتھ حصہ لینے کی ترغیب دیتے ہیں۔ رہا عام مسلمانوں کا فوج میں بھرتی ہونے نہ ہونے کا سوال تو اس کا فیصلہ ہم خود ان کی صوابدید پر چھوڑتے ہیں...... موجودہ حالات میں جبکہ دفاعی تیاریوں کا وقت ہے، ارکان جماعت کو اپنے اصلاحی پروگرام کے ساتھ ساتھ اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق دفاع کے مختلف کاموں کی تربیت حاصل کرنے پر مامور کر دیا گیا ہے۔ جہاں جہاں حکومت یا پبلک کی طرف سے اس تربیت کے انتظامات موجود ہیں وہ ان میں حتی الوسع خود بھی حصہ لے رہے ہیں اور دوسروں کو بھی خلوص نیت کے ساتھ حصہ لینے کی تلقین کر رہے ہیں کیونکہ وہ پاکستان کو بہر حال اسلام کے لئے بچانا چاہتے ہیں اور اسی جذبے کے ساتھ اس کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں جس جذبے کے ساتھ اس قطعہ زمین کی حفاظت کی جاتی ہے جو مسجد تعمیر کرنے کے ارادے سے حاصل کیا گیا ہو۔ آگے چل کر خدانخواستہ داخلی یا خارجی طور پر کوئی نازک صورتحال پیدا ہو جائے تو پھر جماعت اسلامی اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے اس خطرے کو دور کرنے میں اپنی ملت اور حکومت کے ساتھ پورا پورا تعاون کرے گی۔ ظاہر ہے کہ دفاع کے سلسلے میں تعاون کرنے میں جماعت فوج کے ڈسپلن سے علیحدہ رہ کر کچھ نہیں کر سکتی۔ ایسے اضطراری حالات میں اسے خود آگے بڑھ کر اور حسب ضرورت اپنے عام اصلاحی پروگرام کو ملتوی کر کے بھی اپنی قوت اور وسائل کو سرکاری فوج یا حکومت کے دوسرے دفاعی شعبوں کی تحویل میں دینا پڑے گا تا کہ وہ قوت کو اپنے ڈسپلن کے

تحت حسب ضرورت استعمال کرسکیں۔ دفاع کے سلسلے میں ہماری طرف سے یہ سارا تعاون جہاد فی سبیل اللہ کے جذبے کے تحت خالصتاً للہ اور رضا کارانہ ہوگا نہ کہ ملازمانہ حیثیت سے۔ فریضہ دفاع سے عہدہ برآ ہو جانے کے بعد جماعت پھر پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے اصل مقصد اور مستقبل پروگرام کی طرف لوٹ آئے گی...... رہا اضطراری حالت کا معاملہ تو اس پہلو سے جماعت اسلامی کے اصول اور اس کا موقف حکومت اور پبلک دونوں پر خوب اچھی طرح واضح ہے اور اب ہم دوبارہ صاف صاف عرض کئے دیتے ہیں کہ ایک غیر اسلامی نظام زندگی کو اسلامی نظام کا درجہ دینا، اسے اسلامی نظام کے سے حقوق دینا اور اسے اپنی قوتیں پوری شرح صدر کے ساتھ ملازمت یا تعاون کے طور پر ہر استعمال کے لئے پیش کرنا یا دوسروں کو اس طرز عمل کا مشورہ دینا دین میں تحریف کے بغیر ممکن نہیں اور اس قسم کی جسارت کرنے کی ہمت ہم بہرحال اپنے اندر نہیں پاتے...... موجودہ نظام حکومت ایک اسلام دشمن طاقت نے کافرانہ اصولوں پر تعمیر کر کے اپنے ورثہ میں چھوڑا ہے۔ اس کے تمام شعبے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت سے آزاد ہیں۔''

نوائے وقت نے عبدالجبار خان کے اس بیان کے طویل اقتباسات کے حوالے دے کر ایک زوردار اداریہ لکھا جس کا عنوان تھا ''مودودی خارجیت اپنے اصلی رنگ میں'' یہ اداریہ نہ صرف اس لئے اہمیت کا حامل تھا کہ اس میں مودودی خارجیت کے اصلی رنگ کو بے نقاب کیا گیا تھا بلکہ اس لئے بھی کہ اسی نوائے وقت نے کچھ عرصہ بعد جب پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے شاونسٹوں کی ترجمانی کرتے ہوئے وزیراعظم لیاقت علی خان کے خلاف نہایت معاندانہ محاذ آرائی کی تھی تو اس نے اسی ملک وقوم کی دشمن مودودی خارجیت کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کی تھی۔

نوائے وقت کا اداریہ یہ تھا کہ ''عبدالجبار خان غازی کی یہ تحریر منافقت اور ریاکاری کا ایک نہایت دلچسپ نمونہ ہے۔ یہ امیر جماعت کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو فوج میں بھرتی ہونے نہ ہونے کے متعلق کوئی مشورہ دینے سے معذور ہیں اور اس کا فیصلہ ان کی صوابدید پر چھوڑتے ہیں۔ قیم جماعت کی پوزیشن اس سے مختلف تھی۔ طفیل صاحب اس سوال کا فیصلہ مسلمانوں کے صوابدید پر نہیں چھوڑتے تھے بلکہ ان کا ارشاد تھا کہ ہم مسلمانوں کو فوج میں بھرتی ہونے کا مشورہ دینے سے معذور ہیں۔ نئے امیر نے اب یہ پوزیشن اختیار کی ہے کہ ہم بھرتی نہ ہونے کے متعلق کوئی مشورہ دینے سے معذور ہیں۔ یہ پوزیشن جماعت کی پہلی پوزیشن سے مختلف ہے کیونکہ پہلے مسلمانوں کو

فوج میں بھرتی ہونے کا مشورہ دینے سے معذوری ظاہر کی گئی تھی۔ مطلب یہ تھا کہ ہم فوج میں بھرتی کے خلاف ہیں۔ اب پوزیشن بظاہر غیر جانبداری کی ہے یعنی ہم نہ بھرتی ہونے کو کہتے ہیں نہ بھرتی ہونے سے منع کرتے ہیں۔ عام مسلمانوں کی مرضی ہے وہ فوج میں بھرتی ہوں نہ ہوں۔ مگر امیر جماعت نے ارکان جماعت کو مختلف ہدایات دی ہیں۔ عام مسلمانوں اور ارکان جماعت میں فرق بڑا اہم ہے۔ ارکان جماعت امیر کے حکم کے پابند ہیں اور کوئی بات ان کی صوابدید پر نہیں چھوڑی گئی۔ اس لحاظ سے یہ ہدایات بے حد اہم ہیں کیونکہ انہی کے مطالعہ سے جماعت کی پالیسی کا پتہ چلتا ہے۔ ان ہدایات میں (1) دفاع کے سلسلہ میں حکومت کے ساتھ پورے پورے تعاون کا وعدہ ہے۔ (2) یہ کہا ہے کہ ''ظاہر ہے کہ دفاع کے سلسلے میں تعاون کرنے میں جماعت فوج کے ڈسپلن سے علیحدہ رہ کر کچھ نہیں کر سکتی ہے'' مگر یہ نہیں فرمایا گیا کہ جماعت فوج میں شامل ہوئے بغیر کچھ نہیں کر سکتی۔ (3) یہ کہا گیا ہے کہ ''اپنی قوت اور وسائل کو سرکاری فوج یا حکومت کے دوسرے شعبوں کی تحویل میں دینا پڑے گا''......مگر......اور یہ مگر بڑی اہم ہے!......''دفاع کے سلسلے میں ہماری طرف سے یہ سارا تعاون جہاد فی سبیل اللہ کے جذبے کے تحت خالصتاً للہ اور رضا کارانہ ہوگا نہ کہ ملازمانہ حیثیت سے۔'' خدا کے نام کو اس سے زیادہ بے انصافی کے ساتھ شاید ہی کبھی استعمال کیا گیا ہو۔ امیر صاحب کا مطلب یہ ہے کہ ہم دفاع کی تیاریوں میں تو حصہ لیں گے۔ حکومت سے پورا پورا تعاون بھی کریں گے مگر یہ تعاون رضا کارانہ ہوگا نہ کہ ملازمانہ حیثیت سے'' یعنی فوج میں ہرگز بھرتی نہ ہوں گے۔ اپنی علیحدہ اور پرائیویٹ تنظیم کی حیثیت سے فوج سے تعاون منظور مگر فوج میں بھرتی نامنظور۔ امیر صاحب یا تو خود احمق ہیں یا حکومت پاکستان کو احمق سمجھتے ہیں کہ وہ ان کی پرائیویٹ آرمی کی پیشکش کو تعاون کی پیشکش سمجھے گی...... یہ ہے جماعت اسلامی کی اصل پالیسی اور مسلک کہ پاکستان کی حکومت غیر اسلامی ہے۔ ہم اسے اسلامی نظام کا درجہ اور حقوق دینے کو تیار نہیں۔ یہ حقوق کیا ہیں؟ اس سے وفاداری اور پاکستان کے تحفظ و مفاد کے لئے اسے اپنی قوتیں پوری شرح صدر کے ساتھ ملازمت یا تعاون کے طور پر استعمال کرنے کے لئے پیش کرنا یا دوسروں کو اس طرز عمل کا مشورہ دینا......ارشاد ہوتا ہے کہ ''موجودہ نظام حکومت ایک اسلام دشمن طاقت نے کافرانہ اصولوں پر تعمیر کر کے اپنے ورثہ میں چھوڑا ہے۔ اس کے تمام شعبے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت سے آزاد ہیں۔'' دیانتداری

ملاحظہ فرمایئے کہ ادھر تو یہ ارشاد ہوا کہ ہم فیصلہ مسلمانوں کی صوابدید پر چھوڑتے ہیں کہ ہم انہیں اس سلسلہ میں مشورہ دینے سے معذور ہیں اور آخر میں مسلمانوں سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ (1) موجودہ نظام کافرانہ ہے۔ (2) موجودہ حکومت غیر اسلامی ہے۔ (3) دین میں تحریف کئے بغیر اسے اپنی قوتیں پوری شرح صدر کے ساتھ ملازمت یا تعاون کے طور پر استعمال کے لئے پیش کرنا ممکن نہیں۔ گویا یہ مشورہ نہیں ہے۔ عبدالجبار غازی صاحب عام مسلمانوں کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنی جماعت کی پوزیشن صاف لفظوں میں واضح کردی ہے۔ اب کسی کو بھی ان کی جماعت کے متعلق کوئی شبہ باقی نہیں رہا ہوگا کہ خدانخواستہ جنگ کی صورت میں اس جماعت پر کہاں تک بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟ اور عام حالات میں یہ جماعت کہاں تک قابل اعتماد ہے۔ ہم ان سے صرف اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ اگر عام مسلمانوں میں خدانخواستہ ان کی جماعت کے خیالات مقبول ہوجائیں تو یہ ملک کسی دشمن کا مقابلہ کرنے کے بھی قابل نہیں رہے گا۔ اس وقت مسلمانوں کو غیر جانبداری کی تلقین کرنا، فوج سے بے تعلق رکھنا، موجودہ نظام کو کافرانہ بنا کر مسلمانوں کو حکومت سے، فوج اور دفاع جیسے اہم مسئلہ میں تعاون سے روکنا ملک وملت سے سب سے بڑی دشمنی ہے اور اسلام اور پاکستان کے دشمنوں کی بہت بڑی خدمت ہے کیونکہ اس وقت مسلمان ایک ایسے نازک دور سے گزر رہے ہیں کہ اس وقت جو ان کے ساتھ نہیں وہ ان کا دشمن ہے۔ افسوس صد افسوس کہ ہندوستان میں تو مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حفظ الرحمان اور مولانا احمد سعید مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ حکومت سے دل وجان کے ساتھ تعاون کریں مگر پاکستان میں اسلامی حکومت اور اسلامی نظام کے داعیوں کا یہ طائفہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہا ہے کہ موجودہ حکومت غیر اسلامی اور موجودہ نظام کافرانہ ہے۔ لہٰذا دین میں تحریف کئے بغیر اس سے تعاون ناممکن ہے۔ گویا اس عدم تعاون کے نتیجے کے طور پر خدانخواستہ پاکستان ختم ہوجائے تو پھر یہاں اسلامی نظام رائج ہوجائے گا؟ جماعت اسلامی ہندوستان میں بھی ہے اور اس کے امیر بھی مودودی صاحب ہی ہیں۔ یہ کیا بات ہے کہ ان کے سارے فتوے پاکستان کے لئے ہی وقف ہیں؟ بندہ پرور آپ غدار اور دشمن کے ایجنٹ نہیں ہوں گے مگر خود ہی انصاف فرمایئے غدار اور دشمن کے ایجنٹ پاکستان کو اس سے زیادہ کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟'' [12]

دو دن کے بعد نوائے وقت کے ادارتی کالموں میں دہلی میں سکھوں کے اخبار ''شیر پنجاب'' کا وہ ادارتی نوٹ نقل کیا گیا جس میں اس نے مودودی کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ شیر پنجاب نے لکھا تھا کہ ''اگرچہ مسٹر جناح مر چکے ہیں لیکن ان کی سپرٹ تو دوسرے وزرا حکومت میں حلول کر ہی چکی ہے بھلا وہ کسی طرح مولانا مودودی کے جنگ کشمیر سے متعلقہ صحیح، دیانتدارانہ اور نیک مشورہ کو برداشت کر سکتے تھے بجائے اس کے کہ وہ اس مرد خدا کی سچائی اور جرأت کے معترف ہوتے اور کشمیر کی جنگ بند کر کے اپنی دیانتداری اور راستبازی کا ثبوت دیتے الٹا انہوں نے ظلمستان پاکستان میں اس شمع ہدایت کو بجھا دینے کی تدبیریں وضع کرنی شروع کر دیں اور بالآخر حکومت نے پاکستان کے اس معزز شہری کو جس نے ظلم و ریا کی طاقتوں میں رہتے ہوئے بھی صدائے حق بلند کرنے کی جسارت کی۔ اس کے سیکرٹری سمیت اس کو گرفتار کر لیا۔ لیکن کیا اہل پاکستان سمجھتے ہیں کہ اس روش سے آنکھیں موند کر وہ محفوظ و مامون ہو گئے ہیں۔ ہرگز نہیں بلکہ وقت قریب ہے جبکہ اپنے ہمسایوں اور دوستوں سے خدا واسطہ کا بیر رکھنے اور بلا وجہ ان کے ملک کے ایک حصہ پر قبضہ کرنے کی پاداش میں ان پر قہر الٰہی نازل ہوگا اور انہیں اپنے کئے کی سزا بھگتنی پڑے گی۔'' نوائے وقت نے اس ادارتی نوٹ پر کوئی طویل تبصرہ نہ کیا۔ البتہ اتنا لکھا کہ ''سکھوں کی بارگاہ سے مودودی صاحب کو شمع ہدایت، علمبردار حق اور مرد مجاہد کے خطاب اس لئے تو نہیں دیئے جا رہے کہ مودودی صاحب کی موجودہ روش سکھوں کے نزدیک بھی پاکستان کے لئے نقصان دہ ہے اس لئے جو بھی پاکستان کو دانستہ یا نا دانستہ نقصان پہنچا رہا ہے وہ سکھوں کا ممدوح ہے۔'' اسی دن نوائے وقت میں ایک مراسلہ بھی شائع ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ ''پاکستان میں حکومت اسلامی ہو کہ غیر اسلامی یہ یقینی ہے کہ وہ گروہ جو اپنے آپ کو ''اسلامی جماعت'' کہتا ہے پاکستان کا دشمن ہے اور دشمن رہے گا۔ جس شاندار کامیابی کا نام پاکستان ہے اور جو قوم کی متحدہ کوششوں اور قربانیوں کا نتیجہ ہے بعض مردودوں کو پسند نہیں۔ بنی بنائی چیز پر ایک نہیں کئی جماعتیں قابض ہونا چاہتی ہیں۔ یہ تو ہے حقیقت۔ رہا یہ امر کہ عام مسلمان کیا کریں گے۔ آپ یقین رکھئے کہ قوم خارجیت، منافقت اور ہیچوں قسم دیگر حرکات کو ٹھکرا رہی ہے۔ پیران پارسا کے جامہ ریا کو زیادہ چاک کرنے کی ضرورت نہیں۔ بہروپیوں کی تعداد میں دو چار کا اضافہ ہو جائے تو چنداں مضائقہ نہیں۔''[13]

مودودی اور احراری مُلّاؤں کی گرفتاری سے مُلّائیت کی پسپائی اور سیکولر عناصر کی حوصلہ افزائی......احمدیہ جماعت کے ظفر اللہ خان کا بلا مقابلہ انتخاب

قائداعظم جناح کے 11ر ستمبر کو انتقال کے بعد نوائے وقت اور حکومت کے دیگر ذرائع ابلاغ کی جانب سے مُلّا مودودی اور اس کی جماعت کے خلاف یلغار، ستمبر کے اواخر میں دو احراری لیڈروں مخدوم شاہ بنوری اور شیخ حسام الدین کی گرفتاری اور پھر اکتوبر کے اوائل میں جماعت اسلامی کے قائدین کی گرفتاری کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر رنگ و نسل کے مُلّاؤں نے جنوری 1948ء کے بعد شرعی نظام کے فوری نفاذ کی جو مہم شروع کر رکھی تھی وہ بہت ماند پڑ گئی اور وزیر اعظم لیاقت علی خان کو اپنا اقتدار مستحکم کرنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ مزید براں پاکستان کے عوام میں اپنے مستقبل کے بارے میں جو خوف و ہراس پیدا ہوا تھا وہ بہت حد تک دور ہو گیا۔ یہ سب کچھ اس حقیقت کے باوجود ہوا کہ 28ر ستمبر کو پاکستان کا وزیر خارجہ سر محمد ظفر اللہ خان مغربی پنجاب کے مسلم حلقہ انتخاب سے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا بلا مقابلہ رکن منتخب ہو گیا تھا۔ یہ نشست راجہ غضنفر علی خان کی ایران میں بحیثیت سفیر تقرری کے بعد خالی ہوئی تھی۔ اس کے لئے راؤ خورشید علی خان اور عبدالستار نیازی بھی امیدوار تھے لیکن ان دونوں کے کاغذات نامزدگی مسترد کر دیئے گئے تھے۔ سر ظفر اللہ کا یہ انتخاب اس لحاظ سے بہت سیاسی اہمیت کا حامل تھا کہ نفاذ شریعت کی مہم کے دوران احراری مُلّاؤں نے فرقہ احمدیہ اور سر ظفر اللہ خان کو اپنے حملوں کا خاص نشانہ بنایا تھا۔ احراری لیڈر شیخ حسام الدین کی سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتاری اسی دن عمل میں آئی تھی جس دن ظفر اللہ خان کے انتخاب کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس کے خلاف الزام یہ تھا کہ اس کی سرگرمیاں تحفظ مملکت کے منافی تھیں۔ ظفر اللہ خان ان دنوں پیرس میں تھا جہاں اس نے 30ر ستمبر کو مصر کے وزیر خارجہ احمد خشابہ پاشا سے ملاقات کے بعد مسلم ورلڈ نیوز کے ایک نامہ نگار سے انٹرویو کے دوران بتایا تھا کہ اقوام متحدہ میں اسلامی ممالک کے ایک بلاک کی تشکیل کی جائے۔

یکم اکتوبر 1948ء کو کراچی میں تعلیمات عامہ کے ڈائریکٹروں کی ایک کمیٹی نے صوبائی حکومتوں سے یہ سفارش کی کہ وہ ترکی کے طریقہ تعلیم کو پاکستان میں رائج کریں اور اردو کی کتابیں نستعلیق کی بجائے نسخ میں لکھی جائیں۔ 4ر اکتوبر کو اس خبر پر روزنامہ امروز کا تبصرہ یہ تھا کہ ’’ترکی

کے جس نظام تعلیم کی نقل کی جا رہی ہے اس کے وضع ہونے سے قبل مصطفی کمال نے یہ طے کر لیا تھا کہ اسے مطلق العنان شاہی کی دقیانوسی روایات ترک کر کے مغربی ممالک کے نہج پر ایک ایسی ترکی سوسائٹی کی تعمیر کرنی ہے جو قرون وسطیٰ کے فرسودہ نظام کی آلائشوں سے پاک اور زمانہ جدید کی ترقیوں سے مالا مال ہو۔ اس لئے پہلے ترکی کا جمہوری دستور بنایا گیا۔ انسانی حقوق معین کئے گئے۔ اور ایک ایسا ہمہ گیر لائحہ عمل مرتب ہوا تعلیمی تعمیر جس کا ایک شعبہ تھا۔ اور گذشتہ 25 سال میں جن ممالک میں بھی تعمیر نو کا کام ہوا، تفصیلات میں فرق ضرور ہے لیکن طریقہ کار یہی رہا۔ لہٰذا ہم حکومت پاکستان سے اپیل کرتے ہیں کہ آئین سازی سے قبل تعلیمی تجربوں پر وقت اور روپیہ ضائع نہ کرے......قوم نے اپنا مستقبل آئین ساز اسمبلی کے سپرد کیا ہے۔ آئین ساز اسمبلی ایک ایسا طرز عمل معین کرے گی جس کے سانچے میں مستقبل کے شہری ڈھالے جائیں گے۔'' امروز کے اس اداریے کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان میں ترکی کی طرح ایک ایسا جمہوری آئین مرتب کیا جائے جس کی بنیاد مذہب پر نہ ہو اور جس کے مطابق سیکولر نظام حکومت رائج ہو۔ اسے یہ اداریہ لکھنے کی اس لئے جرات ہوئی تھی کہ مجلس احرار کے بعض لیڈروں کی گرفتاری کے بعد ملائیت کی کسی حد تک پسپائی ہو گئی تھی اور جماعت اسلامی کے خلاف متوقع تعزیری کاروائی کے بعد اس کی مزید پسپائی کا امکان تھا۔

6 اکتوبر کو مُلّا مودودی اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کے دو دن بعد پاکستان کے وزیر خزانہ غلام محمد نے کراچی سے ایک نشری تقریر میں کہا کہ پاکستان ایک جمہوری ریاست کے طور پر قائم ہوا ہے۔ جمہوریت کی نشوونما صرف آزاد ماحول میں ہی ہو سکتی ہے۔ جمہوری آئین پر کامیابی کے ساتھ عملدرآمد کے لئے ضروری ہے کہ ملک کی مستقل سروسز، عدلیہ، پبلک سروس کمیشن اور پریس کی دیانت اور راست بازی کا پوری طرح تحفظ کیا جائے۔ اگر رائے عامہ باشعور ہو تو اقتدار چند ہاتھوں میں مرتکز نہیں ہو سکتا اور نہ ہی چند لوگ جمہوریت کے نام پر اقتدار کا غلط استعمال کر سکتے ہیں۔ ہمیں پاکستان کی تعمیر ایک آزاد جمہوری ریاست کے طور پر کرنی چاہیے جس میں جمہوریت اور انصاف کی اعلیٰ ترین روایات کی کارفرمائی ہو۔ اقتدار لازماً عوام کے پاس ہونا چاہیے اور عوام کو ہی اقتدار کو بروئے کار لانا چاہیے۔''[14] غلام محمد کی اس تقریر کا مطلب یہ تھا کہ پنجاب اور صوبہ سرحد میں جماعت اسلامی اور مجلس احرار کے بعض فتنہ پرور مولویوں اور لیڈروں کے خلاف تعزیری کاروائی کی وجہ سے مُلّائیت کی جو پسپائی ہوئی تھی وہ ان عناصر کی حوصلہ افزائی کا

باعث بنی تھی جو پاکستان میں مغربی طرز کا سیکولر جمہوری نظام رائج کرنا چاہتے تھے۔ غلام محمد وغیرہ پاکستان میں اللہ کی حاکمیت یا قرآنی قانون یا شرعی نظام کے نام پر مُلّائیت کے نفاذ کے خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان قائداعظم جناح کی 11/اگست 1947ء کی تقریر کے مطابق ایک سیکولر بورژوا جمہوری ریاست ہو جس میں عوام الناس کو یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ اقتدار اپنے منتخب نمائندوں کو سپرد کریں۔ پاکستان ٹائمز نے غلام محمد کی اس تقریر کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھا کہ "خوش قسمتی سے پاکستان کے عوام میں توانائی، پہل قدمی، جرأت، قوت برداشت خود انحصاری اور قربانی کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ ایک آزاد، ترقی پسند اور جمہوری ریاست کے قیام کے لئے اسی قسم کی افرادی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے عوام کے مزاج اور عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق جمہوری آئین بنانے میں مزید تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔"[15] قبل ازیں امروز بھی اپنے 4/اکتوبر کے اداریے میں یہ مطالبہ کر چکا تھا کہ پاکستان میں ترکی کی طرز کا سیکولر آئین فوراً بنانا چاہیے، باقی سارے کام بعد میں ہو جائیں گے۔ مطلب یہ تھا کہ اب جبکہ شرعی نظام کے فوری نفاذ کی مہم ماند پڑ گئی ہے تو اس صورتحال سے فائدہ اٹھا کر جمہوری آئین کی ترتیب میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ اس وقت تک ہندوستان میں جمہوری آئین کا ابتدائی ڈھانچہ تیار ہو چکا تھا۔

مجلس احرار نے حکومت پاکستان سے وفاداری اور مسلم لیگ سے اختلافات کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ لیگی مولوی شبیر احمد عثمانی کو تقویت حاصل ہوئی

صوبہ سرحد اور پنجاب میں مُلّاؤں کی فتنہ پروری کے خلاف اقدامات کا سب سے اصلاحی اثر احراری مولویوں پر ہوا۔ چنانچہ 6/اکتوبر کو سیالکوٹ کے ایک جلسہ عام میں احراری لیڈروں نے حکومت پاکستان کو یقین دلایا کہ وہ پاکستان کے پوری طرح وفادار ہیں۔ انہوں نے کہا کہ "اگر حکومت کو ان کی نیک نیتی کے بارے میں کوئی شبہ ہو تو وہ تحقیقات کرا سکتی ہے۔ وہ پاکستان کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کا عزم صمیم رکھتے ہیں۔"[16] پھر 9/اکتوبر کو احراری لیڈر سید عطا اللہ شاہ بخاری نے لاہور کے ایک جلسہ عام میں کہا کہ "ہم نے مسلم لیگ سے اپنے تمام اختلافات کو ختم کر دیا ہے اور اب ہم پاکستان کے سچے خادم ہیں، اگر احرار جماعت کے کسی فرد نے پاکستان سے غداری کا ثبوت دیا تو وہ سب سے پہلا آدمی ہو گا جو اسے گولی کا نشانہ بنتا ہوا

دیکھنا پسند کرے گا۔''[17] عطاءاللہ شاہ بخاری کی یہ تقریر بڑی سیاسی اہمیت کی حامل تھی''امیر شریعت''احراریوں کا سب سے بڑا شعلہ بیان لیڈر تھا۔1930ء کے بعد اس کی قیادت میں مجلس احرار کی سیاست کی سب سے بڑی بنیاد فرقہ احمدیہ کی مخالفت پر رہی تھی اور جنوری 1948ء کے بعد نفاذ شریعت کی مہم کے دوران بھی اس نے اپنی نکتہ چینی کا سب سے بڑا ہدف فرقہ احمدیہ اور ظفر اللہ خان کو بنایا تھا۔لیکن اب اس نے مسلم لیگ کے ساتھ اپنے اختلافات ختم کرنے کا اعلان کیا تھا۔ حالانکہ اسی لیگ کے زیر سایہ فرقہ احمدیہ کا خلیفۃ المسیح بشیرالدین احمد تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف تھا اور اس نے جولائی 1948ء میں کوئٹہ کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ بلوچستان اس کے فرقہ کے عقائد کی تبلیغ کے لئے ایک اڈہ بن سکتا ہے اور پھر ستمبر میں اس فرقہ کا سب سے بڑا لیڈر ظفر اللہ خان 28ر ستمبر کو مغربی پنجاب کے مسلم حلقہ انتخاب سے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا بلا مقابلہ رکن منتخب ہوا تھا۔

22ر اکتوبر کو جمعیت العلمائے اسلام کے لیڈر شبیر احمد عثمانی نے ایک بیان میں عطاءاللہ شاہ بخاری کے اس اعلان کا خیر مقدم کیا۔اس نے کہا کہ''ہمارے محترم کرم فرما مولانا عطاءاللہ شاہ بخاری کی حالیہ تقریر جو انہوں نے لاہور میں کی ہے مفصل پڑھی۔شاہ صاحب نے اس تقریر میں اپنی ذات اور اپنی جماعت کی طرف سے پاکستان کی غیر مشروط وفاداری کا پورے زور سے اطمینان دلایا ہے۔دین اور سیاست کے مخلوط جذبات کے احساس سے قدرتی طور پر ایک طرح کی اخلاقی ذمہ داری کا جو بوجھ میں اب تک محسوس کرتا رہا ہوں آج شاہ صاحب کی یقین دہانی سے مجھے ایسا معلوم ہوا ہے کہ وہ بہت ہلکا ہو گیا ہے۔شاہ صاحب کا ایسی سرگرمیوں سے ادھر تشریف لے آنا میرے نزدیک پاکستان کے تحفظ و استحکام کے لئے انشاءاللہ دیباچہ فتوحات ثابت ہوگا۔ میں امید کرتا ہوں کہ جو سحر آفرین زبان ایک عرصہ سے تحریک پاکستان کے خلاف بڑی تیزی کے ساتھ چلتی رہی ہے اب اس سے دگنی روانی کے ساتھ پاکستان کی حمایت میں استعمال ہو کر تلافی مافات کا وہی منظر پیش کرے گی جو''وحشی کے خنجر''نے حضرت حمزہؓ کو شہید کرنے کے بعد مسیلمہ کذاب کے قتل سے پیش کیا تھا۔''[18] شبیر احمد عثمانی کے اس بیان کی اہمیت یہ تھی کہ یہ شیخ الاسلام پاکستان میں مُلّائیت کی بالادستی کے لئے اپنی زیر قیادت ہر فرقہ کے مُلّاؤں کا ایک متحدہ محاذ بنانے کا خواہاں تھا۔چنانچہ اس نے اپنے اسی منصوبے کے تحت پہلے 8ر اکتوبر کو اور پھر 22ر اکتوبر

کو جماعت اسلامی کے مُلّا مودودی اور اس کے ساتھیوں کی رہائی کا بھی مطالبہ کیا تھا اور پھر 22/اکتوبر کو اس سلسلے میں اس کا بیان یہ تھا کہ ''اسلام کی ایسی تلواروں کو نیام میں بند نہ رکھیئے جنہیں پاکستان کی حفاظت و استحکام اور فتنہ اشتراکیت و لامذہبیت کی امانتہ وابطال کے لئے اس وقت کھلا رکھنے کی شدید ضرورت ہے۔ بلاشبہ دفاع کا مسئلہ سردست سب مسائل پر مقدم ہے لیکن آئین اسلامی کو رواج دینا اور اس پر عملاً کاربند ہونا خود دفاع کے سلسلے میں بھی مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ مؤثر اور کامیاب ہتھیار ثابت ہوگا۔''[19]

شبیر احمد عثمانی کا یہ بیان دراصل وزیر خزانہ غلام محمد کی 6/اکتوبر کی نشری تقریر کے جواب میں تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ ستمبر۔ اکتوبر میں صوبہ سرحد اور پنجاب میں مُلّائیت کی پسپائی کے باوجود مُلّاؤں نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے اور وہ اپنی قوتوں کو از سرنو مجتمع کر کے ایک مرتبہ بھرپور حملہ کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ گویا ایک طرف تو وزیر خزانہ غلام محمد کی زیر قیادت بورژوا سیکولر قوتیں منظم ہو رہی تھیں اور دوسری طرف شبیر احمد عثمانی کی رہنمائی میں مُلّائیت کی قوتیں جمع ہو رہی تھیں اور دونوں کے درمیان ایک اور معرکہ ناگزیر تھا۔ ان دنوں وزیر اعظم لیاقت علی خان دولت مشترکہ کی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لندن گیا ہوا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ جب وہ لندن سے واپس آئے گا تو وہ دقیانوسی مُلّائیت کی حمایت نہیں کرے گا کیونکہ اس نے قائداعظم کے انتقال کے بعد ستمبر میں جو تقریریں کی تھیں ان میں اس نے اسلام کی تعبیر بورژوا نقطہ نگاہ سے کی تھی اور جماعت اسلامی اور مجلس احرار کے لیڈروں کی گرفتاریاں بھی مرکزی وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین کے دورہ لاہور کے بعد عمل میں آئی تھیں۔

نئے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے مُلّائیت کی پھر سے حوصلہ افزائی کردی، جماعت اسلامی نے شہ پائی مگر نوائے وقت نے عثمانی کو شیخ الاسلام کے منصب پر فائز کرنے کا مطالبہ کردیا

تاہم شبیر احمد عثمانی اور دوسرے مُلّاؤں کو نئے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کی پشت پناہی پر بڑا بھروسہ تھا۔ اگرچہ اس شخص نے اپریل 1947ء میں ایک آزاد و خود مختار سوشلسٹ متحدہ بنگال کی ریاست کی تجویز کی اعلانیہ حمایت کی تھی لیکن قیام پاکستان کے بعد جب

مشرقی بنگال کی عنان اقتدار اس کے ہاتھ میں آئی تھی تو یہ بہت دیندار بن گیا تھا۔ اس نے وہاں اپنے دو سالہ عہد اقتدار میں علما و مشائخ کی کئی کانفرنسیں کروائی تھیں جن کا مقصد یہ تھا کہ اسلام اور مسلم قومیت کے زور سے اس عوامی تحریک کو کچلا جائے جو قومیتی و طبقاتی حقوق کے لئے نومبر 1947ء میں ہی چل پڑی تھی۔ تاہم اس کی ان مذہبی کانفرنسوں سے کوئی سیاسی مقصد پورا نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ستمبر میں جب یہ مشرقی بنگال کی وزارت عظمیٰ چھوڑ کر پاکستان کے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالنے کے لئے کراچی آیا تھا، وہاں قومیتی و طبقاتی تحریک بہت زور پکڑ چکی تھی۔ مسلم قومیت، اردو زبان اور عربی رسم الخط کے ہتھیاروں میں سے کوئی ہتھیار بھی اس تحریک کو کچلنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ تاہم 14 ر ستمبر کو اس نے کراچی میں گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالنے کے بعد جو نشری تقریر کی تھی اس میں قائداعظم جناح کی 11 ر اگست 1947ء کی تقریر کے برعکس مُلّائیت کی جھلک نمایاں تھی۔ چنانچہ جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے 14 سے 18 ر ستمبر تک اپنے چار روزہ اجلاس میں جو قراردادیں منظور کی تھیں ان میں خواجہ ناظم الدین کے نام بصورت پیغام ایک قرارداد یہ بھی تھی کہ ''گورنر جنرل ہونے کے بعد آپ نے جو تقریر فرمائی ہے اس کے اندر ایک دینی روح پائی جاتی ہے اور نیک ارادوں کا نشان ملتا ہے جس کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ پاکستان کو روح اور قالب ہر دو حیثیتوں سے فی الواقع ایک ''اسلامی ریاست'' بنانے کی کوشش کریں گے۔ آپ یقین رکھئے کہ اس مقصد کے لئے جو صحیح کوشش بھی آپ کریں گے جماعت اسلامی اس میں آپ کے ساتھ پورا تعاون کرے گی۔''[20]

مجلس شوریٰ نے خواجہ ناظم الدین کے نام جس دن یہ پیغام بھیجا تھا اسی دن یہ مختصر خبر شائع ہوئی تھی کہ ''گورنر جنرل ہاؤس کراچی میں پانچ وقت باقاعدہ اذان کے بعد نماز با جماعت ادا ہوتی ہے اور اس میں ہز ایکسیلینسی خواجہ ناظم الدین اور ان کے سٹاف کے سب ممبر شریک ہوتے ہیں۔ خواجہ ناظم الدین نے اپنے سٹاف کے منتخب ارکان کو خاص طور پر ہدایت کی ہے کہ وہ شعائر اسلام کی پوری پابندی کریں تا کہ دوسرے لوگوں کے لئے نیک مثال قائم ہو۔''[21] اگلے دن نوائے وقت کا اس خبر پر تبصرہ یہ تھا کہ ''ہمارے نزدیک گورنر جنرل ہاؤس کے متعلق یہ مختصر سی خبر اس لئے اہم اور خوشگوار ہے کہ یہ ایک اہم اور خوشگوار رجحان کی طرف اشارہ کرتی ہے اور یہ رجحان اسلام کی طرف لوٹنے کا رجحان ہے...... ارباب اقتدار یعنی گورنر جنرل، گورنروں اور وزیروں کی زندگیاں اسلامی

ہوں گی تو سرکاری افسر اور اہلکار بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں گے۔ اگر سرکاری مشینری اسلامی سانچہ میں ڈھل جائے تو قوم کی خود بخود اصلاح ہو جائے گی...... خواجہ ناظم الدین اور حکومت پاکستان کے دوسرے ارکان کو پاکستان کو ایک اسلامی مملکت بنانے کے لئے ایک اور ضروری قدم اٹھانا چاہیے۔ اس وقت تک حکومت محض سیاستدانوں اور مدبرین پر مشتمل ہے۔ ایک اسلامی حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ شیخ الاسلام کے مشوروں سے مستفید ہو تا کہ اس کی پالیسی محض سیاسی مصلحتوں کی بنیاد پر نہ متعین کی جائے بلکہ اس کا فیصلہ کرتے وقت مصالح اسلامی کا بھی پورا پورا خیال رکھا جائے اور شیخ الاسلام وزرا کو بتائیں کہ قرون اولیٰ اور اسلام کے زریں عہد میں خلفائے راشدین یا حضرت عمر بن عبدالعزیز جیسے خلفائے کرام کے زمانہ میں حکومت کے سامنے ایسا ہی مسئلہ پیش ہوا تو کیا قدم اٹھایا گیا؟ ہماری رائے میں شیخ الاسلام کا منصب جلد از جلد قائم کیا جانا چاہیے اور شیخ الاسلام کی رائے اور مشورہ کی وہی حیثیت اور قدر و قیمت ہونی چاہیے جو کابینہ کے کسی دوسرے رکن کی رائے یا مشورہ کی یعنی ہر لحاظ سے ان کی حیثیت اور مرتبہ رکن وزارت کے برابر ہو مگر اتنا فرق ضرور ملحوظ رکھا جائے کہ شیخ الاسلام کا لقب و عزل وزارت کی زندگی سے وابستہ نہ ہو تا کہ وزارت کے استعفیٰ کے ساتھ ہی شیخ الاسلام کو بھی مستعفی نہ ہونا پڑے۔ وزارتیں پارٹیوں کی بنا پر بنتی اور ٹوٹتی ہیں۔ شیخ الاسلام کے منصب کی عزت و عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ اسے پارٹی سیاسیات سے بالاتر رکھا جائے۔ خوش قسمتی سے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی پاکستان میں موجود ہیں۔ اپنے علم و فضل کے اعتبار سے وہ اس منصب کے اہل ہیں اور ان کی ذات گرامی پر کسی جماعت کو بھی اعتراض نہ ہو گا۔ اگر ان سے یہ منصب قبول کرنے کی درخواست کی جائے اور وہ اسے قبول فرمالیں تو حکومت کی بنیادی پالیسی پر ضرور اسلامی رنگ چڑھ جائے گا اور یہی مسلمانوں کی خواہش ہے۔''[22] نوائے وقت کے اس اداریے کا مطلب یہ تھا کہ پنجاب کے بیشتر جاگیردار اور درمیانہ طبقہ کے بعض عناصر بھی پاکستان میں مُلّاؤں کے تصور کے مطابق خلافتی نظام حکومت ہی رائج کرنے کے حق میں تھے۔ انہیں مُلّاؤں کی نفاذ شریعت کی مہم پر اعتراض صرف یہ تھا کہ وہ نواب ممدوٹ کی حکومت کے لئے نظم و نسق کا مسئلہ پیدا کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ علما و مشائخ نفاذ شریعت کے لئے جلسوں اور جلوسوں کی بجائے اپنی سفارشات پر امن طریقے سے دستور ساز اسمبلی کے سامنے پیش کریں۔ ان دنوں ممتاز دولتانہ نے ملک فیروز خان نون اور بعض دوسرے یونینسٹ زمینداروں سے گٹھ جوڑ کر

کے نواب ممدوٹ کی وزارت کے لئے ایک اور ڈیڈلاک پیدا کر دیا گیا تھا۔ صوبائی مسلم لیگ کی صدارت کے لئے بھی ممدوٹ دھڑے اور دولتانہ دھڑے کے درمیان سخت کشمکش جاری تھی۔ دولتانہ پس پردہ مُلّاؤں کو ہلہ شیری دے کر ممدوٹ حکومت کے لئے مشکلات پیدا کر رہا تھا۔

لیکن مُلّا مودودی کی سیاسی بے بصیرتی اور مذہبی خارجیت نے مُلّاؤں کی ''شرعی مہم'' کو وقتی طور پر درمیانہ طبقہ کے جذبہ حب الوطنی کے بوجھ تلے دفن کر دیا۔ احراری لیڈر عطا اللہ شاہ بخاری کی جانب سے پاکستان کے حق میں اعلان وفاداری کے بعد شرعی نظام کے فوری نفاذ کے لئے جلسوں اور جلوسوں کا سلسلہ یکا یک بند ہو گیا۔

بنگال میں کمیونزم کے خطرہ کے خلاف لیاقت علی نے اسلام کا سہارا لیا تو نوائے وقت نے کمیونسٹوں اور مولویوں دونوں کی بیک وقت مخالفت کرتے ہوئے اسلامی آئین کے نفاذ کا مطالبہ کر دیا

مُلّاؤں کے محاذ پر یہ سکوت ایک ڈیڑھ ماہ تک جاری رہا جبکہ وزیر اعظم لیاقت علی خان دولت مشترکہ کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لندن میں مقیم تھا۔ وہ براستہ قاہرہ نومبر 1948ء کے دوسرے ہفتے میں اسلامی ممالک کے درمیان اشتراک وتعاون کی باتیں کرتا ہوا واپس آیا تو ملک مُلّائیت کے مسئلہ سے دوچار نہیں تھا۔ البتہ بعض اخبارات نے شیعہ۔ سنی تنازعہ کھڑا کر رکھا تھا۔ 16 نومبر کو اس کے اعزاز میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی زیر صدارت کراچی کے شہریوں کا ایک جلسہ عام ہوا تو اس میں ناگزیر طور پر اسلامی ریاست، اسلامی نظام اور اسلامی آئین کے سوالات زیر بحث آئے۔ لیاقت علی خان نے اس موقع پر اے۔ ایم۔ قریشی کے پیش کردہ سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''سارے اسلامی ممالک تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں اور انہوں نے تم سے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ ہمیں پاکستان کو ایک مضبوط ملک بنانے کے لئے جدوجہد کرنی چاہیے کیونکہ ایک کمزور ملک دوسرے کمزور ملک کی کوئی امداد نہیں کر سکتا۔'' اس نے کہا کہ ''پاکستان کی دستور ساز اسمبلی اردو کو سرکاری زبان بنانے کا فیصلہ کر چکی ہے لیکن اردو کو انگریزی کی جگہ لینے میں وقت لگے گا۔''

18 نومبر کو لیاقت علی خان مشرقی بنگال کے دورہ کے لئے جب ڈھاکہ پہنچا تو صوبائی

کمیونسٹ پارٹی کی زیر قیادت میمن سنگھ کے علاقے میں کسانوں کی زوردار جدوجہد جاری تھی اور طلبا میں بھی معاشی، معاشرتی اور ثقافتی مسائل کی وجہ سے بہت بے چینی تھی۔ چنانچہ یہاں بھی 20 نومبر کو جلسہ عام ہوا تو اسلام کا مسئلہ زیر بحث لایا گیا۔ لیاقت علی خان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ''پاکستانی آئین مساوات، اخوت اور انصاف کے اسلامی اصولوں کی بنا پر استوار کیا جائے گا۔'' لیاقت علی خان کا یہ اعلان کوئی نیا اعلان نہیں تھا۔ اس سے پہلے قائداعظم جناح اکتوبر 1947ء کے اواخر میں اپنی کشمیر پالیسی کی ناکامی کے بعد ایک سے زیادہ مرتبہ یہ اعلان کر چکے تھے اور خود لیاقت علی خان اور دوسرے مرکزی وزراء بھی اس اعلان کو کئی بار دہرا چکے تھے۔

نوائے وقت نے لیاقت علی خان کے اس اعلان کا پرجوش خیر مقدم کیا اور لکھا کہ ''اگر کمیونزم کا سیلاب جو چین اور برما تک پہنچ چکا ہے واقعی روکنا مقصود ہے تو حکومت کو سب سے پہلے مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ حل کرنا ہوگا۔ کمیونزم کے خلاف سب سے پہلا اور سب سے آخری مستحکم مورچہ یہی ہے کہ ملک کی آبادی بھوکی اور اقتصادی اعتبار سے تباہ حال نہ ہو۔ پاکستان کو ایک بڑا خطرہ کمیونسٹوں سے ہے۔ عجیب بات ہے کہ پاکستان کو دوسرا بڑا خطرہ ایک ایسے گروہ سے ہے جو بظاہر کمیونسٹوں کا دشمن ہے۔ مگر دراصل اپنی کوتاہ نظری سے کمیونزم کے فروغ کا باعث ہو رہا ہے۔ ہماری مراد کم نظر، کم علم اور کم سواد مُلّاؤں سے ہے جو اسلام کی حقیقی روح سے قطعاً بے خبر ہیں...... اس امر کا قوی خدشہ ہے کہ تنگ نظر مُلّاؤں کا یہ گروہ اپنی بظاہر معصوم سرگرمیوں سے پاکستان کی جڑوں کو ہی کھوکھلا نہ کر دے۔ جس طرح کمیونزم کے خطرے سے نپٹنے کے لئے حکومت کی محض منفی تدابیر ہی کافی نہیں بلکہ بعض مثبت اقدام بھی ضروری ہیں اسی طرح تنگ نظر مُلّائیت کے خطرہ کے سدباب کے لئے بھی صرف منفی انتظامات کافی نہیں۔ حکومت کے لئے ایک مثبت قدم اٹھانا بھی ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ حکومت اپنی اولین فرصت میں اس امر کا اعلان کر دے کہ پاکستان کا آئندہ دستور اسلام کے بنیادی اصولوں پر مبنی ہوگا...... مسٹر لیاقت علی خان کا یہ اعلان کروڑوں مسلمانوں کے لئے وجہ اطمینان ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ چند اہل غرض محض اس لئے شریعت اور اسلامی آئین کا شور مچا رہے ہیں کہ اس بہانے انہیں اپنی دکان قیادت چمکانے کا موقع ملتا ہے...... اہل غرض کی شرانگیز سرگرمیوں کا سدباب یہ ہے کہ حکومت یہ اعلان کر دے کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے اور اس کا دستور اسلام کے اصولوں پر مبنی ہوگا۔ مسٹر لیاقت علی خان نے اعلان کر ہی دیا ہے۔ دستور ساز اسمبلی اس پر مہر تصدیق

ثبت کر دے تو آئین کی بحث ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔ جہاں تک مکمل دستور کی ترتیب کا تعلق ہے اس میں وقت لگے گا۔لیکن محض یہ اعلان کہ دستور کی اساس اسلامی ہوگی مزید وقت کا محتاج نہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ اعلان پاکستانی عوام میں ایک نیا ولولہ پیدا کر دے گا اور وہ دفاع و استحکام کے لئے ہی اپنی سرگرمیاں دو چند نہیں کر دیں گے بلکہ اقتصادی و معاشی مشکلات کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کریں گے اور ان کے مقابلے کے لئے اپنے آپ میں نئی قوت پائیں گے۔''[23]

پنجاب میں ممدوٹ دھڑے اور دولتانہ دھڑے کے مابین اقتدار کی رسہ کشی میں نوائے وقت اور مُلّاؤں کا کردار

نوائے وقت کے مذکورہ اداریے کا سیاسی پس منظر یہ تھا کہ قیام پاکستان کے پہلے ہی روز سے پنجاب میں مسلم لیگ کے ممدوٹ دھڑے اور دولتانہ دھڑے کے درمیان اقتدار کی جو کشمکش شروع ہوئی تھی وہ کسی صورت ختم ہی ہونے میں نہیں آتی تھی۔ وزیر اعلیٰ ممدوٹ نے اس بحران کو ختم کرنے کے لئے جون 1948ء میں اپنی وزارت میں ممتاز دولتانہ اور شوکت حیات خان کی جگہ تین نئے وزرا...... میاں نور اللہ، میجر مبارک علی شاہ اور عبدالحمید دستی...... کو شامل کیا تھا اور پھر کچھ عرصہ بعد اس نے اپنے اقتدار کے مزید استحکام کے لئے شیخ کرامت علی کو اپنی کابینہ میں جگہ دے دی تھی۔ مگر اس کی سیاسی مشکل پھر بھی دور نہ ہوئی تھی کیونکہ ایک طرف تو جماعت اسلامی، مجلس احرار اور جمعیت العلمائے پاکستان اور مسلم لیگ کے خلافت گروپ کے مُلّاؤں نے، جن کی دولتانہ پس پردہ حمایت کرتا تھا، نفاذ شریعت کی مہم شروع کر کے اس کے لئے نظم و نسق کا مسئلہ پیدا کر دیا تھا اور دوسری طرف دولتانہ نے ملک فیروز خان نون وغیرہ سے گٹھ جوڑ کر کے یہ تاثر پیدا کر دیا تھا کہ اسمبلی میں ممدوٹ وزارت کو اکثریت کی حمایت حاصل نہیں ہے۔ اس صورتحال کے پیش نظر نواب ممدوٹ نے اکتوبر میں یہ کوشش کی کہ دولتانہ اور نون کو اپنی کابینہ میں شامل کر کے اپنے اقتدار کو قائم رکھے مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھی اور صوبہ کا سیاسی بحران اس بنا پر شدید سے شدید تر ہو گیا کہ صوبائی لیگ کی صدارت کے لئے ممتاز دولتانہ کے مقابلہ میں ممدوٹ دھڑے کی طرف سے علاؤالدین صدیقی اس عہدہ کا امیدوار بن گیا۔ وزیر اعظم لیاقت علی خان جب نومبر کے دوسرے ہفتے میں لندن سے واپس آیا تھا تو ان دونوں دھڑوں کے درمیان دونوں ہی محاذوں پر کشمکش بڑی

ہی شدید تھی اور اس کشمکش میں مُلّا عبدالستار نیازی سمیت شرعی نظام کے بیشتر علمبرداران دولتانہ دھڑے کا ساتھ دے رہے تھے۔

10 رنومبر کو ان دونوں دھڑوں کے قائدین نے کراچی میں گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین اور وزیراعظم لیاقت علی خان سے ملاقاتیں کیں اور مدیر نوائے وقت سمیت پنجاب کے پانچ ایڈیٹروں نے بھی اس سلسلے میں گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین، وزیراعظم لیاقت علی خان، وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین اور پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں سے ملاقاتیں کر کے ممدوٹ دھڑے کی حمایت کی مگر وزارتی الجھن دور نہ ہوئی۔ چنانچہ 17 رنومبر کو نوائے وقت میں یہ خبر شائع ہوئی کہ نواب ممدوٹ اپنی کابینہ میں ممتاز دولتانہ اور فیروز خان نون کو شامل نہ کرے گا۔ البتہ وہ شیخ کرامت علی کی جگہ چودھری فضل الٰہی کو وزارت تعلیم کا عہدہ پیش کرے گا۔

19 رنومبر کو نواب ممدوٹ کا بیان یہ تھا کہ ”میں نے دولتانہ اور نون کو وزارت میں شامل نہ کرنے کا فیصلہ اس لئے کیا ہے کہ ان دونوں نے تعاون کی بجائے افتراق پردازی کا عزم کر رکھا ہے۔“ چونکہ اس ساری کشمکش میں کم علم، کم نظر اور کم سواد مُلّا دولتانہ دھڑے کا ساتھ دے رہے تھے اس لئے ان کی مُلّائیت کمیونزم کے بعد پاکستان کے لئے دوسرا بڑا خطرہ تھی۔ اس وقت نواب ممدوٹ اور اس کے مشیر خاص مدیر نوائے وقت کو یہ نہیں معلوم تھا کہ پاکستان کو ایک تیسرا بڑا خطرہ بھی لاحق تھا اور وہ یہ تھا کہ وزیراعظم لیاقت علی خان نے اندر خانے دولتانہ دھڑے سے ساز باز کر لی تھی اور اس ساز باز کا پہلا نتیجہ تو 29 رنومبر کو برآمد ہوا جبکہ ممتاز دولتانہ نے صوبائی لیگ کے صدارتی انتخاب میں ممدوٹ دھڑے کے امیدوار علاؤ الدین صدیقی کو 22 ووٹوں کی اکثریت سے شکست دے دی۔ اس انتخاب میں نون گروپ کے یونینسٹ جاگیرداروں کے علاوہ مُلّا عبدالستار نیازی کے خلافت گروپ کے ارکان نے بھی دولتانہ کے حق میں ووٹ دیئے۔

دستور ساز اسمبلی میں اسلامی نظام کے علمبرداروں اور سیکولر نظام کے حامیوں کے مابین زکوٰۃ کی وصولی کی قرارداد پر اختلاف

یہ غالباً پنجاب مسلم لیگ کے مختلف دھڑوں کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی کا ہی نتیجہ تھا کہ لیاقت علی خان کے اس اعلان اور اس پر نوائے وقت کے اس تبصرہ کے باوجود مُلّاؤں کے محاذ

پر بدستور سکوت طاری رہا۔ البتہ جب چند دن بعد 14 /دسمبر کو دستور ساز اسمبلی کے سرمائی اجلاس میں گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے جو افتتاحی تقریر کی وہ قائداعظم جناح کی 11 /اگست 1947ء کی افتتاحی تقریر سے بالکل مختلف تھی۔ قائداعظم جناح نے پاکستانی قومیت کو مذہب و ملت سے بالاتر قرار دیا تھا مگر خواجہ ناظم الدین نے پاکستان کو صرف مسلمانوں کا ہوم لینڈ قرار دیا اور پھر اسمبلی کے نئے صدر مولوی تمیز الدین نے اپنی تقریر میں ایوان کی توجہ اس مطالبہ کی طرف مبذول کرائی کہ پاکستان کا آئین اسلام کے بنیادی اصولوں کی بنیاد پر مرتب ہونا چاہیے۔ 16 /دسمبر کو اسمبلی کی کانگرس پارٹی کے سیکرٹری پروفیسر راجکمار چکرورتی نے گورنر جنرل کی تقریر پر مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''پاکستان صرف مسلمانوں کا ہی ہوم لینڈ نہیں ہے۔ یہاں اقلیتیں بھی آباد ہیں اور وہ بھی اس ملک کو اپنا وطن تصور کرتی ہیں۔ قائداعظم نے اپنی کسی تقریر میں ایسی بات کبھی نہیں کہی تھی۔'' پروفیسر چکرورتی کے اس بیان کا ارباب اقتدار کی طرف سے کوئی جواب نہ دیا گیا لیکن جب 21 /دسمبر کو اسمبلی میں چودھری نذیر احمد خان کی یہ قرارداد زیر بحث آئی کہ پاکستان میں زکوٰۃ کی وصولی کا انتظام کیا جائے اور اس مقصد کے لئے ایک الگ وزارت قائم کی جائے تو یہ تاثر ملا کہ مرکزی اسمبلی کے بیشتر مسلمان ارکان اپنے سیاسی مقصد پورے کرنے کے لئے مذہب کی آڑ لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس قرارداد کی آٹھ مسلمان ارکان نے تائید کی جن میں مولانا اکرم خان، ایم۔ ایچ۔ گزدر، ڈاکٹر آئی۔ ایچ قریشی اور سردار شوکت حیات خان بھی شامل تھے۔ تاہم وزیر خزانہ غلام محمد نے اس قرارداد کی مخالفت کی۔ اس نے قرآن مجید کے انگریزی ترجمے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ''زکوٰۃ مسلمانوں پر ایک قسم کا ٹیکس ہے چنانچہ اگر زکوٰۃ کی فراہمی کا کام کسی سرکاری مشینری کے سپرد کیا گیا تو یہ موجودہ ٹیکسوں پر اثر انداز ہوگا۔'' اس نے موجودہ زمانے کا 1300 سال پہلے کے زمانے سے موازنہ کرتے ہوئے کہا کہ ''موجودہ اقتصادی حالات کے پیش نظر بھاری ٹیکسوں کے جواز میں دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ اگر مسلمان زکوٰۃ دینے لگیں تو وہ ٹیکسوں میں کمی کا مطالبہ کر دیں۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ زکوٰۃ ادا نہ کی جائے۔ ہاں یہ ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ چونکہ زکوٰۃ محض خیرات کے کاموں میں خرچ کی جا سکتی ہے اس لئے اس کے عوض میں ٹیکسوں میں تخفیف کا مطالبہ پیش نہ کیا جائے۔''[24] غلام محمد کی اس تقریر سے یہ ظاہر تھا کہ وہ اپنے اس نظریے پر قائم تھا کہ پاکستان میں ایک ایسا سیکولر بورژوا

نظام حکومت رائج ہونا چاہیے جس میں مُلاّئیت کا عمل دخل نہ ہو۔ اسے معلوم تھا کہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے جون 1948ء سے ایک مذہبی امور کی وزارت کے قیام کا منظوبہ تیار کر رکھا تھا اور نوائے وقت اسے وزیر کا رتبہ دے کر شیخ الاسلام بنانے کے حق میں تھا۔

لیاقت علی نے کشمیر پر جنگ بندی قبول کر لی تو حالات کا پانسہ پھر مولویوں کے حق میں پلٹ گیا......اس نے مکہ، مدینہ اور قاہرہ کے مولویوں اور سعودی عرب کے فرمانرواسے جہاد کشمیر کے حق میں فتاویٰ لے رکھے تھے

غلام محمد کی مذکورہ تقریر سے جدیدیت پسند عناصر کی کچھ قدرے حوصلہ افزائی ہوئی مگر چند دن بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے حالات کا پانسہ پھر مُلاّئیت کے حق میں پلٹ دیا۔ واقعہ یہ تھا کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے پاکستان کے انگریز کمانڈر انچیف جنرل گریسی کے مشورے کے مطابق کشمیر میں جنگ بندی پر یکا یک رضامندی ظاہر کر دی۔ چنانچہ یکم جنوری 1949ء کو کراچی اور دہلی سے بیک وقت اعلان ہو گیا کہ آج رات کو بارہ بج کر پانچ منٹ پر فریقین کی طرف سے لڑائی بند کر دی جائے گی۔ لیاقت علی خان کے اس فیصلے سے نہ صرف پنجاب کے درمیانہ طبقہ میں سخت غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی بلکہ پنجابی فوج میں بد دلی اور بے چینی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اس فوج نے کشمیر کی لڑائی میں چند دن قبل بیری پتن کے پل پر گولہ باری کر کے پہلی مرتبہ کامیاب جارحانہ کاروائی کی تھی۔ پنجاب کے مُلاّؤں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے میں کوئی دیر نہ کی اور انہوں نے شرعی نظام کا پرچم اٹھا کر ان ارباب اقتدار پر یلغار کر دی جو یا تو اسلام کی بورژوا نقطہ نگاہ سے ترقی پسندانہ تعبیر کرتے تھے یا پھر کھلم کھلا سیکولر نظام حکومت کی علمبرداری کرتے تھے۔

مُلاّؤں کی اس دوسری یلغار کا پس منظر یہ تھا کہ اکتوبر 1947ء سے نوائے وقت اور دوسرے سرکاری و نیم سرکاری ذرائع ابلاغ مسلسل یہ پروپیگنڈا کرتے رہے تھے کہ کشمیر کی لڑائی کشمیری مسلمانوں کے علاوہ مسلمانان پاکستان کے لئے بھی جہاد ہے۔ اس جہاد کے فیصلہ سے نہ صرف کشمیری مسلمانوں کی تقدیر وابستہ ہے بلکہ اس پر پاکستان کے مستقبل کا بھی انحصار ہے اور اگر خدانخواستہ پاکستان کا وجود نہ رہا تو سارا عالم اسلام تباہ و برباد ہو جائے گا کیونکہ ہندوستانی دشمن

صرف پشاور تک پہنچ کر ہی نہیں رک جائے گا۔ مئی 1948ء میں جب امیر جماعت اسلامی مُلاّ مودودی نے اپنی یہ ''شرعی رائے'' ظاہر کی تھی کہ کشمیر کی لڑائی مسلمانان پاکستان کے لئے جہاد نہیں ہے تو ان ذرائع ابلاغ نے اس کو اور اس کی جماعت کو اسلام اور پاکستان کے غدار ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا اور یہ ثابت کرنے کی بھی کوشش کی تھی کہ مُلاّ مودودی نے پاکستان کی حکومت کو کافرانہ حکومت اور مروجہ آئین وقوانین کو غیر اسلامی قرار دینے کی جو مہم شروع کی ہے اس کا مقصد دراصل مذہب کی آڑ لے کر پاکستان کی بیخ کنی کرنا ہے۔ چنانچہ جب اکتوبر 1948ء کے اوائل میں مُلاّ مودودی اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاریاں عمل میں آئی تھیں تو پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے بیشتر محب الوطن عناصر نے اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ حکومت کی ترغیب پر ان ذرائع ابلاغ نے نہ صرف بہت سے مقامی حکومت نواز مُلاّؤں کے مودودی کے خلاف فتووں کی خوب تشہیر کی تھی بلکہ انہوں نے ان فتووں کا بھی بہت چرچا کیا تھا جو مکہ و مدینہ سے خاص طور پر منگوائے گئے تھے۔ چنانچہ 31 را کتوبر کو مدینہ منورہ سے یہ خبر بھیجی گئی تھی کہ ''انجمن مسلمانان عالم پاکستان کا ایک وفد شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی مدظلہ کی طرف سے کشمیر اور پاکستان کے سلسلہ میں دو فتوے علمائے اسلام کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے لایا تھا۔ یہ وفد ہر دو فتووں کی تصدیق کے لئے علمائے حرم، علمائے جامعہ ازہر (مصر)، شام، حضرموت، کردستان اور ایران سے ملا۔ تمام علما کا ایک اجلاس مدرسہ سعودیہ میں حضرت شیخ حسن دین مدظلہ، الامین العام (یعنی جنرل سیکرٹری) انجمن اخوان المسلمین کی صدارت میں ہوا اور اس میں تمام علمائے اسلام نے ہر دو فتاویٰ کی تصدیق فرمائی۔ یعنی دنیا کے علما نے جنگ کشمیر کو شرعی جہاد قرار دیا اور افغانستان، ایران اور پاکستان پر بالخصوص اور دیگر تمام عالم اسلام پر بالعموم اس میں شرکت لازمی قرار دی۔ دوسرے فتوے میں پاکستان کی مدد ہر مسلمان پر لازم قرار دی اور قرار دیا کہ جو پاکستان کی اسلامی سلطنت کو نقصان پہنچاتا ہے وہ کافر ہے اور ایسا فعل حرام ہے۔''[25]

18 ردسمبر 1948ء کو یہ خبر پہنچی کہ مکہ مکرمہ کے علمائے کرام نے فتویٰ جاری کیا تھا کہ کشمیر کی موجودہ جنگ جہاد کا درجہ رکھتی ہے۔ اب مسجد نبوی کے تمام علما اور مدینہ منورہ کے دوسرے علمانے بھی اس فتویٰ پر دستخط کر دیئے ہیں۔ فتویٰ کے الفاظ یہ ہیں ''تمام مسلمانوں کا بالعموم اور پاکستان، افغانستان، قبائلی علاقوں اور ایران کے مسلمانوں کا بالخصوص یہ فرض ہے کہ وہ کشمیر کی

جنگ آزادی میں حصہ لیں۔"[26] اور پھر 20دسمبر کو یہ خبر شائع ہوئی کہ "انجمن مسلمانان عالم پاکستان کا جو وفد حضرت مولانا ثناءاللہ صاحب کی زیر قیادت حجاز اور عرب کے دورے کے لئے گیا تھا۔اس کے ہاتھ جلالتہ الملک عبدالعزیز ابن سعود والئی حجاز و عرب نے اسلامیان پاکستان کے نام جو پیغام روانہ کیا ہے اس کا متن درج ذیل ہے:

1۔ پاکستان کے خلاف، پاکستان کی حکومت کے خلاف اور پاکستان کے نظام حکومت کے خلاف خواہ کیسا ہی پروپیگنڈا کیا جائے لیکن میرا ایمان ہے کہ وہ ایک اسلامی سلطنت ہے۔ اس کے خلاف کوئی کام کرنا، اس کی حکومت کو کمزور کرنا، نقصان پہنچانا، پروپیگنڈا کرنا اسلام کے صریح خلاف ہے اور میں اس کو حرام سمجھتا ہوں۔

2۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ جس کی عنان حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو خواہ وہ مسلمان کیسے ہی ہوں اور خواہ ان کے ساتھ دوسری کتنی ہی قومیں آباد ہوں اس کو اسلامی سلطنت سمجھتا ہوں اور جس ملک کی عنان حکومت کفار اور مشرکوں کے ہاتھ میں ہو خواہ وہاں مسلمان کتنی ہی بڑی تعداد میں ہوں میں اس کو ایک مشرک سلطنت سمجھتا ہوں۔

3۔ کشمیر کے مسئلہ میں جو رویہ پاکستان نے اختیار کیا ہے وہ بالکل حق وصدارت پر مبنی ہے اس لئے میری اور میری حکومت کی تمام ہمدردیاں اور تائید پاکستان کے ساتھ ہے۔اور پاکستان جب کبھی اور جیسی مدد مجھ سے چاہے گا میں اور میری حکومت بفضل تعالیٰ پیش کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔ہم اسے اپنا اسلامی فرض سمجھتے ہیں اور میں ہمیشہ مجاہدین کشمیر کی فتح کیلئے دعا کرتا رہتا ہوں۔

4۔ میری نظر میں پاکستان اور میری مملکت میں کوئی فرق نہیں۔ میں اپنے آپ کو پاکستان کا ایسا خادم سمجھتا ہوں جیسا کہ اپنے ملک کا اور دونوں کی بہتری و بہبود کے لئے کام کرنا اسلامی فرض سمجھتا ہوں۔"[27]

21دسمبر کو کراچی سے خبر یہ تھی کہ "پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز کانفرس نے بھاری اکثریت سے ایک قرارداد منظور کی ہے جس میں کانفرنس کے تمام ارکان کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ پاکستان کے استحکام کو نقصان پہنچانے والے کسی نظریہ کی تشہیر نہ کریں خواہ یہ نظریہ مذہب کے نام پر ہی کیوں نہ پیش کیا گیا ہو۔"[28] مدیر نوائے وقت حمید نظامی کی اس کانفرنس کے آخری اجلاس

میں تقریر یہ تھی کہ "اسلام میں مذہب وسیاست دومختلف چیزیں نہیں ہیں۔ پاکستان کا آئندہ آئین اسلامی اصولوں پر مرتب ہونا چاہیے۔...... میں اسلام کے لئے استحکام پاکستان کا خواہاں ہوں۔ لہٰذا مدیران جرائد سے میری اپیل یہ ہے کہ وہ اس امر کی ہرگز اجازت نہ دیں کہ کوئی شخص اسلام کی آڑ لے کر مملکت کی بنیادوں کو کمزور کرے۔"[29]

24 رد سمبر کو انجمن مسلمانان عالم کے وفد کے قائد ثنا اللہ نے لاہور میں ایک پریس کانفرنس کو وہ فتاویٰ دکھلائے جن میں عرب اور مشرق وسطیٰ کے 24 مقتدر علما و مشائخ نے کشمیر کی جنگ آزادی کو اسلامی جہاد قرار دیا تھا اور فتویٰ دیا تھا کہ کشمیر کی امداد مسلمانان پاکستان، افغانستان، سرحدات آزاد اور ایران پر فرض عین ہے اور باقی مسلمانان عالم پر فرض کفایہ، علاوہ ازیں ان تمام علما کا فتویٰ یہ تھا کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے، اس کی امداد ہر مسلمان پر فرض ہے اور اس کو کسی قسم کا نقصان پہنچانا یا اس کے خلاف کوئی تخریبی کاروائی کرنا یا اس کے دشمنوں کی مدد کرنا از روئے شریعت حرام ہے۔" اس خبر کے حوالے سے نوائے وقت نے لکھا کہ "نوائے وقت کی رائے میں یہ فتویٰ اس لحاظ سے انتہائی اہمیت رکھتا ہے کہ اس سے قبل صرف 1914ء میں پہلی جنگ عظیم کے موقع پر تمام عالم اسلام کے علما نے ترکی کی امداد وحمایت کے حق میں فتویٰ دیا تھا اور اسے جہاد قرار دے کر اس میں تمام مسلمانان عالم کی شرکت کو فرض عین قرار دیا تھا۔"[30]

27 رد سمبر کو افغانستان کے حضرت المشائخ مُلّا شور بازار نے لاہور میں نمائندہ نوائے وقت کو ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ "جنگ کشمیر اسلامی جہاد ہے۔ اس جہاد میں شرکت کرنا کشمیر کے متصل اسلامی ممالک کے مسلمانوں کے لئے فرض عین ہے اور باقی مسلمانان عالم کے لئے فرض کفایہ ہے۔"[31]

لیکن اس کے دو تین دن بعد یکم جنوری 1949ء کو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے کشمیر میں جنگ بندی کی تجویز منظور کر کے اس بارے میں پروپیگنڈے کے غبارے میں سے ہوا نکال دی۔ پنجاب کے درمیانہ طبقہ نے اس فیصلہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اس فیصلے سے نہ صرف کشمیری مسلمانوں، پاکستان، نہ صرف مسلمانان پنجاب، نہ صرف عالم اسلام بلکہ خود اسلام سے بھی غداری کی ہے۔ اس درمیانہ طبقہ نے جنگ کشمیر کے حق میں کس قدر مذہبی جنون پیدا کیا ہوا تھا۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ حکومت آزاد کشمیر کا صدر سردار محمد

ابراہیم خان بارایٹ لاء ایک ڈوگرہ قیدی کے بیان کا حوالہ دے کر یہ کہتا تھا کہ ''مجاہدین کے ساتھ نیلے لباس میں ملبوس گھوڑوں پر سوار فوج بھی لڑتی ہوئی دیکھی گئی تھی۔'' اس کا مزید کہنا یہ تھا کہ ''مجاہدین کشمیر کا تو اعتقاد یہ ہے کہ مجاہدین میں سے جو شہید ہو چکے ہیں وہ بھی اکثر مقامات پر مجاہدین کے دوش بدوش لڑتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ مسلمان جب اللہ کے نام پر تلوار اٹھاتا ہے تو سو طاقتیں اس کے ساتھ ہوتی ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی مسلمان نے اللہ کے نام پر تلوار اٹھائی فتح پائی۔''[32] لیکن اب لیاقت علی خان نے اس فتح کی امید کو غارت کر دیا تھا۔

ایک بار پھر شرعی نظام کے نفاذ کے نام پر پنجاب کے مُلّاؤں کی بھرپور یلغار......نوائے وقت نے اسے ممدوٹ وزارت کے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کی

پنجاب کے اقتدار پرست علما، بالخصوص وہ علما جنہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی اسی موقع کے منتظر تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے لبادوں کے نیچے سے پھر شرعی نظام کی تلواریں نکالیں اور جو سامنے آیا اس کو گھائل کرنا شروع کر دیا۔ جگہ جگہ مُلّاؤں کے جلسے ہونے لگے اور پھر یہ مطالبہ شروع ہو گیا کہ شرعی قوانین کا فی الفور نفاذ کیا جائے۔ 5رجنوری کو جہانیاں سے خبر آئی کہ اس مضمون کی ایک قرارداد مقامی مسلم لیگ کے ایک جلسے میں منظور کی گئی ہے۔ 8رجنوری کی ایک اطلاع کے مطابق چیچہ وطنی میں جمعیت العلمائے پاکستان کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں اسلام کے وقار اور عظمت میں اضافہ کرنے کے لئے ہر ممکن قربانی کا عہد کیا گیا اور شجاع آباد کے ایک جلسہ میں پاکستان دستور ساز اسمبلی سے مطالبہ کیا گیا کہ پاکستان کی خودمختاری کے تحفظ کے لئے یہاں شرعی قانون نافذ ہوگا۔ اس سے ایک دن قبل پشاور کے ایک جلسہ میں بھی اسی قسم کا مطالبہ کیا گیا تھا اور مُلّا شور بازار کا مسلمانان پاکستان کو مشورہ یہ تھا کہ وہ متحد و متفق رہیں اور قرآن حکیم کی تعلیمات اور اسوہ رسول کریم ﷺ کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں۔ 10رجنوری کو لاہور میں چودھری محمد حسن ایم۔ ایل۔ اے۔ کی صدارت میں صوبہ مہاجر کانفرنس ہوئی جس میں پہلے تو ایک قرارداد کے ذریعے متروکہ جائیدادوں کی الاٹمنٹوں کے سلسلے میں دوست نوازی، کنبہ پروری اور جانب داری کی مذمت کی گئی اور پھر ایک اور قرارداد میں یہ رائے ظاہر کی گئی کہ

''خالص اسلامی نظام حکومت ہی استحکام پاکستان کا باعث ہوسکتا ہے اور صرف قوانین شریعت ہی بقائے انسانیت کے ضامن ہیں۔''

11 رجنوری کے پاکستان ٹائمز میں اور 12 رجنوری کے امروز میں دو مراسلہ نگاروں نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ جو لوگ ملک میں اللہ کی حاکمیت یا اسلامی نظام حکومت کا مطالبہ کر رہے ہیں انہوں نے ابھی تک اپنے اس مطالبہ کی قابل فہم تعبیر نہیں کی جو لوگ اللہ کے قانون اور اللہ کی حاکمیت کی باتیں کرتے ہیں وہ یہ نہیں بتاتے کہ اگر ان کے مطالبہ کو پورا کر دیا جائے تو عنان اقتدار تو پھر بھی اللہ کے نام پر انسانوں ہی کے ہاتھ میں ہوگی۔ کیا پیر، مُلّا اور امام صلاحیت اور اخلاق کے اعتبار سے موجودہ۔ اینگلو انڈین ارباب اقتدار سے بہتر ہوں گے...... چند مہینے پہلے مولانا شبیر احمد عثمانی نے نجی طور پر کراچی میں کچھ اہل الرائے لوگ بلائے اور 18 دن تک آپس میں بحث وتمحیص ہوتی رہی مگر اسلامی دستور کے متعلق فیصلہ نہ ہونا تھا نہ ہوا۔'' لیکن چھوٹے بڑے پنجابی مُلاّؤں کو ایسی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کا مطالبہ ایک ہی تھا کہ اللہ کی حاکمیت قائم کی جائے اور قرآنی قانون نافذ کیا جائے۔ 14 رجنوری کو ضلع ملتان کے مخدوم پور پھوڑان میں بہ اتفاق رائے یہ قرارداد منظور کی گئی کہ ''مسلمانان مخدوم پور پھوڑان کا یہ اجتماع پاکستان دستور ساز اسمبلی سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم کرنے کا اعلان کیا جائے۔ یہ اجتماع ارکان دستور ساز اسمبلی پر واضح کر دینا چاہتا ہے کہ اگر اسلامی دستور کی بجائے کوئی ملا جلا دستور حکومت تجویز کیا گیا تو مسلمانان مخدوم پور کے لئے ہرگز قابل قبول نہیں ہوگا۔''

جب احراری مولویوں نے صوبہ کی فضا مُلاّ ئیت کے فروغ کے لئے ایک مرتبہ پھر اتنی سازگار دیکھی تو ان سے خاموش نہ رہا گیا۔ انہوں نے پہلے تو غداری کے الزام سے بچنے کے لئے 12 رجنوری کو لاہور میں ایک دفاع پاکستان کانفرنس منعقد کی اور پھر 15 رجنوری کو ان کی مجلس عاملہ نے ایک قرارداد کے ذریعے یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ مجلس احرار سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے گی۔ عاملہ نے اپنے کارکنوں کو جو سیاست میں دلچسپی رکھتے تھے یہ مشورہ دیا کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں اور اپنے رضا کاروں کو مشورہ دیا کہ وہ مسلم لیگ نیشنل گارڈز، نیشنل گارڈز اور قومی رضا کاروں میں شامل ہو جائیں کیونکہ مجلس احرار اب اپنی سرگرمیاں تبلیغی اور مذہبی میدان میں ہی مرکوز رکھے گی۔''[33]

نوائے وقت نے مجلس احرار کے اس فیصلے کا صدق دل سے خیر مقدم کیا اور لکھا کہ
''مجلس احرار مسلمانوں کی ایک پرانی اور فعال جماعت ہے۔ اس جماعت سے ایک نہایت اہم سیاسی غلطی ہوئی جس نے مسلمانوں کو اس سے دور کر دیا۔ لیکن اس جماعت کے کارکنوں کی ہمت اور کام کرنے کی صلاحیت سے کبھی کسی کو انکار نہیں ہوا۔ اب جبکہ مجلس احرار نے اپنی سیاسی حیثیت کو ختم کر دینے کا اعلان کیا ہے، مسلم لیگ کے پرانے کارکنوں کو بڑی کشادہ دلی کے ساتھ احراری بھائیوں کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ جب مجلس احرار ہی نے اپنے ماضی کو دفن کر دینے کا فیصلہ کر دیا ہے تو مسلم لیگ کو بھی ماضی کی تلخ یاد بھلا دینی چاہیے۔ مجلس احرار کے کارکن فعال اور محنتی لوگ ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ مسلم لیگ میں ان کی شرکت لیگ کو ایک نیا اور تازہ خون بخشے گی۔ لیگ کے غریب اور عوامی کارکنوں کو خاص طور پر احرار کے اس فیصلے پر خوشی ہونی چاہیے۔ مسلم لیگ میں احرار کی شرکت غریب طبقہ کے ہاتھ مضبوط کرے گی اور اس خطرہ کا، کہ کہیں لیگ جاگیرداروں، لینڈ لارڈوں، انگریز کے پرانے کاسہ لیسوں اور سابق یونینسٹوں کے قبضہ میں نہ چلی جائے اور حصول اقتدار کے لئے ایک مشین بن کر نہ رہ جائے، کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا جائے گا۔''[34]

احرایوں کی مجلس عاملہ کا یہ فیصلہ سراسر منافقت اور مکاری پر مبنی تھا۔ انہوں نے یہ فیصلہ اپنے اس بنیادی موقف کے باوجود کیا تھا کہ اسلام میں مذہب اور سیاست دو مختلف چیزیں نہیں ہیں اور اس کا مقصد محض یہ تھا کہ آئندہ غداری کے الزام سے بچ بچا کر مذہبی تبلیغ کی آڑ میں سیاست بازی کی جائے۔ اس طرح نوائے وقت کا یہ خیر مقدمی اداریہ بھی سراسر منافقت اور مکاری پر مبنی تھا۔ احراریوں کی طرح مدیر نوائے وقت بھی مذہب اور سیاست کو دو مختلف چیزیں قرار نہیں دیتا تھا۔ لیکن اب اس نے احراریوں کی سیاست کو مذہب سے الگ کر دیا تھا۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ احرایوں کا سیاسی طور پر مسلم لیگ کے اندر ممدوٹ دھڑے کے ساتھ گٹھ جوڑ ہو جائے جو اس کے دعوے کے مطابق غریب اور عوامی کارکنوں پر مشتمل تھا۔ ممدوٹ دھڑے کی محاذ آرائی دولتانہ دھڑے کے ساتھ تھی جو بقول نوائے وقت جاگیرداروں، لینڈ لارڈوں، انگریز کے پرانے کاسہ لیسوں اور سابق یونینسٹوں پر مشتمل تھا اور جسے وزیر اعظم لیاقت علی خان کے علاوہ گورنر پنجاب سر فرانسس موڈی (Francis Moody) کی بھی پشت پناہی حاصل تھی۔ دولتانہ دھڑے کا نومبر 1948ء سے صوبائی مسلم لیگ پر قبضہ تھا اور اب اس نے نواب ممدوٹ کو وزارت اعلیٰ کی

گدی سے اتارنے کے لئے عدم اعتماد کی تحریک کا نوٹس دے رکھا تھا۔ چونکہ آثار یہ تھے کہ اب نواب ممدوٹ کا اقتدار زیادہ دیر تک نہیں رہے گا اس لئے نوائے وقت کی خواہش یہ تھی کہ اگر اس کے ممدوح کی جگہ دولتانہ کی وزارت قائم ہوئی تو اس کے لئے احراریوں کی جانب سے نظم و نسق کا ایسا ہی مسئلہ پیدا کیا جائے گا جیسا کہ دولتانہ نے ممدوٹ وزارت کے لئے جنوری 1948ء کے بعد کئی ماہ تک مختلف النوع مُلّاؤں کی امداد سے پیدا کیا تھا۔ گویا اس نقطہ نگاہ سے نہ تو احراریوں کے لئے اور نہ ہی نوائے وقت کے لئے مذہب اور سیاست دو مختلف چیزیں تھیں۔ دونوں ہی مذہب کی آڑ لے کر اپنے مخصوص سیاسی مقاصد پورے کرنا چاہتے تھے۔

ممدوٹ وزارت کی برطرفی ...... پنجابی۔ تلئیر تضاد میں شدت، پنجابی شاونزم اور مُلّائیت کے مابین گٹھ جوڑ کی بنیاد

پنجاب میں اس قسم کی سیاسی معرکہ آرائی کے لئے میدان 24 رجنوری 1949ء کو بالکل تیار ہو گیا جبکہ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اپنے لاہور میں قیام کے دوران پنجاب اسمبلی کو توڑ دیا اور صوبہ میں گورنری راج نافذ کر دیا۔ پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے نکتہ نگاہ سے یکم جنوری 1949ء کو کشمیر میں جنگ بندی کے بعد یہ لیاقت علی خان کی دوسری بڑی غلطی تھی جو کسی صورت قابل معافی نہیں تھی۔ لیاقت علی خان کے اس اقدام کا مطلب یہ سمجھا گیا تھا کہ اس نے پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے خلاف اس صوبہ کے جاگیرداروں، لینڈ لارڈوں، انگریز کے پرانے کاسہ لیسوں اور سابق یونینسٹوں سے گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔ دراصل پنجاب کے درمیانہ طبقہ کو اس حیثیت کا نومبر، دسمبر 1948ء میں ہی پتہ چل گیا تھا جبکہ ممتاز دولتانہ نے صوبہ مسلم لیگ کا صدارتی انتخاب جیتا تھا اور پھر اس کے فوراً بعد ہی اس نے نواب ممدوٹ کی وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کا نوٹس دلوا دیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد نوائے وقت (یکم جنوری 1949ء) میں تلئیروں☆ کے ہاتھوں ''پنجاب کی تذلیل'' کے موضوع پر کارفرمائی شروع ہو گئی تھی اور اب 24 رجنوری کو اس واقعہ کے بعد صاف دکھائی دینے لگا تھا کہ آئندہ پنجاب میں لیاقت علی خان کے خلاف پنجابی شونزم اور مُلّائیت کا گٹھ جوڑ ہوگا۔ اس مُلّائیت کے ساتھ جو کچھ عرصہ قبل تک مدیر نوائے وقت کی رائے میں

☆ اس زمانے میں پنجابیوں کی طرف سے مہاجروں کے لئے تلئیر کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔

پاکستان کی بیخ کنی کر رہی تھی۔ اس گٹھ جوڑ کے لئے مشترکہ بنیادیں پہلے ہی سے موجود تھیں۔ ایک بنیاد یہ تھی کہ لیاقت علی خان پاکستان میں ''تلبیز راج'' قائم کرنے کا عزم رکھتا تھا اور دوسری بنیاد یہ تھی کہ لیاقت علی خان اسلام کی تعبیر بورژوا نقطہ نگاہ سے کرتا تھا یعنی وہ چاہتا تھا کہ پاکستان میں نظام حکومت عملی طور پر تو مغرب کی جدید طرز کا ہو لیکن اس پر نظریاتی غلاف اسلام کی قدیم طرز کا چڑھا ہوا ہو اور یہ بات قدامت پرست مُلّاؤں کے لئے ہرگز قابل قبول نہیں تھی۔

لیاقت علی اسلام کی جدید تعبیر کرتا تھا جو خلافتی مُلّاؤں کو قابل قبول نہیں تھی......مغربی پاکستان میں مُلّائیت کی نئی لہر

لیاقت علی خان نے پنجاب میں گورنری راج قائم کرنے کے فیصلے کے اعلان سے دو دن قبل 22 رجنوری کو پنجاب یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد میں جو تقریر کی تھی اس میں یہ نہیں کہا تھا کہ پاکستان مُلّاؤں کے تصور کا شرعی نظام قائم کرنے کے لئے قائم کیا گیا تھا بلکہ اس نے کہا تھا کہ پاکستان اس لئے وجود میں آیا تھا کہ ہم ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے جس کی بنیاد انصاف، مساوات اور انسانی اخوت کی بنیاد پر ہو۔ بالفاظ دیگر ہم ایک ایسا معاشرہ چاہتے تھے کہ جس میں اندرونی تضادات نہ ہوں جس میں انسان کو اپنی محنت کا پورا پھل ملے اور جس میں دوسروں کی محنت کی پیداوار پر زندہ رہنے والے مفت خورے نہ ہوں۔ ایسے مفت خورے اللہ اور انسان دونوں ہی کی نظروں میں قابل قبول نہیں ہیں۔ اسلامی نظام زندگی کیا ہے؟ یہ ایک ایسا نظام زندگی ہے جو ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی ذات میں غیر مشروط اعتقاد پر انحصار کرتا ہے اور دوسری طرف یہ تسلیم کرتا ہے کہ انصاف اور مساوات معاشرتی زندگی کی بنیاد ہیں۔ انسانی معاملات، علم ودانش اور دلائل کے ذریعے طے ہونے چاہئیں۔ اور روحانی ترقی کے لئے عمدہ کردار ضروری ہے۔''[35] پھر 24 رفروری کو اس نے یونیورسٹی ہال میں عورتوں کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے اس موقف کی حمایت کی کہ پاکستان میں عورتوں کے لئے ہر شعبہ زندگی میں مکمل آزادی ہونی چاہیے۔ اس نے اقلیتوں کو مساوی حقوق دینے کے اصول کو بھی تسلیم کیا اور کہا کہ ''پاکستان صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ ان سب کے لئے ہے جو اس میں آباد ہیں۔ یہاں غیر مسلموں کو وہی مراعات ملنی چاہئیں جو مسلمانوں کو حاصل ہیں۔''[36]

لیاقت علی خان کی یہ دونوں تقریریں خلافتی مُلّاؤں کے تصور کے نظام زندگی کے سراسر

منافی تھیں۔ لیاقت پاکستانی معاشرے کی تعمیر اس ملک میں بلالحاظ مذہب وملت سارے انسانوں کے درمیان انصاف، مساوات اور اخوت کے رشتوں پر کرنے کی بات کرتا تھا۔ وہ اقلیتوں کو مساوی حقوق دینے کے حق میں تھا اور عورتوں کو ہر شعبہ زندگی میں مکمل آزادی دینے کی وکالت کرتا تھا۔ مگر اس کے برعکس شبیر احمد عثمانی اور ابوالاعلیٰ مودودی سمیت سارے قدامت پسند علما و مشائخ غیر مسلموں کو مساوی حقوق دینے پر آمادہ نہیں تھے اور وہ ہندوؤں کو پالیسی ساز اداروں میں شامل کرنے کے خلاف تھے۔ انہیں کلیدی مناصب بھی دینا نہیں چاہتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ ان سے جزیہ وصول کر کے انہیں ان کے جان و مال اور عزت وآبرو کی حفاظت کی ضمانت دی جائے۔ وہ عورتوں کو بھی مکمل آزادی دینے کے حق میں نہیں تھے اور کہتے تھے کہ عورتوں کو پردے میں رہ کر محض گھریلو ذمہ داریاں پوری کرنی چاہئیں۔

پاکستان میں نظام زندگی یا نظام حکومت کے بارے میں لیاقت علی خان کے اس نظریے کی وضاحت دو تین دن قبل پاکستان دستور ساز اسمبلی کا صدر مولوی تمیز الدین بھی کر چکا تھا۔ اس کی 29 رجنوری 1949ء کو ڈھاکہ میں تقریر یہ تھی کہ ''پاکستان کی اقلیتوں کو ایسی باتوں سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے کہ پاکستان کا آئین اسلام کی بنیاد پر مرتب ہوگا۔ انہیں یقین رکھنا چاہیے کہ آئین کو خواہ کوئی بھی نام دیا جائے اس کی بنیاد مساوات واخوت اور معاشرتی انصاف پر ہی ہوگی۔ پاکستان میں جو آئین بنے گا اس کے ماتحت انسان اور انسان کے درمیان نسل، رنگ یا مسلک کی بنیاد پر کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا۔''[37] اور پھر 24 رجنوری کو دہلی میں پاکستان کے ہائی کمشنر محمد اسماعیل کا اعلان یہ تھا کہ ''پاکستان ایک سیکولر جمہوری ریاست ہے جس نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ بلالحاظ ذات، مسلک یا مذہب سارے شہریوں سے منصفانہ سلوک کرے گی۔'' اس نے مزید کہا کہ ''سیکولر جمہوریت کا مطلب یہ ہے کہ اس میں سب کو مساویانہ مواقع اور انصاف ملے گا۔ پاکستان مذہب کی بنیاد پر کسی امتیاز کو تسلیم نہیں کرتا۔ جب کبھی پاکستان میں شرعی قانون کی بات ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کا اطلاق صرف مسلمانوں پر ہوگا۔ وہاں کبھی کسی نے غیر مسلموں پر شریعت کے نفاذ کا خواب نہیں دیکھا۔ یہ بات ہولناک ہوگی۔''[38] چونکہ پاکستانی ہائی کمشنر کا پاکستان کے نظام حکومت کے بارے میں یہ اعلان وزیر اعظم لیاقت علی خان کی پالیسی یا نظریے کے منافی نہیں ہوسکتا تھا اس لئے یہ ان مُلاّؤں کے لئے بہت اشتعال انگیز تھا

جو پاکستان میں قرونِ وسطیٰ کا خلافتی نظام نافذ کر کے غیر مسلموں کو ثانوی درجہ کے شہریوں کی حیثیت دینا چاہتے تھے اور جنہیں اس بات کی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ اگر پاکستان میں ان کے تصور کا شرعی نظام رائج ہوا تو ہندوستان میں رام راج کے تحت ساڑھے تین کروڑ مسلمانوں سے شودروں کا سا سلوک ہوگا۔

جمعیت العلمائے اسلام کے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کو پاکستان دستور ساز اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے اس قسم کے کم علم، کم نظر اور کم سواد مُلاّؤں کے سربراہ کی حیثیت حاصل تھی۔ وہ 3 رجنوری 1949ء کو دستور ساز اسمبلی میں اس مضمون کی قرارداد پیش کرنا چاہتا تھا کہ ''حکومت پاکستان مستند علما کی ایک کمیٹی مقرر کرے جو پاکستان کے لئے اسلامی دستور بنانے کے سلسلے میں اپنی سفارشات پیش کرے گی۔''[39] مگر یہ قرارداد محض اس لئے پیش نہ ہو سکی کہ اسی دن وزیر اعظم لیاقت علی خان نے وزراء کی نااہلی کا قانون (پروڈا) اسمبلی میں پیش کر دیا تھا اور پھر اس قانون کی منظوری کے بعد 6 رجنوری کو اسمبلی کا اجلاس غیر معین عرصے کے لئے ملتوی ہو گیا تھا۔ ان دنوں صوبہ سندھ کی حکومت کا سربراہ پیر الٰہی بخش تھا جو محض اپنی سیاسی موقع پرستی کی وجہ سے نظریاتی طور پر شبیر احمد عثمانی سے بھی دو قدم آگے تھا۔ چنانچہ اس کی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے کئی جاگیردار ارکان بھی صوبہ میں جرائم کے انسداد کے لئے شرعی قوانین کے نفاذ کے حق میں تھے۔ ان جاگیردار ارکان اسمبلی میں ایک شخص علی محمد مری بھی تھا۔ وہ صوبائی اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں یہ قرارداد پیش کرنا چاہتا تھا کہ ''یہ ایوان اپنی صوبائی اسمبلی سے سفارش کرے کہ وہ حکومت پاکستان کے سامنے نئے قوانین کے نفاذ یا موجودہ قوانین میں ترمیم کرنے کے لئے جلد ہی قدم اٹھانے کی تحریک پیش کرے تا کہ وہ شریعت کے قوانین کے مطابق ہو جائیں۔ خصوصاً جرائم کی جو سزا شریعت نے مقرر کی ہے اس پر عملدرآمد ہونے لگے۔ مثلاً چوری کے جرم میں مجرم کے جسم سے ایک ہاتھ کاٹ دیا جائے۔'' سندھ کا ایک سابق وزیر اعلیٰ میر بندے علی تالپور بھی اس قسم کی قرارداد پیش کرنا چاہتا تھا۔ ان دونوں قراردادوں میں فرق صرف یہ تھا کہ علی محمد مری کی قرارداد کی بنیاد مُلاّؤں کے اس مطالبہ پر تھی کہ اسلامی حکومت میں اسلامی قوانین رائج ہونے چاہئیں جبکہ بندے علی تالپور کی قرارداد محض اس موقف کی بنیاد پر تھی کہ سندھ میں ڈاکہ، قتل اور لوٹ مار کی روزانہ وارداتوں کو روکنے کا واحد علاج یہی ہے کہ یہاں شریعت کے مطابق تعزیری قوانین نافذ کئے جائیں۔[40]

7رفروری کو لائلپور (فیصل آباد) کی تقریباً ساری مساجد میں بذریعہ قرارداد یہ مطالبہ کیا گیا کہ دستور ساز اسمبلی شریعت کے نفاذ کا فوری طور پر اعلان کرے۔ صوبائی مسلم لیگ کونسل کے رکن شیخ بشیر احمد کی ایک مسجد میں تقریر یہ تھی کہ ''پاکستان نے یورپ کی تقلید کر کے بہت نقصان اٹھایا ہے۔ صرف اسلام اور اس کے اصول ہی ہمارے ملک کے مسائل حل کر سکتے ہیں اور مسلمانوں کو صراط مستقیم پر ڈال سکتے ہیں''[41] 11رفروری کو سرگودھا کی جامع مسجد اہل حدیث میں خواجہ ظہور احمد امرتسری کی زیر صدارت ایک جلسہ ہوا جس میں دستور ساز اسمبلی سے یہ کہا گیا کہ وہ ملک کا آئین اسلامی شریعت کی روشنی میں وضع کرے۔ اسی دن تل (تحصیل ملتان)، فورٹ سنڈ مین، داؤد خیل اور مغربی پاکستان کے متعدد دوسرے مقامات پر بھی جلسوں میں یہی مطالبہ کیا گیا۔ منٹگمری (ساہیوال) کی مسجد مائی والی، مسجد عیدگاہ اور مسجد غلہ منڈی کے جلسوں میں ایک مضمون کی چار نکاتی قرارداد میں دستور ساز اسمبلی سے یہ اعلان کرنے کا مطالبہ ہوا کہ ''(1) پاکستان کی بادشاہی صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ (2) پاکستان کا بنیادی قانون اسلامی شریعت ہے۔ (3) پاکستان کا دستور ہماری قومی زبان اردو میں تیار ہو گا (4) دستور ساز اسمبلی کی خالی نشستیں ایسے آدمیوں سے پر کی جائیں گی جو مذہب و سیاست سے پوری طرح واقف ہوں گے۔''[42]

مشرقی پاکستان میں بڑھتی ہوئی مہنگائی اور غذائی قلت پر قابو پانے میں ناکام حکومت نے کمیونزم کے فروغ کا خوف پیدا کر کے اسلام کا سہارا لیا..... سرکاری مُلّاؤں کا دورہ بنگال

مغربی پاکستان میں شرعی نظام کی نئی مہم اور وزیر اعظم لیاقت علی خان کے ہاتھوں پنجاب کی ''تذلیل'' پر پنجابی شاونسٹوں کی روز افزوں تلملاہٹ کے دوران مولانا شبیر احمد عثمانی ڈھاکہ میں تھا کیونکہ وہاں اسلام کے زور سے کمیونزم اور بنگالی نیشنلزم کے بڑھتے ہوئے خطرے کا سدباب ضروری تھا۔ پاکستان کے سفیر مقیم برما محمد علی بوگرا کا 28رجنوری کو کراچی میں بیان یہ تھا کہ ''اگر برما کمیونسٹ ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ برمی کمیونسٹوں کا آئندہ نشانہ پاکستان کی ہمسایہ مملکت ہی ہو۔ اگر حکومت برما کمیونسٹوں کو دبانے میں کامیاب ہو بھی جائے تب بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی کوششوں کا مرکز مشرقی پاکستان میں منتقل کر لیں۔ دونوں صورتوں میں خطرہ بدستور موجود

ہے۔''[43] یکم فروری کو گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کی شکایت یہ تھی کہ ''مشرقی بنگال میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ہمیشہ کڑھتے رہتے ہیں اور حالات کا تاریک اور مایوس کن نقشہ کھینچتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ کوئی کام کروانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہماری مشکلات اور کوتاہیوں کے بیان میں مبالغہ کریں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے آپ کو محب الوطن کہتے ہیں لیکن وہ شب و روز نجی محفلوں میں اور عوامی جلسوں میں دانستہ طور پر حکومت کی برائی کرتے رہتے ہیں۔ ان کا اعلانیہ مقصد یہ ہے کہ ملک میں انتشار برپا کر کے انقلاب برپا کیا جائے۔''[44]

2رفروری کی رپورٹ یہ تھی کہ ''ڈھاکہ میں چاول کا بھاؤ 40 روپے من تک بڑھ گیا ہے جبکہ مغربی بنگال میں چاول 25 روپے من بک رہا ہے۔''[45] 6رفروری کو ڈان کی اطلاع یہ تھی کہ مشرقی بنگال کے بعض سیاسی شر پسند عناصر زرعی شعبہ میں مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ کسانوں میں یہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ چونکہ مستقبل قریب میں زمینداری نظام ختم ہو رہا ہے اس لئے کسی زمیندار کو لگان دینے کی ضرورت نہیں۔[46] 7رفروری کو مرکزی وزیر تعلیم فضل الرحمان کی پشاور میں تجویز یہ تھی کہ ''کمیونزم کے خطرے کا اسلامی حل ہونا چاہیے۔''[47] 8رفروری کو ڈھاکہ میں گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے متنبہ کیا کہ ''اگر کمیونسٹ پارٹی جیسی سماج دشمن پارٹیوں نے مزدوروں میں گڑبڑ پھیلا کر ہماری ترقی کی سرگرمیوں کو سبوتاژ کرنے اور صنعت کو مفلوج کرنے کی کوشش کی تو حکومت اس کے خلاف لازمی طور پر مناسب اقدامات کرے گی۔''[48] اور پھر 11رفروری کو کراچی واپس پہنچ کر خواجہ ناظم الدین نے انکشاف کیا کہ ''مشرقی بنگال میں کمیونسٹ سرگرم عمل ہیں۔ وہ چاول کی مہنگائی کو اپنے پروپیگنڈا کے لئے بطور لیور استعمال کر رہے ہیں۔''[49] روزنامہ ڈان نے خواجہ ناظم الدین کے اس بیان پر ادارتی تبصرہ کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ ''حال ہی میں میمن سنگھ میں صوبائی حکومت کی فراہمی اناج کی پالیسی کے خلاف ایک پبلک جلسہ میں پولیس اور لوگوں میں جو تصادم ہوا تھا اس میں دو افراد مارے گئے تھے۔ ممکن ہے کہ اس ایجی ٹیشن میں کمیونسٹوں کا ہاتھ ہو لیکن کمیونزم کو تشدد سے نہیں دبایا جا سکتا۔ کمیونزم کے سدباب کا مؤثر طریقہ یہی ہے کہ معاشرے کو غربت، بھوک اور معاشی بے انصافیوں سے پاک کیا جائے۔ اگر محض مذہبی اپیل کی گئی اور اس کے ساتھ عوام کی بے اطمینانی دور کرنے کے لئے کوئی پختہ اقدام نہ کیا گیا تو ممکن ہے کہ اس سے کوئی زیادہ کامیابی نہ ہو۔ کیا پیغمبر اسلام نے

ایک مرتبہ یہ نہیں فرمایا تھا کہ غربت بعض اوقات انسان کو الحاد کی جانب دھکیل سکتی ہے۔''[50]

لیکن شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس حدیث نبوی سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود اپنے مشرقی بنگال کے دورے میں وہاں کی غربت، بھوک اور معاشی بے انصافی، بے روزگاری اور مہنگائی کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند نہ کی۔ وہ 31 رجنوری کو ڈھاکہ پہنچا تھا۔ اسی دن وہاں سے وہ چٹا گانگ چلا گیا۔ جہاں سے وہ 2 رفروری کو واپس آیا اور 3 رفروری کو اس نے ڈھاکہ کے ایک جلسہ عام میں تقریر کی۔ اس تقریر میں اس نے چاول کی بے مثال مہنگائی اور عوام الناس کی غربت کا کوئی ذکر نہ کیا۔ اس نے اس حقیقت کی بھی مذمت نہ کی کہ صوبہ کی صنعت، تجارت اور سرکاری سروسز میں بنگالی عوام کا کوئی حصہ نہیں ہے اور پنجابی وتلئیر اعلیٰ حکام مقامی غریب عوام سے حقارت آمیز سلوک کرتے ہیں۔ البتہ اس نے عوام الناس کو تلقین کی کہ اسلام کے اکابرین کی زندگیوں کو پیش نظر رکھ کر اپنی اصلاح کریں۔ اس نے کہا کہ ''اگر اسلامی اصولوں کو ترک کر دیا گیا تو پاکستان قائم نہیں رہے گا...... صرف اسلامی اصول ہی پاکستان کو مستحکم ریاست بنائیں گے اور دنیا پر ایک بار پھر یہ واضح ہو جائے گا کہ حکومت کا نظم ونسق کس طرح چلاتے ہیں۔'' پیر مانکی نے بھی اس جلسہ میں تقریر کی۔ اس نے کہا کہ ''جو شخص پاکستان کا دشمن ہے وہ بلاشبہ اسلام کا دشمن ہے لیکن جو شخص اسلامی آئین کے نفاذ پر زور دیتا ہے اسے فرقہ پرست نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ صحیح جمہوریت صرف وہی ہے جو اسلام نے سکھائی ہے۔'' مولانا احتشام الحق نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''اسلام میں سیاست اور مذہب دو الگ چیزیں نہیں ہیں۔ اگر مسلمانوں نے ان دونوں کو الگ کرنے کی کوشش کی تو یہ بہت نقصان رساں ثابت ہوگی۔''[51]

9 رفروری کو مولانا شبیر احمد عثمانی کی زیر صدارت مشرقی پاکستان کی جمعیت العلمائے اسلام کی دو روزہ کانفرنس ہوئی تو اس میں بھی مشرقی بنگال کے عوام الناس کے معاشی مسائل زیر بحث نہ لائے گئے۔ مولانا عثمانی نے کانفرنس کے اختتامی اجلاس میں جو خطبہ صدارت پڑھا اس میں حکومت پاکستان پر زور دیا گیا تھا کہ وہ ملک کا آئین شرعی قوانین کی بنیاد پر مرتب کرے اور انتظامی مقاصد کے لئے اسلامی اصولوں کو رائج کرے۔ اس نے کہا کہ ''پاکستان اس اصول کی بنا پر حاصل کیا گیا تھا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ اب حکومت کا فرض ہے کہ وہ پاکستان کو مستحکم کرے اور یہ کام اسلامی ریاست کے قیام کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اسلام سے شرمانے کی کوئی

ضرورت نہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ جرأت سے کام لے کر یہ اعلان کردے کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے اور ایسے اقدامات کرے کہ وہ عوام کے معاملات قرآن مجید کے احکامات کے مطابق طے کرے۔ ایسی ریاست میں اقلیتوں کو نہ صرف جانی و مالی اور عزت و آبرو کی قطعی سلامتی ملے گی بلکہ انہیں حکومت سے خصوصی تحفظ ملے گا بشرطیکہ وہ ریاست کے حقیقی معنوں میں وفادار ہوں۔ پاکستان دنیا پر یہ واضح کردے گا کہ اقلیتوں سے ایسا منصفانہ سلوک کہیں نہیں ہوتا جیسا کہ اسلامی ریاست میں ہوتا ہے۔ اگر پاکستان اسلامی اصولوں کے مطابق قائم نہ ہوا تو اس کا وجود قائم نہیں رہ سکے گا۔ اس نے کہا کہ جب کبھی جمعیت العلمائے اسلام کی طرف سے حکومت کو اس قسم کی تجاویز پیش کی جاتی ہیں تو بالعموم اسے عقیدہ پرست مُلاؤں کی جماعت قرار دے دیا جاتا ہے اور بعض اس پر نکتہ چینی کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ علما حکومت میں حصہ مانگتے ہیں۔ جمعیت العلما انتظامیہ میں کوئی حصہ نہیں مانگتی۔ وہ صرف یہ چاہتی ہے کہ حکومت قدرے مُلاّ بن جائے۔"[52] ایک اور رپورٹ کے مطابق اس نے کہا کہ "بعض لوگ چاہتے ہیں کہ مُلاّ اپنے آپ کو معاشرے کی اصلاح کے لئے وقف کرے جبکہ وہ شب و روز معاشرے کو خراب کرتے رہیں۔ اگر غیر مناسب ماحول کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ہم پر حکومت کرتے ہیں ان کا ماحول مناسب نہیں تو پھر قوم کو سوچنا پڑے گا کہ ملک کا نظم و نسق کون چلائے...... یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مُلاّ اقتدار چاہتا ہے...... میں کہتا ہوں کہ جب لوگ دنیاوی مقاصد کے لئے اقتدار کے متمنی ہوتے ہیں تو اس میں کیا حرج ہے کہ مُلاّ بھی ایک حقیقی اسلامی ریاست قائم کرنے کے لئے اقتدار کی تمنا کرے۔ مُلاّ حکمرانی نہیں کرنا چاہتا وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ حکمران مُلاّ کی طرح بن جائیں۔"[53]

مُلاّ عثمانی کی طرف سے مُلاّؤں کو اقتدار میں شریک کرنے کا مطالبہ......

پنجابی شاونزم کے علمبردار نوائے وقت اور ترقی پسند امروز کے دو مختلف ردعمل

مولانا شبیر احمد عثمانی کی مذکورہ تمنا کوئی نمائشی نہیں تھی۔ اس سے قبل وہ جون 1948ء میں اس مقصد کے لئے ایک منصوبہ بھی تیار کر چکا تھا جبکہ امیر جماعت اسلامی ابوالاعلیٰ مودودی بھی پاکستان کی امارت کا متمنی تھا اور چاہتا تھا کہ عنان اقتدار ان کے ہاتھ میں ہو جن کو وہ صالحین سمجھتا تھا۔ تاہم لاہور کے روزنامہ نوائے وقت نے شبیر احمد عثمانی کی اس تقریر کا خیر مقدم کرتے ہوئے

اس کی اس تمنائے اقتدار کی حمایت نہ کی حالانکہ کچھ عرصہ قبل وہ اس کو سرکاری شیخ الاسلام بنانے کی تجویز پیش کر چکا تھا۔ البتہ اس نے یہ لکھا ہے کہ ''اگر ارباب اختیار جو بات زبان سے کہتے ہیں دل سے بھی اس کے حامی ہیں تو وہ اسلامی آئین کے بارے میں اپنے اعلانات کے بعد پہلا اور منطقی قدم اٹھانے سے کیوں ہچکچاتے ہیں۔ یعنی دستور ساز اسمبلی میں ان ہی اعلانات کی بنیاد پر پاکستان کے ایک اسلامی ریاست ہونے کا اعلان کر کے اسلام کے اصولوں اور روایات کی بنیاد پر ملک کا آئندہ دستور مرتب کرنے کا مبارک کام کیوں نہیں شروع کرتے۔''[54]

لیکن روزنامہ امروز کے ایک مراسلہ نگار کو اسلامی نظام کی مہم کے مقاصد کے بارے میں شبہ تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ اسلامی حکومت کے نام پر کوئی ایسا نظام حکومت ہم پر مسلط نہ کر دیا جائے جس میں حکومت کے سارے معاملات صرف ایک ہی گروہ کے ہاتھ میں رہیں۔ ''ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسلامی نظام حکومت کا مطالبہ کرنے والوں میں وہ لوگ پیش پیش ہیں جنہیں جاگیرداری سے گہرا تعلق ہے۔ مثلاً فیروز خان نون جو جاگیرداروں کے نمائندے ہیں یا میاں ممتاز دولتانہ جو لڈن کی طرح مسلم لیگ کو بھی اپنی جاگیر بنا لینا چاہتے ہیں، اسلامی نظام کے پرزور حامیوں میں سے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر صحیح معنوں میں اسلامی نظام حکومت قائم ہو گا تو اس کا پہلا وار نظام جاگیرداری پر ہی ہو گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں کی جانب سے اسلامی نظام کی حمایت کیوں کی جا رہی ہے۔ کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ اپنی جاگیرداریوں اور زمینداریوں سے دست کش ہونے پر آمادہ ہیں اور صرف اسلامی نظام حکومت کے قیام کا انتظار کر رہے ہیں یا ان لوگوں کے بیانوں کے کوئی اور معنی بھی ہو سکتے ہیں۔''[55]

امروز کے ایک اور مراسلہ نگار نے بھی ایک ڈیڑھ ماہ قبل اسلامی آئین کے بارے میں اسی قسم کے شبہ کا اظہار کیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ ''اخبارات میں اس مضمون کی ایک اطلاع چھپی ہے کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں مولانا شبیر احمد عثمانی ایک قرارداد پیش کر رہے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ پاکستان کا دستور بنانے کا کام علما کی ایک جماعت کے سپرد کیا جائے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے دستور ساز اسمبلی اس لئے قائم کی گئی ہے کہ پاکستان کا آئین تیار کرے۔ اگر پاکستان کا آئین صرف علما ہی مرتب کر سکتے ہیں تو موجودہ دستور ساز اسمبلی کی ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے۔ اس صورت میں یہ بہتر ہو گا کہ یا تو موجودہ دستور ساز اسمبلی کی بجائے نئی دستور ساز

اسمبلی قائم کی جائے جس میں صرف علما شامل ہوں یا موجودہ دستور ساز اسمبلی کے چند ممبران کے سوا باقی تمام ممبر مستعفی ہو جائیں اور ان کی جگہ علما کو لے لیا جائے۔ میرے نزدیک زبان سے کہہ دینا تو آسان ہے کہ پاکستان کا دستور شریعت مطہرہ کے اصولوں کے مطابق تیار کیا جائے۔ لیکن یہ کام کر دکھانا بہت ہی مشکل ہے۔ اسلامی ملکوں میں سے کوئی ملک ایسا نہیں جس کا دستور پوری طرح اسلامی اور شریعت کے اصولوں کے عین مطابق ہو۔ زیادہ سے زیادہ مملکت نجد و حجاز کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہاں کا دستور اسلامی شریعت کے عین مطابق ہے لیکن نجد و حجاز نے جتنی ترقی کی ہے وہ ظاہر ہے۔ مجھے تو یہ اندیشہ ہے کہ اگر پاکستان کی دستور سازی کا کام علما کے سپرد کیا گیا تو کہیں ہمارا ملک بھی مملکت نجد و حجاز کا مثنیٰ نہ بن کر رہ جائے...... تعجب ہے کہ ہمارے اہل علم ان چیزوں کو جنہیں قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے دوسرے ملکوں سے لیا تھا اسلامی سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص غیر مما لک کے جدید دستوری اور آئینی طریقوں سے فائدہ اٹھانے کی سفارش کرے تو اسے گردن زدنی سمجھا جاتا ہے۔ سلطان ابن سعود کو ہی لیجئے۔ انہیں یہ تو منظور نہیں کہ امریکہ یا سوئٹزرلینڈ کے دستور کے نمونے پر اپنے ہاں کسی نئے آئین حکومت کو رواج دیں لیکن امریکہ والوں کو پٹرول کا اجارہ دینے اور امریکی ڈالر قبول کرنے میں انہیں کوئی عذر نہیں اور اس معاملہ میں ان کی سرگرمی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے پر چند در چند پابندیاں بھی عائد کر لیتے ہیں یعنی جہاد فلسطین کو جہاد تو کہتے ہیں لیکن اس میں عملاً حصہ نہیں لیتے اور صرف لفظی ہمدردی پر اکتفا کر کے چپکے ہو رہتے ہیں۔" [56]

لیکن امروز کے ان طوطیوں کی آواز مُلّائیت کے نقار خانے میں سننے والا کوئی نہیں تھا۔

باب:6

قرارداد مقاصد کی منظوری سے ملک میں مُلّا ئیت اور فرقہ واریت کو مضبوط بنیاد فراہم کردی گئی

لیاقت علی نے قرارداد مقاصد کے ذریعے مُلّا ئیت اور پنجابی شاونزم کا توڑ کرنے، بنگالیوں، سندھیوں، پٹھانوں اور بلوچوں کے قومیتی حقوق دبانے، طبقاتی تضاد کو جاگیرداروں کے حق میں حل کرنے اور اینگلو امریکی سامراج کے مفاد میں اسلامی بلاک کی تشکیل کرنے کی کوشش کی

پنجابی شاونسٹوں کا ترجمان اخبار نوائے وقت بدستور یہ لکھتا رہا کہ بس دستور ساز اسمبلی میں یہ اعلان کردو کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے اور اس کا آئین اسلامی اصولوں کی بنیاد پر بنے گا۔ اس طرح اسلامی آئین کے بارے میں سارا شوروغوغا خود بخود ختم ہوجائے گا اور پھر ملک کا آئین پرسکون ماحول میں آہستہ آہستہ بنتا رہے گا۔

وزیراعظم لیاقت علی خان نے جنوری فروری 1949ء میں پنجاب اور آزاد کشمیر کے دورے کے دوران یہ محسوس کیا کہ اگر پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے شاونسٹوں کے اس مطالبہ پر عمل کردیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔ اس طرح سانپ بھی مرجائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ چنانچہ اس نے 25رفروری کو کراچی میں مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کا ایک خفیہ اجلاس منعقد کیا جس میں یہ مطالبہ پورا کرنے کی غرض سے ایک قرارداد مقاصد پر غور کیا گیا لیکن اس دن اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ دو ایک دن بعد جب پارٹی کے ایک اور اجلاس میں اس مجوزہ قرارداد پر اتفاق رائے ہوگیا تو دستور ساز اسمبلی کے اجلاس سے دو تین دن قبل یکم مارچ 1949ء کو قرارداد کا

مسودہ برائے اشاعت اخبارات کو دے دیا گیا جنہوں نے اسے شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کیا۔
اگرچہ اس قرارداد میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ پاکستان ایک وفاقی ریاست ہوگا جس کے مختلف یونٹ متعینہ اختیارات کے تحت خودمختار ہوں گے اور جملہ اختیارات حکمرانی عوام کے منتخب نمائندوں کو حاصل ہوں گے۔ تاہم چونکہ اس کے ابتدائی پیراگراف میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا ذکر تھا اس لئے عوام الناس کو یہ تاثر دینے کی بھرپور کوشش کی گئی کہ اس قرارداد کے مطابق پاکستان ایک اسلامی ریاست ہوگا اور اس میں اسلامی نظام حکومت نافذ ہوگا۔ مجوزہ قرارداد کا متن یہ تھا:

''چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کل کائنات کا بلاشرکت غیرے حاکم مطلق ہے اور اس نے جمہور کی وساطت سے مملکت پاکستان کو اختیار حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لئے عطا فرمایا ہے اور چونکہ یہ اختیار حکمرانی ایک مقدس امانت ہے:

''لہٰذا جمہور پاکستان کی نمائندہ یہ مجلس دستور ساز فیصلہ کرتی ہے کہ آزاد وخودمختار مملکت پاکستان کے لئے ایک دستور مرتب کیا جائے گا''

''جس کی رو سے مملکت جملہ حقوق واختیارات حکمرانی جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعے سے استعمال کرے۔ جس میں اصول جمہوریت، حریت ومساوات ورواداری اور عدل عمرانی کو جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے۔

''جس کی رو سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی اسلامی تعلیمات ومقتضیات کے مطابق، جو قرآن مجید اور سنت رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم میں متعین ہیں، ترتیب دے سکیں۔

''جس کی رو سے اس امر کا قرار واقعی انتظام کیا جائے کہ اقلیتیں آزادی کے ساتھ اپنے مذہبوں پر عقیدہ رکھ سکیں اور ان پر عمل کر سکیں اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دے سکیں۔

''جس کی رو سے وہ علاقے جو اب پاکستان میں داخل ہیں یا شامل ہو گئے ہیں اور ایسے دیگر علاقے جو آئندہ پاکستان میں داخل یا شامل ہو جائیں ایک وفاقیہ بنائیں جس کے ارکان مقرر کردہ حدود واربعہ متعینہ اختیارات کے ماتحت خودمختار رہوں۔

''جس کی رو سے بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے اور ان حقوق میں قانون واخلاق عامہ کے ماتحت مساوی حیثیت ومواقع، قانون کی نظر میں برابری، عمرانی، اقتصادی اور سیاسی

عدل، خیال، اظہار، عقیدہ، دین، عبادت اور ارتباط کی آزادی شامل ہوں۔

''جس کی رو سے اقلیتوں اور پسماندہ و پست طبقوں کے جائز حقوق کے تحفظ کا قرار واقعی انتظام کیا جائے۔

''جس کی رو سے نظام عدل کی آزادی کامل طور پر محفوظ ہو۔

''جس کی رو سے وفاقیہ کے علاقوں کی سالمیت، اس کی آزادی اور اس کے جملہ حقوق کا تحفظ کیا جائے تاکہ اہل پاکستان فلاح وخوشحالی کی زندگی بسر کرسکیں اور اقوام عالم کی صف میں اپنا جائز اور ممتاز مقام حاصل کرسکیں اور امن عالم کے قیام اور بنی نوع انسان کی ترقی و بہبود میں کماحقہٗ اضافہ کرسکیں۔''

بقول مولانا ابراہیم علی چشتی یہ قرارداد متضاد خیالات ونظریات کا بے معنی ملغوبہ تھی۔ اس میں مذہبی اصطلاحات والفاظ استعمال کر کے پاکستان کے نیم تعلیم یافتہ اور سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس میں ایک طرف تو مغربی طرز کے جمہوری نظام حکومت کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن دوسری طرف غیر جمہوری مُلّائیت کے لئے بھی گنجائش رکھی گئی تھی۔ وزیر خزانہ غلام محمد، بیگم شاہ نواز، فیروز خان نون اور ممتاز دولتانہ کے علاوہ لیگ پارلیمانی پارٹی کے متعدد دوسرے ارکان اس قرارداد کے خلاف تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک میٹنگ کر کے پارٹی کے اجلاس میں اس کی مخالفت کرنے کا فیصلہ کیا مگر بالآخر لیاقت علی خان کے دباؤ کے تحت وہ ایسا نہ کر پائے اور صرف بیگم شاہ نواز نے اس کی مخالفت کی۔[1]

لیاقت علی کی جانب سے اس قرارداد کی منظوری پر زور دینے کی کئی وجوہ تھیں۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ یکم جنوری کو کشمیر میں جنگ بندی کی وجہ سے اور 24 رجنوری کو پنجاب میں گورنری راج کے نفاذ کی وجہ سے پنجاب کے درمیانہ طبقہ میں سخت خفگی کے جذبات پیدا ہو گئے تھے اور پنجابی فوج میں بھی غم وغصہ کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے پنجاب اور آزاد کشمیر کے دورے کے دوران اس حقیقت کا یقیناً احساس کرلیا ہوگا اور سوچا ہوگا کہ اسلامی قرارداد مقاصد پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے مشتعل جذبات کو ٹھنڈا کر دے گی۔ پنجابی شاونزم کو ہوا نہیں ملے گی اور فوج کا کوئی عنصر اس کا تختہ الٹنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ کراچی کے بعد اسلامی نظام کی سب سے زیادہ آوازیں پنجاب ہی سے اٹھتی تھیں۔ یہاں کے درمیانہ طبقہ کے بیشتر عناصر مُلّاؤں کی تائید کرتے تھے۔ یہاں تک

کہ ضلعی سطح پر مسلم لیگیوں کی بھاری اکثریت بھی اس کی حامی تھی۔ نواب ممدوٹ، ملک فیروز خان نون اور ممتاز دولتانہ جیسے جاگیردار بھی اسلامی نظام کے نعرے لگا کر اپنے نجی اور طبقاتی مفادات کا تحفظ کرنے کے حق میں تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانی، ابوالاعلیٰ مودودی، عطا اللہ شاہ بخاری اور داؤد غزنوی کے علاوہ تقریباً سارے ہی مولوی شرعی نقطہ نگاہ سے تعلقہ داریوں، جاگیرداریوں اور زمینداریوں کو جائز قرار دیتے تھے۔ مختصر یہ کہ قرارداد مقاصد پنجاب کے ان تمام عناصر کا منہ بند کر سکتی تھی جو کسی نہ کسی وقت اس کے اقتدار کے لئے خطرہ پیدا کر سکتے تھے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ سندھ، بلوچستان، سرحد اور مشرقی بنگال میں قومیتی حقوق و مفادات کی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ بلوچستان میں مسلم لیگ کے 1930ء کے بعد کے بے شمار وعدوں کے برعکس جمہوری نظام رائج نہیں کیا گیا تھا اور وہاں پنجابی بیوروکریسی کے خلاف سخت نفرت پائی جاتی تھی۔ وہاں صوبائی حقوق کا مطالبہ اتنا زوردار تھا کہ قاضی عیسیٰ جیسا موقع پرست مسلم لیگی لیڈر بھی علم بغاوت بلند کرنے کی دھمکیاں دیتا تھا۔ سندھ میں ایوب کھوڑو کی حکومت کی برطرفی کے باوجود سندھی حقوق کی تحریک بہت زور پکڑ رہی تھی اور مرکزی حکومت کا پٹھو وزیر اعلیٰ پیر الٰہی بخش اس تحریک کا سدباب کرنے میں ناکام رہا تھا۔ ایوب کھوڑو سندھی شاونزم کا بہت طاقتور نمائندہ بن گیا تھا اور مرکزی حکومت کی مخالفت کے باوجود صوبائی مسلم لیگ پر اس کے دھڑے کا غلبہ تھا۔ سرحد میں خان عبدالغفار خان اور دوسرے سرخپوشوں کی گرفتاری کے باوجود صوبائی حق خود اختیاری کا مطالبہ ختم نہیں ہوا تھا بلکہ اس میں مزید جان پڑ گئی تھی۔ یہاں تک کہ پیر مانکی بھی پاکستان میں بڑھتی ہوئی مرکزیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے لگا تھا۔ مشرقی بنگال میں قومی زبان کے مسئلہ کی وجہ اور دوسرے بہت سے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کی وجہ سے بنگالی نیشنلزم کا نعرہ بہت مقبول ہو رہا تھا۔ حمید الحق چودھری اور حبیب اللہ بہار اس نیشنلزم کے نمائندہ بن گئے تھے جبکہ پنجابی اور مہاجر بیوروکریسی کے خلاف بنگالی عوام کی نفرت میں خطرناک حد تک اضافہ ہو گیا تھا۔ لیاقت علی خان کا خیال ہو گا کہ قرارداد مقاصد ان قومیتی تحریکوں کو دبانے میں بہت ممد و معاون ثابت ہو گی۔ ان پسماندہ صوبوں کے قبائلی سردار، جاگیردار اور دوسرے مفاد پرست عناصر بھی اسلامی نظام کے قلعے میں اپنے آپ کو محفوظ تصور کرتے تھے۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ سندھ، پنجاب، سرحد اور مشرقی بنگال کے غریب کسانوں نے

مقامی کمیونسٹ عناصر کی زیر قیادت زمینداری نظام کے خلاف جدوجہد شروع کر دی تھی۔ مشرقی بنگال کے میمن سنگھ کے علاقے میں تو کسانوں کی مسلح جدوجہد ہو رہی تھی اور صوبہ سرحد میں بھی ایسی ہی جدوجہد شروع ہونے کا خطرہ تھا۔ روزنامہ امروز کی 26 رجنوری 1949ء کی اطلاع کے مطابق تحصیل ہری پور ہزارہ کے تین لاکھ کسانوں کا ایک ہی نعرہ تھا اور وہ یہ تھا کہ زمین کسان کی ہے۔ نوابزادہ لیاقت علی خان خود بھی جاگیردار طبقہ سے تعلق رکھتا تھا اس لئے اس کے لئے یہ نعرہ سب سے زیادہ خطرناک تھا۔ اس کا خیال ہوگا کہ قرارداد مقاصد اس نعرے کا گلا گھونٹ دے گی۔

چوتھی وجہ یہ تھی کہ اکتوبر 1948ء میں لندن میں جو دولت مشترکہ کانفرنس ہوئی تھی اس میں ایک فیصلہ یہ ہوا تھا کہ جنوب مشرقی ایشیا میں کمیونسٹ باغیوں کی سرکوبی کے لئے دولت مشترکہ کے ممالک ہر طریقے سے اشتراک عمل کریں گے اور دوسرا فیصلہ یہ ہوا تھا کہ مشرق وسطیٰ میں سوویت یونین کے اثر ورسوخ کے سدباب کے لئے مذہب کے نام پر گٹھ جوڑ کی کوشش کی جائے گی۔ چنانچہ اس دوسرے فیصلے کے مطابق نومبر 1948ء سے لیاقت علی خان، ظفر اللہ خان اور چودھری خلیق الزماں وغیرہ نے اسلامی اتحاد، اسلامی بلاک اور اسلامستان کی باتیں شروع کر دی تھیں لیکن اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ پاکستان کے اندر اور باہر مسلم عوام کو یہ تاثر دیا جائے کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے اور اس لحاظ سے اس کا مذہبی فریضہ ہے کہ وہ عالم اسلام کے اتحاد کے لئے مناسب کوشش کرے۔ برطانوی اخبارات اور ریڈیو نے بھی اس کانفرنس کے بعد اسلامی اتحاد اور اسلامی قوت کا زبردست پروپیگنڈا شروع کر دیا تھا اور تقریباً نصف صدی کے بعد برطانوی لیڈروں اور درجنوں دوسرے دانشوروں نے ایک مرتبہ پھر پان اسلام ازم کے تصور کو فروغ دینا شروع کر دیا تھا۔ قرارداد مقاصد اس تصور کو مزید تقویت دینے کا موجب بن سکتی تھی۔ بالخصوص ان پنجابی عناصر کے لئے یہ نعرہ بہت پسندیدہ تھا جو پاکستان کو یعنی پنجاب کو سارے عالم اسلام کا لیڈر بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے اور جو یہ بھی سمجھتے تھے کہ عالم اسلام کے اتحاد سے دہلی کے لال قلعے پر ہلالی پرچم لہرایا جا سکتا ہے۔

پانچویں وجہ یہ تھی کہ حکومت ہندوستان نے آزادی کے سال ڈیڑھ سال بعد اپنے ملک کا جمہوری آئین مرتب کر لیا تھا اور اس وجہ سے پاکستانی عوام میں اس امر پر مایوسی ظاہر کی جا رہی تھی کہ جو کام ہندوستان نے تھوڑے ہی عرصے میں مکمل کر لیا ہے اس کی ہماری حکومت نے

ابھی ابتدا بھی نہیں کی۔ لیاقت علی کے نقطہ نگاہ سے اس کی حکومت کی کارکردگی کے بارے میں عوام کے تاثر کو دور کرنا ضروری تھا۔ بایں ہمہ لیاقت علی خان نے جب مولانا شبیر احمد عثمانی کے مشورے اور رضا مندی سے دستور ساز اسمبلی سے یہ قرارداد منظور کروانے کا فیصلہ کیا تھا تو اسے یہ احساس و شعور نہیں تھا کہ وہ جن مقاصد کے تحت یہ کام کر رہا ہے ان میں سے کوئی ایک مقصد بھی پورا نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس اس سے پاکستان کی سیاست میں ایک ایسے عنصر کی آمیزش ہو جائے گی جو پہلے اس کی ذات کے لئے اور بالآخر پاکستان کے لئے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوگی۔

کراچی اور لاہور کے بیشتر اخبارات کا مشترکہ اداریہ کے ذریعے قرارداد مقاصد کا خیر مقدم۔ بنگال، سندھ، سرحد اور بلوچستان کا سرد، ردعمل

پاکستانی اخبارات کو اس قرارداد کا متن یکم مارچ کو دیا گیا تھا۔ دوسرے دن جب سرکاری اور غیر سرکاری ذرائع ابلاغ سے اس کی زبردست تشہیر ہوئی تو ڈان (کراچی)، نوائے وقت (لاہور)، زمیندار (لاہور)، سفینہ (لاہور)، سندھ آبزرور (کراچی)، انجام (کراچی)، جنگ (کراچی)، الوحید (کراچی)، وطن (کراچی) اور ہلال پاکستان (حیدرآباد، سندھ) کے ایڈیٹروں نے مشترکہ غور وفکر کے بعد ایک ہی مضمون کا اداریہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا جس کا ماحصل یہ تھا کہ اس قرارداد پر عمل کرنے سے پاکستان کے سارے داخلی مناقشات اور تنازعات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ عالم اسلام کو بے انتہا سکون ملے گا اور ساری دنیا میں اسلام کی سربلندی ہوگی۔ اس مشترکہ اداریے کے آخری دو تین پیراگراف یہ تھے کہ یہ قرارداد اسلام کے جوہر کو پیش کرتی ہے۔ اس کا مقصد آزادی اور مجلس عدل کی بنیادوں پر ایک مضبوط اور باہم پیوستہ حکومت قائم کرنا ہے۔ قرارداد کی دفعات کی رو سے حکومت کی یہ خاص کوشش ہوگی کہ وہ ملک میں تعلیم و زندگی کے معیار کو اس حد تک بلند کر دے کہ طبقاتی اختیارات ختم ہو جائیں اور غربت و افلاس ناپید ہو جائے۔ اس ریاست کے ہر شہری کو اپنی قابلیت اور صلاحیت کار کو ترقی دینے میں مدد دی جانی چاہیے تاکہ وہ ریاست کی تقویت اور باشندوں کی فلاح و بہبود کی خاطر پیش پیش حصہ لے سکے۔ اس کا لازمی اور ناگزیر نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام ان برائیوں کا استیصال ہو جائے گا جو انسان کی روح کو زنجیروں سے جکڑ دیتی ہیں۔ اس قرارداد سے اب ان مسلمانوں کو اطمینان ہو جانا چاہیے جو اس غیر مبہم اعلان کا

مطالبہ کر رہے تھے کہ پاکستان اسلامی تعلیمات اور نظریات کی ہی پیروی کرے گا کیونکہ اعلان مقاصد کی کسی قرارداد میں بھی اسلامی ریاست کا اس سے بہتر نقشہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس قرارداد سے اسلامی اقلیتی جماعتوں اور غیر مسلم قوموں کے دلی خدشات بھی دور ہو جانے چاہئیں کیونکہ ان کے حقوق و مفادات کی حفاظت کی پوری ضمانت دے دی گئی ہے اور اسلامی اصولوں کے مطابق انہیں مسلمانوں کے برابر درجہ دے دیا گیا ہے۔ سب سے آخر میں تنگ نظرانہ مذہبی حکومت کے قیام کا خطرہ بھی دور کر دیا گیا ہے اور مُلاّئیت کے کسی گروہ کو کوئی خاص اختیارات نہیں دیئے گئے کیونکہ اسلام مُلاّ گردی کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ قرارداد میں عوام کو ہی طاقت کا اصلی منبع تسلیم کیا گیا ہے کیونکہ ریاست انہی کے توسط سے اقتدار حاصل کرتی ہے اور یہ ان کا اپنا کام ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو اپنا نمائندہ منتخب کر لیں جو ذہنی اور قلبی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہوں تا کہ پاکستان اسلام کے لئے طاقت کا ایک سرچشمہ اور غیر ملکوں کے لئے سلامتی و اطمینان کا ملجا و ماویٰ بن سکے اور نہ صرف دیگر جدید اقوام کے دوش بدوش جادہ پیمارہ کر انسانی ترقی اور خوشحالی میں اپنے شان شایان حصہ ادا کر سکے بلکہ بعض پہلوؤں سے ان سے آگے نکل سکے۔ پاکستان اسلامی نصب العین سے وفاداری کا ثبوت دے کر اور صحیح معنوں میں استبداد، ناانصافی، غیر رواداری، عدم مساوات، خوف اور افلاس سے پاک و منزہ اسلامی سوسائٹی قائم کر کے ہی اس مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ ہمارے عوام نے مغرب کی کورانہ تقلید یا جامد اور غیر ترقی پسند رجعت پسندی کی پالیسی کی خاطر بے مثال مصائب و آلام کو برداشت نہیں کیا۔ مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں نے اپنا خون اس لئے بہایا کہ روئے زمین پر ایک ایسی تجربہ گاہ قائم کی جائے جہاں یہ ثابت کیا جا سکے کہ اسلام کی ترقی پسند تعلیمات کے سوا دنیا کے دکھوں کا اور کوئی مداوا نہیں۔ ہماری رائے میں یہی وہ مقصد ہے جس کی تکمیل کے لئے یہ قرارداد پیش کی جا رہی ہے۔''[2]

کراچی اور لاہور کے ان اخبارات کے مشترکہ اداریے سے یہ ظاہر تھا کہ پاکستان میں صرف ان دو مراکز کے بعض مفاد پرست عناصر ہی یہ سمجھتے تھے کہ مذہبی نعرے کے ہتھیار سے پاکستان کے سارے داخلی مناقشات و تنازعات کا خاتمہ ہو جائے گا اور اسی طریقے سے یہ ملک عالم اسلام کے لئے طاقت کا سرچشمہ بن جائے گا۔ مشرقی بنگال، سندھ، بلوچستان اور سرحد کے پسماندہ صوبوں میں اختیارات نہ ہونے کے برابر تھے۔ لہٰذا ان صوبوں میں اس قرارداد کا

کوئی والہانہ اخباری خیر مقدم نہ ہوا۔

پاکستان ٹائمز، امروز اور سول اینڈ ملٹری گزٹ کی قرارداد مقاصد پر تنقید

لاہور میں بھی پاکستان ٹائمز، امروز اور سول اینڈ ملٹری گزٹ نے اس قرارداد پر تعریف وتوصیف کے ڈونگرے نہ برسائے۔ پاکستان ٹائمز کو اعتراض یہ تھا کہ ''اس قرارداد میں یہ تو کہا گیا ہے کہ عنان اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھ میں ہوگی لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ لفظ عوام سے کیا مراد ہے اور ان نمائندوں کا انتخاب کس طرح ہوگا۔ عوام الناس کا حق رائے دہندگی بنیادی حقوق کی فہرست میں شامل ہونا چاہیے تھا اور یہ بھی واضح کر دینا چاہیے تھا کہ جمہوریت، آزادی اور مساوات وغیرہ کے بارے میں اسلامی اصولوں کی تعبیر کون کرے گا۔ اگر یہ کام چند افراد کے سپرد کر دیا گیا تو انتشار اور فرقہ وارانہ تنازعات کا دروازہ کھل جائے گا۔ قرارداد میں یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ پاکستان جمہوریہ ہوگی، آئینی بادشاہت ہوگی یا طبقاتی آمریت ہوگی۔ اگر پاکستان کے ساتھ لفظ ''مملکت'' کا استعمال کرنے کی بجائے لفظ ''جمہوریہ'' کا استعمال کیا جاتا تو کوئی حرج نہ ہوتا۔ لیکن سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ بنیادی حقوق کی فہرست میں عوام کے زندہ رہنے کا حق شامل نہیں کیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس قرارداد کے مطابق عوام کے لئے روٹی کا انتظام کرنے کے کام سے مملکت کا کوئی سروکار نہیں ہوگا حالانکہ اگر پیٹ میں روٹی نہ ہو تو انسان کی کوئی روحانی یا مادی ترقی نہیں ہو سکتی۔''[3]

امروز کا تبصرہ یہ تھا کہ ''ہم اسلام کے جمہوری اصولوں، مساوات، معاشی انصاف اور متوازن معاشرے کے تصور کو نظر انداز کرنے کے حق میں نہیں۔ لیکن ہمیں ان عناصر کی طرف سے اندیشہ ہے کہ جو کل تک برطانوی استعمار کو عین اسلامی اور ملک معظم کو ''ظل سبحانی'' قرار دیتے تھے اور آج بھی معاشرے میں کسی قسم کی تبدیلی اور اقتصادی ڈھانچے میں اصلاح ان کو گوارا نہیں۔ دراصل یہ عناصر ساری سوسائٹی کو گھن کی طرح کھائے جا رہے ہیں اور آئندہ دستور کو مسخ کرنے کے لئے غیر جمہوری اور استبدادی طاقتیں انہیں آلہ کار بنائیں گی۔ لہٰذا اسلام اور اسلامی جمہوریت کی قطعی واضح اور صاف الفاظ میں جتنی زیادہ تشریح کی جائے غلط فہمیوں اور گمراہ کن تاویلوں کے امکانات اس قدر کم ہوتے جائیں گے۔ جب وزیر اعظم صاحب کو اعتراف

ہے کہ اسلام کلیسا کی سیادت یا رہبانیت کو تسلیم نہیں کرتا تو اس اصول کو قرارداد میں شامل کرنے میں کیا امر مانع ہے۔ جب اقتدار کا سرچشمہ جمہور ہیں تو یہ اعلان کرنے میں کیا حرج ہے کہ پاکستان ایک عوامی مملکت ہوگا۔''[4]

سول اینڈ ملٹری گزٹ کی رائے یہ تھی کہ ''یہ قرارداد مقاصد بیگم شاہنواز کی اس تجویز سے متصادم نہیں ہے کہ مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو ایک انتظامی یونٹ میں مدغم کر دیا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو صوبائی عصبیت کا خاتمہ نہیں ہوگا بلکہ اس میں اضافہ ہوگا۔ ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ آج کل پاکستان کے مختلف علاقوں کے درمیان ہم آہنگی نہیں ہے۔ پاکستانی غیر ملکیوں کے مقابلے میں پہلے پاکستانی ہیں اور پھر کچھ اور ہیں لیکن جہاں تک اندرونی طور پر ان کے باہمی رشتوں کا تعلق ہے، وہ پہلے پنجابی، بنگالی، پٹھان، سندھی اور بلوچی ہیں اور اس کے بعد وہ ہم وطن ہیں۔''[5]

دو ایک دن بعد ڈان کے ایک مضمون نگار کا خیال تھا کہ ''قرارداد میں مقاصد کا جو چارٹر پیش کیا گیا ہے اس کے مطابق پاکستان کی حکومت نہ صرف صحیح معنوں میں عوامی ہوگی بلکہ اس پر طرہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے ماتحت ہوگی...... حکومت الٰہیہ کا کس قدر شاندار تصور ہے۔''[6] لیکن نوائے وقت کے ایک مراسلہ نگار کا موقف یہ تھا کہ ''اس قرارداد میں حکومت الٰہیہ کا کوئی تصور نہیں کیونکہ اس میں یہ اعلان نہیں کیا گیا کہ (1) پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے۔ (2) آئین کی بنیاد قرآن وسنت پر ہوگی۔ (3) حکومت پاکستان کو شریعت کے خلاف کوئی قانون نافذ کرنے کا اختیار نہیں ہوگا۔ (4) حکومت عوام میں اسلامی طریقوں کو مروج کرے گی۔''[7]
نوائے وقت کے اس مراسلہ نگار کا موقف دراصل ان مُلّاؤں کا موقف تھا جو جنوری 1948ء کے بعد شرعی نظام کے فوری نفاذ کے لئے جگہ جگہ اس مضمون کی چار نکاتی قرارداد منظور کرواتے رہتے تھے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد جب مُلّاؤں کے ایک بڑے حلقے نے اپنی سیاسی مصلحت کے تحت اس قرارداد کو تسلیم کر کے یہ مان لیا کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے تو انہوں نے اس قرارداد کی تعبیر انہی چار نکات کے مطابق کرنا شروع کر دی تھی۔

دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد کی مخالفت میں بنگال کے ہندو ارکان کی مدلل تقریریں، انہوں نے اسلام کے نام پر ایک آمر (یعنی ضیاء الحق) کے ظہور کے بارے میں پیش گوئی کی

پروگرام کے مطابق 7/مارچ کو لیاقت علی خان نے دستور ساز اسمبلی میں یہ قرارداد پیش کی تو اس نے اس کی تائید میں جو لچھے دار تقریر کی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں نے پاکستان اس لئے بنایا تھا کہ وہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے تھے اور دنیا پر یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ آج کل بنی نوع انسان کو جو بہت سے دکھ لاحق ہیں اسلام کے پاس ان کا تریاق موجود ہے۔ چونکہ اس قرارداد میں عوام کو طاقت کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے اس لئے قدرتی طور پر پاکستان میں مُلّا ئیت کے قیام کے خطرے کا سدباب ہو گیا ہے۔ اسلام میں مامور من اللہ مذہبی پیشواؤں کی حکومت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اسلام مُلّا ئیت یا پاپائیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ اگر اس کے باوجود کچھ لوگ پاکستان کے نظام حکومت کے بارے میں تھیوکریسی کا لفظ استعمال کرتے ہیں وہ یا تو بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں یا پھر شر انگیز پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ اسلام کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ اس نے سارے انسانوں کے درمیان مساوات کا تصور دیا ہے۔ لہٰذا پاکستان میں اقلیتوں کو مکمل آزادی ہو گی اور چھوٹے یا بڑے مذہبی فرقہ کو اپنے عقائد ٹھونسنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

لیاقت علی کی اس تقریر کے بعد مشرقی بنگال کے ایک ہندو رکن پریم ہری برما نے یہ تحریک پیش کی کہ ایوان میں اس قرارداد پر بحث سے قبل 30/اپریل تک اس کی تشہیر کر کے اس کے بارے میں رائے عامہ معلوم کی جائے۔ سریش چندر چٹو پاڈھیا نے اس تحریک کی حمایت میں زوردار تقریر کی۔ اس نے کہا کہ ''ہمارے خیال میں یہ قرارداد بالکل غیر ضروری ہے۔ جو چیز اہم ہے وہ یہ ہے کہ آئین سازی کی جائے نہ کہ آئین کے اغراض و مقاصد کے بارے میں کوئی نظریاتی قرارداد منظور کی جائے۔ اب تک ہمارا خیال یہ تھا کہ آئین کی بنیاد مساوات، جمہوریت اور معاشرتی انصاف کے دائمی اصولوں پر رکھی جائے گی۔ ہمارا خیال تھا کہ مذہب کو سیاست میں

ملوث نہیں کیا جائے گا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے اس ایوان میں یہی اعلان کیا تھا۔ لیکن اب جو قرارداد پیش کی گئی ہے اس کی بنیاد مذہب پر ہے۔ ہم اس قرارداد کے بعض پیراگرافوں کے مفہوم کو پوری طرح نہیں سمجھ پائے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنے مسلم اور غیر مسلم دوستوں کے ساتھ مل کر ان کا مطالعہ کریں، ان کے بارے میں مشورہ کریں اور پھر غور وفکر کریں اور اس سلسلے میں عوام الناس سے پوچھیں جن کے ہم نوکر ہیں۔ اس قرارداد کے پہلے پیراگراف میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کل کائنات کا بلاشرکت غیرے حاکم مطلق ہے۔ ہم غیر مسلموں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس فقرے کا مطلب کیا ہے۔ ہم اس کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اور مشرقی بنگال میں اپنے دوستوں سے اس کے بارے میں مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم تو بجٹ سیشن میں شرکت کرنے کے لئے یہاں آئے تھے۔ ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ایوان میں اس قسم کی قرارداد پیش کر دی جائے گی۔ ہمیں اس قرارداد کا کوئی نوٹس نہیں دیا گیا تھا...... میں چاہتا ہوں کہ پاکستان عظیم ہو اور قوموں کی برادری میں مناسب مقام حاصل کرے۔ صرف روحانی طور پر نہیں بلکہ سیاسی، معاشی اور ثقافتی طور پر بھی، محض روحانیت سے کام نہیں چلے گا۔“[8] مگر چٹوپاڈھیا کے یہ دلائل لیاقت علی خان کو متاثر نہ کر سکے اور پریم ہری برما کی تحریک کثرت رائے سے مسترد کر دی گئی۔

8 مارچ کو اس قرارداد پر بحث کی ابتدا بھوپندر کمار دتہ کی اس ترمیم سے ہوئی کہ قرارداد کے افتتاحی پیراگراف میں سے ”مقدس امانت ہے“ کے الفاظ حذف کر دیئے جائیں۔ اس نے اپنی اس ترمیم کے حق میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اگر اس پیراگراف کے اس فقرے کو کہ ”اختیار حکمرانی مقدس امانت ہے“ جوں کا توں رہنے دیا گیا تو بہت الجھنیں پیدا ہوں گی اور بڑی گڑبڑ ہوگی۔ اس نے کہا کہ ”اگرچہ ایک آزاد ریاست میں اختیارات کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں تاہم عوام اور ریاست کے رشتوں کا تعین بعض قوانین وقواعد کے ذریعہ کیا جاتا ہے اور عصر حاضر میں اس قسم کے قوانین سیاسیات کے دائرے میں آتے ہیں۔ ریاست اور عوام کے درمیان رشتے مختلف اقسام کے ہوسکتے ہیں ان کی جو نوعیت بھی ہو اس کا تعلق سیاست سے ہوگا۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ اور انسان کے درمیان رشتہ مذہب کے دائرے میں آتا ہے۔ سیاسیات اور مذہب انسان کے ذہن کے دو مختلف حصوں سے تعلق رکھتے ہیں خواہ یہ کہا جائے کہ یہ دونوں حصے خدا کے وجود کی وجہ سے یا انسان کی ذات اور اس کے ذہن کی یکجہتی کی وجہ سے ایک دوسرے

سے منسلک ہیں۔ سیاسیات کا تعلق عقل و دانش سے ہے اور مذہب عقیدے کے دائرے میں آتا ہے۔ عقل اور عقیدے دونوں میں مکمل وحدت ہو بھی جائے تو جب وہ بروئے کار آتے ہیں تو ہم انہیں الگ الگ رہنے دیتے ہیں۔ دونوں کے ادغام یا وحدت کی آخری منزل کی جانب سفر میں اس امر کا امکان ہے کہ دونوں غیر محسوساتی طور پر یا غیر نمایاں طور پر ہمرکاب ہوں۔ ہم جانتے ہیں کہ جب بھی کبھی کسی فرد یا گروہ میں کسی ایک کی حیثیت دوسرے کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہوئی تو بہت ہیجان پیدا ہوا۔ جب کبھی گروہوں میں اس قسم کا ہیجان پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کو بلاوجہ بڑی تکالیف برداشت کرنا پڑیں۔ ریاستوں کے پرخچے اڑ گئے اور انسانیت کا منہ کالا ہو گیا۔ چونکہ اس قرارداد کے افتتاحیہ میں سیاست کو مذہب سے منتھی کر دیا گیا ہے اس لئے اس امر کا امکان ہے کہ سیاست بھی عقیدے کے دائرے میں چلی جائے گی۔ اسی طرح اس پیراگراف میں اللہ کی حاکمیت کا ذکر کر کے ایک طرف تو یہ خطرہ پیدا کر دیا گیا ہے کہ مذہب بھی زیر تنقید آ جائے گا اور دوسری طرف جہاں تک ریاست اور ریاست کی سیاسیات کا تعلق ہے دلیل اور نکتہ چینی کو خارج از بحث کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں جدید جمہوری اداروں کی نشوونما نکتہ چینی کے ذریعے ہوتی ہے اور یہ نکتہ چینی بڑی بے لاگ اور تلخ بھی ہو سکتی ہے لیکن جب مذہب کو درمیان میں لایا جاتا ہے تو نکتہ چینی پر خفگی کا دروازہ کھل جاتا ہے اور مطلق العنانیت کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ ہمیں آج کوئی ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیے کہ جس سے ہماری آئندہ نسلیں اندھے انجام کے طوفان میں مبتلا ہو جائیں۔ خدانخواستہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کسی دن شاید ہماری زندگی میں ہی، کوئی یوآن شی کائی یا بچہ سقہ جیسا سیاسی طالع آزما اپنی مرضی اور اختیار اس ریاست پر ٹھونس دے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اس اقدام کے لئے اس افتتاحیہ میں سے جواز تلاش کر لے۔ وہ ہماری ریاست کے عوام کے سامنے اپنے دعوے کی بنیاد اس قرارداد کی اس شق پر رکھے جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے جمہور کی وساطت سے مملکت پاکستان کو اختیار حکمرانی نیابتاً عطا فرمایا ہے۔ اسے اس میں صرف ایک اور رشتہ جوڑنا ہوگا اور وہ یہ کہ مملکت پاکستان کی وساطت سے اختیار حکمرانی نیابتاً جمہور کو مل گیا ہے اور پھر وہ اعلان کر دے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے پاکستان کا حکمران مقرر کیا ہے۔

مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ اسلام کو سمجھنے کے لئے شریعت کا مطالعہ ضروری ہے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ شرعی فقہ کے کئی مکتب ہیں۔ صرف حنفی فقہ چودہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ مجھے جو کچھ

بتایا گیا تھا وہ صحیح ہے یا نہیں؟ اگر یہ جزوی طور پر بھی صحیح ہے تو ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ملک میں اللہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر اختیارات کے استعمال کے کیا نتائج ہوں گے۔ ان حدود کے بارے میں بے انتہا ابہام ہے اور ہم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ کئی برس پہلے کی بات ہے مجھے ایک مرتبہ مغربی پنجاب میں تین سال گزارنے پڑے تھے۔ وہاں میں نے کچھ کتابوں اور چند افراد کی مدد سے اسلام کی روح کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میرے لئے یہ کام بہت بڑا ثابت ہوا۔ جب میں جیل میں اپنے اساتذہ سے سیکھ رہا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ ان میں سے بعض کو مسلمان کہنے میں تامل کرتے تھے جو آج ہمارے حکمرانوں میں سب سے زیادہ دانشمند ہیں۔ میرے ان اساتذہ میں سے ایک نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ میں نے قرآن مجید کا جو ترجمہ خریدا ہے وہ غیر اسلامی ہے۔ اس لئے جب اللہ کی مقرر کردہ حدود کا ذکر کیا جاتا ہے تو بڑا مشکل معاملہ درپیش ہو جاتا ہے۔ ان کی حدود کی بہت سی تعبیریں ہو سکیں گی اور چونکہ ان حدود کا ذکر ہمارے آئین کی قرارداد کے افتتاحی پیراگراف میں ہوگا اس لئے ان کی نوعیت میں مختلف ارباب اختیار اور ماہرین وقتاً فوقتاً فرق پیدا کرتے رہیں گے۔ کبھی لچکدار اور کبھی بالکل بے لچک۔ مجھے اس موقع پر ایک وزیر کی دلیل یاد آئی ہے جو اس نے اس ایوان میں زکوٰۃ کی وصولی کے بارے میں ایک قرارداد پر بحث کے دوران دی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ پرانی دنیا کا محصولاتی نظام جدید نظام حکومت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ہمارا کاروبار حکومت اس قرارداد کے افتتاحیہ کے مطابق چلایا گیا تو ہمیں اس قسم کی بہت سی مشکلات پیش آئیں گی مثلاً جب یہ ناقابل مزاحمت مطالبہ ہوا کہ خلافتی نظام قائم کیا جائے اور مسلم اکثریت کے لئے محتسب مقرر کیا جائے یا بیکاری کا نظام منسوخ کر دیا جائے تو جو مشکلات درپیش ہوں گی ان پر کیسے قابو پایا جائے گا۔"[9] بھوپندر کمار دتہ نے اپنی اس طویل تقریر میں اور بھی بہت سی وزن دار باتیں کہی تھیں۔ لیکن غالباً اسے خود بھی یہ نہیں معلوم تھا کہ اس نے پاکستان میں جمہور اور اللہ کے نام پر یوآن شی کائی یا بچہ سقہ کے ظہور کے بارے میں جو پیشگوئی کی تھی وہ کس قدر صحیح تھی۔

دتہ کی یہ ترمیم نامنظور ہوئی تو پروفیسر راج کمار چکرورتی نے یہ ترمیم پیش کی کہ "اس قرارداد کے افتتاحیہ میں جہاں یہ لکھا ہے کہ مملکت پاکستان کو اختیار حکمرانی دیا گیا ہے وہاں لفظ "جمہور" کا اضافہ کر دیا جائے۔ ایسا کرنے سے فقرہ یوں بن جائے گا کہ اللہ نے جمہور کی وساطت

سے جمہوری مملکت پاکستان کو اختیار حکمرانی نیابتاً عطا کیا ہے۔ اس نے اپنی ترمیم کے حق میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ میرا مطلب یہ ہے کہ اختیار حکمرانی عوام الناس کو عطا کیا گیا ہے مملکت کو نہیں۔ پہلے عوام ہیں اور مملکت بعد میں ہے۔ مملکت عوام کی منظم منشا کو کہتے ہیں۔ عوام مملکت بناتے ہیں عوام اس کی رہنمائی کرتے ہیں اور عوام ہی اس پر کنٹرول رکھتے ہیں۔ یہ دور حاضر کی ایک حقیقت ہے۔ مملکت عوام کی ترجمان ہوتی ہے ان کی آقا نہیں ہوتی۔ مملکت رائے عامہ اور عوامی مطالبات کے مطابق کام کرتی ہے۔ لیکن اس قرارداد کے افتتاحیہ کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ ضروری نہیں کہ مملکت رائے عامہ یا عوامی مطالبات کے مطابق عمل پیرا ہو۔ یہ ایک خطرہ ہے اور میں اسے دور کرنا چاہتا ہوں۔'' پروفیسر چکرورتی نے اس کے ساتھ ہی ایک اور ترمیم بھی پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ اس قرارداد کے دوسرے پیراگراف میں آزاد و خودمختار مملکت پاکستان کی بجائے آزاد و خودمختار جمہوری مملکت پاکستان لکھا جائے۔ اس نے اپنی دوسری ترمیم کے حق میں یہ کہا کہ ''ہمیں عوام کو اور دنیا کو یہ بتانا چاہیے کہ ہمارا آئین کس قسم کا ہوگا۔ ہمیں یہ واضح کر دینا چاہیے کہ حکومت ایک فرد کی ہوگی یا چند افراد کی ہوگی یا بہت سے افراد کی ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بادشاہت ہو، استبدادیت ہو، چند افراد کی آمریت ہو یا جمہوریت ہو۔ میں نے دیکھا ہے کہ اس قرارداد کے بعض فقرے آئرلینڈ کے آئین کے افتتاحیہ میں سے لئے گئے ہیں۔ آئرلینڈ کے آئین کی پانچویں دفعہ میں کہا گیا ہے کہ آئین نہ صرف آزاد و خودمختار ہوگا بلکہ جمہوری بھی ہوگا۔ اس لئے اگر ہم بھی آزاد و خودمختار مملکت کے ساتھ لفظ جمہوری کا اضافہ کر دیں تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔'' مگر چکرورتی کی یہ اپیل نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی اور اس کی دونوں ترمیمیں مسترد کر دی گئیں۔

دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد کے حق میں شبیر احمد عثمانی کی لچھے دار تقریر

اگلے دن 9 / مارچ کو شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس قرارداد کے حق میں خطبہ دیا۔ چونکہ لیاقت علی خان کے پولیٹیکل سیکرٹری نواب صدیق علی خان کے بیان کے مطابق یہ ''عظیم الشان اور تاریخی'' قرارداد مولانا عثمانی کے ''مشورے اور رضامندی'' سے ہی تیار ہوئی تھی۔ اس لئے اس نے اس کی حمایت میں فن خطابت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اس کے اس طویل

خطبے کا خلاصہ یہ تھا کہ ''دنیا آج کل مادیت کے بھنور میں پھنسی ہوئی ہے اور الحاد اور مادہ پرستی کی تاریکی میں اپنا راستہ بھول گئی ہے۔ پاکستان چاہتا ہے کہ وہ اس دنیا کے لئے مشعل راہ بنے۔ یہ قرارداد مقاصد دنیا کے لئے چیلنج نہیں ہے بلکہ یہ امن وامید کا ایک پیغام ہے۔ یہ ان کی رہنمائی کرتی ہے جو مسرت اور خوشحالی کے متلاشی ہیں...... ہمارے لئے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اس کائنات کا جس کے ہم اور ہماری مملکت ایک جزو ہیں، حقیقی مالک اور حاکم مطلق کون ہے اور کیا ایسی ہستی کا واقعی کوئی وجود ہے؟...... ہم یہ مطالبہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہمارے حاکم مطلق نے ہمیں جو جائیداد عطا کی ہے ہم اس کا اسی حد تک استعمال کر سکتے ہیں جس حد تک کہ اس نے ہمیں ایسا کرنے کا اختیار کر دیا ہے...... اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو اسی لئے بھیجا تھا اور انہیں الہامی کتابیں اسی لئے عطا کی تھیں کہ وہ بنی نوع انسان کو بتائیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے کس کس چیز کی منظوری دی ہے اور کیا کیا اختیار دیا ہے۔ اس اہم ترین حقیقت کو اجاگر کرنے کے لئے اس قرارداد کے پہلے پیراگراف میں ''اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدود کے اندر'' کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور اسی بات میں وہ بنیادی فرق مضمر ہے جو ایک اسلامی مملکت اور ایک لادینی مادہ پرست مملکت کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اسلام نے اس نظریے کو کبھی تسلیم نہیں کیا کہ مذہب انسان اور اس کے خالق کے درمیان ایک نجی معاملہ ہے...... اسلامی مملکت سے مراد وہ مملکت ہے جو اسلام کے اعلیٰ وارفع اصولوں کے مطابق چلائی جائے۔ ظاہر ہے کہ جس مملکت کی بنیاد بعض اصولوں پر رکھی گئی ہو...... خواہ وہ مملکت ڈیموکریٹک یا تھیوکریٹک ہو یا سیکولر (سوویت یونین کی طرح) ہو...... اس کو صرف وہی لوگ چلا سکتے ہیں جو ان اصولوں کو مانتے ہیں۔ جو لوگ ان نظریات کے قائل نہیں ہیں انہیں مملکت وانتظامی مشینری میں تو کوئی جگہ دی جا سکتی ہے لیکن انہیں مملکت کی عمومی پالیسی کی تشکیل کرنے یا مملکت کی سلامتی اور سالمیت کے اہم معاملات سے نپٹنے کی ذمہ داری نہیں سونپی جا سکتی۔ اسلامی مملکت کو کوئی اختیار بطور حق نہیں ملتا بلکہ اسے یہ اختیار نیابتاً عطا کیا جاتا ہے حقیقی حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہی ہوتی ہے۔ انسان اس کرہ ارض پر اس کا خلیفہ ہے اور وہ اس لحاظ سے اپنے مذہبی فرائض سمجھتا، اپنی ذمہ داری، ''مملکت کے اندر ایک مملکت'' کے اصول کی بنا پر اور اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر ادا کرتا ہے۔ اسلامی مملکت جب اپنی عمدگی کی اعلیٰ ترین سطح پر ہوتی ہے تو حکومت راشدہ کہلاتی ہے۔ رشد کی اصطلاح کا مطلب عمدگی کی اعلیٰ ترین سطح ہے......

اسلام کا سرمایہ داری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلامی مملکت نجی ملکیت کے خاتمہ کے حق میں نہیں ہے اور سرمایہ اندوزی کی ایک خاص حد تک ہی اجازت دیتی ہے۔ فالتو دولت کے لئے ملی بیت المال کا انتظام کیا جاتا ہے جس پر سب کو مساوی حق حاصل ہوتا ہے۔ دولت کی اس طرح کی منصفانہ تقسیم امارت اور غربت کے درمیان توازن قائم رکھتی ہے...... اسلامی مملکت کی حقیقی بنیاد شوریٰ ہے۔ اسلامی مملکت اس دنیا میں پہلا سیاسی ادارہ ہے جس نے شہنشاہیت کو منسوخ کر کے استصواب کا اصول رائج کیا تھا اور بادشاہ کی بجائے عوام کے منتخب خلیفہ کا تقرر ہوا تھا۔ اسلام بادشاہت کے وراثتی حق کو یا جبر وقوت سے حاصل کردہ برتری کو تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام عوام کی وساطت سے اور ان کی مرضی کے مطابق مملکت کو اختیار دیتا ہے۔ اگرچہ عوام کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ حکومتی ادارے کو نظرانداز کریں اور قانونی اختیار کے استعمال میں رکاوٹ حائل کر کے انتشار، بدامنی اور مزاحمت پیدا کریں۔ اس طرح اسلام نے دنیا کی ساری جمہوریتوں کی رہنمائی کی ہے...... یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ موجودہ عالمی معاشی انتشار اور مالی عدم استحکام کی وجہ سے کمیونزم کو فروغ حاصل ہوا ہے اور اس کے سایہ سے دنیا تاریک ہو رہی ہے۔ صرف اسلامی نظام معیشت ہی ایسا نظام ہے جو کمیونزم کا اسی کے میدان میں مقابلہ کر سکتا ہے۔ اگر ہم پاکستان اور مسلم دنیا کو متوقع خطرے سے بچانا چاہتے ہیں تو اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم پاکستان میں اسلامی نظام رائج کریں اور سارے ملکوں کو اپنے ساتھ تعاون کی دعوت دیں۔ اگر سارے مسلم ممالک ایک فیڈریشن کی تشکیل کر لیں تو ایک عظیم مسلم برادری ظہور میں آ جائے گی۔ یہ ایک ایسا نقطہ عروج ہوگا جس کی ہمارے آقا و مولا کو بڑی دیر سے خواہش رہی ہے اور جو کمیونزم اور کیپٹل ازم کی زبردست پیش قدمی کے خلاف ایک پتھریلا پہاڑ ہوگا۔"[10]

شیخ الاسلام کا یہ خطبہ بہت اہم تھا۔ اس میں وزیراعظم لیاقت علی خان کی اس افتتاحی تقریر کی تردید کی گئی تھی جس میں اس نے اس قرارداد کی آڑ لے کر ایک بورژوا نظام حکومت کا نقشہ کھینچا تھا اور غیر مسلم اقلیتوں کو یقین دلایا تھا کہ اس قرارداد کے مطابق قائم شدہ مملکت میں انسان اور انسان کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا جائے گا اور یہ کہ اس قرارداد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پاکستان میں مُلّا گردی ہوگی یا مامور من اللہ مُلّاؤں کا راج ہوگا۔ لیاقت علی خان کے برعکس مولانا عثمانی نے اسلامی مملکت کے جو خدوخال بتائے تھے وہ وہی تھے جن کا مطالبہ ابوالاعلیٰ مودودی،

عطا اللہ شاہ بخاری اور دوسرے علما و مشائخ کی جانب سے جنوری 1948ء کے بعد سے کیا جا رہا تھا۔ عثمانی کے تصور کی اسلامی مملکت میں مشرقی بنگال کے ایک کروڑ پچاس لاکھ ہندوؤں کے لئے پالیسی سازاداروں، قانون سازاداروں اور دفاعی اداروں میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ انہیں کوئی کلیدی اسامی نہیں دی جاسکتی تھی البتہ انہیں انتظامی مشینری میں کوئی چھوٹا موٹا کام دیا جاسکتا تھا۔ تاہم اس کی اسلامی مملکت میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی موج تھی کیونکہ اس میں انہیں نجی ملکیت کا پورا حق دیا گیا تھا اور توقع کی گئی تھی کہ بیت المال کے ذریعے امیروں اور غریبوں کے درمیان طبقاتی کشمکش کا خاتمہ ہو جائے گا۔ عثمانی کے اس خطبے کی ایک اور اہمیت یہ تھی کہ اس میں سوویت یونین کے خلاف برطانوی سامراج کے تجویز کردہ اسلامی بلاک کی پرزور حمایت کی گئی تھی۔ یہ تجویز وزیر اعظم لیاقت علی خان اکتوبر 1948ء میں دولت مشترکہ کانفرنس سے لے کر آیا تھا اور اس کے بعد سے پاکستان، عراق، ایران اور ترکی وغیرہ میں اسلامی بلاک، ورلڈ مسلم فیڈریشن اور عالم اسلام کے اتحاد کا بہت زیادہ چرچا ہونے لگا تھا۔ پاکستان میں مسلم لیگ کا صدر چودھری خلیق الزماں اس نظریے کا سب سے بڑا غیر سرکاری علمبردار تھا۔ وزیر خارجہ محمد ظفر اللہ خان اس کا سب سے بڑا سرکاری وکیل تھا اور لاہور کا روزنامہ نوائے وقت اس کا سب سے بڑا ڈھنڈورچی تھا اور اب شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس پر مذہبی تقدس کی مہر بھی ثبت کر دی تھی۔ انگریز سیاستدانوں اور دانشوروں کا خیال تھا کہ سوویت یونین کے کمیونزم کا لادینی نظریات کے میدان میں مقابلہ نہیں کیا جاسکتا اس لئے ایشیا اور بالخصوص مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک میں اسلام اور دوسرے مذاہب کے قدامت پرست پیشواؤں کی خدمات حاصل کرنا ضروری ہوگا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ تقریباً ایک ہفتہ قبل مولانا شبیر احمد عثمانی ایک عالمگیر مسلم کانفرنس کا صدر بنا تھا۔[11]

لیکن پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں کمیونزم کے خطرے پر بحث کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ بھوپندر کمار دتہ کے خیال میں پاکستان کے ارباب اختیار اپنی مملکت پر سبز مذہبی رنگ چڑھا کر کمیونزم کی سرخی میں اضافہ کر رہے تھے۔ اس نے اپنی 8 مارچ کی تقریر میں اس مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''مسلم عوام کسی زمانے میں کانگرس سے وابستہ تھے۔ یہ 21-1920ء کی بات ہے۔ اس وقت کے بعد سے مسلم نوجوانوں نے مسلم لیگ کے علاوہ اگر کسی اور پارٹی سے وابستگی کا اظہار کیا ہے تو وہ کمیونسٹ پارٹی ہے۔ یہ کمیونسٹ دیانتداری سے یہ باور کرتے ہیں کہ

مذہب عمومی طور پر افیون ہے جس کا استعمال عوامی امنگوں کو دبانے کے لئے کیا جاتا ہے۔ معاشرے کے نئے نظام کے ان ایجنٹوں کو قرارداد مقاصد کے موجودہ افتتاحیہ سے خود آئین کے خلاف ایک زبردست ہتھیار مل جائے گا۔ اس آئین کی جو بھی شکل وصورت ہوگی وہ اسے رجعت پسندانہ ہی کہیں گے اور آج کل مشرقی ممالک میں ان کمیونسٹوں کو آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔" [12] گویا جہاں تک کمیونزم کے سدباب کا تعلق تھا مولانا شبیر احمد عثمانی اور بھوپندر کمار دتہ کے نصب العین میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں تھا۔ فرق صرف طریقہ کار میں تھا۔ مولانا عثمانی مذہب کے زور سے کمیونزم کا راستہ روکنا چاہتا تھا جبکہ بھوپندر کمار دتہ کا خیال تھا کہ مذہب پر زور دینے سے کمیونزم کو فروغ حاصل ہوگا۔

ہندو ارکان اسمبلی کی جانب سے اس خطرہ کا اظہار کہ اگر پاکستان میں مُلّاؤں کا اسلامی آئین نافذ کر دیا گیا تو ہندوستان کے پنڈت وہاں رام راج نافذ کروا کر وہاں کے مسلمانوں کے لئے مشکل پیدا کر سکتے ہیں

مولانا شبیر احمد عثمانی کے مذکورہ خطبے سے دستور ساز اسمبلی کے ہندو ارکان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ انہیں یہ محسوس ہوا کہ اسلامی مملکت پاکستان میں کسی ہندو کو کوئی باعزت مقام حاصل نہیں ہوگا اور ان کے فرقہ کے سارے افراد بنیادی شہری حقوق سے محروم ہوں گے۔ چنانچہ سب سے پہلے بی۔ سی۔ منڈل نے اسلامی مملکت کے اس نظریے کے خلاف احتجاج کیا۔ اس نے کہا کہ اسلام کے عظیم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش عرب میں ہوئی تھی اور عرب میں ہی اسلام کا ظہور ہوا تھا لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے آج کل اس ملک میں بھی انتظامیہ اور آئین کی بنیاد اسلامی اصولوں پر نہیں ہے۔ ترکی دنیا میں ایک طاقتور مسلم ملک ہے وہاں بھی آئین کی بنیاد اسلامی اصولوں پر نہیں ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ یہاں کے علما اسلام کے ان اصولوں پر اصرار کرتے ہیں۔ کیا ہندوستان میں پنڈت نہیں ہیں۔ کیا وہ اپنے سیاسی لیڈروں کو مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ اس قسم کا آئین مرتب کریں۔ کیا انگلستان اور امریکہ میں بشپ نہیں ہیں۔ عیسائی ممالک میں سے نہ تو انگلستان نہ امریکہ اور نہ ہی کوئی اور ایسا ملک ہے جس میں ان علما یعنی بشپوں کی کوئی شنوائی ہو۔ اس

کرہ ارض پر ہر جگہ اور ہمیشہ آئین کی بنیاد جمہوریت، بالخصوص سیاسی لوگوں کے معاشی نظریات پر رہی ہے مگر مگر ہمارے محبوب پاکستان میں اس اصول سے بہت انحراف کیا گیا ہے...... اس ڈومینین کے بانی نے انتہائی غیر مبہم الفاظ میں یہ کہا تھا کہ پاکستان ایک سیکولر مملکت ہوگی۔ ہمارے اس عظیم قائد نے کبھی نہیں کہا تھا کہ آئین کے اصول کی بنیاد اسلام پر ہوگی......ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ہم ایک سنگین غلطی کر رہے ہیں۔ آج دنیا ترقی کر رہی ہے لیکن ہم پاکستان میں اس بات پر لڑ رہے ہیں کہ فلاں مسلم ہے، فلاں ہندو ہے، فلاں عیسائی ہے اور فلاں بدھ ہے۔ لیکن ایک وقت ایسا آئے گا کہ لوگ اپنے انفرادی مذاہب کو نہیں مانیں گے۔ کوئی شخص ایسی چیزوں کو نہیں مانے گا۔''[13] منڈل کی یہ تقریر جذبے سے بھرپور تھی لیکن وہ کھل کر اپنی بات نہیں کہہ سکا تھا۔ وہ کہنا یہ چاہتا تھا کہ اگر تم نے پاکستان میں مُلّاؤں کے تصور کے مطابق خلافتی نظام رائج کر کے ایک کروڑ پچاس لاکھ ہندوؤں کی زندگیاں دوبھر کر دیں تو ہندوستان میں بھی برہمنوں کے تصور کے مطابق رام راج رائج ہو سکے گا اور اس طرح وہاں ساڑھے تین کروڑ مسلمانوں کی زندگیاں دشوار ہو جائیں گی۔ اس نے اپنی تقریر میں ترکی کے سیکولر نظام حکومت کا ذکر کیا تھا۔ لیکن وہ اس موقع پر ایک خبر کا حوالہ دینا بھول گیا تھا جو تین چار دن قبل پاکستان کے اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ انقرہ سے خبر یہ تھی کہ ''دو ایک دن ہوئے ترکی کی پارلیمنٹ میں بحث کے دوران دو اشخاص نے یکا یک عربی زبان میں اذان دینا شروع کر دی۔ انہیں فوراً گرفتار کر کے تین ماہ کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔ انہیں جس قانون کے تحت سزا دی گئی وہ 15 سال پرانا ہے اور اس کے تحت عربی زبان میں اذان دینا جرم ہے۔''[14] اس نے ایران کے نئے آئین کا بھی حوالہ نہیں دیا تھا جس کے تحت بادشاہ پر نکتہ چینی کی ممانعت کر دی گئی تھی۔

ہندو ارکان اسمبلی کا مودودی کے حوالے سے اس خطرہ کا اظہار کہ ''اسلامی آئین انہیں جمہوری اور معاشی و معاشرتی حقوق سے محروم کر دے گا''

12 ر مارچ کو سریش چندر چٹو پادھیا نے اسلامی مملکت کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ''اس قسم کی مذہبی مملکت میں سارے شہریوں کو مساوی حقوق حاصل نہیں ہو سکتے۔ ہندوؤں، عیسائیوں اور بدھوں میں سے کوئی شخص بھی عوام کے ووٹ حاصل کر کے اس

مملکت کا سربراہ نہیں بن سکتا۔لہٰذا اگر ہم نے اس قرارداد کو منظور کرلیا تو بڑی مشکل پیش آئے گی۔ اس وقت میرے پاس ایک کتاب ہے۔ یہ میری کتاب ہے۔کانگرس کی نہیں ہے۔اسے لاہور کی جماعت اسلامی نے شائع کیا ہے۔اس کے صفحہ 30 پر لکھا ہے کہ ''اسلام جمہوریت نہیں ہے کیونکہ جمہوریت ایسی حکومت کو کہتے ہیں جس میں حاکمیت بالآخر عوام الناس کی پاس ہوتی ہے جس میں قالب اور روح کے لحاظ سے قانون کا انحصار رائے عامہ کی قوت اور سمت پر ہوتا ہے اور اس رائے عامہ کی تبدیلی کے مطابق قانون میں بھی ترمیم یا تبدیلی ہوتی ہے۔اگر عوام الناس کسی خاص قسم کے قانون کے خواہاں ہوں تو ایسا قانون وضع کرنے کے لئے اقدامات کرنے ہی پڑتے ہیں۔ اگر عوام کسی قانون کو پسند نہ کریں اور اس کی تنسیخ کا مطالبہ کریں تو اسے بلاتاخیر حذف کر دیا جاتا ہے اور اس کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔اسلام میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔لہٰذا اسلام کو ان معنوں میں جمہوریت نہیں کہا جاسکتا۔'' میرے دوست عبدالرب نشتر نے اگلے دن کہا تھا کہ نام میں کیا رکھا ہے۔ میں بھی کہتا ہوں کہ نام میں کچھ بھی نہیں ہے۔نام عوام کو گمراہ کرنے کے لئے رکھا جا سکتا ہے لیکن اس سے تھیوکریسی کی بو آتی ہے۔

عبدالرب نشتر:۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ حکومت نے اس شخص سے کیا سلوک کیا ہے۔وہ جیل میں ہے۔

سریش چندر چٹو پاڈھیا:۔ یہ الگ معاملہ ہے۔ یہ شخص مزید لکھتا ہے کہ ''اس کا زیادہ مناسب نام حکومت الٰہیہ ہوگا جسے انگریزی میں تھیوکریسی کہتے ہیں۔'' میں تمہاری تھیوکریسی یا سنت کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا۔لیکن اس شخص نے مجھے اسلام کے بارے میں بہت سی باتیں بتائی ہیں۔اس کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ ''کسی قانون میں تبدیلی صرف مسلمانوں کے اجماع سے ہوسکتی ہے۔'' اگر یہ بات ہے تو پھر ہماری کیا حیثیت ہے۔ہم مسلمان نہیں ہیں۔بظاہر قرارداد میں بہت سے تحفظات موجود ہیں۔ میں ان کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔الفاظ موجود ہیں لیکن انہیں عملی جامہ پہنانے کے لئے کوئی قانون نہیں ہے۔یہ مجبوری ہے کہ اگر غیر مسلم ووٹ نہیں دے سکتے تو ہمارے یہاں آئین سازی کے لئے آنے کا کیا فائدہ ہوگا۔اگر ہمیں اس قرارداد پر ووٹ دینے کا حق مل جائے تو بھی اگر کوئی غیر مسلم اس مملکت کا سربراہ بننا چاہے گا تو وہ نہیں بن سکے گا۔ہم کسی غیر مسلم کو قانون ساز ادارے کا رکن منتخب نہیں کر سکتے۔ہم صرف مسٹر نشتر کے لئے ووٹ

دے سکتے ہیں، سریش چندر چٹو پاڈھیا کے لئے نہیں کیونکہ وہ غیر مسلم ہے۔تم یہ قرارداد منظور کر سکتے ہو کیونکہ تم اکثریت میں ہو لیکن ہم اس پر رضا مند نہیں ہو سکتے۔ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے اس کی مخالفت کریں۔ ہم اس کو قبول کر کے خودکشی نہیں کر سکتے۔ غیر مسلم ثانوی کردار ادا نہیں کریں گے۔ وہ صرف ماشکی اور لکڑ ہارے کا کام نہیں کریں گے۔ کیا تم کسی خوددار شخص سے اس قسم کی پوزیشن قبول کرنے کی توقع کر سکتے ہو۔''[15]

مسلم ارکان کی جانب سے قرارداد مقاصد کی تائید میں تقاریر، لیاقت علی نے مودودی کو شر پسند مولوی قرار دیا اور اقلیتی ارکان کو یقین دہانیاں کرائیں

چٹو پاڈھیا کی مذکورہ تقریر سے قبل اور اس کے بعد ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، مسٹر ظفر اللہ خان، سردار عبدالرب نشتر، چودھری نذیر احمد، پروفیسر عمر حیات ملک، ڈاکٹر محمود حسین، نور احمد اور بیگم شائستہ اکرام اللہ نے قرارداد کی تائید میں تقریریں کیں۔ ڈاکٹر قریشی کا موقف یہ تھا کہ ''یہ قرارداد بنیادی حقوق کے بارے میں اقوام متحدہ کے چارٹر کے منافی نہیں ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ اسلام مُلّائیت کو تسلیم نہیں کرتا تو پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ ہماری جمہوریت سیکولر نہیں ہے۔'' سر ظفر اللہ خان کا کہنا یہ تھا کہ ''جمہوریت کی روح یہ ہے کہ عوام کے منتخب نمائندے سیاسی اختیار کا استعمال کریں۔ یہ بات اس قرارداد میں واضح طور پر کہہ دی گئی ہے۔'' ڈاکٹر محمود حسین کی رائے یہ تھی کہ ''قرارداد میں جدید جمہوریت کی روح موجود ہے اور جہاں کہیں مملکت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس سے مراد عوام ہیں۔'' لیکن ڈاکٹر عمر حیات ملک کی رائے ان سب سے مختلف تھی اور مولانا عثمانی کی رائے سے ملتی جلتی تھی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ ''اس قرارداد کے مطابق جمہوریت محدود ہوگی عوام کو کچھ اختیارات ملیں گے لیکن انہیں سارے اختیارات نہیں ملیں گے...... بعض چیزوں کا فیصلہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کر سکتا ہے اور وہ اس کے ذاتی دائرہ اختیار میں ہیں۔ عوام کو صرف انہی معاملات سے نپٹنے کا اختیار ہوگا جو اللہ نے ان کے لئے چھوڑی ہیں۔ قرآن میں اسلام کے اصولوں اور قوانین کی وضاحت کر دی گئی ہے اور مملکت کے لئے ان اصولوں اور قوانین کی پابندی لازمی ہے۔ عوام اور مملکت ان اصولوں اور قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے...... لیکن ان اصولوں اور قوانین کے باہر بہت کھلا میدان ہے جس میں عوام الناس آزادی سے سرگرم عمل ہو سکیں گے...... اس کو تھیوڈیموکریسی

کہا جا سکتا ہے یعنی ایسی جمہوریت جو اللہ کے فرمان کے اندر رہے لیکن چونکہ لفظ تھیو کا استعمال عام نہیں ہے۔ اس لئے ہم اسے اسلامک ڈیموکریسی کا نام دے سکتے ہیں۔'' [16]

آخر میں وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اپنی تقریر میں جب حزب اختلاف کو یقین دلایا کہ ''لاہور کے جن دو علما نے اسے اسلامی لٹریچر مہیا کیا ہے وہ شر پسند ہیں اور پاکستان کو تباہ کرنے کے درپے ہیں۔ وہ پاکستان کے مسلمانوں کی نیک نیتی کے بارے میں شبہات پیدا کرنے کے لئے یہاں آئے تھے۔ خدا کے لئے ان کے شر انگیز پروپیگنڈا پر کان نہ دھریں۔ میں ایسے عناصر کو، جو پاکستان میں انتشار پھیلاتے ہیں متنبہ کرتا ہوں کہ ہم ان کی سرگرمیوں کو مزید برداشت نہیں کریں گے۔ انہوں نے اسلامی نظریے کی غلط تعبیر کی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اسلام پسند کہتے ہیں لیکن درحقیقت وہ اسلام کے دشمن ہیں...... اگر اس ملک کے مسلمانوں میں کچھ دیوانے ہیں تو کیا تم ان کی باتیں مانو گے یا ان باتوں سے رہنمائی حاصل کرو گے جن پر مسلمانوں کی بھاری اکثریت اعتقاد رکھتی ہے...... ان علما نے اسلامی مساوات کے بارے میں حزب اختلاف کے قائد کو گمراہ کیا ہے۔ حزب اختلاف کا قائد بہت تجربہ کار ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ ان نام نہاد دو علما سے اتنی آسانی کے ساتھ گمراہ ہو گیا ہے اور اس نے اسلام کے بارے میں ہماری یا مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے لوگوں کی باتوں پر اعتبار نہیں کیا...... یہ بالکل غلط ہے کہ اس قرارداد کی روح سے کوئی غیر مسلم انتظامیہ کا سربراہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی بھی غیر مسلم آئینی حکومت کا محدود اختیارات کے ساتھ سربراہ بن سکتا ہے...... یہ غلط ہے کہ پاکستان میں غیر مسلموں کی حیثیت سقوں اور لکڑ ہاروں کی سی ہوگی۔ اسلامی معاشرے میں اس قسم کے طبقات کا تصور نہیں ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا آدمی بڑی پوزیشن حاصل کر سکتا ہے۔ جب ہم معاشرتی انصاف کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارا مطلب معاشرتی انصاف ہوتا ہے جب ہم جمہوریت کا ذکر کرتے ہیں تو اس کا مطلب وہ تھیوری نہیں ہے جو حزب اختلاف کے قائد نے نام نہاد علما سے سیکھی ہے۔ ہم صحیح معنوں میں جمہوریت کے قائل ہیں...... قیام پاکستان سے مسلم لیگ کا صرف آدھا مشن پورا ہوا۔ بقیہ آدھا مشن یہ ہے کہ ہم پاکستان کو ایک ایسی لیبارٹری بنانا چاہتے ہیں جس میں ہم اسلام کے اصولوں پر عمل کر کے بنی نوع انسان کی فلاح و ترقی کے لئے اپنا کردار ادا کر سکیں......

میرے معزز دوست نے پوچھا ہے کہ کیا پاکستان کے شہری صرف مسلمان ہیں یا ہندو بھی ہیں؟

میں کہتا ہوں کہ ہم دونوں ہی ہیں۔ پاکستان میں ہندو اور مسلمان ہیں اور ہر ایک پاکستان کا شہری ہے۔ مجھے اس بیان میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔ تم اس مملکت کے مساوی حقوق، مساوی مراعات اور مساوی ذمہ داری کے حامل شہری ہو سکتے ہو اور اس کے ساتھ ہی مسلمان اور ہندو بھی رہ سکتے ہو۔ مجھے پتہ نہیں چلتا کہ اس میں مشکل کیا ہے۔"[17]

لیاقت علی کی منافقانہ سیاست......قرارداد مقاصد کی منظوری نے اقلیتوں کو خوف میں مبتلا کر دیا اور مستقبل کے "ضیاالحق" کے لئے گنجائش پیدا کر دی

لیاقت علی خان کی اس تقریر کے بعد اس کی "عظیم الشان و تاریخی" قرارداد مقاصد کثرت رائے سے منظور تو ہو گئی لیکن یہ سوال اپنی جگہ پر قائم رہا کہ پاکستان میں اسلام کی کون سی تعبیر کارفرما ہو گی۔ لیاقت علی خان کی تعبیر کا مطلب تو یہ تھا کہ اس قرارداد مقاصد کے باوجود پاکستان میں بورژوا جمہوری نظام رائج ہو گا جس میں بلا لحاظ مذہب و ملت سب شہریوں کو ہر شعبہ زندگی میں مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ بالفاظ دیگر وہ قائداعظم جناح کی طرح سیکولر جمہوری نظام کے حق میں تھا۔ اس کی خواہش صرف یہ تھی کہ اس پر اسلام کا لیبل لگا دیا جائے یعنی جمہوریت کے ساتھ لفظ اسلامی لگا دیا جائے تا کہ نہ صرف ان مُلّاؤں کو خاموش کیا جا سکے جو شب و روز شرعی نظام کا شور مچا رہے تھے بلکہ سادہ لوح مسلم عوام کو یہ دھوکا دیا جا سکے کہ ان کی مملکت ایک اسلامی مملکت ہے۔ لیکن لیاقت علی خان کو یہ احساس نہیں تھا کہ اس کی سیاست کی عمارت اتنی بڑی منافقت اور اتنے بڑے فریب کی بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ بیک وقت دینیت اور لادینیت کی دو کشتیوں پر زیادہ دیر تک سوار نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کا مُلّائیت کے گہرے سمندر میں غرق ہو جانا ناگزیر تھا۔ اس نے لندن میں بیرسٹری کی تعلیم پائی ہوئی تھی، اس کے پاس کسی دینی مدرسے کی سند نہیں تھی۔ اسی لئے بیشتر علما اور مشائخ اسے اور اس کے ساتھیوں کو "اینگلو محمڈن" کہتے تھے اور ابوالاعلیٰ مودودی جیسے بعض علما عوام الناس کو یہ باور کراتے تھے کہ "ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھتا ہو...... ان لوگوں کی عملی زندگی میں اور ان کے خیالات، نظریات، طرز سیاست اور رنگ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی...... ان

سارے لیڈروں کو بٹھا کر اسلام کے بنیادی اور ابتدائی مسائل کے متعلق امتحان لیجئے تو شاید ہی کوئی صاحب دو فیصدی سے زیادہ نمبر لے سکیں گے۔'' ان کے برعکس مولانا شبیر احمد عثمانی دارالعلوم دیوبند کا سند یافتہ جید عالم تصور کیا جاتا تھا۔ پاکستان کے اخبارات اور بے شمار لوگ اسے ''شیخ الاسلام'' کے لقب سے پکارتے تھے۔ وہ پاکستان کی جمعیت العلمائے اسلام کا صدر تھا لہٰذا اسلام کے بارے اس کی تعبیر لیاقت علی خان کی تعبیر سے بہت زیادہ قابل اعتماد تھی۔ دستور ساز اسمبلی میں اس کی تعبیر اور لیاقت علی خان کی تعبیر میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔ لیاقت علی خان اسلام کی رو سے غیر مسلموں کو ہر شعبہ زندگی میں مساوی حقوق دیتا تھا حتیٰ کہ وہ انہیں سربراہ مملکت کے عہدے پر فائز ہونے کا بھی حق دیتا تھا۔ وہ ان مُلّاؤں کو پاکستان اور اسلام کے دشمن قرار دیتا تھا جو یہ کہتے تھے کہ جدید جمہوریت اسلامی اصولوں کے منافی ہے اور اسلامی مملکت میں قانون سازی کا کام صرف مسلمانوں کے اجماع ہی سے ہوسکتا ہے۔ اس کے برعکس مولانا عثمانی کا اسی دستور ساز اسمبلی میں غیر مبہم اعلان یہ تھا کہ اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کو پالیسی ساز اداروں، دفاعی اداروں اور قانون ساز اداروں میں کوئی مقام نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے اس اعلان میں خوردبین لگا کر بھی جدید جمہوریت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جاسکتی تھی۔ مزید برآں پنجاب یونیورسٹی کا وائس چانسلر ڈاکٹر عمر حیات ملک اسلامی جمہوریت کو محدود جمہوریت قرار دیتا تھا۔ وہ عوام الناس کو لامحدود اختیارات نہیں دیتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ عوام یا مملکت قرآنی اصولوں اور قوانین میں کوئی تبدیلی کرنے کے مجاز نہیں ہوں گے۔ پنجاب کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ میں عمر حیات ملک تنہا آدمی نہیں تھا جو اس نظریے کا حامل تھا بلکہ اس جیسے دوسرے پروفیسر اور دانشور موجود تھے جو اپنے مذہبی نظریہ کے لحاظ سے مُلّاؤں سے بھی زیادہ مُلّا تھے۔ ان میں اور قدامت پرست مُلّاؤں میں فرق صرف یہ تھا کہ وہ انگریزی زبان میں مضامین اور لیکچروں کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے جبکہ علما صرف عربی اور اردو میں اپنا زورِ قلم اور زورِ خطابت دکھاتے تھے۔ اس لئے ہندو ارکان اسمبلی کا واویلا بے جا نہیں تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اگر پاکستان میں اللہ تعالیٰ حاکم مطلق ہوگا تو پھر عوام کو تو کوئی اختیار نہیں ہوگا اور یہ ملک جمہوری نہیں ہوگا۔ جب وہ کہتے تھے کہ قرارداد کے ابتدائی پیراگراف میں آزاد وخود مختار پاکستان کے ساتھ لفظ جمہوری شامل کرلو تو سردار نشتر کہتا تھا کہ نام میں کیا رکھا ہے۔ گلاب کے پھول کو خواہ کسی نام سے

پکارو اس کی خوشبو وہی رہتی ہے۔ ڈاکٹر محمود حسین کہتا تھا کہ لفظ عوام، محض ایک معاشرتی تصور ہے اس لئے قرارداد میں لفظ مملکت کی بجائے عوام کا لفظ لکھنا ضروری نہیں۔ جب وہ کہتے تھے کہ سیاست میں مذہب کی آمیزش سے ناگزیر طور پر ملائیت کا غلبہ ہو جائے گا تو ظفر اللہ خان کہتا تھا کہ مذہب کو سیاست سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور مولانا عثمانی نے جو خطبہ دیا تھا اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اسلام کی رو سے تم ہندوؤں کو اسلامی مملکت میں ثانوی درجہ کے شہریوں کا مقام حاصل ہوگا۔ انہیں مسلمانوں کے برابر حقوق نہیں ملیں گے۔ اس لئے ہندو ارکان اسمبلی کا واویلا بے جا نہیں تھا بالخصوص ایسی صورت حال میں کہ اسمبلی کے باہر ابوالاعلیٰ مودودی اور دوسرے مُلّاؤں کا بھی یہی فتویٰ تھا۔ وہ ہندوؤں کو ذمی قرار دے کر ان سے جزیہ وصول کرنے کے حق میں تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ بھوپندر کمار دتہ کو تو اس غیر ضروری اور بے معنی قرارداد کے مضمرات کا پتہ چل گیا تھا لیکن لیاقت علی خان کی آنکھوں پر سیاسی مصلحتوں کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اس قرارداد کا بالآخر منطقی نتیجہ کیا ہوگا۔ وہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اس قرارداد کے ذریعے مُلّائیت کی جو حوصلہ افزائی ہوگی اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ کسی شب کوئی یوآن شی کائی یا بچہ سقہ فوجی بیرک میں سے نمودار ہوگا اور بندوق کے زور سے عنان اقتدار سنبھالنے کے بعد یہ اعلان کرے گا کہ میں مامور من اللہ ہوں اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے پاکستان پر حکمرانی کا اختیار عطا فرمایا ہے۔

جماعت اسلامی نے قرارداد مقاصد کو خوش آمدید کہتے ہوئے حکومت سے تعاون کا اعلان کر دیا تا کہ مودودی کی رہائی ممکن ہو سکے

اس قرارداد پر بحث کے دوران مختلف سیاسی لیڈروں اور تنظیموں کی طرف سے تعریفی بیانات شائع ہوتے رہے۔ 8 / مارچ کو صوبہ سرحد کی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے وزیر اعظم لیاقت علی خان کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی کہ ''قرارداد مقاصد کے الفاظ نہایت دانشمندانہ ہیں اور ان میں عوام کے جذبات کی پوری پوری ترجمانی کی گئی ہے۔ یہ امر موجب اطمینان ہے کہ قرارداد میں جمہور پاکستان کو تمام اختیارات کے حامل اور پاکستان کو خود مختار علاقوں کا وفاق بنانے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔'' 12 / مارچ کو سرحد اسمبلی کے سپیکر نوابزادہ اللہ نواز خان نے پشاور ریڈیو سے تقریر نشر کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ قرارداد صحیح اسلامی روح سے

سرشار ہے۔ اسلامی جمہوریت میں عوام کی زندگی چند لوگوں یا گروہوں کی خواہشات کے رحم وکرم پر نہیں ہوتی۔"

اور پھر 15 ر مارچ کو اس قرارداد کی تعریف ایک ایسی تنظیم کی طرف سے ہوئی جسے وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خان اور روزنامہ نوائے وقت پاکستان اور اسلام کا دشمن قرار دے چکے تھے۔ یہ تنظیم ابوالاعلیٰ مودودی کی جماعت اسلامی تھی۔ اس کی مجلس شوریٰ نے قرارداد مقاصد کے متعلق ایک ریزولیوشن منظور کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے یہ قرارداد منظور کر کے جماعت اسلامی کے مطالبہ کی روح کو قبول کر لیا ہے کیونکہ اگر اس قرارداد کے الفاظ اور ان کے مضمرات و مقتضیات کی روح اور منشا کے عین مطابق دستور مرتب کیا جائے تو اس میں ریاست کے قانون کا ماخذ کتاب وسنت کے سوا اور کسی شے کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ریزولیوشن نے دستور ساز اسمبلی سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ وہ قرارداد مقاصد کی روح اور منشا کے مطابق جبر وتشدد، رشوت ستانی، معاشی عدم توازن، خویش پروری، خیانت اور عام اخلاقی انحطاط کو جو ہمارے طویل دور زوال کا نتیجہ ہیں، ختم کرنے کے لئے جلد از جلد نیا دستور مرتب کرے جس میں یہ وضاحت کر دی جائے کہ آئندہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کیا جائے جو شریعت اسلامی کے خلاف پڑتا ہو۔ جماعت اسلامی کے ارکان اور ہمدردوں کو چاہیے کہ وہ قرارداد مقاصد کے مطابق نئے دستور کے لئے سازگار فضا پیدا کرنے کی خاطر حکومت سے پورا پورا تعاون کریں۔"[18]

مجلس شوریٰ نے یہ ریزولیوشن جماعت اسلامی کو اس سیاسی مشکل میں سے نکالنے کے لئے منظور کیا تھا جس میں ابوالاعلیٰ مودودی کی خارجیت نے اسے ڈال دیا ہوا تھا۔ اس ریزولیوشن کا مطلب یہ تھا کہ آئندہ جماعت اسلامی پاکستان کی حکومت کو غیر اسلامی یا کافرانہ نہیں کہے گی۔ وہ اپنے ارکان اور ہمدردوں کو اس حکومت کے مروجہ آئین کی وفاداری کا غیر مشروط حلف لینے سے منع نہیں کرے گی اور مسلمانوں کو یہ مشورہ نہیں دے گی کہ وہ پاکستان کی افواج میں بھرتی نہ ہوں۔ غالباً مجلس شوریٰ کو امید تھی کہ اس ریزولیوشن کے بعد مودودی پر اسلام اور پاکستان کی دشمنی کا الزام عائد نہیں کیا جائے گا اور اسے اور اس کے بعض ساتھیوں کو رہا کر دیا جائے گا۔ ان کی نظر بندی کی میعاد اپریل میں ختم ہو رہی تھی۔ تاہم اس ریزولیوشن میں یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ لیاقت نے اسمبلی

میں اسلام کی جو جمہوری تعبیر کی تھی وہ جماعت کے لئے قابل قبول نہیں ہوگی بلکہ وہ غیر جمہوری تعبیر پر اصرار کرے گی جس کے بارے میں چٹوپاڈھیا نے اپنی تقریر میں خدشات کا اظہار کیا تھا۔

بنیادی اصولوں کی کمیٹی کا تقرر...... مُلاّ عثمانی کے ہمراہ احمدی اور ہندو ارکان کے علاوہ خواتین ارکان کو بھی شامل کیا گیا جس پر مُلاّ عثمانی کو کوئی اعتراض نہ ہوا

15 رمارچ کو جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کا مذکورہ ریزولیوشن اخبارات کے دفتر میں پہنچا تو اسی دن کراچی سے یہ خبر آئی کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے 12 رمارچ کو قرارداد مقاصد کی منظوری کے بعد 25 ارکان پر مشتمل جو بنیادی اصولوں کی کمیٹی مقرر کی تھی، اس کا پہلا اجلاس اسمبلی کے صدر مسٹر تمیز الدین خان کی صدارت میں منعقد ہوا۔ کمیٹی کے تمام ارکان نے بشمول وزیر اعظم لیاقت علی خان جلسہ میں شرکت کی۔ سات ارکان پر مشتمل ایک ''طریق کار کی کمیٹی'' قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا جو بنیادی اصولوں کی کمیٹی کے فرائض کار کی وسعت کا اندازہ لگائے گی۔ کمیٹی مندرجہ ذیل ارکان پر مشتمل ہوگی۔ مسٹر لیاقت علی خان، سر محمد ظفر اللہ خان، مسٹر جوگندر ناتھ منڈل، مولانا شبیر احمد عثمانی، مسٹر ایس۔ سی۔ چٹوپاڈھیا اور مسٹر بی۔ سی منڈل وغیرہ۔ اس خبر سے ظاہر تھا کہ بنیادی اصولوں کی یہ کمیٹی جو دستور مرتب کرے گی اس کا ماخذ قرآن وسنت نہیں ہوگا کیونکہ دستور سازی کے اس کام میں ہندو ارکان بھی شامل ہوں گے۔ مولانا عثمانی کے نظریے کے مطابق ہندوؤں کو اسلامی مملکت کے اس اہم ترین کام میں کوئی کردار ادا کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ لیکن اس موقع پر مولانا عثمانی، جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کے ارکان اور دوسرے علما ومشائخ خاموش رہے کیونکہ ان کی سیاسی مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔ وہ جوابی حملے کے لئے مناسب وقت کے منتظر تھے۔

ان دنوں پورے پاکستان میں بالعموم اور پنجاب میں بالخصوص مسلم لیگ کے مختلف دھڑوں کے درمیان سخت رسہ کشی ہو رہی تھی اور عوام الناس مسلم لیگی لیڈروں کی رشوت ستانی، خویش پروری، خیانت اور ہوس اقتدار سے بہت تنگ آ چکے تھے۔ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل

محمد دین تاثیر جیسے بعض لوگوں کو خدشہ تھا کہ اگر کچھ عرصہ اور مسلم لیگیوں کی یہ بدعنوانیاں جاری رہیں تو مُلّاؤں کو اسلام کے نام پر اپنی مطلق العنانیت قائم کرنے کا موقع مل جائے گا۔ 31/مارچ کو مولانا شبیر احمد عثمانی کا بیان یہ تھا کہ ''مسلم لیگ کی مجوزہ تنظیم غیر جمہوری ہے اس لئے میں نے اس جماعت کی مجلس عاملہ کا رکن بننے سے انکار کر دیا ہے۔ ایک گروہ نے مسلم لیگ کو اپنی اجارہ داری بنا لیا ہے اور عوام کے لئے اس جماعت کے دروازے بند کر دیئے ہیں جس کی وجہ سے یہ جماعت غیر جمہوری ہو گئی ہے۔''[19] اس خبر سے محمد دین تاثیر کے اس خدشے میں اضافہ ہوا تھا جس کا اظہار اس نے 27/مارچ کے پاکستان ٹائمز میں کیا تھا۔ پنجاب کی انجمن ترقی پسند مصنّفین نے اسی خدشہ کی بنا پر 2/اپریل کو اپنا ایک نیا منشور منظور کیا تھا جس میں پاکستانی ادیبوں پر یہ فرض عائد کیا تھا کہ وہ ''یہاں کی زندگی میں ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کی اعانت کریں۔ اس قسم کے انداز تنقید کو رواج دینا ان کا فرض ہے جس سے خاندان، مذہب، جنس، رنگ و معاشرت کے بارے میں رجعت پسندانہ اور ماضی پرستی کے خیالات کی روک تھام کی جا سکے...... ہم ہر اس بات کو رجعت پسند کہہ کر رد کرتے ہیں جو ہم کو بدکاری، سستی اور توہم پرستی کی طرف گھسیٹ لے جاتی ہے اور ان تمام باتوں کو ہماری قوت تنقید ابھارتی ہے جو رسموں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں۔''[20]

جب 14 اور 15/اپریل کو بنیادی اصولوں کی کمیٹی کے دو روزہ اجلاس میں یہ فیصلہ ہوا کہ آئین سازی کے کام میں مشورہ دینے کے لئے دینی علوم کے ماہر علما کا ایک بورڈ مقرر کیا جائے گا تو محمد دین تاثیر کا خدشہ مزید صحیح ثابت ہوا۔ علما کے اس بورڈ کے قیام کا فیصلہ بڑی بحث و تمحیص کے بعد ہوا اور وزیر خزانہ غلام محمد، بیگم شاہنواز اور بعض دوسرے ارکان کی مخالفت کے باوجود یہ طے ہوا کہ علما کا یہ بورڈ صرف انہی آئینی امور کے بارے میں مشورے دے گا جن کے بارے میں اس سے مشورہ طلب کیا جائے گا۔ یہ بورڈ از خود کمیٹی کو کوئی مشورہ دینے یا تجویز پیش کرنے کا مجاز نہیں ہوگا۔ مزید طے ہوا کہ اس بورڈ کا صدر سید سلیمان ندوی ہوگا جو اس وقت تک لکھنؤ میں ہی تھا اور اس کی تنخواہ پندرہ سو روپے ماہوار ہوگی۔ بیگم شاہنواز کو اس بورڈ کی تشکیل پر سخت اعتراض تھا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ لیاقت علی خان نے قائداعظم جناح اور مس فاطمہ جناح کے مولویوں کے بارے میں مخالفانہ اعلانات کے باوجود یہ فیصلہ اس لئے کروایا تھا کہ ''اس کی اس ملک میں کوئی

سیاسی بنیاد نہیں تھی۔ وہ اپنے لئے یہ بنیاد مہیا کرنے کی خاطر قدامت پرستوں اور مفاد پرستوں سے گٹھ جوڑ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔"[21]

بنیادی اصولوں کی کمیٹی کے اس اجلاس میں تین سب کمیٹیوں کی بھی تشکیل کی گئی۔ پہلی کمیٹی فیڈرل کونسٹی ٹیوشن اینڈ ڈسٹری بیوشن آف پاورز کمیٹی (Federal Constitution And Distribution of Powers Committee) تھی۔ اس کا صدر سردار عبدالرب نشتر تھا اور یہ غلام محمد، فضل الرحمان، خواجہ شہاب الدین، سر ظفر اللہ خان، عبدالستار پیرزادہ، نورالامین، یوسف ہارون، خان عبدالقیوم خان، مولانا شبیر احمد عثمانی، پروفیسر آئی۔ ایچ۔ قریشی، ڈاکٹر محمود حسین، ممتاز دولتانہ، مولانا محمد اکرم، ڈاکٹر عمر حیات ملک، ایس۔ سی، چٹو پاڑھیا، فیروز خان نون، پریم ہری برما اور شیخ کرامت علی پر مشتمل تھی۔ دوسری کمیٹی جوڈیشری کمیٹی (Judiciary Committee) تھی جس کا صدر وزیر قانون جوگندر ناتھ منڈل تھا اور یہ محمد ظفر اللہ خان، عبدالستار پیرزادہ، مولانا شبیر احمد عثمانی، چودھری نذیر احمد خان، کے۔ کے۔ دتہ اور مسٹر جسٹس عبدالرشید پر مشتمل تھی۔ تیسری کمیٹی وزیر تعلیم فضل الرحمان کی زیر صدارت فرینچائز کمیٹی (Franchise Committee) تھی اور یہ سردار عبدالرب نشتر، عبدالستار پیرزادہ، جے۔ این۔ منڈل، سردار بہادر خان، بیگم جہاں آرا شاہ نواز، بیگم شائستہ اکرام اللہ، میاں افتخار الدین، پریم ہری برما، شیخ کرامت علی، فیروز خان نون، مولانا اکرم خان، مولانا شبیر احمد عثمانی، غلام محمد اور ایس سی چٹو پاڑھیا پر مشتمل تھی۔[22] ظاہر ہے کہ ان کمیٹیوں کی ہیئت ترکیبی ایسی تھی کہ اگر شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی واقعی اصول پسند ہوتا تو اسے ان کمیٹیوں میں سے کسی ایک کی بھی رکنیت قبول نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ان کمیٹیوں میں ہندو بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں اور مولانا عثمانی کے مذہبی نقطہ نگاہ سے ان دونوں عناصر کو اسلامی آئین کی ترتیب کے کام میں شریک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دوسری کمیٹی کا صدر تو ایک ہندو تھا۔ اس سے کیسے توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اسلامی نظام عدل کی سفارش کرے گا۔ مزید برآں ان کمیٹیوں میں فرقہ احمدیہ کا ایک سرکردہ رکن ظفر اللہ خان بھی تھا جو مولانا عثمانی کے اپنے فتوے کے مطابق مرتد اور واجب القتل تھا۔ مگر مولانا عثمانی نے ان سب حقائق کے باوجود ان کمیٹیوں کا رکن بننے میں کوئی تامل نہ کیا اور کسی دوسرے مولوی نے بھی اس سے کوئی احتراز نہ کیا۔

قرارداد مقاصد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پنجاب میں برطرف شدہ ممدوٹ وزارت کے حامی مُلّاؤں نے امتناع شراب کا مسئلہ کھڑا کر کے گورنر موڈی اور لیاقت علی کے خلاف مہم شروع کر دی...... جسٹس کارنیلیس نے ایک شراب رکھنے والے کو بری کر دیا تھا

اگرچہ احراری مولوی اپنے 15 رجنوری کے فیصلے کے مطابق ''سیاست'' سے کنارہ کش ہو کر اپنی ''تبلیغی'' سرگرمیوں میں مصروف ہو چکے تھے لیکن ابھی تک انہوں نے مصلحتاً حکومت کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کیا تھا۔ وہ بھی جماعت اسلامی کے مولویوں کی طرح قرارداد مقاصد کی منظوری سے ''مطمئن'' تھے اور کہتے تھے کہ ''اس قرارداد کے مطابق نئے دستور کی تشکیل کے لئے سازگار فضا پیدا کرنے کی خاطر حکومت سے پورا پورا تعاون کرنا چاہیے۔'' ان کے اس رویے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے پنجاب مسلم لیگ کے دولتانہ دھڑے سے گٹھ جوڑ کرنے کی کوشش شروع کر رکھی تھی اور 11 راپریل کو اس مقصد کے لئے ملتان میں احراری رہنماؤں شیخ حسام الدین اور نوابزادہ نصر اللہ خان کی دولتانہ کے معتمدین عطا اللہ جہانیاں اور میر عبدالقیوم وغیرہ سے تبادلہ ہوا تھا۔[23] لیکن پنجاب میں جو مولوی ممدوٹ دھڑے سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے امتناع شراب کے مسئلہ کی آڑ لے کر گورنر موڈی اور لیاقت علی خان کی حکومت کے خلاف مہم شروع کر دی تھی۔ اس مہم کا پس منظر یہ تھا کہ ممدوٹ وزارت نے 8 رستمبر 1948ء کو ایک آرڈیننس کے ذریعے صحت مند مسلمان کے لئے شراب نوشی کی ممانعت کر دی تھی۔

24 رجنوری 1949ء کو ممدوٹ وزارت کی برطرفی کے تقریباً دو ہفتے بعد 8 رفروری 1949ء کو لاہور کے گلستان ہوٹل کے مالک محمد اسلم کو اس الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا کہ اس کے قبضہ سے بیئر کی دو بوتلیں برآمد ہوئی تھیں۔ ملزم نے اپنی اس گرفتاری کے خلاف ہائیکورٹ میں درخواست دائر کی اور اس میں یہ موقف اختیار کیا کہ صوبائی حکومت کا 8 رستمبر 1948ء کا اعلان غیر آئینی تھا اس لئے اس کے تحت اسے کوئی سزا نہیں دی جا سکتی۔ اس درخواست کی سماعت جسٹس اے۔ آر۔ کارنیلیس نے کی اور اس نے 16 رفروری کو یہ فیصلہ صادر کیا کہ ملزم کا موقف صحیح ہے اور

اس کی گرفتاری غیر قانونی ہے۔ 24رفروری کو لاہور کے ایک اخبار ''جدید نظام'' نے ہائیکورٹ کے اس فیصلہ پر سخت نکتہ چینی کی اور لکھا کہ ''جسٹس کارنیلیس نے اپنے فیصلہ میں قرآن مجید کے احکام کی تردید وتحقیر کی ہے اور یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ کتاب الٰہی کے احکام زمانہ کے ساتھ ساتھ بدل سکتے ہیں۔ جسٹس کارنیلیس ''ابن الوقت'' ہے اور اس نے صوبہ میں گورنر موڈی کا راج ہونے کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا ہے۔'' صوبائی حکومت نے جدید نظام کے اس تبصرے کا سخت نوٹس لیا اور اس اخبار کے ایڈیٹر اور پرنٹر پبلشر امین الدین صمدانی کے خلاف توہین عدالت کا مقدمہ دائر کر دیا۔ اس مقدمہ کی سماعت چیف جسٹس عبدالرشید، جسٹس محمد منیر اور جسٹس محمد شریف پر مشتمل فل بنچ نے کی اور 16رمارچ کو انہوں نے امین الدین صمدانی کو ایک ماہ قید اور 500 روپے جرمانہ کی سزا دے دی۔ ان ججوں نے اپنے فیصلہ کے آخر میں لکھا تھا کہ ''جسٹس کارنیلیس کے فیصلہ کا اسلامی احکام وقوانین سے کسی طرح بھی کوئی تعلق نہیں تھا اور اس میں مسئلہ زیر بحث کے متعلق اسلام کے احکام کی نسبت کوئی رائے ظاہر نہیں کی گئی تھی۔ یہ فیصلہ محض صوبہ کے مروجہ قوانین کے مطابق کیا گیا تھا۔ جس دن ہائی کورٹ کے فل بنچ نے یہ فیصلہ صادر کیا اسی دن نوائے وقت نے ''اسلامی حکومت کی طرف ایک اور قدم'' کے زیر عنوان ایک اداریے میں اس امر پر افسوس ظاہر کیا کہ ''اگرچہ پنجاب کے اخبارات نے متفقہ طور پر ایک مرتبہ نہیں بار بار یہ مطالبہ کیا ہے کہ ہائی کورٹ کے اس فیصلہ نے جس سقم کو واضح کیا ہے اسے دور کر کے پنجاب میں امتناع شراب کی پالیسی کو کامیاب بنایا جائے مگر گورنر بہادر کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور انہوں نے اس کا لحاظ نہیں فرمایا کہ دستور ساز اسمبلی تو قرارداد مقاصد منظور کر کے یہ اعلان کر رہی ہے کہ پاکستان کا دستور اسلامی اصولوں پر مبنی ہوگا اور پنجاب میں شرعاً حرام شراب کو قانوناً حرام قرار دے کر پھر حلال کرنا اس قرارداد پر منافقت کا لیبل چسپاں کرنے کے مترادف ہے۔''[24]

نوائے وقت کے اس اداریے میں دراصل ممدوٹی مُلّاؤں سے اشارۃً یہ کہا گیا تھا کہ بس شروع ہو جاؤ۔ چنانچہ وہ شروع ہو گئے اور صوبہ کی مختلف مساجد میں پنجاب کے انگریز گورنر سر فرانسس موڈی اور ''اینگلو۔محمڈن'' وزیر اعظم لیاقت علی خان اور اس کی بے پردہ بیگم کے نام امتناع شراب کے مسئلہ پر تنقیدی خطبوں میں شامل ہو گئے مگر اس مسئلہ پر بھرپور مہم اپریل کے اواخر میں چلی جبکہ لاہور کی ''آسٹریلین مسجد میں نماز جمعہ سے قبل مسلمانان لاہور کے ایک عظیم

اجتماع نے ایک قرارداد کے ذریعے گورنر جنرل پاکستان سے مطالبہ کیا کہ لاہور ہائی کورٹ نے مغربی پنجاب کے قانون امتناع شراب نوشی میں جو اسقام ظاہر کئے ہیں ان کو دور کرنے کے لئے فوراً ایک آرڈیننس جاری کیا جائے اور صوبائی حکومت کو ہدایت کی جائے کہ وہ قانون امتناع شراب پر فوری عمل کرے۔ انجمن مسلمانان عالم کے شعبہ امور دینی کے ڈائریکٹر مولانا ثناءاللہ خان نے یہ قرارداد پیش کرتے ہوئے کہا کہ قرارداد مقاصد کے پیش نظر حکومت پاکستان کا فرض تھا کہ وہ متعلقہ قانون میں اسقام کو دور کرنے کے لئے فوری اقدام اٹھاتی مگر افسوس ہے کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود حکومت ابھی تک ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ اس لئے ضروری ہے کہ اب مسلمانان پنجاب حکومت پر ظاہر کردیں کہ انہیں یہ تساہل بہت ناگوار گزر رہا ہے اور اگر حکومت نے امتناع شراب کے قانون پر فوری عملدرآمد نہ کیا تو مسلمانان پنجاب خود اس کے متعلق قدم اٹھائیں گے۔"[25]

جب پندرہ دن تک مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے اس الٹی میٹم کا نوٹس نہ لیا تو انجمن مسلمانان عالم پاکستان کی جانب سے مسلمانان پنجاب سے اپیل کی گئی کہ وہ "20 رمئی کو پنجاب کے طول وعرض میں یوم امتناع شراب منائیں۔ اس موقع پر متذکرہ مضمون کی قرارداد منظور کی جائے اور اس قرارداد کی نقول بذریعہ ٹیلی گرام گورنر جنرل پاکستان کراچی، حضرت شیخ الاسلام پاکستان مولانا شبیر احمد عثمانی کراچی، مولانا ثناءاللہ خان ناظم امور دینی انجمن مسلمانان عالم پاکستان لاہور اور اخبارات کو بھیج دی جائیں۔" چنانچہ اس ہدایت کے مطابق 20 رمئی کو صوبہ کے مختلف علاقوں میں یوم امتناع شراب منایا گیا۔ 24 رمئی کو مولانا شبیر احمد عثمانی نے ایک جلسہ عام میں "مسلمانان پنجاب" کے اس مطالبہ کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ "قرارداد مقاصد کے منظور ہو جانے کے بعد پاکستان میں شراب اور دیگر فواحش کا بند نہ ہونا ہمارے لئے شرمناک ہے۔ مولانا نے یقین ظاہر کیا کہ اسلامی حکومت صرف پاکستان ہی میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں قائم ہو کر رہے گی۔"[26]

باب:7

احراری مولویوں کی طرف سے جماعت احمدیہ کے خلاف بھرپور مہم کا پس منظر

جماعت احمدیہ کے سربراہ مرزا بشیر الدین کا پورے صوبہ بلوچستان کو احمدی بنانے کی مہم کا اعلان اور احراری مولویوں کا بھرپور جوابی حملہ

ممدوٹی مولویوں کی لیاقت کے خلاف مہم سے احراری مولویوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے امتناع شراب کے مسئلہ کی آڑ لے کر اپنی توپوں کے دہانے فرقہ احمدیہ کی طرف کھول دیئے۔ انہوں نے پہلی مرتبہ یکم مئی کو پنڈ دادن خان کے ایک جلسہ عام میں فرقہ احمدیہ کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود احمد اور وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان پر گولہ باری کی۔ احراریوں نے جب 15 رجنوری 1949ء کو سیاست سے کنارہ کشی کر کے اپنی توجہ صرف مذہبی تبلیغ کی طرف مبذول رکھنے کے فیصلے کا اعلان کیا تھا تو سمجھنے والے لوگ سمجھ گئے تھے کہ اب فرقہ احمدیہ کی خیر نہیں ہے۔ کیونکہ 1930ء کے بعد احراریوں کی سیاست کی سب سے بڑی بنیاد فرقہ احمدیہ سے ان کی مذہبی چپقلش تھی☆۔

تاہم فرقہ احمدیہ کے سربراہ اور اس کے دوسرے سرکردہ ارکان کو اس خطرے کا احساس نہیں ہوا تھا۔ غالباً اس لئے کہ وہ خود مذہبی دیوانگی کا شکار تھے اور اپنے فرقہ کے عقائد کی تبلیغ بڑے جارحانہ انداز سے کرتے تھے۔ اس فرقہ کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کی کوئٹہ میں 23 رجولائی

☆ تفصیل کے لیے دیکھئے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ۔ جلد 5۔ مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء ادارہ مطالعہ تاریخ۔ 1991ء

1948ء کی تقریر احراری مولویوں اور دوسرے مولویوں کے لئے واقعی بڑی اشتعال انگیز تھی اور وہ جوابی حملہ کے لئے کسی مناسب موقع کے منتظر تھے۔ مرزا بشیر کی تقریر یہ تھی کہ ''بلوچستان کی آبادی پانچ چھ لاکھ ہے اور اگر ریاستی بلوچستان کو ملا لیا جائے تو اس کی آبادی 11 لاکھ ہے۔ لیکن چونکہ یہ ایک یونٹ ہے اس لئے اسے بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ زیادہ آبادی کو تو احمدی بنانا مشکل ہے لیکن تھوڑے آدمیوں کو احمدی بنانا کوئی مشکل نہیں۔ پس جماعت اس طرف اگر پوری توجہ دے تو اس صوبے کو بہت جلدی احمدی بنایا جاسکتا ہے...... یادرکھو تبلیغ اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک ہمارا اڈہ مضبوط نہ ہو۔ پہلے اڈہ مضبوط ہو تو پھر تبلیغ پھیلتی ہے۔ پس پہلے اپنا اڈہ مضبوط کرلو۔ کسی نہ کسی جگہ اپنا اڈہ بنالو...... اگر ہم سارے صوبے کو احمدی بنالیں تو کم ازکم ایک صوبہ تو ایسا ہوجائے گا جس کو ہم اپنا صوبہ کہہ سکیں گے اور یہ بڑی آسانی کے ساتھ ہوسکتا ہے۔''[1]

ایک جمہوری معاشرے میں کسی مذہبی فرقہ کے سربراہ کی اس قسم کی تقریر عام حالات میں قابل اعتراض نہیں ہوسکتی کیونکہ جمہوری نظام حکومت میں ہر شخص کو مذہبی تبلیغ کا حق دیا جاتا ہے بشرطیکہ اس کی تبلیغ دوسروں کے مذہبی جذبات کو مجروح نہ کرے لیکن اگر مرزا بشیر الدین محمود کو علم سیاسیات سے کوئی شناسائی ہوتی تو اسے معلوم ہوتا کہ مغربی پاکستان کے جاگیرداری معاشرے میں یورپ کے صنعتی معاشرے کے جمہوری نظام کی برکتوں کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہاں جنوری 1948ء کے بعد مُلّائیت کی زبردست یلغار شروع ہوگئی تھی۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے، جو پندرہ بیس سال قبل اس کے فرقے کو مرتد اور واجب القتل قرار دے چکا تھا، شیخ الاسلام کا لقب اختیار کرلیا تھا اور امیر جماعت اسلامی ابوالاعلیٰ مودودی بھی پاکستان کی قیادت عظمیٰ کا دعویدار تھا۔ ایسے حالات میں اس قسم کی تقریر سیاسی بصیرت سے مکمل ناآشنائی کی وجہ سے ہی کی جاسکتی تھی۔

احمدی وزیر خارجہ ظفر اللہ خان کی مذہبی جنونیت...... اس نے قائداعظم کی نماز جنازہ میں شرکت نہ کی

مذکورہ تقریر کے ڈیڑھ پونے دو ماہ بعد 11 ستمبر 1948ء کو جب قائداعظم محمد علی جناح کا انتقال ہوا تو وزیر خارجہ محمد ظفر اللہ خان نے کراچی میں موجود ہونے کے باوجود ان کے جنازے میں شرکت نہ کی اور اس طرح اس نے اپنے فرقہ کے حریف مولویوں کو بہت بڑا ہتھیار

مہیا کر دیا تھا۔ ظفر اللہ خان کا بیان صفائی یہ تھا کہ چونکہ مولانا عثمانی اس کے فرقہ کو مرتد اور واجب القتل قرار دے چکا تھا اس لئے وہ اس کی زیر امامت قائد اعظم کی نماز جنازہ میں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی یہ دلیل بودی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ خود مذہبی جنونی تھا اور وہ اپنے فرقہ کے دوسرے ارکان کی طرح کسی غیر احمدی سے معاشرتی روابط نہیں رکھتا تھا یہاں تک کہ اس کی نماز جنازہ میں بھی شریک نہیں ہوا کرتا تھا۔ اس کے فرقہ کے بانی مرزا غلام احمد اور اس کے خلفا کا فتویٰ یہ تھا کہ احمدیوں اور غیر احمدیوں کے درمیان بس وہی تعلقات رہ سکتے ہیں جو مسلمانوں اور عیسائیوں یا یہودیوں کے درمیان ہوتے ہیں یعنی ایک احمدی کسی غیر احمدی کے پیچھے نماز نہیں پڑھ سکتا۔ اس کی یا اس کے بچے کی نماز جنازہ نہیں پڑھ سکتا۔ اس کی بیٹی لے سکتا ہے مگر اس کو بیٹی دے نہیں سکتا۔ بظاہر مرزا غلام احمد اور اس کے خلفا نے اپنے فرقہ کے لوگوں کے لئے یہ فتویٰ دوسرے مسلمان مولویوں کے ان کے خلاف کفر کے فتووں کے ردعمل کے طور پر صادر کیا تھا تاہم اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں گروہوں کے درمیان معاشرتی مقاطعہ کی حالت پیدا ہو گئی تھی۔

احمدیوں کی خویش پروری اور دوسروں پر معاشی سبقت قائم کرنے کی کوشش سے عام مسلمان ان کے خلاف ہو گئے

لیکن اس سے بھی شدید اور خطرناک وہ کشمکش تھی جو احمدیوں اور غیر احمدیوں کے درمیان معاشی میدان میں پیدا ہو گئی تھی۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت تھی کہ معیشت کے ہر شعبہ میں احمدیوں کو غیر احمدیوں پر ترجیح دینے اور ایک دوسرے کی مدد کر کے آگے بڑھانے کا سلسلہ جاری تھا اور اس سے دونوں گروہوں کے تعلقات کی تلخی روز بروز بڑھتی چلی گئی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ سرکاری ملازمتوں کے معاملہ میں دونوں گروہوں کی کشمکش زیادہ نمایاں تھی۔ چھوٹے بڑے احمدی اہلکاروں کی خویش پروری نے اس کو مزید ہوا دی تھی۔ اگر چہ ساری دنیا میں ہر اقلیتی فرقہ میں، خواہ اس کی بنیاد مذہب، رنگ، نسل یا ذات پر ہو، عام طور پر یہ رجحان پایا جاتا ہے اور بعض حالات میں اکثریتی فرقہ کے لوگ بھی اقلیتوں کے خلاف اسی قسم کا رویہ اختیار کرتے ہیں مثلاً برصغیر کی تقسیم سے پہلے ہندو اکثریتی فرقہ کی زندگی کے سارے شعبوں میں خویش پروری اور فرقہ پرستی نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان معاندانہ تضاد کی ایک ایسی خلیج حائل کر دی تھی جو

بالآخر برصغیر کی تقسیم کا باعث بنی۔ جہاں دو گروہوں کے درمیان مذہب، معاشرت اور معیشت میں کشمکش ہو وہاں سیاسی کشمکش کا رونما ہونا ایک بالکل قدرتی بات ہوتی ہے۔ اگر فرقہ احمدیہ کے سربراہ مرزا بشیرالدین محمود اور اس کے نائبین محمد ظفراللہ خان وغیرہ کی عقل و دانش پر مذہبی جنون نے قبضہ نہ کر لیا ہوتا تو وہ پاکستان میں اپنے جوش تبلیغ کا اس طرح اشتعال انگیز مظاہرہ کر کے احراری مولویوں کو اپنے خلاف اتنا فتنہ کھڑا کرنے کا سنہری موقع مہیا نہ کرتے۔

مرزا بشیرالدین کی دوغلی پالیسی......ایک طرف مسلم لیگ کو توڑ کر نیشنل لیگ کے قیام کی حمایت دوسری طرف مسلم ونگ کی بالادستی کی باتیں

بظاہر مرزا بشیرالدین محمود کے لئے مشکل یہ تھی کہ وہ ایک مذہبی فرقہ کا سربراہ تھا اس لئے وہ پاکستان میں ایک سیکولر نظام حکومت کے قیام کی تجویز کی کھل کر حمایت نہیں کر سکتا تھا حالانکہ مارچ 1947ء سے قبل انگریزوں کے سیکولر راج کا عقیدہ خود یہی تھا اور اس نے اور اس کی جماعت نے تحریک پاکستان کی کبھی کھل کر حمایت نہیں کی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد اس نے دوغلی پالیسی اختیار کی۔ وہ ایک طرف تو مسلم لیگ کی جگہ ایک غیر فرقہ وارانہ نیشنل لیگ کے قیام کے حق میں تھا لیکن اس کے ساتھ وہ پاکستان میں اسلامی مملکت کے قیام کی بھی حمایت کرتا تھا۔ دسمبر 1947ء میں اس نے ایک اخباری انٹرویو دیا جو اس کی دوغلی پالیسی یا منافقت کی آئینہ داری کرتا تھا۔ اس کا ایسوسی ایٹیڈ پریس کے نامہ نگار سے انٹرویو یہ تھا کہ پاکستان میں مسلم لیگ کو توڑ کر اس کی جگہ ایک نیشنل لیگ قائم کرنی چاہیے جس کی رکنیت کے دروازے غیر مسلموں پر بھی کھلے ہوں اور جس کی بنیاد سوشل ڈیموکریٹک اور انٹرنیشنل اصولوں پر رکھی جائے۔ اس نے کہا تھا کہ قیام پاکستان سے مسلم لیگ کے بڑے مقصد کی تکمیل ہوگئی ہے اور اب اس تنظیم کو پاکستان یا ہندوستان میں قائم رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگرس میں شامل ہو جانا چاہیے۔ مرزا بشیر کا خیال تھا کہ ''ہندوستان کے ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں، جنہوں نے قیام پاکستان کے لئے بے شمار قربانیاں دی ہیں، کے تحفظ کے لئے مسلم لیگ کی سمت میں تبدیلی کرنا ضروری ہے۔ اگر ہم یہاں غیر مسلموں کو گلے سے لگا لیں تو ہندوستان میں غیر مسلم، مسلمانوں کے بارے میں معاندانہ رویہ یقیناً ترک کر دیں گے۔ ہمیں ہندوستان کے مسلمانوں سے بے وفائی

نہیں کرنی چاہیے۔ اگر پاکستان میں مسلم لیگ کو توڑ دیا جائے گا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ مسلم لیگی اپنے سابقہ اصولوں سے منحرف ہو جائیں گے۔ ان کا مجوزہ نئی تنظیم میں ایک بہت مضبوط ونگ ہوگا اور وہ اپنی بھاری اکثریت سے اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہوں گے۔ ہمیں عقل و دانش پر جذبات کا پردہ نہیں ڈالنا چاہیے۔ مجوزہ قومی تنظیم میں مسلم ونگ کا مقصد پاکستان میں اسلامی مملکت کا قیام ہونا چاہیے۔ جہاں تک تھیوکریٹک مملکتوں کے احیا کے بارے میں جدید دنیا کی رائے عامہ کی مخالفت کا تعلق ہے اس کا تدارک یوں ہو سکتا ہے کہ اگرچہ مسلمانوں کو کسی صورت میں بھی اسلام کے بنیادی احکامات سے انحراف نہیں کرنا چاہیے۔ تاہم اگر مجوزہ قومی تنظیم کے اغراض و مقاصد کو ٹیکنیکل سیاسی زبان میں بیان کیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ اسلام کے بنیادی احکامات کو بڑی آسانی سے ساتھ مقبول عام، سوشل ڈیموکریٹک اور انٹرنیشنل اصولوں کی شکل دی جا سکتی ہے۔''[2]

مرزا بشیر الدین محمود کے اس عجیب و غریب انٹرویو کا پس منظر یہ تھا کہ اگرچہ بابائے پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی 11 راگست 1947ء کی پالیسی میں غیر مبہم اعلان کیا تھا کہ پاکستان میں سیکولر سیاست کی کارفرمائی ہوگی اور اکتوبر 1947ء کے اوائل میں خود جناح بھی پاکستان میں مسلم لیگ کی جگہ غیر فرقہ وارانہ نیشنل لیگ کے قیام کے حق میں تھے حالانکہ ان کی کشمیر پالیسی کی ناکامی، لاکھوں مہاجرین کی آمد اور حکومت ہندوستان کے معاندانہ رویے کی وجہ سے پاکستان کی فضا غیر فرقہ وارانہ جماعت کے قیام کے لئے سازگار نہیں تھی۔ اسی وجہ سے بعد میں انہوں نے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں اپنے اس موقف پر اصرار نہیں کیا تھا اور ان کا خیال تھا کہ پاکستان کے استحکام کے لئے فی الحال اسلام اور اسلامی اصولوں کا ذکر ضروری ہے۔ تاہم اگرچہ اگر مرزا بشیر الدین محمود سیاسی دور اندیشی کی صلاحیت سے محروم نہ ہوتا تو اسے یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اس کی یہ دلیل کہ مجوزہ نیشنل لیگ کے فیصلوں پر مضبوط مسلم ونگ ہی اثر انداز ہوگا، خود اس کے اپنے فرقے کے خلاف بھی استعمال کی جا سکتی تھی کیونکہ اس کی مجوزہ اسلامی مملکت کے فیصلوں پر اس کا اقلیتی فرقہ اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا بلکہ مسلمانوں کے وہ مضبوط فرقے ہی اثر انداز ہو سکتے تھے جن کے مذہبی پیشوا اس کے فرقے کو مرتد اور واجب القتل قرار دیتے تھے۔ مغرب کے صنعتکاروں کی سوشل ڈیموکریسی کے تصور کا مغربی پاکستان کے جاگیرداروں کی اسلامی مملکت

کے تصور سے کوئی ملاپ نہیں ہوسکتا تھا۔

مرزا بشیر الدین محمود کی اس قسم کی مذہبی سیاست کو مارچ 1948ء میں سخت دھچکا لگا جبکہ وزیر خارجہ ظفر اللہ خان اپنی زوردار وکالت اور انگریزوں کی کاسہ لیسی کے باوجود تنازعہ کشمیر پر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل سے پاکستان کے حق میں کوئی فیصلہ نہ کروا سکا۔ چنانچہ اس نے جون 1948ء میں، جبکہ پنجاب کے مُلاّؤں نے شرعی نظام کے فوری نفاذ کی مہم شروع کر رکھی تھی، پاکستان کے ارباب اقتدار کے اس موقف کو اپنا لیا کہ یہاں شریعت کا فوری نفاذ نہیں ہونا چاہیے۔ اس نے ایک جلسہ میں حاضرین سے کہا کہ ''اگر وہ اس کی بجائے اچھے مسلمان بننے کی کوشش کریں تو بہتر ہوگا اور ہمارے مذہب کا مقصد پورا ہوگا۔''[3] لیکن اس کی کوئٹہ میں 23رجولائی 1948ء کی تقریر بڑی اشتعال انگیز تھی کیونکہ اس میں تبلیغی جارحیت نمایاں تھی۔

ستمبر 1948ء میں قائداعظم کا انتقال ہوا۔ اکتوبر 1948ء میں وزیراعظم لیاقت علی خان دولت مشترکہ لندن کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گیا۔ وہاں سے وہ کمیونزم کے خلاف اسلامی اتحاد یا اسلامی بلاک کا حکم نامہ لے کر براستہ قاہرہ نومبر میں واپس پہنچا تو اس کے تقریباً ایک ماہ بعد 12ردسمبر کو مرزا بشیر الدین محمود نے لاہور کے منیارڈ ہال میں تقریر کرتے ہوئے پان اسلام ازم کے نظریے کی حمایت کی۔ اس نے کہا کہ ''اگرچہ یہ نظریہ ابتداً یورپی دانشوروں نے بدنیتی سے پیش کیا تھا، تاہم اب وقت آ گیا ہے کہ اس نظریے کو اسلامی ممالک کے درمیان ثقافتی اور تجارتی روابط قائم کر کے ٹھوس شکل دی جائے۔''[4]

احراریوں نے مرزا بشیر الدین محمود کی اس قسم کی سرگرمیوں کا اس طرح نوٹس لیا کہ انہوں نے پہلے تو 12رجنوری 1949ء کو لاہور میں دفاع پاکستان احرار کانفرنس منعقد کر کے یہ مطالبہ کیا کہ پاکستان کا آئین قرآن مجید کے ارشادات کے مطابق بنایا جائے اور وسیع پیمانے پر عسکری تعلیم جاری کر کے ساری قوم کو مسلح کیا جائے اور پھر ان کی مجلس عاملہ نے 15رجنوری کو سیاست سے کنارہ کشی کرنے اور صرف تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف ہونے کا فیصلہ کر دیا۔ احراریوں کا یہ فیصلہ دراصل مذہبی تبلیغ کی آڑ میں اینٹی احمدیہ تحریک شروع کرنے کے الٹی میٹم کی حیثیت رکھتا تھا۔

احراریوں نے ظفراللہ اور مرزا بشیر کی ہندوستان نوازی اور ملک سے وفاداری مشکوک ہونے کا پروپیگنڈا کیا جبکہ قائداعظم نے خود ظفراللہ کو اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کا سربراہ اور پھر وزیر خارجہ مقرر کیا تھا

تاہم 17 رجنوری کو ظفراللہ نے پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرز کے سالانہ ڈنر پر تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کو سچائی اور انصاف کے اصولوں پر کاربند ہونے کی تبلیغ کی۔ ظفراللہ خان نے کہا کہ ''تقسیم کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں مسابقت کی جنگ جاری رہی ہے اور دونوں نے دنیا کے سامنے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ برائی اور ظلم میں ان میں سے کون دنیا کے سامنے مثال قائم کر سکتا ہے۔ پاکستان کی بنیاد اس امر پر تھی کہ اس میں اسلام کے اصولوں پر عمل پیرا ہو کر دنیا کی رہنمائی کی جا سکے۔ ہم نے ان اصولوں کا اعلان کیا مگر ان پر عمل نہیں کیا۔ ہم نے یاس انگیز ناکامی کا منظر پیش کیا ہے۔ اسلام نے ہمیں سکھایا ہے کہ ہم برائی کو نظرانداز کر دیں تاکہ وہ شخص جو آج ہمارا دشمن ہے کل ہمارا دوست بن جائے۔ مسلمانوں کو اپنی انفرادی، اجتماعی اور سیاسی زندگی میں اسلامی اصولوں پر کاربند رہنا چاہیے۔''[5] سرظفراللہ خان کی اس تقریر کے پس منظر میں یہ حقیقت کارفرما تھی کہ اکتوبر کی دولت مشترکہ کانفرنس میں پاکستان کے ارباب اقتدار کو نہ صرف یہ ہدایت ملی تھی کہ مشرق وسطیٰ میں سوویت یونین کے اثر و رسوخ کے سدباب کے لئے اسلامی اتحاد کی تحریک چلائیں بلکہ یہ بھی حکم دیا گیا تھا کہ وہ ہندوستان کے ساتھ اپنے تنازعات ختم کر کے روس اور چین کے اشتراکی طوفان کا سدباب کریں۔ چنانچہ ظفراللہ خان کی خواہش یہ تھی کہ پاکستان ہندوستان کے ساتھ اختلافات کو نظرانداز کر کے اس کے ساتھ گہری دوستی پیدا کرے۔ جنوری 1949ء میں اس کے ''اسلامی اصول'' یعنی برطانوی سامراج کے مفاد کا تقاضا یہی تھا۔ چین میں ماوزے تنگ کی سپاہ آزادی برق رفتاری سے پیش قدمی کر رہی تھی اور جنوب مشرقی ایشیا کے سارے ممالک میں اشتراکیت کا لاوا ابل رہا تھا۔

چونکہ پنجاب کے درمیانہ طبقہ کی نظر میں ہندوستان ان کا بدترین قومی دشمن تھا اور اسے کسی صورت بھی دوست بنانا ممکن نہیں تھا اس لئے احراریوں کو اشاروں اور کنایوں میں یہ کہنے کا

موقع مل گیا تھا کہ ظفر اللہ خان فرقہ احمدیہ کے نمائندہ کی حیثیت سے پاکستان کا وفادار نہیں ہے اور اس فرقہ کا سربراہ مرزا بشیر الدین محمود دوبارہ قادیان کو مذہبی ہیڈکوارٹر بنانے کا متمنی ہے اور ایسا پاکستان کو ختم کر کے ہی ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے اس الزام کی تائید میں احمدیہ فرقہ کی ستمبر 1947ء میں منعقدہ کانفرنس کی کاروائی کا حوالہ دیتے تھے جس میں مشرقی پنجاب، بالخصوص قادیان کے علاقہ سے آمدہ احمدیوں کو ہدایت مل گئی تھی کہ وہ ''اپنے بیوی بچوں کو مغربی پنجاب میں چھوڑ کر جتنی جلدی ہو سکے واپس اپنے دیہات میں جا کر اجتماعی صورت میں دوبارہ وہاں آباد ہو جائیں اور جو احمدی فوری طور پر واپس نہیں جا سکتے وہ یہاں اکٹھے ہو کر رہیں تا کہ جب موقع ملے تو وہ واپس اپنے گھروں کو جا سکیں۔ اس کانفرنس میں مزید یہ فیصلہ ہوا تھا کہ پاکستان اور ہندوستان میں احمدیوں کی الگ الگ جماعتیں نہیں ہوں گی۔''[6]

اگرچہ جماعت احمدیہ کا یہ فیصلہ اس کی قومی غداری کا ثبوت نہیں تھا کیونکہ ستمبر 1947ء میں ایسے مسلمان مہاجرین کی تعداد خاصی تھی جو یہ سمجھتے تھے کہ ان کی مشرقی پنجاب سے ہجرت عارضی ہے اور وہ جلدی ہی اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں گے۔ تاہم احراریوں نے احمدیوں کے اس فیصلہ سے سیاسی فائدہ اٹھایا جس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ فرقہ احمدیہ کا سربراہ مرزا بشیر الدین فی الحقیقت قادیان کو اپنے فرقہ کا ''مقدس شہر'' تصور کرتا تھا اور بہر صورت اس قصبہ کو اپنا ہیڈکوارٹر بنانے کا متمنی تھا۔ اس فرقہ کے بانی مرزا غلام احمد کی قبر وہیں تھی۔

احراری مولوی جب جماعت احمدیہ کی کانفرنس کے مذکورہ فیصلے کا ذکر کرتے تھے تو وہ اس حقیقت کا ذکر نہیں کرتے تھے کہ اس کانفرنس کے دو تین دن پہلے قائداعظم جناح نے سر محمد ظفر اللہ خان کو پاکستانی وفد کے قائد کی حیثیت سے اقوام متحدہ بھیجا تھا۔ اس نے 2 نومبر 1947ء کو امریکہ کی ییل یونیورسٹی (Yale University) کے طلبا کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''پاکستان ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کے اس نظریے کی بنا پر وجود میں آیا ہے کہ ثقافت اور معاشی انصاف سے متعلقہ ان کے اصول بنی نوع انسان کی ترقی و خوشحالی میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں اور یہ کہ ان اصولوں کا تحفظ ہونا چاہیے اور انہیں فروغ ملنا چاہیے۔ آج کل پاکستان کی عنان اقتدار جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے ان کا عزم یہ ہے کہ اس نوزائیدہ مملکت میں حقیقی جمہوری اصولوں کو بلا روک ٹوک فروغ حاصل ہوگا۔ پاکستان میں کسی گروہ یا فرقہ پر کسی قسم کا

کوئی جبر نہیں ہوگا بلکہ حکومت عوام کے سارے حلقوں کو ہر جائز آزادی دے گی اور انہیں ترقی کے مواقع مہیا کرے گی۔"[7] اس تقریر سے ظاہر تھا کہ اس نے پاکستان کو صدق دل سے قبول کر لیا ہوا تھا اور اس کا خیال تھا کہ یہاں قائداعظم جناح کی 11 راگست 1947ء کی تقریر کے مطابق جدید جمہوری نظام رائج ہوگا۔ اس نے اس تقریر میں اسلامی اصولوں یا اسلامی نظام یا اسلامی جمہوریت کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا لیکن جب وہ دسمبر میں اقوام متحدہ سے واپس آیا تو اس نے یہاں اسلام اور اسلامی اصولوں کا چرچا سن کر سندھ مدرسہ کے طلبا و طالبات کے ایک اجتماع میں انہیں تلقین کی کہ "وہ قرآنی اقدار پر عمل پیرا ہوں۔ قرآن کا فرمان عالمگیر ہے، قرآن مجید سے رہنمائی ملتی ہے، یہ ایک ایسا ضابطہ ہے جس پر عمل کرنا چاہیے اور قرآن کے مطالعہ سے ثقافت کی بنیاد قرآنی اقدار پر رکھی جاتی ہے...... قرآن مجید آج بھی تروتازہ ہے جتنا کہ اس وقت تھا جبکہ اس کا نزول ہوا تھا۔"[8] ظفر اللہ خان نے جب یہ تقریر کی تھی اس وقت قائداعظم جناح نے اسے وزیر خارجہ مقرر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وزیراعظم لیاقت علی خان اس وزارت کا قلمدان اپنے ہی پاس رکھنا چاہتا تھا اور ملک فیروز خان نون بھی، جسے قائداعظم نے ستمبر 1947ء میں مشرق وسطیٰ کے خیر سگالی کے دورے پر بھیجا تھا، اس عہدے کا امیدوار تھا مگر قائداعظم نے ان دونوں پر ظفر اللہ خان کو ترجیح دی تھی۔

پنجاب کے درمیانہ طبقہ میں تاثر کہ ظفر اللہ خان انگریزوں اور یہودیوں کا پٹھو ہے

ظفر اللہ خان نے جب 25 ردسمبر 1947ء کو وزارت خارجہ کا حلف اٹھایا تو اس وقت پاکستان کی خارجہ پالیسی کی بنیاد ہندوستان کے ساتھ دشمنی پر تھی۔ تقریباً ایک سال کے بعد جب انگریزوں کے کہنے پر کشمیر میں جنگ بندی ہوئی تھی تو ان دونوں ملکوں کے درمیان دشمنی میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی بلکہ پنجاب کے درمیانہ طبقہ میں احساس شکست خوردگی کے باعث اس میں اضافہ ہوا تھا۔ ایسے موقع پر ظفر اللہ خان نے پاکستانیوں کو ہندوستانیوں کے ساتھ گہری دوستی کرنے کی تلقین کر کے اپنی سیاسی بے تدبیری و بے بصیرتی کا ثبوت دیا تھا۔ پھر چند دن بعد نوائے وقت میں اس کے کراچی کے نامہ نگار کا ایک مکتوب چھپا تو ظفر اللہ خان کے خلاف پنجاب کے درمیانہ طبقہ کی برہمی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اس مکتوب میں "ہمارے دفتر خارجہ میں غیر ملکی

اثرات'' کے زیر عنوان لکھا تھا کہ ''درون راز حلقوں کا یہ کہنا ہے کہ آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والی لیاقت کے باوجود ہماری ڈپلومیٹک پالیسی اندر سے کھوکھلی ہے اور یہ حالت اسی طرح رہے گی بلکہ زبوں تر ہوتی چلی جائے گی جب تلک ہمارا دفتر خارجہ غیر ملکی اثرات اور یہودی کنٹرول سے آزادی حاصل نہیں کر لیتا۔ آپ یہ آخری فقرہ پڑھ کر چونک اٹھے ہوں گے کہ یہ کیا ہلچل ہے پاکستان کی ڈپلومیٹک اور خارجہ پالیسی اور یہودی اثر و رسوخ کے پیچھے۔ میرا ذہن خود اسے باور نہیں کر سکتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کا امور خارجہ کا محکمہ اور اس کی ڈپلومیٹک اور بین الاقوامی پالیسی کی تشکیل اور ترتیب ایک سابقہ آئی۔ سی۔ ایس۔ یہودی افسر مسٹر کریا کون کے ہاتھ میں ہے...... اور یہ اس پر بھی ختم نہیں، ہمارے فارن آفس کے دوسرے بڑے ستون انگریز ہیں (کرنل فلیچر)۔ آپ سپیشل آفیسر کہلاتے ہیں اور جائنٹ سیکرٹری کے مساوی مرتبہ رکھتے ہیں۔ پاکستان کے سفارت خانوں کی تنظیم، وہاں کے سٹاف کا تقرر اور ان پر نگرانی سب کرنل فلیچر کے ہاتھ میں ہے۔''[9]

اس مکتوب سے پنجاب میں یہ تاثر دینا مقصود تھا اور یہی تاثر لیا گیا تھا کہ وزیر خارجہ ظفر اللہ خان کی لیاقت کھوکھلی ہے، وہ انگریزوں کا پٹھو ہے اور اسی لئے سلامتی کونسل میں کشمیر کا فیصلہ پاکستان کے حق میں نہیں ہوا اور کشمیر میں جنگ بندی بھی اسی وجہ سے ہوئی ہے۔ اس نے ستمبر، اکتوبر 1947ء میں اقوام متحدہ میں فلسطینیوں کے موقف کی جو زوردار وکالت کی تھی وہ پرفریب تھی۔ درحقیقت وہ یہودی نواز ہے اور اس کی خارجہ پالیسی ایک یہودی اعلیٰ افسر کے کنٹرول میں ہے۔ گویا ظفر اللہ خان نہ صرف پاکستان کا بلکہ پورے عالم اسلام کا وفادار نہیں ہے۔

نوائے وقت کی یہ رپورٹ محض جزوی طور پر صحیح تھی۔ ظفر اللہ واقعی انگریزوں کا نہایت قابل اعتماد پٹھو تھا اور وہ کوئی بات انگریزوں کی رضامندی اور اجازت کے بغیر نہیں کرتا تھا۔ اس کی یہ ذہنیت محض اس کی ذاتی موقع پرستی کی وجہ سے ہی نہیں تھی بلکہ اس کی بڑی وجہ اس کی طفلگی ہی سے فرقہ احمدیہ سے وابستگی میں مضمر تھی۔ اس فرقہ نے انگریزوں کی زیر سرپرستی نشوونما پائی تھی۔ اس لئے اس کی انگریزوں سے وفاداری عملاً اس کے مذہبی عقیدے کا جزو بن چکی تھی۔ بالخصوص ظفر اللہ خان کی انگیریزوں سے وفاداری تو ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔

قائداعظم جناح نے جب دسمبر 1947ء میں اسے وزیر خارجہ بنایا تھا اس وقت ارنسٹ بیون (Ernest Beven) کی زیر قیادت برطانیہ کے محکمہ خارجہ کی پالیسی یہ تھی کہ تنازعہ کشمیر کا تصفیہ بذریعہ سلامتی کونسل کروا دیا جائے کیونکہ اس طرح نہ صرف سوویت یونین کے خلاف اینگلو۔ امریکی بلاک کے زیر اثر مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کا گٹھ جوڑ کرانے میں مدد ملے گی بلکہ کشمیر میں سوویت یونین کے خلاف فوجی اڈہ بھی قائم ہو سکے گا۔ خیال یہ تھا کہ ظفر اللہ خان انگریزوں کے ساتھ اپنے دیرینہ نیازمندانہ تعلقات کی وجہ سے ارنسٹ بیون کی اس پالیسی کو آگے بڑھانے میں کامیاب ہو گا مگر آزاد ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن (Mount Batten) اور برطانیہ کے وزیر خزانہ سر سٹیفورڈ کرپس (Stafford Cripps) کے دباؤ کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا اور نتیجتاً مارچ 1948ء میں سلامتی کونسل نے تنازعہ کشمیر کے حق میں جو قرارداد منظور کی وہ پاکستان کے حق میں نہیں تھی۔ تاہم ظفر اللہ خان کی انگریزوں سے وفاداری میں کوئی فرق نہ آیا اور وہ برطانوی سامراج کے مفاد میں اسلامی بلاک کے قیام کے لئے کوشاں رہا۔

لیکن اس رپورٹ کی یہ بات غلط تھی کہ پاکستان کے محکمہ خارجہ میں انگریزوں کی موجودگی اور بالخصوص ایک انگریز یہودی افسر کے اس محکمہ کی ایک کلیدی آسامی پر فائز رہنے کی ساری ذمہ داری ظفر اللہ خان پر عائد ہوتی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ ان دنوں پاکستان کی مرکزی حکومت کے تقریباً سارے محکموں میں متعدد اعلیٰ عہدوں پر انگریز فائز تھے اور ان انگریزوں میں یہودی بھی تھے۔ پاکستان کے تین صوبائی گورنر انگریز تھے۔ پاکستان کی افواج میں انگریز افسروں کی بھرمار تھی اور ان انگریز فوجی افسران میں یہودی بھی تھے۔ پاکستان کی دفاعی پالیسی انہی انگریز افسروں کے کنٹرول میں تھی حالانکہ یہ محکمہ وزیر اعظم لیاقت علی خان کے پاس تھا۔ کشمیر میں جنگ بندی بھی پاکستان کی بری فوج کے انگریز کمانڈر انچیف جنرل گریسی کی سفارش پر ہوئی تھی۔ ظفر اللہ خان نے اقوام متحدہ میں فلسطینیوں کے موقف کی جو وکالت کی تھی وہ واقعی زوردار تھی اور اس کی وجہ سے مشرق وسطیٰ میں پاکستان کے لئے خیر سگالی کے جذبات پیدا ہوئے تھے۔ لیکن احراریوں کو ان حقائق سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ انہیں ظفر اللہ خان اور فرقہ احمدیہ پر یلغار کرنے کے لئے کوئی معقول بہانہ چاہیے تھا اور وہ نوائے وقت کی اس رپورٹ نے مہیا کر دیا تھا۔

مرزا بشیر الدین کا یہ اعلان کہ ''ہمارا پاکستان میں قیام عارضی ہے اور ہم ہندوستان جا کر وہاں کے وفادار شہری بن کر رہیں گے''...... پنجاب میں احمدیوں کے خلاف مزید نفرت کا سبب بنا

پھر بات یہیں ختم نہ ہوئی۔ مارچ 1949ء کے اوائل میں فرقہ احمدیہ کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود نے خود ہی احراریوں کو مزید گولہ بارود مہیا کر دیا جبکہ اس نے ایک اخباری انٹرویو میں یہ کہہ دیا تھا کہ ''جونہی حالات درست ہو گئے ہم اپنا مرکز فوراً قادیان میں منتقل کر دیں گے اور حکومت ہند کے وفادار شہری بن کر رہیں گے۔ لاہور ہمارا عارضی مرکز ہے۔ ربوہ میں پاکستان کی احمدی تحریک کا مرکز رہے گا لیکن ہم قادیان کے سوا کسی اور جگہ کو دنیا میں احمدی تحریک کے مرکز کی حیثیت دینے کا خیال تک نہیں کر سکتے۔''

نوائے وقت کا مرزا بشیر کے اس انٹرویو پر تبصرہ یہ تھا کہ ''عام حالات میں یہ اعلان بالکل بے ضرر ہوتا مگر موجودہ غیر معمولی حالات میں حیرت انگیز ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ مرزا صاحب کا لاہور یا پاکستان میں قیام عارضی ہے اور وہ عارضی طور پر پاکستان کے شہری ہیں اور اس لئے پاکستان سے ان کی وفاداری کی نوعیت بھی عارضی ہی ہے۔ ان کا مستقل مستقر قادیان اور مستقل وطن ہندوستان ہے اس لئے ان کی مستقل وفاداری کا مرجع بھی ہندوستان ہی ہے۔ جناب مرزا صاحب ایک عرصہ سے سیاسیات پاکستان، بالخصوص کشمیر کے معاملات میں بڑی گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔ اگر ان کی پوزیشن یہی ہے کہ وہ دراصل ہندوستان کے شہری ہیں تو ظاہر ہے کہ جن صاحب کے دماغ میں ہر وقت یہ بات ہو گی کہ ان کا اصل وطن ہندوستان ہی ہے اور انہیں ہندوستان میں ہی واپس جانا ہے وہ خواہ مخواہ اپنے مستقل وطن ہندوستان کے مفاد کو اپنے عارضی وطن پاکستان کے مفاد پر ترجیح دیں گے۔ اگر یہ بات درست ہے تو مذہبی عقائد کے اختلاف کی بحث کو قطعاً نظر انداز کرتے ہوئے ہم ان کی خدمت میں بڑے ادب کے ساتھ یہ عرض کریں گے کہ وہ پاکستان اور کشمیر کے سیاسی معاملات میں بالکل دخل نہ دیں۔ ان کے قول کے مطابق پاکستان میں ان کی حیثیت ایک ہندوستانی پناہ گزین کی ہے۔ دنیا کا مسلمہ اصول یہ ہے کہ جب

ایک ملک کا آدمی عارضی طور پر دوسرے ملک میں پناہ لیتا ہے تو وہ اس ملک کی سیاست میں دخل دینے سے کلی اجتناب کرتا ہے۔''[10] نوائے وقت کا یہ تبصرہ صحیح تھا۔ فرقہ احمدیہ کے سربراہ مرزا بشیر کے نزدیک مذہبی نقطہ نگاہ سے قادیان کی حیثیت بالکل ایسی ہی تھی جیسی کہ دربار صاحب امرتسر کے مذہبی ''پانچ پیاروں'' کی نظر میں ننکانہ صاحب کی تھی۔ لیکن ان سکھ ''پانچ پیاروں'' نے یا اکالی دل کے صدر نے یا گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے صدر نے بھی یہ اعلان کرنے کی جرأت نہیں کی تھی کہ ہندوستان میں ان کا قیام عارضی ہے اور ان کا مستقل وطن پاکستان ہے۔ وہ ننکانہ صاحب کو بزور قوت فتح کرنے کی تو باتیں کرتے تھے لیکن وہ پاکستان کو اپنا مستقل وطن قرار نہیں دیتے تھے۔ مرزا بشیر نے اپنے اس انٹرویو سے فرقہ احمدیہ کے بارے میں پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے ان شکوک وشبہات کو تقویت دی تھی جو ستمبر 1947ء میں لاہور میں احمدیوں کی کانفرنس کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ مزید اس نے اس طرح وزیر خارجہ ظفر اللہ خان کی پوزیشن کو بھی بڑی زک پہنچائی تھی جس کی پاکستان اور عالم اسلام کے ساتھ وفاداری کے بارے میں احراریوں کی طرف سے شبہات پھیلائے جا رہے تھے۔ ظفر اللہ خان کے بارے میں سب کو معلوم تھا کہ وہ اپنے ''خلیفۃ المسیح'' کا دیوانہ وار وفادار تھا، اس لئے اس کی جانب سے مرزا بشیر الدین محمود سے مختلف موقف اختیار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ظفر اللہ نے دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد کے حق میں پرزور تقریر کی جبکہ وہ مرزا غلام احمد اور جماعت احمدیہ سے جنون کی حد تک وابستگی رکھتا تھا اور حد درجہ توہم پرست واقع ہوا تھا

ظفر اللہ خان نے دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد پر بحث کے دوران اپنے ''خلیفۃ المسیح'' کے اس انٹرویو سے پیدا شدہ تاثر کو دور کرنے کی کوشش کی جبکہ اس نے اس قرارداد کے حق میں مذہبی نقطہ نگاہ سے طویل تقریر کی۔ اس نے اسلامی مملکت کے قیام کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ ''مذہب کو سیاست سے الگ کرنے کے تصور کی بات مذہب کی اہمیت کو پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ مذہب کیا ہے اور اس کا کردار کیا ہے؟ مذہب ایک ایسا طرز زندگی ہے جس کی

مدد سے انسان کو اپنی روحانی، اخلاقی، جسمانی اور ذہنی ترقی کی انتہا تک پہنچنا چاہیے۔ مذہب کا کردار یہ ہے کہ ایک طرف تو انسان اور اس کے خالق کے درمیان اور دوسری طرف انسان اور انسان کے درمیان سارے شعبہ ہائے زندگی میں انتہائی خوشگوار رشتہ قائم ہو اور اسی طرح برقرار رہے۔ سیاست انسان اور انسان کے درمیان رشتے کا صرف ایک پہلو ہے۔ جو لوگ مذہبی شعبے اور سیاسی شعبے میں امتیاز کر کے انہیں الگ الگ قرار دیتے ہیں وہ مذہب کے کردار کی بہت ہی ادنیٰ تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مذہب کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے انسان کا اس کے خالق کے ساتھ روحانی رشتہ قائم ہوتا ہے اور وہ اس کو بعض رسمی اور تقریبی کارروائیوں یعنی عبادت تک محدود رکھتے ہیں۔ مذہب کے بارے میں اسلامی تصور یہ نہیں ہے۔''[11]

ظفر اللہ خان جب اپنی وکیلانہ انگریزی میں اس قسم کی باتیں کرتا تھا اور لوگوں کو قرآن پاک کی اقدار اور تعلیمات پر عمل کرنے کی تلقین کرتا تھا تو وہ یہ احساس نہیں کرتا تھا کہ وہ اسلام اور قرآن کی جو تعبیر کرتا ہے وہ احراری اور دوسرے مولویوں کے لئے قابل قبول نہیں ہوتی تھی۔ یہ سارے علما و مشائخ قرآن پاک ہی کے حوالے سے اسے اور اس کے فرقہ کو مرتد اور واجب القتل قرار دیتے تھے اور پاکستان کی اسلامی مملکت میں سارے فیصلے انہی علما و مشائخ کی تعبیر کے مطابق ہی ہو سکتے تھے۔ اسلامی مملکت پاکستان میں اس کے فرقہ کا مذہبی نقطہ نگاہ مساوی نہیں ہو سکتا تھا بلکہ ان علما و مشائخ کے مذہبی نقطہ نگاہ ہی کی کارفرمائی ہو سکتی تھی جو یہ کہتے تھے کہ مرزا بشیر الدین محمود، ظفر اللہ خان اور ان کے فرقہ کے سارے ارکان پاکستان اور عالم اسلام کے دشمن ہیں۔

ظفر اللہ خان کی مشکل یہ تھی کہ اس کی مذہبی دیوانگی اور توہم پرستی کی واقعی کوئی انتہا نہیں تھی۔ اس کی وجہ بظاہر یہ تھی کہ اس نے اپنی زندگی میں جتنے اعلیٰ مقامات حاصل کئے تھے وہ محض اس لئے حاصل نہیں کئے تھے کہ وہ بہت لائق و فائق تھا بلکہ اس لئے بھی کہ وہ فرقہ احمدیہ سے وابستہ تھا اور اپنے ''خلیفۃ المسیح'' کا چہیتا تھا۔ اس کی خودنوشت سوانح عمری ''تحدیث نعمت'' پر ایک نظر ڈالی جائے تو انسان حیران ہوتا ہے کہ جو شخص دنیاوی زندگی میں اتنے اونچے مقامات پر پہنچ سکتا ہے وہ مذہبی لحاظ سے اتنا توہم پرست بھی ہو سکتا ہے۔ وہ 1893ء میں ضلع سیالکوٹ کے ایک بارسوخ زمیندار گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا والد چودھری نصر اللہ خان سیالکوٹ میں وکالت کرتا تھا۔ اس کی والدہ کو ''اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے سچے خوابوں اور بشارتوں سے نوازتا تھا۔

والدہ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی (یعنی مرزا غلام احمد کی) بیعت بھی اپنے خوابوں کی بنا پر کی تھی اور چند دن بعد والد صاحب نے بھی بیعت کر لی تھی جبکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام آخیر ستمبر اور شروع اکتوبر 1904ء میں سیالکوٹ میں جلوہ افروز تھے۔" خود ظفر اللہ خان نے "16ر ستمبر 1907ء کو بعد نماز ظہر مسجد مبارک میں حضور کی خدمت میں گزارش کی کہ میری بیعت قبول فرمائی جائے اور حضور نے اجازت بخش دی۔" 1908ء میں جب مرزا غلام احمد کا انتقال ہوا تو" حضور کی تدفین مقبرہ بہشتی میں عمل میں آئی۔"

ظفر اللہ خان 1911ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کرنے کے بعد یہ اجازت لینے کے لئے قادیان گیا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان جائے کہ نہ جائے۔ اس پر خلیفۃ المسیح الاول نے ارشاد فرمایا کہ" آپ بھی اور آپ کے والد صاحب بھی استخارہ کریں۔ اگر اطمینان ہو تو اجازت ہے۔" اس پر اس نے قادیان میں ہی استخارہ کیا اور دوسری یا تیسری رات کو وہ ابھی سویا ہی تھا کہ اسے ایسے محسوس ہوا کہ کوئی شخص اس کی چارپائی کے پاس کھڑا ہے اور اس نے اسے مخاطب کر کے کوئی بات کہی۔ جس کا پہلا حصہ تو اس کی سمجھ میں نہ آسکا لیکن آخری الفاظ جو تھے وہ یہ تھے" تو پھر انگلستان جاؤ" چنانچہ وہ بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے انگلستان چلا گیا۔

اس کے بعد اس کی زندگی میں شاید ہی کوئی ایسا بڑا واقعہ ہوا تھا جس کے بارے میں اس کے بقول یا تو" خلیفۃ المسیح" کو پہلے بشارت نہیں ہوئی تھی یا اس کی والدہ نے پہلے خواب نہیں دیکھا تھا یا اس کے دوست چودھری شمشاد علی کو خواب میں پہلے یہ پتہ نہیں چل گیا تھا۔ مثلاً دسمبر 1931ء میں اسے کار کا ایک حادثہ پیش آیا جس کے بارے میں اس کے بقول" خلیفۃ المسیح" اور اس کی والدہ کو پہلے ہی بشارت ہو گئی تھی۔" خلیفۃ المسیح" نے اسے بتایا کہ" پہلے کوئی جسمانی تکلیف پہنچے گی اس کے بعد دنیاوی مرتبے میں بلندی ہو گی۔" اور اس کی والدہ نے اسے بتایا کہ "میں نے اس سے پہلی رات خواب دیکھا کہ سیاہ بادل اٹھا ہے اور آسمان پر چھا گیا ہے اس اندھیرے میں بجلی گری اور دہشتناک کڑک کی آواز آئی۔ ساتھ ہی بادل چھٹ گیا اور روشنی ہو گئی۔ لوگوں نے کہا خیر ہی خیر رہی البتہ ساتھ والے مکان پر بجلی گری اور اس کی چھت اڑ گئی ہے۔ چنانچہ والدہ کا یہ خواب سچا نکلا۔ پہلے حادثہ پیش آیا، پھر اس کے دوست چودھری شمشاد علی کا انتقال ہو گیا اور پھر وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسلری مل گئی۔

اس کے بقول ''خلیفۃ المسیح الثانی'' نے دوسری جنگ عظیم کے بارے میں دومرتبہ رویا دیکھا تھا اور دونوں مرتبہ ہو بہو صحیح ثابت ہوا تھا حتیٰ کہ امریکہ نے برطانیہ کو جو جنگی جہاز دیئے تھے ان کی تعداد بھی بالکل اتنی ہی تھی جتنی کہ ''حضرت خلیفہ نے رویا میں دیکھی تھی۔'' اسی طرح فیڈرل کورٹ کی ججی پر تقرر کے بارے میں بھی اس نے خود تین خواب دیکھے تھے جن کی تعبیر یہی تھی کہ کوئی عہدہ ملنے والا ہے۔

مختصر یہ کہ توہم پرستی کی اس قسم کی باتوں سے اس کی سوانح عمری بھری پڑی ہے جنہیں پڑھ کر ذہن میں بار بار سوال اٹھتا ہے کہ اس شخص کی ذہنی نشوونما کس سطح تک ہوئی تھی اور یہ کس زمانے کی مخلوق تھا۔ اس کی قابلیت وصلاحیت غالباً اس حد تک ہی تھی کہ اسے انگریزی زبان پر اچھا خاصا عبور تھا۔ اس نے انگریزوں کے علم قانون پر اچھی خاصی دسترس حاصل کر لی تھی اور یہ اپنی محنت اور وفاداری کے علاوہ ''خلیفۃ المسیح'' اور سر فضل حسین کی نظر عنایت کے باعث انگریز سامراجیوں کا مکمل اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ابتداً اس کی وکالت چمکنے کی وجہ یہ تھی کہ جماعت احمدیہ کے ارکان کے بیشتر دیوانی وفوجداری مقدمات اس کے پاس آتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی اس کا اور اس کے فرقہ احمدیہ کا ستارہ ڈیڑھ سال تک عروج پر رہا۔ لیکن 1949ء کے ابتدائی چند مہینوں میں چند ایک ایسے واقعات ہوئے کہ جن سے پتہ چلتا تھا کہ اب اس کی اور اس کے فرقہ کی خیر نہیں ہے۔

ظفر اللہ پر الزام کہ اس نے کشمیر کے متعلق سرکاری راز مرزا بشیر کو بتائے ہیں...... مرزا کا تاویلاتی دفاعی بیان بے اثر رہا، احراری مولویوں نے احمدیوں کے خلاف بھرپور مہم کا آغاز کر دیا

نوائے وقت میں 5/مارچ 1949ء کے اداریے کے بعد مجلس احرار کے فتنہ پرور مولویوں کے حملے کے لئے میدان صاف ہو گیا تھا اور اگر اس سلسلے میں کوئی کسر رہ گئی تھی تو وہ بھی چند دن کے بعد پوری ہو گئی جبکہ بعض اخبارات نے مرزا بشیر الدین محمود سے منسوب کر کے یہ خبر شائع کی کہ پاکستان کے وزیر خارجہ ظفر اللہ خان نے اور بعض فوجی افسروں نے اسے کشمیر کے

بارے میں بعض سرکاری رازوں سے مطلع کر دیا ہے۔ 15/ مارچ کو مرزا بشیرالدین نے ایک پریس کانفرنس میں اس الزام کی تردید کرتے ہوئے بتایا کہ ظفراللہ خان نے اس کے استفسار پر اسے صرف یہ بتایا تھا کہ کشمیر کی تقسیم کی کوئی تجویز حکومت پاکستان کے زیر غور نہیں ہے۔ اور بعض فوجی افسروں نے اسے یہ بتایا تھا کہ اس سے پونچھ اور کشمیر کے بعض لوگوں نے جو باتیں کہیں تھیں وہ صحیح نہیں تھیں اور ان کی وجہ سے کسی خطرے کا امکان نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ ظفراللہ خان نے اسے جو کچھ بتایا تھا وہ محکمہ خارجہ کا کوئی راز نہیں اور فوجی افسروں نے اسے جو کچھ بتایا تھا وہ کوئی فوجی راز نہیں تھا۔ ان سب نے صرف غلط افواہوں کی تردید کی تھی اور بطور پاکستانی ان کا فرض یہی تھا۔ مرزا بشیرالدین نے اس الزام کی، کہ وہ قادیان کو اپنا مستقل ہیڈکوارٹر تصور کرتا اور وہاں جا کر ہندوستان کے وفادار شہری کی حیثیت سے رہنے کا متمنی ہے، ان الفاظ میں تردید کی کہ ''دراصل بات یہ ہے کہ ایک خبر رساں ایجنسی کے مالک نے مجھ سے پوچھا کہ کیا احمدی قادیان جانے کا خیال رکھتے ہیں یا ربوہ ان کا مستقل مرکز ہوگا۔ میں نے ان سے جواباً کہا کہ ''قادیان ایک مذہبی مرکز ہے اور اس سے ہر ملک کے احمدی مذہبی عقیدت رکھتے ہیں اس لئے اس کے مرکز ہونے کی حیثیت کو میں یا اور کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ جب بھی وہاں حالات سازگار ہوں گے وہ احمدی جو وہاں عقیدت یا کام کی وجہ سے جا سکتے ہوں، جائیں گے۔ اس کے علاوہ انتظامی طور پر میں نے ہندوستان یونین کے سوا دوسرے تمام احمدیوں کو پاکستان کے ماتحت کر دیا ہے تاکہ کوئی سیاسی پیچیدگی پاکستان کے خلاف پیدا نہ ہو اور اسی وقت دوسرے ممالک کے احمدیوں کو قادیان کے ماتحت کیا جائے گا جب پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جو الجھن ہے وہ دور ہو جائے۔ یقیناً یہ بات پاکستان کے حق میں تھی اور ہے۔ اگر پاکستان سے ہمیں وفاداری نہ ہوتی تو پاکستان کے باہر احمدیوں کو ہم پاکستان کے مرکز کے ماتحت کیوں کرتے۔''[12]

مرزا بشیرالدین محمود کا پریس کانفرنس میں یہ تاویلاتی بیان صحیح تھا یا غلط، احراری مولویوں کی اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہیں احمدیوں کے خلاف نوائے وقت کی 28/ جنوری کی خبر اور 5/ مارچ کے ادارتی تبصرے نے خاصا بارود مہیا کر دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے پہلے تو اپریل کے وسط میں مسلم لیگ کے دولتانہ دھڑے سے گٹھ جوڑ کیا اور پھر یکم مئی 1949ء کو انہوں نے پنڈ دادن خان کے ایک جلسہ عام میں احمدیوں پر بھرپور حملہ شروع کر دیا۔ بس پھر اللہ دے اور

بندہ لے۔ جگہ جگہ ان کی تبلیغی کانفرنسیں شروع ہو گئیں۔ جن میں مطالبہ یہ ہوتا تھا کہ احمدیوں کو ایک غیر مسلم اقلیتی فرقہ قرار دیا جائے اور چودھری ظفر اللہ خان و دوسرے احمدیوں کو کلیدی مناصب سے ہٹایا جائے۔

باب:8

مُلّاؤں نے جاگیرداری اور زمینداری نظام کے حق میں فتوے دیئے اور کسانوں کے لئے زرعی اصلاحات کی مخالفت کی

کسانوں کی قیام پاکستان سے وابستہ امید کہ انہیں انگریزوں کے پروردہ جاگیرداروں کے استحصال سے نجات ملے گی، کسان تحریکوں کی شکل میں ظاہر ہونے لگی

1949ء کے ابتدائی مہینوں میں ایک اور مسئلہ جو پاکستان کے فتویٰ فروش مُلّاؤں کی توجہ کا مرکز بنا وہ جاگیرداری یا زمینداری نظام کا مسئلہ تھا۔ یہ مسئلہ دراصل قیام پاکستان کے فوراً ہی بعد اٹھ کھڑا ہوا تھا کیونکہ برصغیر کے مسلم اکثریتی علاقوں کے غریب مسلم کسانوں نے 46-1945ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کو اس امید میں ووٹ دیئے تھے کہ انہیں پاکستان میں ان جاگیرداروں یا زمینداروں کے ظالمانہ استحصال سے نجات ملے گی جو اپنے انگریز آقاؤں کی نظرعنایت سے وسیع رقبہ جات اراضی کے مالک بنے ہوئے تھے۔ اگرچہ مشرقی پاکستان میں اس مسئلہ کو بآسانی حل کیا جاسکتا تھا کیونکہ وہاں کے زمینداروں کی بہت بھاری اکثریت ہندوؤں کی تھی اور ان میں سے زیادہ تر کلکتہ میں قیام پذیر تھے۔ تاہم خواجہ ناظم الدین وہاں اپنے ایک سالہ عہد اقتدار میں اس مسئلہ کو مختلف حیلوں بہانوں سے ٹالتا رہا۔ اس نے اس مقصد کے لئے علما اور مشائخ کی خدمات سے بھی فائدہ اٹھایا۔ لیکن جب فروری 1948ء میں کلکتہ میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا

کی کانگریس کے بعد میمن سنگھ اور بعض دوسرے علاقوں میں کسانوں کی مسلح جدوجہد شروع ہوئی تو نورالامین کی حکومت نے پہلے تو مولانا شبیر احمد عثمانی اور دوسرے علما اور مشائخ کی اشتراکیت کے خلاف خطبوں اور فتووں کے ذریعے اس جدوجہد کو دبانے کی کوشش کی مگر جب اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی تو اسے یہ اعلان کرنا پڑا کہ مشرقی بنگال میں زمینداری نظام کو منسوخ کرنے کے لئے مسودہ قانون تیار کیا جا رہا ہے جو صوبائی اسمبلی کے 1950ء کے بجٹ سیشن میں پیش کر دیا جائے گا۔

مغربی پاکستان میں سب سے پہلے یہ مسئلہ نومبر 1947ء میں اٹھا جبکہ پنجاب کے وزیر بحالیات میاں افتخار الدین نے مہاجرین کی آبادکاری کے بارے میں اپنے منصوبے پر صوبائی کابینہ سے اختلاف کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا اور پھر اس نے جاگیرداری اور زمینداری نظام کے خلاف پورے صوبے میں ایک زوردار مہم چلائی۔ اس پر پنجاب کے بڑے بڑے جاگیردار بوکھلا اٹھے اور انہوں نے میاں افتخار الدین کے ''غیر اسلامی'' نظریات کے خلاف مُلاّؤں کی خدمات حاصل کیں۔ ان مُلاّؤں میں ایک ابوالاعلیٰ مودودی بھی تھا جس کی جنوری 1948ء میں ایک ریڈیائی تقریر یہ تھی کہ اسلام کی رو سے نجی ملکیت پر کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی۔ تاہم میاں افتخار الدین کے اس ''اشتراکی یا غیر اسلامی'' پروپیگنڈے اور مُلاّؤں کی شرعی نظام کی مہم کے دوران ان کے ''اسلامی اصولوں'' کا نتیجہ یہ نکلا کہ سندھ اور صوبہ سرحد کے کسانوں نے بھی مقامی کمیونسٹوں کی زیر قیادت اپنے مطالبات منوانے کے لئے جلسوں اور کانفرنسوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

سندھ کی ہاری رپورٹ، ایم مسعود کے اختلافی نوٹ میں کسانوں کی زبوں حالی......مُلاّؤں کا اس کے خلاف اشتراکی ہونے کا فتویٰ

سندھ میں چونکہ قیام پاکستان کے کچھ عرصہ قبل زیر کاشت اراضی کا تقریباً 40 فیصد رقبہ ہندو ساہوکاروں کی تحویل میں جاچکا تھا اس لئے وہاں 46-1945ء میں ہی کچھ تو فرقہ وارانہ تضاد کی وجہ سے اور کچھ طبقاتی تضاد کی وجہ سے ہاری تحریک خاصا زور پکڑ چکی تھی۔ چنانچہ 1946ء میں سندھ کی مسلم لیگی حکومت نے ایک انگریز سر راجر تھامس (Roger Thomas) کی زیر صدارت ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر کے اسے یہ ہدایت کی کہ وہ ہاریوں کی زبوں حالی کا جائزہ لے کر ان کی اصلاح احوال کے لئے اپنی رپورٹ پیش کرے۔ اس کمیٹی میں ایک مسلمان آئی۔ سی۔ ایس،

ایم۔ مسعود بھی شامل تھا۔ اس کمیٹی نے ڈیڑھ دو سال کے بعد فروری 1948ء میں اپنی رپورٹ پیش کی جس میں اکثریتی رائے یہ تھی کہ پیداوار کی تقسیم کے نظام میں قدرے تبدیلی کر کے ہاریوں کو کچھ رعایات دی جائیں لیکن ایم مسعود کا مئی 1948ء کا اختلافی نوٹ یہ تھا کہ صوبہ میں ہاریوں کی حالت نا قابل بیان حد تک بری ہے اس لئے صوبہ میں کمیونزم کے سدباب کے لئے ضروری ہے کہ یہاں کے ظالمانہ زمینداری نظام کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اس وقت صوبہ کا وزیر اعلیٰ سندھ کے زمینداروں کا سب سے بڑا نمائندہ ایوب کھوڑو تھا۔ چنانچہ اس نے اس رپورٹ پر کوئی عمل کرنا ضروری نہ سمجھا اور اسے اپنے دفتر کی کسی الماری میں رکھ دیا۔ ویسے بھی وہ ان دنوں قائداعظم جناح کے زیر عتاب تھا اور اس کی وزارت اعلیٰ کے دن پورے ہو چکے تھے۔ مئی کے اواخر میں اس کی برطرفی کے بعد پیر الٰہی بخش وزیر اعلیٰ بنا تو اس نے بھی زمینداری کے مفاد کے تقاضے کے پیش نظر اس رپورٹ کو منظر عام پر لانا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن ایم۔ مسعود کو افسری کے علاوہ لیڈری کا بھی شوق تھا اس لئے اس نے ڈان، پاکستان ٹائمز اور دوسرے اخبارات میں اس رپورٹ کی اشاعت کے حق میں ایک پروپیگنڈا مہم چلوا دی۔ اس پروپیگنڈا کی وجہ سے سندھی ہاریوں اور طلبا کی بھی حوصلہ افزائی ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے بھی اس رپورٹ کی اشاعت کے اجتماعی طور پر مطالبے شروع کر دیئے۔ چنانچہ وزیر اعلیٰ پیر الٰہی بخش نے 1949ء کے اوائل میں صرف اکثریتی رپورٹ شائع کر دی اور ایم مسعود کا اختلافی نوٹ دبائے رکھا۔

پیر الٰہی بخش نے یہ حرکت اول تو اس لئے کی تھی کہ وہ خود زمیندار تھا اس لئے وہ اپنے اور اپنے طبقہ کے مفاد کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کر سکتا تھا۔ دوئم اس لئے کہ ایوب کھوڑو اور یوسف ہارون کے گٹھ جوڑ کے باعث اس کی وزارت ڈانواں ڈول تھی اور وہ زمینداروں کی حمایت سے برسر اقتدار رہنے کی امید کرتا تھا لیکن جب اس بنا پر اس کے خلاف یوسف ہارون کے اخبار ڈان اور افتخار الدین کے اخبار پاکستان ٹائمز اور بعض دوسرے اخباروں میں مخالفانہ پروپیگنڈا نے زور پکڑا تو اس نے جمعیت العلمائے پاکستان کے سربراہ مولانا عبدالحامد بدایونی کو ایم۔ مسعود کا اختلافی نوٹ دکھا کر اس سے اس کے خلاف ایک پمفلٹ لکھوا دیا جس پر پندرہ دوسرے مُلّاؤں کے بھی دستخط تھے۔ اس پمفلٹ میں یہ فتویٰ صادر کیا گیا تھا کہ ایم۔ مسعود اشتراکی نظریات کا حامل ہے اور اس نے زرعی ملکیت کے بارے میں غیر اسلامی رپورٹ لکھی ہے۔ تاہم یہ فتویٰ اس کے

کام نہ آیا اور 4 فروری 1949ء کو اسے وزارت اعلیٰ سے مستعفی ہونا پڑا کیونکہ انتخابی ٹربیونل نے صوبائی اسمبلی میں اس کی رکنیت کو ناجائز قرار دے دیا تھا۔ 18 فروری کو اس کی جگہ یوسف ہارون وزیر اعلیٰ بنا اور 20 فروری کو کراچی میں پاکستان مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا تو اس میں یہ قرارداد منظور کی گئی کہ ''چونکہ پاکستان کا موجودہ بندوبست اراضی دقیانوسی اور نقصان دہ ہے اور اس میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے لہٰذا مجلس عاملہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ اسلامی قانون کی روشنی میں اور صوبائی مسلم لیگوں سے مشورہ کرکے اس مسئلہ کا جائزہ لے اور اسلامی اصولوں کی روشنی میں کسانوں کے لئے حقوق کا ایک ایسا چارٹر تیار کرے جس سے ان کی موجودہ شکایات دور ہو سکیں اور عمومی طور پر سارے طبقوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کو یقینی بنایا جا سکے۔''

چونکہ قبل ازیں مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا داؤد غزنوی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور دوسرے بہت سے علما و مشائخ نوابیوں، تعلقہ داریوں، جاگیرداریوں اور زمینداریوں کو قانون شریعت کے عین مطابق قرار دے چکے تھے، اس لئے اس قرارداد کا مطلب یہ سمجھا گیا کہ مسلم لیگ کے ارباب حل وعقد جاگیرداری یا زمینداری نظام میں کسی بنیادی تبدیلی پر رضامند نہیں تھے بلکہ وہ صرف الفاظ کے زور سے کسانوں کی بے چینی دور کرنا چاہتے تھے۔ روزنامہ امروز کے ایک مراسلہ نگار کو یقین تھا کہ ''اگر جاگیرداری کا خاتمہ نہ کیا گیا تو نہ صرف یہ کہ ہماری معاشی ترقی رک جائے گی بلکہ ہم اسلامی تعلیمات پر بھی عمل نہ کر سکیں گے۔ ہمارے امرا نے ہمیشہ کتاب وسنت کو اپنی ہوائے نفسانی کے تابع رکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ آج بھی ''خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں'' کی تصویر ہیں۔ وہ اسلام کے مقدس نام کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے معاشی اقتدار کے بل بوتے پر شریعت فروش مولویوں کو اپنے قابو میں کر سکتے ہیں اور ان سے حسب منشا فتوے لے سکتے ہیں۔ اگر انہیں ختم نہ کیا گیا تو دین بازیچہ اطفال بن کر رہ جائے گا اور فتویٰ سکوں کے قالب میں ڈھلنے لگے گا۔ خلافت راشدہ کے انقراض کے بعد ان لوگوں نے جو کچھ دین اور حاملین دین کے ساتھ کیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ کیا ہم وہ داستان پھر دہرانا پسند کریں گے؟ اب وقت کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔ ہمارے کسانوں، ہمارے مزدوروں، ہمارے دکانداروں، ہمارے شہریوں اور ہمارے دیہاتیوں کو متفقہ طور پر یہ نعرہ بلند کرنا چاہیے کہ ''جاگیرداری ختم کرو۔''[1]

سرحد کے وزیر اعلیٰ قیوم خان نے مسلم لیگ اسمبلی پارٹی میں اپنے مخالف زمیندار گروپ پر دباؤ ڈالنے کے لئے جاگیرداری کے خاتمہ کے لئے ایک کمیٹی مقرر کر دی...... زمیندار گروپ نے واک آؤٹ کر کے قیوم وزارت ڈانواں ڈول کر دی

صوبہ سرحد میں کسانوں کی تحریک پر جوش بھی تھی اور پر تشدد بھی۔ گزشتہ ڈیڑھ سال کے دوران متعدد کسان، زمینداروں کے غنڈوں اور پولیس کی گولیوں سے ہلاک و زخمی ہو چکے تھے اور بیسیوں جیلوں میں مقید تھے۔ لیکن وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان نے مارچ 1949ء میں اپنے آپ کو زمینداروں کا مخالف اور کسانوں کا ہمدرد ظاہر کر کے پاکستان کے ان سیاسی حلقوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا جو صوبہ سرحد کی اندرونی سیاست اور خان عبدالقیوم خان کی سیاسی اہلیت سے اچھی طرح واقف نہیں تھے۔ خان عبدالقیوم خان نے یہ سیاسی شعبدہ بازی 8 مارچ 1949ء کو دکھائی جبکہ اس نے صوبائی اسمبلی کے بجٹ سیشن کے دوران بعض ارکان اسمبلی کی ایک سب کمیٹی مقرر کر کے اسے یہ ہدایت کی کہ وہ صوبہ میں جاگیرداری کے خاتمہ کے مسئلہ کا جائزہ لے کر اپنی رپورٹ پیش کرے۔ اس کی اس قلابازی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ واقعی مظلوم کسانوں کا بہی خواہ بن گیا تھا بلکہ وجہ یہ تھی کہ صوبائی اسمبلی میں زمینداروں کا ایک گروپ ایک عرصے سے یہ خواہش و کوشش کر رہا تھا کہ صوبائی کابینہ میں ان کے نمائندوں کو شامل کیا جائے۔ پیر زکوڑی اور نواب ٹونک ان کی طرف سے وزارت کے امیدوار تھے مگر خان عبدالقیوم انہیں اپنی کابینہ میں لینے پر آمادہ نہیں تھا کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ وہ اسمبلی میں اکثریت کی حمایت حاصل کر کے اس کا تختہ الٹ دیں گے۔ انہیں اس مقصد کے لئے سرخپوشوں اور پیر مانکی گروپ کی اعانت حاصل ہو سکتی تھی۔ مارچ 1949ء میں جب زمیندار گروپ عبدالقیوم خان سے مایوس ہو گیا تو اس نے خفیہ طور پر سکیم بنائی کہ بجٹ پر بحث کے دوران کسی تحریک تخفیف پر رائے شماری کے موقع پر اچانک حکومت کے خلاف ووٹ دے دیئے جائیں گے۔ اس طرح حزب اختلاف کی اکثریت ہو جائے گی اور عبدالقیوم کی حکومت کا تختہ الٹ جائے گا۔ لیکن قیوم خان کو اپنے خلاف اس سازش کا بروقت

پتہ چل گیا۔ چنانچہ اس نے پہلے تو زمینداروں کو خوف زدہ کرنے کے لئے 8 رمارچ کو اسمبلی کی ایک سب کمیٹی مقرر کر دی اور پھر 14 رمارچ کو صوبائی حکومت کی طرف سے یہ سرکاری اعلان ہوا کہ سرخپوشوں کی ایک سازش کا انکشاف ہوا ہے جس کے تحت وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان کو قتل کر کے کشمیر کو پاکستان کے ساتھ ملحق کرنے کی مساعی کو ناکام کرنا مقصود ہے۔ صوبہ سرحد کی پولیس نے بعض دستاویزات پر قبضہ کیا ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ ایک سرخپوش لیڈر اس سلسلے میں ہندوستان کے ایک ''پنڈت صاحب'' سے (یعنی پنڈت نہرو سے) خط و کتابت کرتا رہا تھا۔ اس سازش میں ملوث ہونے کے الزام میں ضلع ہزارہ کے جن آٹھ افراد کو گرفتار کیا گیا ہے ان میں صوبائی اسمبلی کا ایک رکن خان عبدالقیوم خان سواتی بھی شامل ہے۔''[2]

حکومت سرحد کے سرکاری اعلان پر مشتمل یہ خبر 15 رمارچ کو اخبارات میں چھپی تو پورے پاکستان میں سنسنی پھیل گئی۔ عام لوگوں کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ صوبائی حکومت اتنا بڑا جھوٹ بھی بول سکتی ہے۔ سچی بات یہ تھی کہ یہ بہت بڑا جھوٹ تھا۔ کسی سرخپوش لیڈر نے پنڈت جواہر لال نہرو سے کوئی خط و کتابت نہیں کی تھی اور نہ ہی عبدالقیوم خان کو قتل کرنے کی کوئی سازش ہوئی تھی۔ سازش اگر ہوئی تھی تو وہ یہ تھی کہ خان عبدالقیوم خان سواتی نے اسمبلی میں عبدالقیوم خان کا تختہ الٹنے کے لئے زمیندار گروپ کو اپنے گروپ کی حمایت کا خفیہ طور پر یقین دلایا تھا۔ اگر یہ سازش کامیاب ہو جاتی تو عبدالقیوم خان کا جسمانی قتل نہ ہوتا بلکہ اس کی سیاسی موت واقع ہو جاتی۔ عبدالقیوم خان نہایت بددیانت، موقع پرست، منافق، دروغ گو، شقی القلب، رشوت خور اور خویش پرور آدمی تھا۔ اس کے سیاسی نامہ اعمال میں دیانت، خلوص، اصول پسندی اور وسیع القلبی کا نام و نشان نہیں ملتا تھا۔ قائداعظم جناح کو صوبائی گورنر کننگھم (Cunningham) کی خفیہ رپورٹوں سے اور دوسرے ذرائع سے اس کی ان ناقابل برداشت بدعنوانیوں کا علم ہو گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس کو کسی مناسب موقع پر وزارت اعلیٰ کی گدی سے الگ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور انہوں نے اپنے فیصلہ کا عندیہ اپریل 1948ء میں پشاور کے ایک جلسہ عام میں بھی دیا تھا☆ مگر بدقسمتی سے وہ جلدی ہی بہت علیل ہو گئے اور اس طرح انہوں نے

☆ تفصیل کے لیے دیکھئے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ۔ جلد 8۔ افغانستان کا تاریخی پس منظر اور پختون مسئلہ خود مختاری کا آغاز۔ ایڈیشن دوم 2014ء ادارہ مطالعہ تاریخ

صوبہ سرحد کے عوام سے اعلانیہ طور پر جو وعدہ کیا تھا وہ پورا نہ کر سکے تھے۔

عبدالقیوم خان نے قائداعظم کی اس علالت کا فائدہ اٹھایا اور اس نے وزیراعظم لیاقت علی خان سے گٹھ جوڑ کر کے پہلے تو جون 1948ء میں گولیوں کی بوچھاڑ سے بھابڑہ میں سرخپوشوں کی لاشوں کا انبار لگا دیا اور پھر متعدد سرخپوش ارکان اسمبلی کو گرفتار کر کے اپنی پوزیشن مستحکم کر لی تھی۔ جب اسے پنجابی شاونسٹوں کی طرف سے اپنی اس وحشیانہ کاروائی کی بھرپور تائید وحمایت ملی تو وہ اور بھی شیر ہو گیا اور اسے اپنے دائیں بائیں آگے پیچھے جو مخالف بھی نظر آیا اس نے اسے کچلنے میں کسی بھی کاروائی سے دریغ نہ کیا۔ اس نے اس طرح صوبہ سرحد کو ایک سیاسی قبرستان بنا دیا جہاں کسی کو فریاد کرنے یا تڑپنے کی اجازت نہیں تھی۔ بایں ہمہ مارچ 1949ء میں صوبائی اسمبلی میں زمینداروں کے اس گروپ نے اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ایک خفیہ سکیم بنائی جو سرخپوشوں کی متذکرہ سنسنی خیز ''سازش'' کے انکشاف کی وجہ سے 14/مارچ کو ناکام ہو گئی۔

اس سے اگلے دن 15/مارچ کو اسمبلی کے سات زمیندار ارکان یعنی نواب قطب الدین آف ٹونک صدر ڈیرہ اسماعیل خان مسلم لیگ۔ سردار اسد اللہ خان رکن دستور ساز اسمبلی و کونسلر مسلم لیگ، پیر عبداللطیف زکوڑی شریف، راجہ سردار خان آف ہزارہ، سلطان حسن علی خان آف ٹوپی، مصارف خان اور ارباب محمد شریف خان نے وزارتی گروپ سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے عبدالقیوم خان کی قیادت پر عدم اعتماد کا اظہار کیا اور اسمبلی سے واک آؤٹ کر گئے۔ تاہم انہوں نے کہا کہ وہ حسب سابق مسلم لیگ کے رکن رہیں گے۔ ان کا مزید بیان یہ تھا کہ ''جاگیرداری نظام کو ختم کرنے اور مزارعین کو حق ملکیت دینے کے متعلق وزیراعلیٰ کی اشتراکی، تخریبی اور غیر اسلامی روش کی وجہ سے انہوں نے صوبہ سرحد کی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی سے قطع تعلق کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''[3]

وزارتی مشن پارٹی کے ان سات ارکان کی علیحدگی کے بعد اسمبلی میں پارٹی پوزیشن یہ تھی:

خالی نشستیں	3
نظر بند ارکان	7
حزب مخالف	3
جاگیردار گروپ	7
وزارتی گروپ	19

وزارتی گروپ میں مرکزی حکومت کا ڈپٹی منسٹر سردار بہادر خان اور صوبائی اسمبلی کا سپیکر نوابزادہ خان بھی شامل تھے۔ گویا اس کے بعد عبدالقیوم خان کی وزارت واضح طور پر ایک اقلیتی وزارت تھی۔ مگر زمینداروں کے گروپ نے عبدالقیوم خان کی حمایت سے دست کش ہونے کی جو وجہ بیان کی وہ ان کی سیاسی ناپختگی کی علامت تھی۔ انہوں نے عبدالقیوم خان پر اشتراکیت کا لیبل لگا کر اور اپنے جاگیردارانہ مفاد کے تحفظ کے لئے اسلام کی آڑ لے کر خود اپنا سیاسی بیڑا غرق کر لیا تھا۔ عبدالقیوم خان غریبوں کا ''ہمدرد'' بن گیا۔ اس نے 17 رمارچ کو گندم اور مکئی کے نرخوں میں قدرے تخفیف کی اور اعلان کیا کہ ''غریبوں کی خاطر امرا کے خزانوں کا منہ کھول دیا جائے گا۔''

''اسلامی جمہوریت'' اور ''اسلامی سوشلزم'' کے نعرے غریب عوام کو کچھ نہ دے سکے

روزنامہ امروز زمینداروں کے متذکرہ ''اسلامی اعلان'' اور قیوم خان کے اس ''اشتراکی اعلان'' سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنے ایک اداریے میں صوبہ سرحد کے ان زمینداروں کو خوب رگیدا اور بالواسطہ طور پر عبدالقیوم خان کی حمایت کی۔ اس نے لکھا کہ ''صوبہ سرحد کی حکومت نے ابھی زمینداری وجاگیرداری کے خاتمہ کا فیصلہ نہیں کیا بلکہ محض سرسری طور پر یہ مسئلہ اسمبلی میں زیر بحث آیا ہے لیکن مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے ایک پیر اور چھ جاگیرداروں کو یہ سرسری بحث ناگوار گزری۔ الزام یہ ہے کہ جاگیرداری کے خاتمہ اور تنسیخ زمینداری کی باتیں تک خلاف شرع ہیں اور جس کی زبان پر یہ بحث آئے وہ کمیونسٹ ہے...... وہ بھی ایک دور تھا جب اسلام نے اقتصادی ناانصافی، معاشی لوٹ کھسوٹ اور معاشرتی عدم مساوات کو جڑ سے اکھیڑ پھینکا تھا۔ لیکن کتنی عبرت کا مقام ہے کہ اسلام ہی کے نام پر آج جاگیرداری اور زمینداری کو مسلط رکھنے کی علی الاعلان باتیں ہو رہی ہیں۔ جس شریعت کی رو سے بڑے بڑے شاہوں اور مطلق العنان سلطنتوں کے قصرہائے استبداد ڈھا دیئے گئے تھے، آج اس کی رو سے طاغوتی نظام معیشت اور فرسودہ زرعی بندوبست کے خلاف زبان کھولنا جرم قرار دیا جا رہا ہے۔ آج اگر کوئی مسلمان یہ دعویٰ کرے کہ فصل اس کی ہے جو کاشت کرتا ہے، پھل وہ کھائے جو محنت کرتا ہے تو پیر صاحب زکوڑی شریف کی شریعت کی رو سے وہ مسلمان نہیں رہتا بلکہ کمیونسٹ ہو جاتا ہے۔ پیر صاحب کو غالباً علم

نہیں کہ کسی زمانے میں ان ہی جیسے لوگ جاگیرداری، لوٹ کھوسٹ اور ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھانے والے ہر فرد پر ''مسلمان'' ہونے کا ''الزام'' لگایا کرتے تھے۔ صوبہ سرحد کے جاگیرداروں کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ وقت اور زمانہ فرسودہ جاگیری نظام کے خلاف فیصلہ دے چکا ہے۔ اس گلے سڑے نظام کی گرتی ہوئی عمارت کو اب کوئی پیر نہیں جما سکتا۔ اسلام کے مقدس نام کو ناانصافی کے جواز اور لوٹ کھسوٹ کی تائید کے لئے استعمال مت کیجئے۔ مسلمان عوام حضرت ابوذر غفاری کی تعلیمات، شاہ ولی اللہ کی تشریحات اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے صریحی فتووں پر پیر زکوڑی شریف کی تاویلوں کو ترجیح نہیں دیں گے۔''[4]

بلاشبہ امروز کے اس اداریے میں صوبہ سرحد کے عوام دشمن پیروں اور جاگیرداروں کی مذمت کر کے بڑے خلوص کے ساتھ ملک کے فرسودہ نظام معیشت میں بنیادی تبدیلی پر زور دیا گیا تھا۔ لیکن اس اخبار کے اداریہ نگار کی بھی مشکل وہی تھی جو لیاقت علی خان اور اس کے ساتھیوں کی تھی۔ لیاقت علی خان وغیرہ سرمایہ دارانہ یا بورژوا نقطہ نگاہ سے اسلام کی تعبیر کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ اسلام اور مغرب کے جدید جمہوری نظام کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔ وہ اپنے اسلامی نظریے کو اسلامی جمہوریت کا نام دیتے تھے اور امروز کا اداریہ نگار اور اس کے مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے دوسرے عناصر سوشلسٹ نقطہ نگاہ سے اسلام کی تشریح کر کے یہ دعویٰ کرتے تھے کہ سوشلزم اور اسلام میں کوئی تصادم نہیں ہے اور وہ اپنے اسلامی تصور کو اسلامی سوشلزم کہتے تھے۔ یہ دونوں ہی حلقے مُلّاؤں کی طرح مذہب کو سیاست و معیشت سے الگ نہیں کرتے تھے۔ ان ترقی پسند اور دقیانوسی مُلّاؤں میں فرق صرف یہ تھا کہ یہ حلقے تغیر پذیر زمانے کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر اسلام کی تعبیر و تشریح کرتے تھے جبکہ قدامت پرست علما و مشائخ ہر نئی چیز کو بدعت قرار دے کر جامد و بے لچک جاگیردارانہ نقطہ نگاہ سے اسلام کی تفسیر کرتے تھے۔ چونکہ پاکستان سمیت ایشیا کے سارے مسلم ممالک میں جاگیردارانہ نظام صدیوں پرانا تھا اس لئے مسلم عوام کے ذہنوں میں اسلام کے بارے میں مُلّاؤں کے جاگیردارانہ نقطہ نگاہ کی جڑیں بڑی گہری تھیں۔ ان جڑوں کو محض اسلام کی ترقی پسندانہ تعبیر و تشریح کے زور سے اکھیڑ پھینکنا ممکن نہیں تھا۔ البتہ اس کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ اسلام کے مسلمہ 72 فرقوں میں دو ایک اور فرقوں کا اضافہ ہو گیا۔ ایک اسلامی جمہوریت پسند فرقہ اور دوسرا اسلامی سوشلزم فرقہ۔ جو لوگ اسلام کی ترقی پسندانہ تعبیر و تشریح

کر کے اپنے آپ کو یہ باور کراتے تھے کہ عوام الناس زود یا بدیر ان کے مذہبی نقطہ نگاہ کو تسلیم کر لیں گے وہ دراصل بہت بڑی خود فریبی میں مبتلا تھے۔ انہوں نے اسلام کی ساڑھے تیرہ سو سالہ تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا تھا۔ انہیں یہ احساس نہیں تھا کہ چونکہ مسلم ممالک کی جاگیردارانہ معیشت میں صدیوں سے بوجوہ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی اس لئے مذہبی نظریے میں کوئی تبدیلی یا ترمیم یا اجتہاد کا امکان نہیں تھا۔ یورپ میں چودھویں اور پندرھویں صدی میں مذہب کو نجی ایمان وایقان کا معاملہ اس لئے قرار دیا گیا تھا کہ کلیسائی نظام وہاں معیشت وسیاست کی تبدیلی کی راہ میں حائل تھا۔ وہاں کے پادری راہب بھی چار پانچ سو سال قبل ہر قسم کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی تبدیلی کے اتنے ہی دشمن تھے جتنے کہ بیسویں صدی میں پاکستان اور دوسرے مسلم ممالک کے علما ومشائخ تھے۔ قائداعظم نے بظاہر اسی حقیقت کے پیش نظر 11 اگست 1947ء کو غیر مبہم اعلان کیا تھا کہ پاکستان میں مذہب کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہوگا لیکن بدقسمتی سے وہ تھوڑے عرصے بعد اپنی بے پناہ سیاسی مجبوریوں کی وجہ سے اپنے اس اعلان پر قائم نہ رہ سکے۔ چنانچہ جنوری 1948ء کے بعد مُلّائیت پھر سیاست پر حاوی ہوگئی اور جب مارچ 1949ء میں صوبہ سرحد میں جاگیرداری کی تنسیخ کا مسئلہ اٹھایا گیا تھا اس وقت لیاقت علی خان کی ''عظیم الشان اور تاریخی'' قرارداد مقاصد کی وجہ سے مُلّائیت کو مزید تقویت مل چکی تھی۔ جمعیت العلمائے اسلام، جماعت اسلامی اور سیاسی مُلّاؤں کی دوسری ساری تنظیموں نے اس قرارداد کا پرجوش خیر مقدم کیا تھا اور یقین ظاہر کیا تھا کہ اب اس قرارداد کو ان کے مذہبی نقطہ نگاہ کے مطابق عملی جامہ پہنایا جائے گا۔

قیوم خان کے حامی گروپ نے کسانوں اور زمینداروں کے تنازعہ کے لئے ''شرعی حل'' کا سہارا لیا، جاگیرداروں نے نواب ہوتی کی قیادت میں جاگیرداری بچانے کا عہد کیا اور شبیر احمد عثمانی سے مداخلت کی درخواست کی

صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ نے مارچ 1949ء کے بجٹ سیشن کے دوران جاگیرداری کی تنسیخ کا جو مسئلہ اٹھایا تھا وہ خلوص اور نیک نیتی پر مبنی نہیں تھا۔ اس لئے امروز کے اداریہ نگار کی پیش گوئی کے مطابق غریب کسانوں کے حق میں حل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کا ثبوت چند دن بعد پشاور

کے ایک جلسہ عام میں مل گیا جس کا اہتمام خان عبدالقیوم خان کی حامی ڈسٹرکٹ مسلم لیگ نے کیا تھا۔ اس جلسہ عام میں پہلے تو وزارتی پارٹی سے الگ ہونے والے جاگیرداروں سے کہا گیا کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے پارٹی میں دوبارہ شامل ہو جائیں اور پھر حکومت سرحد سے اپیل کی گئی کہ وہ کسانوں اور زمینداروں کے درمیان موجودہ تنازعہ کا ''شرعی حل'' تلاش کرے۔[5] چونکہ مجوزہ ''شرعی حل'' ان پڑھ اور غریب کسانوں کے حق میں تو نہیں ہو سکتا تھا اس لئے پیروں اور جاگیرداروں نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے 12 مارچ کو نواب ہوتی کی زیر صدارت پشاور میں ایک جلسہ کر کے مولانا شبیر احمد عثمانی سے اس معاملہ میں مداخلت کی درخواست کی۔ ان کی شکایت یہ تھی کہ حکومت سرحد قرآن وسنت کی بجائے ماسکو سے ہدایات حاصل کرتی ہے اس جلسہ میں جو پرجوش تقریریں کی گئیں ان میں یہ رائے ظاہر کی گئی کہ صوبائی حکومت نے جاگیرداری کی تنسیخ کا جو فیصلہ کیا ہے وہ ''غیر اسلامی'' ہے اور اس سے صوبہ میں طبقاتی جنگ شروع ہو جائے گی۔ ان کی تقریروں کے بعد جاگیرداروں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھائے کہ وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک کہ ان کا مقصد پورا نہیں ہو گا۔ انہوں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے فوری طور پر دس ہزار روپے چندہ جمع کر کے نواب ہوتی کو اپنی زمیندار ایسوسی ایشن کا صدر منتخب کیا اور پھر ایک بڑے زمیندار نے کہا کہ ''میں اپنی زمین کی حفاظت کے لئے جان دینے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ یہ جاگیریں ہمیں مغلوں، ایرانیوں، سکھوں اور انگریزوں نے دی تھیں۔ اب اگر زمینداروں سے ان کی زمینیں چھین کر کسانوں کو دے دی گئیں تو یہ کاروائی غیر اسلامی ہو گی اور اس سے بہت فساد ہو گا۔''[6]

اس جلسہ میں زمینداروں نے جاگیرداری نظام اور زمینداری نظام میں فرق کو اجاگر نہیں کیا تھا اور عوام الناس کی بہت بھاری اکثریت کو بھی یہ نہیں پتہ تھا کہ ان دونوں کے درمیان کیا فرق ہے۔ وہ ہر بڑے زمیندار کو جاگیردار کہتے تھے۔ انہیں بالعموم معلوم نہیں تھا کہ جاگیردار وہ ہوتا ہے جو اپنی ملکیتی زمین کے علاوہ ایک مقررہ علاقے کے سالانہ لگان میں سے کچھ نقد رقم بھی وصول کرتا ہے جبکہ چھوٹا یا بڑا زمیندار صرف اپنی زمین کی پیداوار حاصل کرتا ہے۔ برصغیر میں انگریزوں کے اقتدار سے پہلے زمیندار نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ صرف جاگیردار ہوتے تھے جو فوجی خدمات کے معاوضہ کے طور پر اپنے مقررہ علاقے کی آمدن وصول کرتے تھے۔ جب کوئی

جاگیردار مرجاتا تو اس کی جاگیر ورثہ میں اس کی اولاد کو نہیں ملتی تھی بلکہ بادشاہ اپنی منشا یا ضرورت یا مصلحت کے تحت جس کسی کو چاہتا تھا وہ جاگیر عطا کر دیتا تھا۔ بادشاہ قانونی طور پر اپنی سلطنت کی ساری زمین کا مالک ہوتا تھا جبکہ کسان عوام کا تصور یہ ہوتا تھا کہ مالک اللہ تعالیٰ ہے۔

قیوم خان نے زمیندار گروپ پر دباؤ بڑھانے کے لئے صوبہ میں جاگیرداری کے خاتمے کا ایک کھوکھلا اعلان کر دیا

ان زمینداروں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے اسلام کا جو نعرہ لگایا تھا اس میں کوئی حیرت یا عبرت کی بات نہیں تھی۔ جاگیرداروں اور اسلام کے اجارہ دار مُلّاؤں کا گٹھ جوڑ صدیوں پرانا تھا اور مُلّاؤں کے فتوے ہمیشہ جاگیرداروں کے حق میں ہوتے تھے لیکن انہوں نے قیوم خان کی ذات پر کمیونزم کا جو ٹھپہ لگایا تھا وہ واقعی بہت مضحکہ خیز تھا۔ قیوم خان کا کمیونزم یا اشتراکیت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ ایک ایسا عوام دشمن اور ابن الوقت سیاسی لیڈر تھا جس کی اقتدار پرستی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے ہر قسم کے حربے کو جائز سمجھتا تھا۔ اس نے جاگیرداری ختم کرنے کا ڈھونگ محض جاگیردار ارکان اسمبلی پر سیاسی دباؤ ڈالنے کے لئے رچایا تھا لیکن جب جاگیردار اور زمیندار اپنے 22/مارچ کے جلسے میں اس مقابلے کے لئے ڈٹ گئے اور پھر 4/اپریل کو پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں نے ممتاز دولتانہ کی زیر صدارت بیگم شاہنواز (پنجاب)، قاضی محمد عیسیٰ (بلوچستان)، خان عبدالقیوم خان (سرحد) اور حاجی علی اکبر (سندھ) پر مشتمل ایک زرعی کمیٹی مقرر کر دی تو قیوم خان نے فیصلہ کیا کہ ان جاگیرداروں کی سالانہ رقم کی ادائیگی بند کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ اس طرح صوبہ کے زمینداری نظام میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوگی اور وہ خود بطور ایک عوام دوست اور ترقی پسند لیڈر پورے پاکستان میں مشہور ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے 22/اپریل کو صوبہ میں جاگیروں کے خاتمہ کا سرکاری اعلان کر دیا۔ اس اعلان میں یہ بتایا گیا تھا کہ آئندہ (1) جاگیرداروں کو مالیہ کی وصولی کا حق نہیں ہوگا۔ (2) مالیہ کی بجائے ملکیتی حقوق بھی نہیں دیئے جائیں گے۔ لیکن اس اعلان میں دو مستثنیات تھیں۔ اول یہ کہ شب قدر کے نزدیک پنج پاؤ کے دیہات میں مہمند کی جاگیر منسوخ نہیں ہوگی اور دوئم یہ کہ فوجی خدمات کے صلے میں عطا کردہ گرانٹس بھی برقرار رہیں گی۔ اگر حکومت کے اس فیصلے کی وجہ سے کسی

جاگیرداری آمدنی بالکل ہی غیر منصفانہ طور پر ختم ہو جائے تو صوبائی حکومت ڈپٹی کمشنروں کی سفارش پر ایسے جاگیرداروں کو گزارہ الاؤنس دے سکے گی۔ سرکاری اعلان میں مزید بتایا گیا کہ صوبائی حکومت کو اس فیصلے پر عملدرآمد سے دس سے لے کر پندرہ لاکھ روپے تک کی بچت ہوگی۔ وزیراعلیٰ قیوم خان کے اس فیصلے پر صوبہ سرحد کے کسی بھی جاگیردار نے اپنی جان کی بازی نہ لگائی جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس اعلان سے زمین کی نجی ملکیت کے حق پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔

پنجاب کے بڑے زمینداروں نے فیروز خان نون کی قیادت میں ''مجلس کاشتکاران'' قائم کر دی۔ مولویوں نے جاگیرداری اور زمینداری کو ازروئے اسلام جائز اور اس کی مخالفت کو کفر و الحاد قرار دیا

تاہم 30 اپریل کو پنجاب کے بڑے بڑے زمینداروں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے ملک فیروز خان نون کی زیر صدارت ایک ''مجلس کاشتکاران'' (چیمبر آف ایگریکلچر یا ایوان زراعت) کی بنیاد رکھی۔ زمینداروں کے اس اجتماع میں قیام پاکستان سے پہلے کی یونینسٹ پارٹی، جاٹ سبھا اور زمیندارہ لیگ کے سابق ارکان پیش پیش تھے۔ صدر جلسہ ملک فیروز خان نے اپنی صدارتی تقریر میں رائے ظاہر کی کہ ''پنجاب میں جاگیرداری و زمینداری ختم کرنے کا جو مطالبہ کیا جا رہا ہے وہ بے معنی ہے کیونکہ یہاں یو۔ پی اور بہار جیسی زمینداری نہیں۔ یہاں صرف 9 بڑے زمیندار ہیں۔ باقی زمینداروں میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کے پاس 5 یا 6 ایکڑ سے زیادہ زمین نہیں ہے۔''[7]

پنجابی زمینداروں کی تنظیم کے قیام کے دو ایک دن بعد ایک مشہور اہلحدیث مولوی نے ایک اخباری مضمون میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ''ازروئے اسلام جاگیرداری اور زمینداری جائز ہے۔ بٹائی کے خلاف جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ سب اشتراکیت ہے، گمراہی ہے، الحاد ہے۔'' اس مضمون پر امروز کے ایک مراسلہ نگار کا تبصرہ یہ تھا کہ اگر علمائے کرام اس طبقاتی کشمکش میں زمینداروں اور جاگیرداروں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور اسلامی تعلیمات سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ زمینداری جائز ہے، جاگیرداری جائز ہے، الارض للہ کا جو مفہوم ہم لوگ سمجھتے ہیں وہ

غلط ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عوام میں الحاد بہت تیزی سے پھیلے گا اور لوگ اسلام کی صداقت ہی سے انکار کرنا شروع کر دیں گے۔ دراصل الحاد پھیلانے میں علما کا بہت بڑا حصہ ہے۔ انہوں نے اسلام کو جس طرح دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ اسلام سے دور ہٹ گیا ہے اور لوگ روز بروز بدعقیدہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔'' اور امروز کے ایک اور مراسلہ نگار کو یقین تھا کہ ''اب جبکہ سندھ، پنجاب اور سرحد کے سارے زمیندار متحد ہو رہے ہیں تو وہ مولویوں سے ضرور کام لینے کی کوشش کریں گے یعنی کسانوں کے حقوق پر پہلا حملہ اسی گروہ کی جانب سے ہوگا جو ''علمائے کرام'' کے لقب سے مشہور ہیں۔''[8]

قیوم خان کی جاگیرداروں کے خلاف اس کامیاب کاروائی کے بعد اندرون پاکستان جاگیرداروں اور مُلّاؤں کے محاذ پر دو تین ماہ تک بہت حد تک فائر بندی رہی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ابوالاعلیٰ مودودی کی نظر بندی کی میعاد میں توسیع کے باعث جماعت اسلامی کی سرگرمیاں بدستور معطل رہیں اور احراری مولویوں نے اگرچہ یکم مئی سے اینٹی احمدیہ جلسے شروع کر دیئے تھے لیکن وہ پنجاب مسلم لیگ کے دولتانہ دھڑے کے ساتھ گٹھ جوڑ کے بعد صوبائی اور مرکزی حکومت کے لئے کوئی بڑا مسئلہ نہیں پیدا کر رہے تھے جبکہ ممدوٹ کے مولویوں اور درمیانہ طبقہ کے شاؤنسٹوں کی ساری توجہ گورنر موڈی کو ہٹانے کی مہم پر مبذول رہی۔☆

نہرو کے دورہ امریکہ کی دعوت قبول کر لینے اور لیاقت کے سوویت یونین کے دورہ کی دعوت قبول کر لینے کے باوجود پاکستان کے حکمران طبقے اسلام کے نام پر کمیونزم کے خلاف اینگلو۔امریکی بلاک کے ساتھ نتھی ہونا چاہتے تھے

مذکورہ صورتحال کے لئے دوسری وجہ یہ تھی کہ 4 اپریل 1949ء کو شمالی بحراوقیانوس کے معاہدہ (نیٹو) پر برسلز میں دستخط ہونے کے بعد بین الاقوامی سطح پر بہت اہم تبدیلی رونما ہوگئی تھی۔ چنانچہ اپریل 1949ء کے اواخر میں لندن میں برطانیہ کی دولت مشترکہ کانفرنس ہوئی تو اس

☆ تفصیل کے لیے دیکھئے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ۔ جلد 4۔ جناح لیاقت تضاد اور پنجابی مہاجر تضاد ادارہ مطالعہ تاریخ۔ لاہور۔ ایڈیشن دوم۔ 2013ء

میں بعض ایسے فیصلے ہوئے کہ پاکستان کے خارجی امور کا داخلی امور پر غلبہ ہو گیا۔ 27 راپریل کو کانفرنس کا فیصلہ یہ تھا کہ اگرچہ ہندوستان اپنے نئے آئین کے تحت جمہوریہ بن گیا ہے تاہم اس کی دولت مشترکہ کی رکنیت بحال رہے گی۔ انگریزوں نے یہ فیصلہ اس امید میں کروایا تھا کہ ہندوستان جواہر لال نہرو کی زیر قیادت ایشیا میں روس اور چین کی اشتراکیت کے خلاف ایک زبردست دفاعی بند باندھنے میں اہم ترین کردار ادا کرے گا۔ چنانچہ لندن میں اس فیصلے سے پہلے ہی 20 راپریل کو نیویارک ٹائمز میں گورنر جنرل پاکستان خواجہ ناظم الدین کا ایک انٹرویو شائع ہوا تھا جس میں اس نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مشترکہ دفاعی معاہدے کے امکان کا اظہار کیا تھا۔ کانفرنس کا دوسرا فیصلہ یہ تھا کہ پاکستان مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کو مذہب کے نام پر سوویت یونین کے خلاف فوجی گٹھ جوڑ کرنے کی سرگرمی سے ترغیب دے گا۔ چنانچہ سٹیٹ بینک آف پاکستان کے گورنر زاہد حسین کی 28 راپریل کو لاہور میں تقریر یہ تھی کہ ''اسلام کمیونزم کے نظریے کے خلاف ایک بہت بڑا حفاظتی بند ہے اس لئے ہمیں اسلام کی بنیادوں کو مستحکم کرنے سے متعلقہ اپنے منصوبوں کو جامہ عمل پہنانے میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔''[9] وزیر اعظم لیاقت علی خان لندن سے براستہ قاہرہ و تہران 18 رمئی کو واپس کراچی پہنچا۔

12 رمئی کو قاہرہ میں لیاقت علی خان کا لندن ٹائمز سے انٹرویو یہ تھا کہ دنیا کے سارے ممالک کمیونزم کے حامیوں اور مخالفوں کی صورت میں منقسم ہو گئے ہیں۔ اس صورتحال میں قاہرہ سے لے کر کراچی تک کے مسلم ممالک اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ مغربی طاقتوں کو چاہیے کہ وہ مشرق وسطیٰ کے ممالک کو تقویت پہنچائیں اور پھر 23 رمئی کو پاکستان کے وزیر خزانہ غلام محمد نے بی۔ بی۔ سی کے نامہ نگار سے انٹرویو میں یہ کہا کہ کمیونزم کا مقابلہ کرنے کے لئے مغربی ممالک اور امریکہ کو پاکستان کی ہر ممکن امداد کرنی چاہیے اور 31 رمئی کو روزنامہ ڈان کی خبر یہ تھی کہ حکومت پاکستان اسلامی ممالک کی ایک کانفرنس بلانے کا ارادہ رکھتی ہے۔

پاکستانی لیڈروں کے ان بیانات سے قبل ہندوستان کا وزیر اعظم جواہر لال نہرو 8 رمئی کو بمبئی میں یہ انکشاف کر چکا تھا کہ صدر ٹرومین نے اسے اکتوبر 1949ء میں امریکہ کا دورہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ چونکہ نہرو کے اس بیان پر پاکستان کی رائے عامہ نے بڑے غیر موافق ردعمل کا اظہار کیا تھا اور خود وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اپنی سبکی محسوس کی تھی، اس لئے اس کی مئی کے

تیسرے ہفتے میں تہران میں قیام کے دوران روسی سفیر سے سوویت یونین کا دورہ کرنے کی جو غیر رسمی بات چیت ہوئی تھی بہت جلد مکمل ہوگئی اور 8/جون کو کراچی اور ماسکو سے یہ اعلان ہوگیا کہ وزیر اعظم پاکستان نے سوویت یونین کا دورہ کرنے کی دعوت قبول کر لی ہے۔ جب پاکستانی عوام نے کراچی اور ماسکو کے اس اعلان کا بے ساختہ خیر مقدم کیا تو اس پر امروز کا تبصرہ یہ تھا کہ ''یہ اینگلو۔امریکن بلاک کے خودسرانہ، متکبرانہ اور آمرانہ طرز عمل کا ردعمل ہے اور اگر ہماری حکومت نے رائے عامہ کی نبض پہچاننے میں غلطی نہیں کی تو اسے اس ردعمل کے بعد سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا ہوگا کہ دولت مشترکہ سے علیحدگی کے لئے کونسی تاریخ مناسب ہے۔'' اور پھر چند دن بعد اسی اخبار نے وزیر خزانہ غلام محمد کے اس بیان پر تنقید کی کہ یورپ کے سرمایہ داروں کو پاکستان میں سرمایہ کاری کرنی چاہیے۔ اخبار کی رائے یہ تھی کہ ''اگر قرارداد مقاصد کی رو سے پاکستان میں فی الواقع اسلام کے معاشی انصاف اور مساوات کے اصولوں پر عملدرآمد مقصود ہے تو پھر یہ ملکی اور غیر ملکی سرمایہ داروں کا سہارا کیوں لیا جا رہا ہے۔ کیا نعوذ باللہ اسلام اور سرمایہ داری نظام میں کوئی فرق نہیں؟'' تاہم لندن ٹائمز کو پوری امید تھی کہ ''وزیر اعظم لیاقت علی خان کے دورہ ماسکو کے باوجود پاکستان کی خارجہ پالیسی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔''[10]

لندن ٹائمز کی یہ امید بے بنیاد نہیں تھی کیونکہ پاکستان کی بیوروکریسی اور سیاسی حلقوں میں ایسے عناصر موجود تھے جو مختلف تدابیر کے ذریعے پاکستان کو اینگلو۔امریکی بلاک کا حصہ بنائے رکھنے کے حق میں تھے اور لیاقت علی خان ان کے پوری طرح زیر اثر تھا۔ یہ عناصر اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لئے کچھ عرصہ سے پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں کو استعمال کر رہے تھے۔ یہ شخص اگرچہ اندرون ملک قدامت پرست مُلّاؤں کی خواہش کے مطابق شرعی نظام رائج کرنے کے خلاف تھا لیکن یہ اینگلو۔امریکی مفاد کی خاطر خارجی طور پر اسلام کا بڑا زور وشور سے ذکر کرتا تھا۔ جب 8/جون کے بعد پاکستان میں سوویت یونین کا بہت چرچا ہونے لگا تو اس نے یکم جولائی کو کراچی میں ایسوسی ایٹیڈ پریس کے نامہ نگار کے ساتھ ایک انٹرویو میں کہا کہ ''اسلامستان قائم کرنے کے لئے اسلامی ممالک کو متحد کرنے کا وقت آگیا ہے۔ میں اس مقصد کے لئے اگست میں ایران، عراق، شام، لبنان، ترکی، مصر، سعودی عرب اور یمن کا دورہ کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ مغربی طاقتیں کمیونسٹوں کے خلاف اسلامی ممالک کا متحدہ محاذ بنانے میں مدد دیں گی۔''[11]

وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان بھی ان عناصر میں شامل تھا جو پاکستان کی تقدیر بہر صورت اینگلو۔امریکی بلاک سے وابستہ کرنے کے حق میں تھے۔ حالانکہ خود اس نے ہی اپریل 1948ء میں سوویت یونین کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے کی تحریک کی تھی۔ اسے اشتراکیت کے سدباب کے لئے ملک کے اندر اور باہر اپنے فرقے کے نقطہ نگاہ سے اسلام کی تبلیغ کرنے کا جنون تھا۔ چنانچہ 7رجولائی کو اس نے مری میں ایک افطار پارٹی سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''پاکستان اس لئے وجود میں نہیں آیا تھا کہ برصغیر کے مسلمان اپنے رہنے کے لئے ایک الگ گھر چاہتے تھے بلکہ اس لئے کہ انہوں نے محسوس کیا تھا کہ وہ ایک مخلوط اور دشوار ماحول میں اسلام کے قیمتی ورثہ کو کھو بیٹھیں گے۔ اس نے کہا کہ ''اسلام مسلمانوں کی ساری سیاسی بیماریوں کا واحد علاج ہے۔ ہم ابھی تک مغربی تہذیب کے غلام ہیں لیکن اگر مسلمان اللہ سے رہنمائی حاصل کریں اور قرآن کی حقیقی روح کو اچھی طرح پہچان لیں تو مجھے ان کے مستقبل کے بارے میں کوئی تشویش نہیں ہوگی۔''[12] پھر 16رجولائی کو اس نے کوئٹہ کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اسلام کی طرف رجوع کریں۔ اس نے ان لوگوں پر سخت نکتہ چینی کی جو ان قدیم شہنشاہوں کی نقالی کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے اسلام سے منہ موڑا، خدا کے احکام بھول کر مادی و دنیاوی حشمت کے لئے ہاتھ پاؤں مارے۔ اس نے کہا کہ ''پاکستان کے لئے تمام مسائل میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ مسلمانوں کا قرآن پاک اور رسول اقدس ﷺ کی تعلیمات سے منہ موڑنا ہے۔''[13] ظفر اللہ خان جب جگہ بہ جگہ اس قسم کی مذہبی تبلیغ کرتا تو اسے یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ اس طرح وہ ایک ایسی خونخوار مُلّائیت کو اشتعال دلاتا تھا جس نے تاریخ اسلام میں مذہبی تنازعات کی بنا پر کئی مرتبہ خون کی ندیاں بہائی تھیں۔

تاہم لاہور کے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کے انگریز ایڈیٹر نے اس قسم کے سامراج نواز عناصر کے بیانات اور تقریروں سے حوصلہ پا کر 25رجولائی کو پشاور سے یہ خبر منگوائی کہ ''صوبہ سرحد میں جس وسیع پیمانے پر کمیونسٹ لٹریچر تقسیم ہونا شروع ہوگیا ہے اس سے سیاسی مبصروں کو بڑی تشویش لاحق ہوگئی ہے۔ کتابوں کی ہر دوکان پر روس کے ہر قسم کے پروپیگنڈا کتابچوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ یاد رہے کہ صوبہ سرحد کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری اور اس کے بعض ساتھیوں کو گزشتہ سال ضلع ہزارہ میں کسانوں کی ایجی ٹیشن کو ہوا دینے کے الزام میں

گرفتار کیا گیا تھا۔ یہ ضلع صوبہ سرحد میں سب سے بڑا خطرے کا علاقہ ہے۔ گزشتہ سال کلکتہ میں کمیونسٹوں کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس صوبہ کا نمائندہ اس میں شامل ہوا تھا۔ اس کانفرنس کے بعد ہندوستان کے بعض علاقوں میں کسانوں اور مزدوروں کی بدامنی کے واقعات ہوئے تھے۔''[14] یہ خبر ایسے موقع پر چھاپی گئی جبکہ کراچی اور پاکستان کے بعض دوسرے شہروں میں پاک سوویت فرینڈشپ ایسوسی ایشنز کا قیام عمل میں آچکا تھا اور ایک روسی تجارتی وفد بھی کراچی پہنچ چکا تھا۔

پنجاب کے پہلے پاکستانی گورنر سردار عبدالرب نشتر کے اسلام پسندی کے مظاہرے...... اس نے اپنی تقریب حلف برداری میں خواتین کو چلمن کے پیچھے بٹھا کر مُلّاؤں کی پردہ مہم کی حوصلہ افزائی کی

2/اگست کو حکومت پاکستان کے اسلام پسند وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر نے فرانسس موڈی کی جگہ پنجاب کے گورنر کا حلف اٹھایا۔ نشتر پشاور کے درمیانہ طبقہ کا ایک بھلا مانس آدمی تھا اور لیاقت علی خان کا معتمد خاص تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے اسلام کا ذکر کرتا تھا لیکن اس کا اسلام بھی مُلّاؤں کی مقرر کردہ اس حد تک نہیں جاتا تھا کہ پاکستان میں فی الفور قرون اولیٰ کے دیوانی اور فوجداری قوانین نافذ کئے جائیں اور سیاسی سطح پر مغربی جمہوریت کو خیر باد کہہ کر قرون وسطیٰ کا خلافتی نظام نافذ کیا جائے۔ اس کا اسلام صرف اس حد تک تھا کہ ہر مسلمان کو انفرادی طور پر اسلامی اقدار کے مطابق اپنی اصلاح کرنی چاہیے، جب سب ایسا کر لیں گے تو پاکستانی معاشرہ خود بخود اسلامی بن جائے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے اس اسلام کے مطابق اپنے حلف اٹھانے کی تقریب کے لئے گورنمنٹ ہاؤس کے دربار ہال میں جو انتظام کیا وہ تقریباً ایسا ہی تھا جیسا کہ ہندوستانی فلموں میں مغل شہنشاہوں کے درباروں کی منظر کشی میں دکھایا جاتا تھا۔ دربار ہال میں تمام عورتوں کو ایک مخصوص جگہ پر بٹھایا گیا تھا اور ان کے آگے ہلکی چلمن لٹکائی گئی تھی اور حاضرین کو اس رسم کے ادا ہونے کے بعد صحن میں مشروبات پیش کی گئیں تو بھی مستورات کے لئے الگ اہتمام تھا۔

اس واقعہ کے چند دن کے بعد امروز کی ایک مراسلہ نگار خاتون نے سخت احتجاج کیا۔ اس نے لکھا کہ ''نئے گورنر کی لاہور میں تشریف آوری کے وقت سٹیشن پر تین خواتین کے سوا باقی

سب کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ پھر اسی شام کو حلف وفاداری کی رسم کے موقع پر گورنمنٹ ہاؤس میں جو خواتین مدعو تھیں ان کی نشست کا ایک چلمن کے پیچھے انتظام کیا گیا۔ بظاہر دونوں بالکل معمولی واقعات نظر آتے ہیں لیکن ان کے پیچھے وہ ناروا جذبہ کارفرما ہے جو آزادیٔ نسواں کے خلاف مردوں کی غالب اکثریت کے دل میں تعصب بن کر جاگزیں ہو چکا ہے۔''

سردار عبدالرب نشتر نے جب اس تقریب میں اپنی درمیانہ طبقہ کی مُلاّئیت کی نمائش کی تھی تو اسے یہ احساس نہیں تھا کہ اس کی یہ اعتدال پسند مُلاّئیت اس انتہا پسند مُلاّئیت کی حوصلہ افزائی کرے گی جو جنوری 1948ء کے بعد سے وزیراعظم لیاقت علی خان کی بے پردہ بیگم پر سوقیانہ حملہ کر رہی تھی۔ بیگم لیاقت علی خان کو اپنی بے پردگی پر ناز تھا اور وہ اسے پاکستان میں آزادیٔ نسواں کی ایک علامت سمجھتی تھی۔ چنانچہ جب وہ لندن کی دولت مشترکہ کانفرنس کے بعد اپنے شوہر کے ہمراہ براستہ قاہرہ و تہران 19 رمئی کو کراچی پہنچی تھی تو اس نے ایسوسی ایٹیڈ پریس کے نامہ نگار کو ایک انٹرویو میں بڑی خوشی سے بتایا تھا کہ ''ایران میں پردہ نہیں ہے۔ وہاں عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔'' نشتر کو بیگم لیاقت علی خان کی بے پردگی پر تو کوئی اعتراض نہیں تھا اور نہ ہی وہ کبھی اس بیگم کے ان بیانات پر معترض ہوتا تھا جو وہ بے پردگی کے حق میں دیتی تھی۔ لیکن اسے ان خواتین کی بے پردگی پسند نہیں تھی جنہیں اس نے اپنی حلف وفاداری کی تقریب میں مدعو کیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد درمیانہ طبقہ کے اس قسم کے سیاسی لیڈروں کے دو قسم کے اخلاقی معیار نے انتہا پسند مُلاّئیت کو بہت تقویت دی تھی۔ یہ لیڈر بیک وقت جدیدیت پسند بھی تھے اور قدامت پرست بھی۔ انتہا پسند مُلاّئیت ان کی جدیدیت پسندی پر سخت حملے کرتی تھی اور ان کی قدامت پرستی سے فائدہ اٹھاتی تھی۔

14 راگست 1949ء کو سردار عبدالرب نشتر نے یوم آزادی کے سلسلے میں منعقدہ ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے اسلام پر بہت زور دیا۔ اس نے کہا کہ ''اگر خدانخواستہ پاکستان کو زک پہنچی تو مسلمانوں کا اس برعظیم میں نام ونشان باقی نہیں رہے گا۔ دنیا میں اسلام کا نام لیوا نہ رہے گا۔'' قومی رضا کاروں کی طرف سے اس موقع پر نشتر کو قرآن مجید کی ایک جلد اور ایک تلوار پیش کی گئی تو اس نے کہا کہ ''تلوار قرآن مجید کے احکام کے مطابق چلے گی اور عدل وانصاف اور انسانیت کی حفاظت کرے گی۔''

لیاقت علی خان نے لاہور کے جلسہ عام میں ساڑھے تیرہ سو سال پہلے کا حوالہ دے کر ملک میں اسلامی سوشلزم رائج کرنے کی حمایت کی

اگست کے آخری ہفتے میں وزیر اعظم لیاقت علی خان اپنی بے پردہ بیگم کے ہمراہ لاہور آیا تو اسلام پسند نشتر نے ہوائی اڈے پر ان دونوں کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ لیاقت علی نے 25؍ اگست کو لاہور کی یونیورسٹی گراؤنڈ میں ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے یقین دلایا کہ ''ملک میں ایسی زرعی اصلاحات نافذ نہیں کی جائیں گی جو شریعت کے قوانین کے منافی ہوں گی لیکن میں شریعت کی وہ تعبیر نہیں مانوں گا جو مفاد پرستوں کی طرف سے کی جائے گی۔'' اس نے مزید کہا کہ ''بڑے زمینداروں کا دور ختم ہو چکا ہے پاکستان کروڑوں عوام کے مقابلے میں مٹھی بھر سرمایہ داروں کو دوام بخشنے کے لئے قائم نہیں کیا گیا تھا۔ اس کا قیام عوام الناس کی فلاح وترقی کے لئے عمل میں آیا تھا۔ آج کل کئی ''ازموں'' کی باتیں ہو رہی ہیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے لئے ایک ہی ازم ہے اور وہ ''اسلامی سوشلزم'' ہے جس کا مختصر مطلب یہ ہے کہ اس سرزمین کے ہر شخص کو روٹی، مکان، کپڑا، تعلیم اور طبی سہولتیں حاصل کرنے کے مساوی حقوق حاصل ہیں۔ جو ممالک اپنے عوام کے لئے ان ضروریات کو یقینی نہیں بناتے وہ ترقی نہیں کر سکتے۔ جو معاشی پروگرام ساڑھے تیرہ سو سال پہلے وضع کیا گیا تھا وہ آج بھی ہمارے لئے بہترین ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ جس نظام کو بھی آزمائیں گے وہ بالآخر اسلامی سوشلزم کی جانب رجوع کریں گے خواہ اس کا کوئی بھی نام رکھ لیں...... پاکستان دنیا کی ایک ایسی سب سے بڑی طاقت ہو گی جس کو یہ سعادت نصیب ہو گی کہ وہ آج کل کی تاریک دنیا کو اسلام کی روشنی دکھائے گی۔''[15] لیاقت علی خان کی تقریر اس کی منافقانہ سیاست کا بدترین نمونہ تھی۔ اس نے اپنی تقریر میں بظاہر اسلام پسندوں، جمہوریت پسندوں، سوشلسٹوں، زمینداروں اور غریب عوام الناس غرضیکہ سب کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن دراصل اس کا مقصد مُلّاؤں اور زمینداروں کو مطمئن کرنا تھا۔ جب بھی کبھی 1350 سال پہلے کے ''ازم'' یا شریعت کا نام لیا جاتا تھا تو مُلّا خوش ہوتا تھا کیونکہ اس ''ازم'' یا شریعت کی تعبیر وتشریح کی اجارہ داری اس کے پاس تھی اور زمیندار اس لئے خوش ہوتا تھا کہ مُلّاؤں کی بہت بھاری اکثریت شریعت کی تشریح اس کے حق میں کرتی تھی۔

مسلم لیگ کی زرعی کمیٹی کی رپورٹ میں آمدہ انتخابات کے پیش نظر کسانوں کو دھوکہ دینے کے لئے جاگیرداری کے خاتمہ اور زرعی اصلاحات کی سفارشات کی گئیں

لیاقت علی خان کی جانب سے زمینداروں کو شریعت کی یقین دہانی کرانے کا پس منظر یہ تھا کہ 11 رجولائی کو مسلم لیگ کی زرعی کمیٹی کی رپورٹ کی اشاعت کے بعد پنجاب اور مغربی پاکستان کے دوسرے صوبوں کے جاگیرداروں اور ان کے پروردہ مُلاؤں کی جانب سے وزیراعظم کو تاریں بھیجی گئی تھیں جن میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ شریعت کے منافی کوئی اصلاحات نافذ نہ کی جائیں۔ کمیٹی کی اس رپورٹ کا خلاصہ یہ تھا کہ:

1۔ جاگیروں اور انعامات کو فی الفور منسوخ کر دیا جائے اور اس کے لئے کوئی معاوضہ نہ دیا جائے کیونکہ یہ جاگیریں حکومت برطانیہ کا عطیہ ہیں۔

2۔ حکومت برطانیہ کی خدمات کے صلے میں عطا کردہ اراضی فوراً بحق سرکار ضبط کر لی جائے۔

3۔ موروثی مزارعین کو ان کے زیر کاشت رقبہ کے ملکیتی حقوق دے دیئے جائیں اور زمینداروں کو ممانعت کر دی جائے کہ وہ ان سے سالانہ لگان نہ لیں۔

4۔ ایسے قوانین بنائے جائیں کہ زمیندار پندرہ سال سے پہلے کسی مزارع کو بے دخل نہ کر سکے۔

5۔ کوئی زمیندار بھی خود کاشت کے لئے 125 ایکڑ سے زیادہ اراضی نہیں رکھ سکے گا۔

6۔ زمیندار مزارع سے حکومت کے لگان کے علاوہ کوئی اور ٹیکس نہیں لے گا اور نہ ہی بیگار لے گا۔

7۔ فصل کا 2/5 حصہ زمیندار کو ملے گا اور باقی مزارع کو۔ مالیہ اور آبیانہ کی ادائیگی زمیندار کرے گا۔

8۔ مزارعین کے لئے بھی وہ مراعات ہونی چاہئیں جو مزدوروں کے لئے ہوتی ہیں مثلاً یہ

کہ زمیندار اپنے مزارعین کے لئے رہائشی کوارٹر تعمیر کرے اور ہفتے میں 56 گھنٹے سے زیادہ کام نہ لے۔

9۔ زمینداروں اور مزارعین کے اشتراک سے بے روزگاری الاؤنس، بیمہ اور پنشن وغیرہ کا انتظام کیا جائے۔

10۔ کاشتکاروں اور مزارعین کے لئے صحت اور تعلیمی سہولیات کا انتظام کیا جائے۔

11۔ 150 ایکڑ نہری زمین اور 450 ایکڑ بارانی زمین سے زیادہ اراضی زمینداروں سے بحق سرکار ضبط کر لی جائے۔ ایسی اراضی کے حصول کے لئے حکومت تحقیقاتی کمیٹی بنائے۔ زمینداروں سے حاصل کردہ اراضی مزارعین کی کواپریٹو سوسائٹیوں کو دی جائے۔

ممتاز دولتانہ کی زیر صدارت زرعی کمیٹی کی یہ سفارشات دراصل پنجاب مسلم لیگ کے انتخابی منشور کی حیثیت رکھتی تھیں۔ 1944ء میں بھی ایک کمیونسٹ کارکن دانیال لطیفی نے پنجاب مسلم لیگ کا اسی قسم کا انتخابی منشور لکھا تھا مگر قیام پاکستان کے بعد اسے طاق نسیاں پر ڈال دیا گیا تھا۔ پنجاب کے متوقع عام انتخابات کے لئے ممتاز دولتانہ کی حکمت عملی یہ تھی کہ ایک طرف تو پس پردہ یونینسٹ جاگیرداروں سے گٹھ جوڑ کیا جائے اور دوسری طرف غریب کسانوں کو گمراہ کرنے کے لئے اس قسم کے انتخابی نعرے لگائے جائیں۔ اس نے مسلم لیگ کے اندر اس مقصد کے لئے عطا اللہ جہانیاں کی زیر قیادت ایک ''پروگریسو گروپ'' بھی منظم کروایا تھا۔ اس کی انتخابی حکمت عملی کا تیسرا جزو یہ تھا کہ احراری مُلّاؤں سے اتحاد کر کے شہروں کے چھوٹے طبقہ کے ووٹ حاصل کئے جائیں۔

جاگیرداروں نے مولویوں سے لامحدود اراضی کی ملکیت کے حق میں فتوے حاصل کر کے زرعی کمیٹی سے اس کے مطابق فیصلہ کروالیا اور اپنی زمینیں بچالیں

زرعی کمیٹی کی اس رپورٹ پر مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے ابھی غور کرنا تھا اور پنجاب سے جاگیرداروں کی کوشش یہ تھی کہ عاملہ اس کی منظوری نہ دے۔ ان جاگیرداروں کو دولتانہ کی اس

حکمت عملی سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس قسم کے نعروں سے، خواہ وہ جھوٹے ہی ہوں کسانوں میں طبقاتی شعور بیدار ہوگا جو بالآخر زمینداری نظام کو تباہ و برباد کردے گا۔ چنانچہ انہوں نے اس زرعی رپورٹ کے خلاف اپنی مہم چلانے کے لئے ''علمائے کرام'' کے فتووں سے بھرپور استفادہ کیا۔ 27 راگست کو لاہور کے روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ کی رپورٹ یہ تھی کہ ''اب جبکہ پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ زرعی کمیٹی کی سفارشات پر غور کرنے والی ہے زمیندار ان اصلاحات پر عملدرآمد کی مخالفت کے لئے اپنے آپ کو منظّم کرنے میں مصروف ہیں اور ان کی جانب سے رائے عامہ کو اپنے حق میں کرنے کے لئے اقدامات کئے جارہے ہیں۔ مغربی پنجاب کے ایوان زراعت نے صوبہ کے تمام زمینداروں کو ایک کتابچہ بھیجا ہے جو محدث الملت حکیم الامت مولانا اشرف علی، مفتی اعظم حضرت مولانا محمد شفیع، قطب عالم ابوحنیفہ وقت حضرت مولانا رشید احمد کے فتوؤں پر مشتمل ہے اور گوجرانوالہ کے مولانا محمد اسماعیل جامعہ اہل حدیث کا ایک مضمون بھی ان فتوؤں کے ساتھ شامل ہے۔ ان فتووں میں کہا گیا ہے کہ زمین زمیندار کی نجی ملکیت ہے خواہ وہ اسے ورثہ میں ملی ہو یا برطانوی عہد میں اسے عطا کی گئی ہو۔ اگر اپنے مذہب، عزت و آبرو اور نجی جائیداد کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے تو وہ شہادت کا درجہ پائے گا۔ اور یہ کہ کسی غیر اسلامی کاروائی پر خاموش رہنا حرام ہے۔ یہ کتابچہ محمد متین خطیب نے مرتب کیا ہے اور اس کے افتتاحیہ میں لکھا ہے کہ زمین کی سرکاری ملکیت کا نظریہ ملحدوں کی سرزمین کی پیداوار ہے۔''[16] اس کتابچے میں شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور حضرت مولانا عبدالحامد بدایونی کے اسمائے گرامی شامل نہیں تھے حالانکہ ان کی بھی ''عالمانہ رائے'' یہی تھی کہ ''از روئے اسلام ایک مسلمان ایک ایکڑ سے لے کر ہزارہا ایکڑ تک کا مالک بن سکتا ہے۔''

لیاقت علی خان لاہور کے اس مختصر دورے بعد کراچی پہنچا تو 29 راگست کو پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے زرعی کمیٹی کی 11 رجولائی 1949ء کی رپورٹ پر غور کے بعد ''اسلامی اصولوں'' کی روشنی میں زرعی اصلاحات کے بارے میں جو فیصلہ کیا وہ مُلّاؤں کی تعبیر و تشریح کے عین مطابق تھا اور زمینداروں کے حق میں تھا۔ یہ لیاقت علی خان کا ''اسلامی سوشلزم'' تھا۔ عاملہ نے اس فیصلہ میں مغربی پاکستان کے زمینداری نظام کو توجوں کا توں برقرار رکھا تھا البتہ اس نے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو ہدایت کی کہ وہ موروثی جاگیروں کو ختم کردیں۔ اس فیصلہ پر پاکستان کے کسی

مُلاّ کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس میں غریب کسانوں کو صرف وعدۂ فردا اور ہدیۂ ہمدردی ہی دیا گیا تھا اور زمینداروں کے مفادات کو ذرا سا بھی خطرہ لاحق نہیں کیا گیا تھا۔ جماعت اسلامی کے مُلاّؤں نے اپنے 7/مئی 1949ء کے اجلاس میں یہی سفارش کی تھی۔ ان کی قرارداد یہ تھی کہ ''جاگیرداریوں کو مکمل طور پر ختم کر دیا جائے اور زمین کی آمدنی کی اس طرح منصفانہ تقسیم کی جائے کہ مزارع کی ضروریات زندگی پوری ہو سکیں۔''[17]

اس فیصلے میں دولتانہ کمیٹی کی سفارشات کے برعکس زمین کی ملکیت کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی تھی نہ ہی بٹائی کی شرح کا تعین کیا گیا اور نہ ہی یہ بتایا گیا تھا کہ زمیندار کو بٹائی کی جگہ نقد رقم کی ادائیگی کب سے اور کس شرح پر ہوگی۔ اس میں زمیندار کے لئے خود کاشت رقبے کا بھی کوئی تعین نہیں کیا گیا تھا۔ اس میں یہ بھی نہیں کہا گیا تھا کہ حکومت برطانیہ کی خدمات کے صلے میں عطا کردہ اراضی فوراً بحق سرکار ضبط کر لی جائے اور کسانوں کے لئے بے روزگاری الاؤنس، بیمہ اور پنشن وغیرہ کا بندوبست کیا جائے۔ مختصر یہ کہ مجلس عاملہ نے لیاقت علی خان کی 25/اگست کی تقریر کے مطابق بڑے زمینداروں کا دور ختم نہیں کیا تھا بلکہ اس نے بے زمین کسانوں کو جھوٹی اصلاحات کی جھلک دکھا کر زمینداروں کے غلبہ کو اور مستحکم کیا تھا۔ جہاں تک جاگیروں کی تنسیخ کا تعلق تھا صوبہ سرحد کا وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان انہیں پہلے ہی منسوخ کر چکا تھا اور سندھ اسمبلی بھی اس مقصد کے لئے وزیر اعلیٰ یوسف ہارون کی تحریک پر ایک قانون منظور کر چکی تھی۔ مجلس عاملہ کی قرارداد یہ تھی کہ ''دولتانہ کمیٹی کی رپورٹ کا بغور جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ اس میں سفارشات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اول ایسی سفارشات جن کو فوراً جامہ عمل پہنایا جا سکتا ہے۔ دوئم ایسی سفاشات جن کو بعد میں نپٹایا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم کی سفارشات کا کئی کمیٹیوں نے جائزہ بھی لیا ہے اور انہوں نے عمومی طور پر ان کی منظوری دے دی ہے۔ دوسری قسم کی سفارشات کا تعلق بڑی زمینداریوں کی منسوخی سے ہے۔ مجلس عاملہ اصولی طور پر یہ تسلیم کرتی ہے کہ بڑی زمینداریوں کی منسوخی ہونی چاہیے اور مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ اس سلسلے میں مناسب اقدامات کریں۔ پہلی قسم کی سفارشات کے بارے میں مجلس عاملہ یہ قرار دیتی ہے کہ:

1۔ موروثی جاگیروں کو بلا معاوضہ فی الفور منسوخ کر دیا جائے۔

2۔ جتنی جلدی ممکن ہو سکے بٹائی کی جگہ نقد رقم لی جائے اور جب تک ایسا نہیں ہوتا

مزارعین اور زمینداروں کے درمیان پیداوار کی تقسیم کا تعین زیادہ منصفانہ طریقہ سے کیا جائے تا کہ مزارعین کے معاشی حالات بہتر ہو سکیں۔

3۔ موروثی مزارعین کے حقوق ملکیت حکومت کو یا مزارعین کو خرید لینے چاہئیں۔ متعلقہ صوبائی حکومت کو اس مقصد کے لئے طریقۂ کار وضع کرنا چاہیے اور شرائط طے کرنی چاہئیں۔

4۔ متعلقہ صوبائی حکومت کو انتظام کرنا چاہیے کہ غیر موروثی مزارعین کو میعاد کار کا تحفظ مل جائے۔

5۔ ان سارے واجبات، ٹیکسوں اور خدمات کو فوری طور پر منسوخ کیا جائے جو جاگیردار وصول کرتے ہیں اور ان کی وصولی غیر قانونی اور قابل سزا قرار دی جائے۔

''مجلس عاملہ کی رائے یہ ہے کہ ان سفارشات پر فوراً عمل کیا جائے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو ہدایت کی جائے کہ وہ ان سفارشات پر عملدر آمد کے لئے فوری طور پر اقدامات کریں تا کہ ان کاشتکاروں کو سہولت مل سکے جو پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی خوشحالی اور خوشی پر ملک کی فلاح و بہبود اور معاشی خوشحالی کا انحصار ہے۔ جہاں تک مشرقی بنگال میں زمینداری کی تنسیخ کا تعلق ہے ایک بل پہلے ہی صوبائی اسمبلی میں پیش کیا جا چکا ہے اس لئے مجلس عاملہ نے اس صوبہ کی مزارعت کے مسئلہ پر کوئی بحث نہیں کی اور نہ ہی کوئی فیصلہ کیا ہے۔''[18]

مجلس عاملہ کا یہ اجلاس چودھری خلیق الزماں کی صدارت میں ہوا۔ اجلاس کے شرکا میں وزیر اعظم لیاقت علی خان، نورالامین، خان عبدالقیوم خان، یوسف ہارون، قاضی محمد عیسیٰ، یوسف خٹک، مولانا اکرم خان، غیاث الدین پٹھان، سید نبی بخش، اے۔ ایم۔ قریشی اور حاجی علی اکبر شاہ شامل ہوئے۔ سندھ مسلم لیگ کے صدر ایم۔ اے۔ کھوڑو نے اس اجلاس میں مطالبہ کیا تھا کہ سندھ صوبائی مسلم لیگ کی رائے معلوم ہونے تک زرعی اصلاحات کے مسئلہ کو ملتوی رکھا جائے لیکن عاملہ نے اس کے اس مطالبہ کو مسترد کر دیا اور اسے سخت تنبیہ کی کہ اگر اس نے عاملہ کے ان فیصلوں سے سرتابی کی یا ان کو بے اثر بنانے کی کوشش کی تو اس کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کی جائے گی۔''[19]

روزنامہ امروز نے مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اس فیصلہ پر ''دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر

کھلا'' کے زیر عنوان ایک اداریے میں اچھا تبصرہ کیا۔ اس نے لکھا کہ ''مجلس عاملہ کی قرارداد سے یہ مغالطہ ہونے کا امکان ہے کہ زمینداری اور جاگیرداری دونوں کو ختم کرنے کی سفارش کی گئی ہے اس لئے کہ رائے عامہ عام طور پر ان کے قانونی اور روایتی امتیاز کے متعلق بہت کم معلومات رکھتی ہے۔ مجلس عاملہ نے بڑے شاطرانہ انداز میں یہ اسٹنٹ چلایا ہے۔ اگر تمام موروثی جاگیریں ضبط ہو جائیں تو بھی پنجاب کے ٹوانے اور سندھ کے تالپور خاندان کی اپنی زمینوں میں سے سالانہ آمدنی میں بمشکل 5 فیصدی کمی واقع ہو گی۔ بنیادی سوال بدستور برقرار رہے گا۔ لیگ کی مجلس عاملہ کو اگر زرعی اصلاح ایمانداری سے کرنی مقصود تھی تو جاگیریں اور زمینداریاں دونوں کی منسوخی کا مطالبہ کرنا چاہیے تھا۔ بڑی بڑی زمینداریوں کے متعلق جو سفارشات کی گئی ہیں وہ اول تو مطلوبہ مقصد پورا کرنے کے لئے مضحکہ خیز حد تک ناکافی ہیں۔ دوسرے قرارداد کے الفاظ بڑے شاعرانہ انداز میں مبہم رکھے گئے ہیں۔ مثلاً بٹائی کے مسئلے کو لے لیجئے۔ جو کمیٹی کسانوں کی حالت بہتر بنانے کی دعویدار ہے اور زرعی اصلاحات کو پاکستان کی ترقی و تعمیر کے لئے از حد ضروری سمجھتی ہے اس کمیٹی نے سب سے پہلے تو زمینداری کا یہ حق تسلیم کیا کہ انہیں ہر سال کسانوں سے بٹائی وصول کرنے کا حق حاصل ہے اور ''اصلاح'' یہ تجویز کی ہے کہ بٹائی جنس کی صورت میں لینے کی بجائے نقد رقم کی صورت میں لی جایا کرے۔ اس رقم کا تعین کون کرے گا۔ کسان کے گاڑھے پسینے کی کمائی کا کتنا فیصد زمیندار کی جیب میں جایا کرے گا، کمیٹی نے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا اور قرارداد میں یہ مبہم جملہ لکھنے پر اکتفا کیا کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے اس کا تعین کیا جائے تا کہ کسان کی حالت زار درست ہو سکے۔ گویا بٹائی کے انسانیت سوز طریقے کے برقرار رہتے ہوئے بھی کسان کی حالت درست ہو سکتی ہے اور پھر ''جس قدر جلد ہو سکے'' کی بھی خوب تھی۔ ستم یہ ہے کہ ساری قرارداد میں زمینداری کے بارے میں کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی گئی۔ ہر سفارش کے متعلق کہا گیا ہے کہ ''مناسب وقت پر'' یا ''جیسا اور جب صوبائی حکومتیں ضروری سمجھیں قدم اٹھایا جائے۔'' لیکن آخر میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ ''ان تجاویز پر فوراً عمل کیا جائے'' سمجھ میں نہیں آتا کہ خود ہی لیت و لعل کی گنجائش برقرار رکھی، کوئی بات قطعیت سے نہیں کہی، پھر یہ کس چیز کو عملی جامہ پہنانے کا مطالبہ ہو رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عوام کو بہلانے اور پھسلانے کے لئے یہ سارے ہتھکنڈے کئے جا رہے ہیں۔ عوام وعدۂ فردا سے تنگ آ چکے ہیں۔ پچھلے وعدوں کی تکمیل چاہتے

ہیں۔ یہ سارے جتن ان کو تھپکنے کے لئے کئے جا رہے ہیں۔ ہم لیگ کے ارباب اختیار سے اپیل کریں گے کہ عوام کو بہلانے کی سعی نہ کریں بلکہ بنیادی مسائل دیانتداری سے حل کرنے کی سبیل کی جائے۔ اس طرح پاکستان اور مسلم لیگ دونوں کو گزند نہ پہنچے گا۔ صرف جاگیرداری نہیں بلکہ اس کے ساتھ زمینداری بھی ختم ہونی چاہیے۔ جس اصول کے بموجب جاگیر پر جاگیردار کا حق نہیں اسی اصول کا اطلاق ٹوانوں اور ان کے قماش کے زمینداروں کی زمینداریوں پر ہونا ضروری ہے۔''[20] امروز کا یہ اداریہ نویس بڑا سادہ لوح تھا۔ مغربی پاکستان کی صوبائی حکومتوں پر زمینداروں کا قبضہ تھا۔ معلوم نہیں وہ کیونکر ان سے یہ توقع کرتا تھا کہ وہ اس کے صحافیانہ دلائل سے متاثر ہو کر پاکستان اور اس کے غریب کسانوں کے مفادات کی خاطر اپنے طبقاتی مفاد کے گلے پر خود ہی چھری پھیر لیں گے۔

خود لیاقت علی خان بہت بڑا جاگیردار اور زمیندار تھا۔ اس نے قیام پاکستان کے بعد نہ صرف پاکستان کی پرانی زمینداریوں کو برقرار رکھا تھا بلکہ اس نے ان زمینوں پر بھی نئی زمینداریاں قائم کر دی تھیں جو غیر مسلم، پنجاب اور مغربی پاکستان کے دوسرے علاقوں میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ مزید برآں وہ پنجاب میں یونینسٹ زمینداروں سے انتخابی گٹھ جوڑ کر رہا تھا۔ اس سے یہ توقع کرنا عبث تھا کہ وہ اپنے سیاسی حلیفوں اور طبقاتی بھائیوں کے مفادات کو کوئی نقصان پہنچائے گا۔ اس کے لئے ''شرعی نظام'' کے بارے میں تو مُلّاؤں کا تصور قابل قبول نہیں تھا لیکن وہ زمینداریوں کے بارے میں مُلّاؤں کی ''شرعی رائے'' کو صائب تصور کرتا تھا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ چند دن بعد صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان نے یہ اعلان کر دیا کہ ''اس کے صوبہ میں بڑی زمینداریوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ جب ان زمینداریوں کے موجودہ مالکان کی وفات ہو جائے گی تو شریعت کے مطابق یہ خود بخود منقسم ہو جائیں گی۔ لہٰذا صوبائی حکومت مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی سفارش کے مطابق ان زمینداریوں کی تنسیخ کے لئے کوئی اقدام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔''[21]

باب: 9

پنجاب میں دولتانہ۔ممدوٹ دھڑوں کی سیاسی کشمکش میں

احراری مُلّا، دولتانہ کے ساتھ،

جماعت اسلامی ممدوٹ کے ساتھ

جماعت اسلامی کی جانب سے مودودی کی رہائی کے لئے مہم۔قرارداد مقاصد اور ارباب حکومت کی بڑھتی ہوئی اسلام پسندی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش

وزیر اعظم لیاقت علی خان کے دورہٗ لاہور سے قبل جماعت اسلامی اپنے امیر ابوالاعلیٰ مودودی کی رہائی کے لئے ''شرعی مہم'' شروع کر چکی تھی۔ اس کی اس مہم کو بڑے زمینداروں کی بھرپور حمایت حاصل تھی کیونکہ ابوالاعلیٰ مودودی ''اسلام کی رو سے'' زمینداری نظام کے زبردست حامیوں میں سے تھا۔ جماعت کا خیال تھا کہ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کی میعاد اگست 1949ء میں ختم ہوگئی تو صوبہ کا نیا ''اسلام پسند'' گورنر سردار عبدالرب نشتر مودودی کی رہائی میں رکاوٹ حائل نہیں کرے گا۔ مگر جب 14ر اگست کو سیفٹی ایکٹ کی میعاد میں توسیع کر دی گئی تو جماعت کی اس امید کو دھچکا لگا۔ چنانچہ اس نے اس امید میں رابطہ عوام کی مہم شروع کر دی کہ ستمبر میں جب مودودی کی نظر بندی کی مقررہ میعاد ختم ہوگی تو حکومت رائے عامہ کے دباؤ کے تحت اسے رہا کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ جماعت کو اس سلسلے میں حکومت کے اندر وزیر امور کشمیر نواب مشتاق احمد گرمانی اور سیکرٹری جنرل چودھری محمد علی وغیرہ سے بھی حمایت کی توقع تھی۔ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی قرارداد مقاصد کی تائید میں جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کی قرارداد کے فوراً بعد ایک

سے زیادہ بیانات میں ابوالاعلیٰ مودودی کی رہائی کا مطالبہ کر چکا تھا۔

جماعت کی یہ مہم پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے زرعی اصلاحات کے بارے میں متذکرہ ''شرعی فیصلے'' کے بعد ستمبر کے اوائل میں تیز ہوگئی جبکہ جماعت نے رینالہ خورد، شیر گڑھ، حجرہ شاہ مقیم، ہیرا سنگھ، گوگیرہ، ہڑپہ، چیچہ وطنی اور نور شاہ اور بعض دوسرے چھوٹے قصبات میں جلسے کئے۔ یہ اعلان کیا گیا کہ جماعت تعمیر پاکستان کے لئے اسلامی اصولوں پر نئی جدوجہد کرے گی۔ ان جلسوں میں وضاحت سے بتایا گیا کہ ''اسلامی اصول انتخاب، صالح قیادت، نئی دستور ساز اسمبلی اور نیا نظم حکومت کیوں ضروری ہے اور یہ کس طرح عمل میں آئیں گے۔ قرآن کے فطری اصولوں کے مطابق معاشی ومعاشرتی مسائل کا حل پیش کیا گیا۔''[1]

2 ستمبر کو جامع مسجد ہری پور کے اجتماع میں متفقہ طور پر یہ قراردادیں منظور کی گئیں کہ ''(1) سیفٹی ایکٹ کو جو کہ انگریزی عہد اقتدار کی منحوس یادگار ہے، فوراً منسوخ کیا جائے۔ (2) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو جنہیں اسی ایکٹ کے ماتحت گرفتار کیا گیا ہے فوراً رہا کیا جائے اور ان کے دینی علم واجتہاد سے پاکستان کی آئین سازی کے سلسلہ میں مدد حاصل کی جائے۔ (3) قرارداد مقاصد کے منظور ہونے کے بعد بلا تاخیر اسلامی آئین کی ترتیب وتدوین کا کام مکمل کر لیا جائے۔''[2] متعدد دوسرے مقامات پر بھی جماعت کے جلسوں میں اس مضمون کی قراردادیں منظور کی گئیں۔

ان قراردادوں کا ایک پس منظر یہ تھا کہ یکم اگست کو پاکستان دستور ساز اسمبلی کی ایک کمیٹی نے پانچ رکنی تعلیمات اسلامیہ بورڈ کا تقرر کر دیا تھا اور اس کے ذمے یہ کام کیا تھا کہ وہ اسمبلی کو اسلامی فقہ کے حوالے سے مشورے دے گا۔[3] اس بورڈ کے صدر کے طور پر سید سلیمان ندوی کے نام کا مارچ میں ہی فیصلہ ہو گیا تھا لیکن اس کے ارکان میں ابوالاعلیٰ مودودی کا نام شامل نہیں تھا۔ حالانکہ پنجاب کے درمیانہ طبقہ اور زمیندار طبقہ کے بعض عناصر اسے اسلام کا ''مفکر اعظم'' تصور کرتے تھے۔ ایک اور پس منظر یہ تھا کہ حکومت پاکستان ایک اسلامک اکنامک کانفرنس منعقد کرنے کے فیصلے کا اعلان کر چکی تھی جس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ اینگلو امریکی سامراج کی زیر سرپرستی سوویت یونین کے خلاف اسلامی ممالک کے گٹھ جوڑ کے لئے راہ ہموار کی جائے۔ اس فیصلے کے بعد وزیر خزانہ غلام محمد بھی جو کچھ عرصے پہلے تک سیکولر نظام حکومت کا علی الاعلان حامی

تھا، اب یکا یک اسلامی اصولوں کی تبلیغ کرنے لگا تھا جبکہ گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین شب و روز اٹھتے بیٹھتے اسلام کا ذکر کرتا تھا۔ چودھری خلیق الزماں نے ''اسلامستان'' کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ وزیر اعظم لیاقت علی خان 1350 سال پہلے کے اسلامی اصولوں کی پابندی کا یقین دلاتا تھا اور سردار عبدالرب نشتر یہ کہتا تھا کہ پاکستان میں قرآنی عدل و انصاف ہوگا۔ ایسی صورتحال میں اسلام کے ''مفکر اعظم'' حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا نظر بند رہنا ''سراسر غیر اسلامی'' تھا۔ تیسرا پس منظر یہ تھا کہ افتخار الدین کے اخبارات پاکستان ٹائمز اور امروز نے اور پنجاب کی کمیونسٹ پارٹی نے بھی فیروز الدین منصور، ایرک سپرین، سی۔ آر۔ اسلم اور بعض دوسرے کمیونسٹ کارکنوں کی نظر بندی کی وجہ سے براہ راست اور اپنی مختلف ذیلی تنظیموں کے ذریعے سیفٹی ایکٹ کی تنسیخ اور شہری آزادیوں کی بحالی کے لئے مہم چلائی ہوئی تھی۔ اس لئے جماعت کے جلسوں میں نہ صرف بائیں بازو کے لوگ بھی شامل ہوتے تھے بلکہ افتخار الدین کے اخبارات میں جماعت کی سرگرمیوں کی بھی خوب تشہیر ہوتی تھی۔ گویا اس محدود مقصد کے لئے جماعت اسلامی اور کمیونسٹ پارٹی کے درمیان عملاً ایک متحدہ محاذ قائم ہو گیا تھا اور چوتھا پس منظر یہ تھا کہ پنجابی شاؤنسٹوں کے وزیر اعظم لیاقت علی خان کی حکومت کے ساتھ روز افزوں تضاد کی وجہ سے مسلم لیگ کے ممدوٹ دھڑے اور نوائے وقت کا ''مودودی خارجیت'' کے بارے میں رویہ بھی بدل گیا تھا۔ اب نوائے وقت میں مودودی اور اس کی جماعت پر اسلام اور پاکستان کی دشمنی کا کوئی الزام عائد نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اس میں وقتاً فوقتاً جماعت کی سرگرمیوں کی خبریں شائع ہونے لگی تھیں۔ چنانچہ اس امر کی علامتیں نظر آنے لگی تھیں کہ ممدوٹ دھڑے اور جماعت اسلامی کے درمیان لیاقت علی خان کی حکومت کے خلاف متحدہ محاذ قائم ہو جائے گا۔

غالباً اس آخری پس منظر میں وہ سب سے بڑی وجہ پنہاں تھی جس کی بنا پر وزیر اعظم لیاقت علی خان کی حکومت نے جماعت اسلامی کے خلاف اپنی سخت گیرانہ پالیسی کو جاری رکھا۔ 3 ستمبر کو راولپنڈی سے ایسوسی ایٹیڈ پریس کی اطلاع یہ تھی کہ ''سرکاری محکموں نے مولانا مودودی کی جماعت کے ممبروں اور ہمدردوں کی تلاش شروع کر دی ہے۔ جس ملازم کو بھی اس جماعت کا ہمدرد پایا جاتا ہے اسے اس بات کا نوٹس دے دیا جاتا ہے کہ وہ یا تو اپنے تعلقات اس ادارہ سے منقطع کرے ورنہ اسے اس کی ملازمت سے سبکدوش کر دیا جائے گا۔ ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل کے

دفتر میں بھی کلرکوں کی ایک کثیر تعداد کو اس طرح کے نوٹس دے دیئے گئے ہیں۔ یہ تمام مرکزی حکومت کی ہدایات کے تحت کیا جا رہا ہے۔"[4] مرکزی حکومت کی اس کاروائی پر جماعت اسلامی کے امیر محمد عبدالجبار غازی نے ایک بیان میں سخت احتجاج کیا۔ اس نے کہا کہ راولپنڈی کے بعض دفاتر بالخصوص ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل کے ملازمین کو جماعت اسلامی کے اغراض ومقاصد سے وابستگی کی بنا پر روزگار سے محروم کرنے کی کاروائی غیر منصفانہ ہے کیونکہ یہ برطانوی سامراج کے وضع کردہ غیر اسلامی سروس رولز کے تحت کی جا رہی ہے۔ قرارداد مقاصد کی منظوری کے بعد جماعت اسلامی کو آئینی اصطلاح میں ایک سیاسی جماعت قرار دینا لغویت ہے۔ اس اصطلاح کی بنیاد اس غلط تصور پر ہے کہ مذہب اور سیاست الگ الگ ہیں۔ یہ تصور سراسر غیر اسلامی ہے۔ جماعت اسلامی کو، جس کا نصب العین اسلام کو اس کی مکمل صورت میں نافذ کرنا ہے۔ محض ایک سیاسی جماعت کہنا اور سرکاری ملازمین کے لئے اس کی رکنیت کی مخالفت کرنا بے ہودگی ہے۔ کیونکہ قرارداد مقاصد میں یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات اور مقتضیات کے مطابق ترتیب دے سکیں۔"[5] جماعت اسلامی کا یہ موقف غلط نہیں تھا۔ قرارداد مقاصد کی بنیاد واقعی اس تصور پر تھی کہ مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں ہیں۔ اس قرارداد پر بحث کے دوران نہ صرف شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس تصور کی تفصیلاً وضاحت کر دی تھی بلکہ لیاقت علی خان، ڈاکٹر عمر حیات خان ملک، سردار عبدالرب نشتر، سر ظفر اللہ خان، ڈاکٹر محمود حسین اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی وغیرہ نے بھی یہی تصور پیش کیا تھا۔ اصولاً اس تصور کے تحت جماعت اسلامی کو محض ایک سیاسی جماعت قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ لیاقت علی خان کی سیاست پر اگر منافقت حاوی نہ ہوتی تو اسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ قرارداد مقاصد کا جو بیج بو رہا تھا اس سے کس قسم کے درخت کی نمود ہوگی اور یہ درخت کس قسم کا پھل دے گا۔

9 ستمبر کو جماعت اسلامی کے اس موقف کو مزید تقویت ملی جبکہ گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے کراچی میں میمن مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "ہمارا مذہب انسانی عمل کے ہر شعبے میں مکمل طور پر رہنمائی کرتا ہے اور اس میں مسلمانوں کے لئے اس امر کا مکمل ضابطہ موجود ہے کہ وہ کس طریقے سے اپنا کاروبار چلائیں۔ نماز ایک کھوکھلی عبادت نہیں ہے۔ اس کا مقصد روح کی پاکیزگی ہے۔ جو لوگ دن میں پانچ دفعہ اللہ کے حضور میں سربسجود

ہوتے ہیں وہ اپنے دنیاوی معاملات کو نپٹاتے وقت اللہ کی موجودگی کو بآسانی فراموش نہیں کر سکتے......اگر ہم پانچ وقت باقاعدگی سے نماز ادا کریں تو مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری مدد کرے گا، ہمارے اخلاق و کردار کا معیار بلند کرے گا اور ہمیں دونوں جہانوں میں خوشحالی اور عزت عطا فرمائے گا۔"[6] ناظم الدین کی اس تقریر کے دو ایک دن بعد لاہور کے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کے ایک مضمون نگار نے گورنر جنرل کے ان ارشادات کی تعریف کرتے ہوئے پاکستان کی معاشرتی زندگی میں مسجد کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ اس کی رائے یہ تھی کہ اضلاع میں ڈپٹی کمشنروں اور تھانیداروں پر انتظامی امور کا بوجھ بہت زیادہ ہے اس لئے بیشتر انتظامی مسائل طے کرنے کے لئے مسجد کے ادارے کا احیا کیا جائے......شاہی مسجد لاہور میں مرکزی دینیات کالج قائم کیا جائے جس کا بورڈنگ ہاؤس مقبرہ جہانگیر میں ہو اور شاہی قلعہ لاہور میں اسلامی کتب کی ایک لائبریری قائم کی جائے......مسجد بآسانی ایک ایسا معاشرتی مرکز بن سکتی ہے جس میں لوگ باہمی مذاکرات سے اپنے معاشرتی امور طے کر سکتے ہیں۔ مسجد کے ارباب اختیار کھیلوں، میلوں، عرسوں، یوم اطفال، نیشنل ڈیفنس اور ہوائی حملوں سے بچاؤ کی تربیت کا انتظام کر سکتے ہیں......مسجدوں میں پرائمری سکول کھولے جائیں۔ امام مسجد کو طب اور جراحی کی تعلیم دی جائے۔ شہروں میں میونسپلٹی کی اور دیہات میں ڈسٹرکٹ بورڈوں کی زیر نگرانی آئمہ مساجد کو پیدائش و اموات کی رجسٹریشن، شادی کی رجسٹریشن، صحت عامہ اور مردم شماری کا کام سونپا جا سکتا ہے۔"[7] معلوم نہیں اس مضمون نگار نے یہ کیوں نہیں لکھا تھا کہ مسجدوں کو سیاسی سرگرمیوں کے لئے بھی استعمال کرنا چاہیے اور ہر امام مسجد کو اپنے علاقے کی سیاسی قیادت کرنی چاہیے کیونکہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا تو مسجدوں میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کا کوئی جواز نہیں ہو سکتا تھا۔ جماعت اسلامی کا موقف یہی تھا اور قرارداد مقاصد کے مطابق یہ موقف بالکل صحیح تھا۔

جماعت اسلامی کی طرف سے پنجاب کے متوقع انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان، جماعت کی نظریاتی قلابازیاں

12 ستمبر کو جماعت اسلامی نے اپنے مذکورہ موقف کی بنا پر پنجاب کے متوقع عام انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔ اس سلسلے میں جماعت کی قرارداد یہ تھی کہ "چونکہ جماعت

اسلامی کے وجود کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ دنیا کے سامنے اسلامی تعلیمات کی سچائی اور ان کے قابل عمل ہونے کا ثبوت پیش کرے اور چونکہ جماعت پہلے ہی یہ وعدہ کر چکی ہے کہ وہ اپنے اس نصب العین کی تکمیل کی جانب پہلے اقدام کے طور پر کسی صالح کو پاکستان کے معاملات سونپنے کا کام کرے گی اس لئے یہ طے کیا جاتا ہے کہ جماعت اسلامی مغربی پنجاب کے آئندہ انتخابات میں حصہ لے گی۔ اس کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق انتخابات کرانے اور ایسے کارکنوں کو منتخب کروانے میں، جو جذبہ وعمل کے لحاظ سے صحیح معنوں میں اسلامی ہوں گے، عوام کی رہنمائی اور امداد کرے گی۔ جماعت کے نزدیک اگر اس نے انتخابات کے اسلامی اصولوں کی قدر وقیمت اور ان کے قابل عمل ہونے کا مظاہرہ کر دیا تو یہ اس کی کامیابی ہوگی۔ لہٰذا جماعت اسلامی ہر اس شخص کو کامیاب کرانے کی کوشش کرے گی...... خواہ وہ شخص جماعت کا رکن ہو یا نہ ہو...... جو انتخابات کے سلسلے میں اسلامی حدود کی پابندی کرنے کا وعدہ کرے گا، جس کا واحد مقصد یہ ہوگا کہ پاکستان میں اسلامی اصولوں کی بنیاد پر معاشرتی نظام قائم کیا جائے اور جو جماعت کے اطمینان کے مطابق اسلامی اخلاق و کردار کے معیار پر پورا اترے گا۔ جماعت مستقبل قریب میں اپنا ایک انتخابی منشور بھی شائع کرے گی۔''[8]

جماعت اسلامی کے اس فیصلے کی اہمیت یہ تھی کہ جماعت نے اس فیصلے کے تحت اپنے ''اسلامی نظریے'' اور ''سیاسی پالیسی'' میں بنیادی تبدیلی کی تھی۔ قیام پاکستان سے پہلے جب جماعت تحریک پاکستان کی مخالفت کرتی تھی تو اس کا ''اسلامی نظریہ'' یہ تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کو ایک چھوٹے سے علاقے میں اپنی مملکت قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر پاکستان کی مملکت بن بھی گئی تو یہ اسلامی مملکت نہیں ہوگی بلکہ یہ ایک ایسی لادینی جمہوری مملکت ہوگی جس کی بنیاد ''وطنی قومیت'' کے ''غیر اسلامی نظریے'' پر استوار ہوگی۔ اگر برصغیر کے مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان بن جائیں تو نہ صرف برصغیر بلکہ پوری دنیا میں خود بخود اسلامی نظام قائم ہو جائے گا۔ لیکن جب 14راگست 1947ء کو جماعت کی مخالفت کے باوجود پاکستان وجود میں آ گیا تو اس کے کچھ عرصہ بعد جماعت نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ پاکستان کی حیثیت اسلامی مملکت کی نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک ایسے قطعہ اراضی کی ہے جس پر مسجد کی تعمیر ہو سکتی ہے بشرطیکہ امامت کے فرائض ابوالاعلیٰ مودودی کے پاس ہوں۔ جماعت پاکستان میں شرعی نظام کے نفاذ کے لئے جدوجہد کرتی رہے گی اور

جب تک اس کے تصور کا شرعی نظام قائم نہیں ہوگا اس وقت تک جماعت اور اس کے ارکان پاکستان کے غیر اسلامی قوانین اور قواعد وضوابط کی پابندی نہیں کریں گے۔ جماعت کا یہ ''اسلامی نظریہ'' اکتوبر 1948ء میں ابوالاعلیٰ مودودی اور اس کے بعض ساتھیوں کی نظر بندی کا باعث بنا۔

پھر جب مارچ 1949ء میں دستور ساز اسمبلی نے قرارداد مقاصد منظور کر دی تو جماعت نے یکا یک نظریاتی قلابازی کھا کر یہ ''اسلامی نظریہ'' اپنا لیا تھا کہ ''دستور ساز اسمبلی نے یہ قرارداد منظور کر کے جماعت اسلامی کے مطالبے کی روح کو قبول کر لیا ہے۔'' اس لئے ''جماعت کے ارکان اور ہمدردوں کو چاہیے کہ وہ قرارداد مقاصد کے مطابق نئے دستور کی تشکیل کے لئے سازگار فضا پیدا کرنے کی خاطر حکومت سے پورا پورا تعاون کریں۔'' جماعت کو امید تھی کہ اس کی اس نظریاتی قلابازی سے ابوالاعلیٰ مودودی کی رہائی عمل میں آ جائے گی مگر ایسا نہ ہوا بلکہ اس کی نظر بندی کی میعاد میں توسیع کر دی گئی تھی۔ لہٰذا اب اس نے 12 ستمبر کی قرارداد میں یہ ''اسلامی نظریہ'' وضع کر لیا کہ جماعت پاکستان کے موجودہ غیر اسلامی نظام حکومت اور اس کے قوانین و ضوابط کے اندر رہ کر صالح افراد کو برسر اقتدار لانے میں عوام کی رہنمائی اور امداد کرے گی۔ بالفاظ دیگر آئندہ جماعت اسلامی دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح میدان سیاست میں برسر عمل ہو گی۔ پنجاب کے آئندہ عام انتخابات میں حصہ لے گی اور اس مقصد کے لئے دوسری سیاسی جماعتوں سے گٹھ جوڑ کرنے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔ جماعت اسلامی کی جانب سے اس سیاسی منزل پر پہنچنے میں اتنی دیر محض اس لئے ہوئی تھی کہ اس کا امیر ابوالاعلیٰ مودودی بہت برخود غلط اور خود پسند آدمی تھا۔ وہ خرابی بسیار کے بغیر صحیح راستے پر نہیں چل سکتا تھا۔ اس کے برعکس مجلس احرار اسلام کا ''امیر شریعت'' سید عطا اللہ شاہ بخاری سیاسی طور پر حقیقت پسند اور دانشمند تھا۔ چنانچہ اس نے جنوری 1949ء میں ہی سیاست سے ''کنارہ کشی'' کا اعلان کر کے مسلم لیگ کے دولتانہ دھڑے کے ساتھ سیاسی گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔

جماعت اسلامی کی جانب سے پنجاب مسلم لیگ میں دولتانہ۔ ممدوٹ دھڑے کے مابین رسہ کشی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش

جماعت اسلامی نے مذکورہ قرارداد ایسے وقت منظور کی تھی جبکہ ابوالاعلیٰ مودودی کی

نظر بندی کی دوسری میعاد ختم ہونے والی تھی اور پنجاب میں شہری آزادیوں کی بحالی اور سیفٹی ایکٹ کی تنسیخ کا مطالبہ زور پکڑ رہا تھا۔ جماعت کا خیال تھا کہ شاید اس کی یہ قرارداد مودودی کی رہائی کا موجب بن جائے گی اور اگر ایسا نہ ہوا تو اس کا مسلم لیگ کے کسی نہ کسی دھڑے سے گٹھ جوڑ ہو جائے گا۔ اس طرح نہ صرف مودودی کی رہائی کے لئے عوامی مہم تیز تر ہو سکے گی بلکہ عوام کی نظر میں جماعت کا سیاسی وقار بلند ہو جائے گا۔ ان دنوں پنجاب مسلم لیگ دولتانہ دھڑے اور ممدوٹ دھڑے کے درمیان صوبائی گورنر کے مشیروں کے تقرر کے مسئلہ پر زبردست کھینچا تانی ہو رہی تھی۔ چونکہ صوبائی مسلم لیگ کی صدارت کے عہدے پر ممدوٹ دھڑے کا ''آدمی'' میاں عبدالباری بیٹھا ہوا تھا اس لئے ان دونوں دھڑوں کے درمیان مخاصمت اتنی شدید ہو گئی تھی کہ آئندہ انتخابات میں ان کا یکجا رہنا ممکن نہیں تھا۔

19 ستمبر کو ممدوٹ دھڑے کی عارضی طور پر فتح ہوئی جبکہ دولتانہ مردہ باد، غداروں کا ساتھی مردہ باد، پنجاب کو ذلیل کرنے والا مردہ باد، کے پر جوش نعروں کے درمیان صوبہ مسلم لیگ کونسل نے کثرت رائے سے صوبائی گورنر کے لئے مشیروں کی تقرری کی حمایت کی۔ کونسل کا یہ اجلاس دولتانہ کے 180 حامی ارکان کی طرف سے 27 اگست کو کئے گئے مطالبہ کی بنیاد پر بلایا گیا تھا۔ ایجنڈا یہ تھا کہ ''بگڑے ہوئے حالات کے پیش نظر گورنر کے لئے مشیروں کے تقرر کے مسئلہ پر دوبارہ غور کیا جائے۔'' صوبائی مسلم لیگ کونسل کے اس اجلاس میں بقول مولانا چراغ حسن حسرت (ایڈیٹر امروز) لکھنؤ کی بھٹیاریوں کی طرح لڑائی ہوئی تھی۔'' اس لئے جب اس کی کاروائی کی رپورٹیں اخبارات میں چھپیں تو پنجاب کے شہری عوام الناس کی نظر میں مسلم لیگ کا سیاسی وقار بہت ہی گر گیا۔ جماعت اسلامی نے اس سے فائدہ اٹھایا اور اس نے فوراً ہی اپنی ''صالح سیاست'' کی تبلیغ کے لئے رابطہ عوام کی مہم شروع کر دی۔ چنانچہ چنیوٹ، صادق آباد، گوجرانولہ، ملتان اور پنجاب کے متعدد وسرے شہروں اور قصبوں میں قراردادوں کے ذریعے مودودی کی رہائی اور غیر اسلامی سیفٹی ایکٹ کی تنسیخ کے مطالبے کئے گئے۔

29 ستمبر کو ملتان میں ممتاز علما کا ایک اجلاس ہوا جس میں ایک قرارداد کے ذریعے مطالبہ کیا گیا کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی، امین احسن اصلاحی، اور مسٹر طفیل محمد کی نظر بندی کی میعاد میں، جو 13 اکتوبر کو ختم ہو رہی ہے، مزید توسیع نہ کی جائے۔ قرارداد میں

شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کی رائے سے اتفاق کیا گیا کہ ''مولانا مودودی'' ''سیف الاسلام'' ہیں اس لئے انہیں مقید رکھنا پاکستان کے نام پر سب سے بڑا دھبہ ہے۔ آج کل پاکستان کو جو بہت سے مسائل درپیش ہیں انہیں حل کرنے کے لئے مولانا کے دانشمندانہ مشوروں کی ضرورت ہے۔ قرارداد مقاصد کی منظوری کے بعد مولانا کی نظر بندی نہ صرف غیر منصفانہ اور ظالمانہ ہے بلکہ اس سے مطلق العنانیت کی بو آتی ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ شیخ الاسلام کی رائے کا احترام کرے اور مولانا مودودی اور ان کے ساتھیوں کو بلا تاخیر رہا کر دے۔''[9] تاہم حکومت پنجاب نے ملتان کے ممتاز علما کی اس قرارداد کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور اسی دن ابوالاعلیٰ مودودی اور اس کے ساتھیوں کی نظر بندی کی میعاد میں مزید چھ ماہ کی توسیع کر دی۔ کیونکہ ''پاکستان کی سلامتی و یکجہتی کا تقاضا یہ تھا کہ یہ افراد فی الحال جیل میں ہی رہیں۔''

نوائے وقت نے صوبائی حکومت کے اس فیصلے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس نے اپنے ایک ادارتی نوٹ میں لکھا کہ ''مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی نظر بندی میں مزید توسیع کر دی گئی ہے اس سلسلے میں حکومت کی طرف سے جو بیان شائع کیا گیا ہے وہ تسلی بخش نہیں۔ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ مغربی پنجاب میں جو لوگ سیفٹی ایکٹ کے ماتحت نظر بند ہیں ان کی تعداد نہایت قلیل ہے اس کے برعکس ہندوستان میں سینکڑوں اشخاص اسی ایکٹ کے ماتحت نظر بند ہیں۔ یہ اعداد و شمار بالکل درست ہیں اور اس لحاظ سے حکومت پاکستان ان پر فخر کر سکتی ہے مگر اس موازنہ سے قطع نظر اصولاً کسی شخص کو مقدمہ چلائے بغیر نظر بند رکھنے کی لئے حکومت کو کوئی معقول وجہ تو پیش کرنی چاہیے۔ اس بیان میں ایسی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی۔ حکومت نے سیفٹی ایکٹ میں جو نئی ترمیم کی ہے اس کے مطابق کسی شخص کو نظر بندی کا حکم صادر کرنے سے پہلے اس کا کیس سیشن جج کے مرتبہ کے کسی جوڈیشنل آفیسر کے سامنے رکھنا چاہیے۔ اگرچہ مودودی صاحب اس ترمیم سے پہلے کے نظر بند ہیں مگر حکومت کو چاہیے کہ ان کا معاملہ بھی کسی بلند پایہ جوڈیشنل افسر کے سامنے رکھے اور ان کے متعلق آئندہ اقدام کا فیصلہ اس کے منصفانہ اور غیر جانبدارانہ مشورہ کے بعد کیا جائے۔''[10] نوائے وقت کے اس ادارتی نوٹ میں ''مودودی صاحب'' کی رہائی کا جو مطالبہ کیا گیا تھا وہ زوردار نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلم لیگ کے ممدوٹ دھڑے اور جماعت اسلامی کے درمیان گٹھ جوڑ کے لئے سلسلہ جنبانی ہو چکا تھا لیکن ابھی کوئی بات پکی نہیں ہوئی تھی۔

ممدوٹ دھڑے نے ابھی تک مسلم لیگ سے علیحدگی کا فیصلہ نہیں کیا تھا کیونکہ صوبہ لیگ پر اس کے ''آدمیوں'' کا غلبہ تھا اور اب ''مشیروں کی حکومت'' میں بھی ان ہی ''آدمیوں'' کا غلبہ قائم ہونے والا تھا۔

حسب توقع مودودی کی نظر بندی کی میعاد میں توسیع کے بعد جماعت اسلامی کی احتجاجی مہم تیز تر ہوگئی۔ پنجاب اور سندھ کے متعدد شہروں میں جلسے ہوئے جن میں قراردادوں کے ذریعے سیفٹی ایکٹ کی تنسیخ اور مودودی کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ ملتان میں جماعت اسلامی کا ایک خصوصی اجتماع ہوا جس میں متفقہ طور پر ایک قرارداد میں حکمران طبقہ کو متنبہ کیا گیا کہ ''مولانا مودودی اور ان کے رفقا کی موجودہ نظر بندی ختم ہونے پر اگر انہیں رہا نہ کرنے کا یہ مطلب ہے کہ انتخابات میں حصہ لینے والی جماعتوں کے لیڈروں کو محض آئندہ انتخابات میں میدان صاف رکھنے کے لئے جیلوں میں رکھا جاتا ہے تو یہ سراسر ڈکٹیٹرانہ رویہ ہوگا جو نہ صرف غیر اسلامی ہے بلکہ موجودہ جمہوری دور میں بھی ایک لعنت ہے۔''[11] اس قرارداد کی ایک اہمیت یہ تھی کہ اب جماعت اسلامی اسلام کے ساتھ ساتھ جمہوریت کا نام بھی لینے لگی تھی۔ گویا اب اس کی نظر میں اسلام اور جمہوریت کے درمیان تضاد رفتہ رفتہ ختم ہونے لگا تھا کیونکہ اب اس کے جلسوں میں حاضرین کی تعداد روز بروز زیادہ ہو رہی تھی۔ 2/اکتوبر کو قائم مقام امیر جماعت اسلامی مولانا عبدالجبار غازی نے صوبائی حکومت کے اس اعلان پر اظہار افسوس کیا جو اس نے مودودی کی میعاد نظر بندی کی توسیع کے جواز میں کیا تھا۔ مولانا کی رائے یہ تھی کہ اس قسم کی فریب کاری ایسی ریاست کے ملازمین کو زیب نہیں دیتی جس نے اسلامی نظام کے مطابق اپنا نظام زندگی ڈھالنے کا عہد کر رکھا ہے۔ 2/اکتوبر کو صادق آباد مسلم لیگ کے ناظم افضل لغاری نے ایک تار میں مولانا مودودی اور اس کے رفقا کی نظر بندی کی میعاد میں توسیع کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے دھمکی دی کہ اگر ان افراد کو رہا نہ کیا گیا تو وہ اور اس کے ساتھی اپنے عہدوں سے مستعفی ہو جائیں گے۔ اس نے غیر اسلامی اور غیر جمہوری سیفٹی ایکٹ کے فوری خاتمہ کا مطالبہ بھی کیا۔

اس کے دو دن بعد 8/اکتوبر کو جماعت اسلامی کی سیاسی موج ہوگئی جبکہ حکومت پاکستان نے ایک مرکزی پبلک سیفٹی آرڈیننس (1949ء) نافذ کر دیا۔ اس آرڈیننس کے نافذ ہوتے ہی جماعت اسلامی کو بہت سے سیاسی حلیف مل گئے۔ 9/اکتوبر کو ملتان میں جماعت

اسلامی کے زیر اہتمام ایک جلسہ عام میں قرآن وحدیث کے حوالے دے کر یہ ثابت کیا گیا کہ یہ مرکزی قانون غیر اسلامی ہے اور قرارداد مقاصد کے منافی ہے۔ 10 اکتوبر کو جماعت کے اس موقف کی زبردست تائید ہوئی جبکہ پنجاب سے دستور ساز اسمبلی کے تمام غیر سرکاری آٹھوں ارکان نے ایک متفقہ قرارداد میں اس آرڈیننس کے نفاذ پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ 'صوبوں میں پہلے ہی سیفٹی ایکٹ نافذ ہیں اور عوام کی طرف سے ان کی تنسیخ کا مطالبہ کیا جارہا ہے اور یہ توقع کی جارہی تھی کہ عوام کی شہری آزادیوں کو بحال کر دیا جائے گا لیکن اس کی بجائے ملک کو ایک فاشسٹ اقدام کا نشانہ بنایا گیا جو ہر شخص کے دل میں خوف وہراس پیدا کر دے گا۔'' اس احتجاجی بیان پر بیگم شاہنواز، افتخار الدین، شوکت حیات خان اور شیخ کرامت علی کے دستخط تھے۔ اسی دن نوائے وقت نے ایک سیاہ حاشیے میں صرف تین سطروں کا ایک اداریہ لکھا۔ اس اداریے کا مضمون یہ تھا کہ ''ایک آزاد ملک میں اس آرڈیننس کا نفاذ ایک ایسا اقدام ہے جس پر ایک ایسی حکومت کو جو پاپولر اور عوامی کہلاتی ہے شرم آنی چاہیے۔'' پھر 14 اکتوبر کو لاہور میں پندرہ مدیران جرائد نے ایک مشترکہ بیان میں مطالبہ کیا کہ سیفٹی آرڈیننس فوراً واپس لیا جائے۔ اس بیان پر دستخط کرنے والوں میں جماعت اسلامی کے جرائد تسنیم اور کوثر کے مدیر بھی شامل تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ جماعت اسلامی کو ایک وسیع سیاسی محاذ میں جگہ مل گئی تھی۔

قرارداد مقاصد کی منظوری کے بعد ملک میں ہر چیز کے بارے میں بحث چھڑ گئی کہ یہ اسلامی ہے یا غیر اسلامی

لیاقت علی خان نے 12 مارچ 1949ء کو دستور ساز اسمبلی سے قرارداد مقاصد اس امید میں منظور کی تھی کہ اس طرح اس کے اقتدار کو استحکام ملے گا۔ مگر نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلا۔ اس نے اس قرارداد کے حربے سے اپنے سیاسی مخالفین کے لئے گڑھا کھودا لیکن وہ خود ہی اس میں گر پڑا۔ مُلّاؤں نے اسی حربے کو اس قدر زوردار طریقے سے استعمال کیا کہ چند ہی مہینوں میں اس کے اقتدار کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں۔ یوں تو قیام پاکستان کے چند ہی ماہ بعد مُلّاؤں نے شرعی نظام یا خلافتی نظام کا زور شور سے مطالبہ شروع کر دیا تھا۔ لیکن قرارداد مقاصد کی منظوری کے بعد ملک کے ہر شعبہ زندگی میں مذہب فروشی کا بازار بے انتہا گرم ہو گیا تھا۔ ہر چیز کے بارے میں یہ

بحث چھڑ جاتی تھی کہ یہ اسلامی ہے یا غیر اسلامی ہے۔ یہ قرارداد مقاصد کے مطابق ہے یا منافی ہے۔ ہر چیز اور ہر کام کے لئے اسلام کا استعمال اس قدر زیادہ ہونے لگا تھا کہ بعض لوگ اس کے خلاف اخبارات میں احتجاج کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ان لوگوں میں ایک خاتون فہمیدہ خانم بھی تھی۔ اس کا 20 ستمبر 1949ء کے امروز میں ایک مراسلہ یہ تھا کہ ''حال ہی میں ایک اشتہار نظر سے گزرا جس میں ایک مصور کے نام کے ساتھ ''مصور اسلام'' کا لقب چسپاں کیا گیا ہے۔ ستم ظریفی کی حد ہو گئی۔ خدا کے لئے جا و بے جا اسلام کا نام ٹانک دینے سے باز آجایئے۔ لیگ کی صدارت کا انتخاب ہو تو ووٹ دینا اسلام کی خدمت، عشقیہ فلموں کو مقبول عام بنانا ہو تو اس کا نام اسلامی سوشل فلم۔ آخر اسلام کو اس طرح رسوا کرنے کا مقصد کیا ہے۔'' فہمیدہ خانم کا یہ احتجاج بالکل صحیح تھا۔ جس دن اس کا مراسلہ شائع ہوا تھا اسی دن لاہور میں پنجاب مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں اس مسئلہ پر گرما گرم بحث ہوئی تھی کہ صوبائی گورنر کے لئے مشیروں کا تقرر قرآن و سنت کے مطابق ہو گا یا نہیں؟

پھر چار پانچ دن بعد ڈھاکہ میں یہ تنازعہ کھڑا ہوا تھا کہ عید کے خطبہ کے دوران یا جمعہ کے خطبہ کے دوران لاؤڈ سپیکر کا استعمال اسلامی ہے یا غیر اسلامی ہے۔ اس پر ڈھاکہ کی جمعیت العلمائے اسلام کے صدر مولانا ظہور احمد کا فتویٰ یہ تھا کہ ''ایسے مواقع پر یہاں تک کہ نماز کے دوران بھی لاؤڈ سپیکر کا استعمال جائز ہے لیکن نماز کے دوران لاؤڈ سپیکر کے ساتھ مکبرین کا انتظام ضروری ہے اور نمازیوں کو رکوع و سجود کی ادائیگی مکبرین کی تکبیر پر ہی کرنی چاہیے۔''[12] اور پھر چند دن بعد کراچی کی میمن مسجد میں عیدالاضحیٰ کی نماز کے بعد ایک مشتعل ہجوم نے بندر روڈ پر زیر تعمیر ایک سینما کو نذر آتش کر دیا۔ ڈان کی اطلاع کے مطابق اس واقعہ کی وجہ یہ تھی کہ عید کی نماز کے بعد مسجد کی مینیجنگ کمیٹی کے بعض ارکان نے اس سینما کی تعمیر کے خلاف اشتعال انگیز تقریریں کی تھیں۔[13]

تاہم لیاقت علی خان نے قرارداد مقاصد کی منظوری کے بعد ان حالات و واقعات سے بھی کوئی سبق نہ سیکھا اور اس نے مذہب کو سیاست سے منتھی کرنے کا عمل جاری رکھا۔ 12 اکتوبر کو ڈھاکہ میں اس کی تقریر یہ تھی کہ ''پاکستان کا آئین اسلامی اصولوں پر مرتب کیا جائے گا۔ حکومت پاکستان صرف یہی نہیں چاہتی کہ پاکستان میں اچھے حکومتی ادارے قائم ہوں، ملک میں امن قائم

ہواور عوام کی فلاح و بہبود کے وسائل پیدا کئے جائیں بلکہ حکومت پاکستان یہ بھی چاہتی ہے کہ دنیا کو اس نور سے منور کیا جائے جس نے 1300 سال پیشتر مغرب و مشرق کو نورانی کر دیا تھا۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ جب تک دنیا اسلامی رنگ سے نہیں رنگی جائے گی وہ نجات کا راستہ حاصل نہیں کر سکے گی۔''[14] اس نے آئین سازی میں تاخیر پر نکتہ چینی کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''پاکستان میں ایک ایسا آئین مرتب کیا جا رہا ہے جو دنیا کے ہر آئین سے بالکل مختلف ہوگا۔ ہمارے اس آئین کی بنیاد اسلامی اصولوں و روایات پر ہوگی۔ آج کل کی دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جو یہ کہہ سکے کہ اس کے پاس اس قسم کا آئین ہے۔ پاکستان ایک تجربہ کر رہا ہے یعنی وہ دنیا پر یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اسلامی نظریہ باقی سارے نظریات سے برتر ہے۔''[15]

جماعت اسلامی نے پنجابی شاونسٹ درمیانہ طبقہ کے لیاقت علی کی تلئیر بالادستی کے خلاف تضاد میں اسلام کی آمیزش کر کے پنجابی درمیانہ طبقہ میں اپنے لئے جگہ بنانے کی کوشش کی

لیکن پنجاب کے اسلام پسندوں کو لیاقت علی خان کی یہ فقید المثال اسلام پسندی قبول نہیں تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ اس صوبہ کے شہری درمیانہ طبقہ کی اس شکایت میں مضمر تھی کہ لیاقت علی خان مغربی پاکستان کے درمیانہ طبقہ کے مفادات پر ''تلئیروں'' کے مفادات کو ترجیح دے کر اسلام اور پاکستان سے ''غداری'' کا ارتکاب کر رہا ہے اور وہ پنجاب کے یونینسٹ جاگیرداروں سے گٹھ جوڑ کر کے اپنی آمریت قائم کرنے کا عزم رکھتا ہے۔ چونکہ لیاقت علی خان خود ہی شب و روز مذہب کو سیاست سے منسلک کرتا تھا اس لئے مغربی پاکستان کے اس درمیانہ طبقہ نے بھی اس کی حکومت کی مخالفت کے لئے مذہب کو 8/اکتوبر کے سیفٹی آرڈیننس کے ساتھ نتھی کر دیا۔ اس طبقہ کے نمائندے دن رات اپنی تحریروں اور تقریروں میں یہ کہتے تھے کہ ''پبلک سیفٹی آرڈیننس اول سے آخر تک ان تمام اصولوں کی نفی کرتا ہے جن کے لئے اسلام آیا ہے اور جن کے قیام کا دعویٰ جمہوریت کو ہے۔ اسلام نے خلافت راشدہ کے مقدس خلفا اور ان کے پاکباز اور خداترس عمال کو بھی وہ حقوق نہیں دیئے گئے تھے جو پاکستان کی مرکزی حکومت عوام کے بخشے

ہوئے اقتدار سے ناجائز فائدہ اٹھا کر استعمال کرنا چاہتی ہے۔صوبائی حکومتوں کے ارباب اقتدار نے پبلک سیفٹی ایکٹ کو پرسنل سیفٹی ایکٹ کی حیثیت سے نافذ کرنے پر ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ خدا کے بخشے ہوئے اقتدار کا حق امانت ادا کرنے کے اہل نہیں۔ کیا اب مرکزی حکومت کے ارباب حل وعقد بھی یہی تصور قائم کرنے کی دعوت دینا چاہتے ہیں۔''

مغربی پنجاب کے صوبائی شاونسٹوں کی اس خفگی کا سب سے زیادہ فائدہ جماعت اسلامی کو پہنچا۔ چنانچہ امروز کے مطابق جماعت نے 8راکتوبر کے بعد تقریباً ایک ہفتے کے دوران ماموں کانجن، حسین آگاہی روڈ ملتان، نواب شاہ سندھ، سکھر، مسجد امیر خان بہاولپور، چنیوٹ، ایبٹ آباد، چارسدہ، نوشہرہ، منٹگمری (ساہیوال) اور دوسرے متعدد شہروں اور قصبوں میں جلسے کر کے اسلامی حوالوں سے سیفٹی آرڈیننس کی مذمت کی اور مولانا مودودی کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ 19راکتوبر کو سیالکوٹ میں جماعت اسلامی کے زیر اہتمام ایک جلسہ عام میں مقررین نے پہلے تو لیاقت حکومت کے خلاف کھیلوں کے سامان کے صنعتکاروں اور مزدوروں کی شکایت کا ذکر کیا اور پھر ایک قرارداد میں پبلک سیفٹی آرڈیننس کے نفاذ کو خدا اور رسول ﷺ کے احکامات کی کھلی خلاف ورزی قرار دیا۔ قرارداد میں رائے ظاہر کی گئی کہ ''کسی شخص کو عدالت میں الزامات ثابت کئے بغیر نظر بند کرنا سراسر غیر اسلامی ہے۔'' اس سے قبل 16راکتوبر کو خانیوال میں اور 18راکتوبر کو پسرور میں بھی اس مضمون کی قراردادیں منظور کی جا چکی تھیں۔ پنجاب کی حکومت نے جماعت اسلامی کے مُلّاؤں کی اس یلغار کے زور کو کم کرنے کے لئے جمعیت العلمائے پاکستان کے مولانا ابوالحسنات اور بعض دوسرے مُلّاؤں سے یہ بیانات دلوائے کہ ''سیفٹی آرڈیننس از روئے شریعت جائز ہے۔'' مگر ان بیانات کا پنجاب کے شہروں کی رائے عامہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کیونکہ بنیادی مسئلہ یہ نہیں تھا کہ سیفٹی آرڈیننس از روئے شریعت ناجائز ہے بلکہ یہ تھا کہ لیاقت حکومت کے ہاتھوں پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے مفادات کو ''نقصان'' پہنچ رہا تھا۔ یہ طبقہ اپنے اس ''نقصان'' کا ازالہ اسلام کے زور سے کرنا چاہتا تھا اور جماعت اسلامی صورتحال سے فائدہ اٹھا کر اپنی سیاسی دکان چمکا رہی تھی اور لوگوں کی بتا رہی تھی کہ ملک کی موجودہ قیادت کو ایک نئی صالح قیادت سے بدلنے کی ضرورت ہے۔

مجلس احرار کا لیاقت۔ دولتانہ دھڑے کے ساتھ اتحاد اور احراری مولویوں کی احمدیوں کے خلاف بھرپور یلغار

مجلس احرار نے اس صورتحال سے اس طرح فائدہ اٹھایا کہ اس نے جنوری 1949ء میں ''سیاست سے کنارہ کش'' ہو کر اپنی جو ''تبلیغی سرگرمیاں'' شروع کی تھیں وہ اکتوبر میں تیز تر کر دیں۔ احراریوں کی اس نئی مہم کا آغاز 22/اکتوبر کو لاہور کے باغ بیرون دہلی دروازہ سے ہوا جہاں ''امیر شریعت'' سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایک عظیم الشان جلسہ عام کو پانچ گھنٹے تک خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ احراریوں نے اپنے آپ کو اسلامی عقیدہ کا اس کے ابتدائی رنگ و روپ میں تحفظ کرنے کے لئے وقف کر دیا ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے غیر مبہم الفاظ میں یہ اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ ملک کی موجودہ سیاست میں احرایوں کے لئے فی الحال کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہم سیاسی محاذ کی دیکھ بھال کا کام مسلم لیگ پر چھوڑتے ہیں کیونکہ یہی پاکستان کے حصول کی ذمہ دار ہے تاہم آئندہ اگر کبھی ضرورت پڑی تو ہم ہر قسم کی جارحیت کے خلاف ملک کے تحفظ کے لئے مسلم لیگ کی مساعی میں حصہ لینے کے لئے آمادہ ہوں گے۔ اس نے آخر میں مجلس احرار کے اس پروگرام پر روشنی ڈالی جو ان عناصر کے خلاف جدوجہد کرنے کے لئے مرتب کیا گیا تھا جو اسلامی عقیدہ کی پاکیزگی کو آلودہ کر رہے تھے۔ اس نے مسلم لیگ سے اپیل کی کہ وہ اس نیک کام میں احرایوں کی امداد کرے۔''[16] سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی اس تقریر کا مطلب یہ تھا کہ احرایوں کے لیاقت۔ دولتانہ دھڑے کے ساتھ گٹھ جوڑ کے لئے اپریل 1949ء میں ملتان میں جو بات چیت شروع ہوئی تھی وہ کامیابی کے ساتھ مکمل ہو گئی تھی۔ اس گٹھ جوڑ کی بنیاد اس سودے پر تھی کہ مجلس احرار پنجاب کے آئندہ انتخابات میں خود حصہ نہیں لے گی بلکہ مسلم لیگی امیدواروں کی بھرپور حمایت کرے گی۔ اس کے عوض حکومت مجلس کو فرقہ احمدیہ کے خلاف تبلیغی کانفرنسیں کرنے کی کھلی چھٹی دے گی۔ لیاقت۔ دولتانہ دھڑے نے احراریوں کے ساتھ یہ ناپاک گٹھ جوڑ اس لئے کیا تھا کہ جماعت اسلامی نے ایک طرف تو مسلم لیگ کے ممدوٹ دھڑے کے ساتھ اتحاد کی بات چیت کر لی تھی۔ دوسری طرف یہ جماعت 17/اکتوبر کو یعنی مودودی کی نظر بندی کی میعاد میں توسیع کے تقریباً دو ہفتے بعد، ایک ''سول لبرٹیز یونین'' میں شامل ہو گئی تھی جس کی تشکیل کمیونسٹ پارٹی کی

تحریک پر ہوئی تھی اس یونین میں مسلم لیگ (ممدوٹ دھڑا)، ٹریڈ یونین، کمیونسٹ پارٹی، جماعت اسلامی، جرنلسٹ یونین، وکلا، عوامی لیگ، سوشلسٹ پارٹی، مہاجرین، مسلم لیگ ترقی پسند گروپ، طلبا اور ڈیموکریٹک یوتھ لیگ کے نمائندے شامل تھے۔ اس صورتحال میں لیگ کا دولتانہ دھڑا مولانا شبیر احمد عثمانی کی جمعیت العلمائے اسلام اور مولانا عبدالحامد بدایونی کی جمعیت العلمائے پاکستان کی حمایت پر بھروسہ نہیں کرسکتا تھا۔ ان دونوں مذہبی جماعتوں کا پنجاب میں کوئی زیادہ اثر ورسوخ نہیں تھا۔ مزید برآں مولانا شبیر احمد عثمانی، جس پر اکتوبر کے اوائل میں فالج کا دورہ پڑا تھا اور اب وہ قلات میں خان اعظم کے مہمان خصوصی کے طور پر آرام کررہا تھا، ''سیف الاسلام'' مولانا مودودی کی رہائی کے حق میں تھا اور جمعیت العلمائے پاکستان کی پنجاب شاخ انتشار کا شکار تھی۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ مُلّا عبدالستار نیازی کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا جبکہ مولانا ابوالحسنات وغیرہ کی حمایت میں کوئی خاص وزن نہیں تھا۔

سید عطاءاللہ شاہ بخاری کی اس تقریر کے بعد صوبہ بھر میں احراریوں کی تبلیغی کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہوگیا جن میں تقریروں کا واحد موضوع فرقہ احمدیہ ہوتا تھا۔ احراری مُلّا تحفظ ختم نبوت کے لئے نہ صرف فرقہ احمدیہ کو مرتد اور واجب القتل قرار دیتے تھے بلکہ وہ وزیر خارجہ ظفر اللہ خان کو بھی یہود وہنود کا ایجنٹ قرار دیتے تھے۔ 26-27 ر نومبر 1949ء کو احراریوں نے سیالکوٹ میں جو تبلیغی کانفرنس منعقد کی اس میں گیارہ ہزار حاضرین کے سامنے ماسٹر تاج الدین، مولوی محمد حیات، مولوی محمد علی جالندھری، شیخ حسام الدین، قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور سید عطاءاللہ شاہ بخاری نے تقریریں کیں۔ ان سب نے احمدیوں کو، احمدیت کے بانی کو، احمدی لیڈروں کو اور چودھری ظفر اللہ خان کو گالیاں دیں۔ اس جلسہ میں جو تقریریں کی گئیں ان کا ایک نمونہ یہ تھا کہ ''اگرچہ مرزا غلام احمد جھوٹا تھا لیکن ہم اس کو الزام نہیں دیتے کیونکہ وہ صرف کبھی کبھی زنا کرتا تھا۔ ہمارا اعتراض موجودہ خلیفہ پر ہے جو ہر روز زناکاری کا مرتکب ہوتا ہے۔''[17]

اس کے بعد احراریوں نے یکم دسمبر کو گوجرانوالہ کے شیرانوالہ باغ میں ڈسٹرکٹ تبلیغی کانفرنس منعقد کی جس میں احمدیوں کے خلاف تقریروں کا مضمون اور لب ولہجہ اسی قسم کا تھا۔ احرایوں کی ان تقریروں کی رپورٹیں بہت کم اخبارات میں چھپتی تھیں کیونکہ بیشتر اخبارات ملک میں فرقہ واریت کو ہوا دینے کی پالیسی کے خلاف تھے۔ نوائے وقت میں احرار کانفرنسوں کی خبریں

نہ چھپنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ احرایوں نے لیگ کے لیاقت۔دولتانہ دھڑے سے اتحاد کیا ہوا تھا جبکہ ممدوٹ لیاقت علی خان کے خلاف شدید محاذ آرائی کی تیاری کر رہا تھا۔تاہم 3 ر دسمبر کو گجرات میں احراریوں کی جو تبلیغی کانفرنس ہوئی اس کی ایک مختصر خبر پاکستان ٹائمز میں شائع ہوئی۔اس خبر میں یہ بتایا گیا تھا کہ ''کانفرنس میں سید عطا اللہ شاہ بخاری نے تقریر کی اور مجلس احرار کے چیف آرگنائزر شیخ حسام الدین نے احراریوں کے اس فیصلے پر روشنی ڈالی جس کے مطابق انہوں نے مسلم لیگ کے حق میں اپنی تمام تر سیاسی سرگرمیاں معطل کر کے صرف تبلیغی کام کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''اس خبر پر امروز کے مولانا چراغ حسن حسرت کا تبصرہ یہ تھا کہ ''یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ سیاست سے احرار کا کوئی واسطہ نہیں تو وہ تبلیغ کیونکر کریں گے۔اگر تبلیغ سے ان کی مراد یہ ہے کہ قرآن کا صحیح پیغام لوگوں تک پہنچایا جائے جب تو سیاسیات سے پہلو بچانا ناممکن ہے۔ہاں اگر وہ صرف وضو، نماز اور روزہ کے مسائل بیان کرنا چاہتے ہیں تو اور بات ہے لیکن یہ کام تو مسجدوں کے پیش امام بھی کر رہے ہیں۔احرار نے یہ کام سنبھال لیا تو یہ لوگ کیا کریں گے۔''مولانا حسرت کا یہ تبصرہ 5 ر دسمبر کے امروز میں شائع ہوا تھا۔اس کے دو دن بعد 7 ر دسمبر کو نوشہرہ ورکاں میں اہلسنّت والجماعت کے نام سے ایک جلسہ عام منعقد ہوا تو مولوی غلام اللہ خان کی تقریر سے اس تبصرہ کا جواب مل گیا۔غلام اللہ خان کی تقریر یہ تھی کہ ''مرزا غلام احمد دجال تھا جس کو انگریزوں نے مسلمانوں کے اتحاد کو توڑنے کی غرض سے پیدا کیا تھا۔قادیانی لوگ خصوصاً چودھری ظفر اللہ خان پاکستان اور ملت مسلمہ کو سخت نقصان پہنچا رہے ہیں اور قادیان کے لئے کشمیر کو فروخت کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔''پنجاب حکومت کے ڈی۔آئی۔جی (سی۔آئی۔ڈی) میاں انور علی کی رائے یہ تھی کہ اس تقریر کی بنا پر غلام اللہ خان کے خلاف سیفٹی ایکٹ کے تحت کاروائی ہونی چاہیے۔انور علی نے اس تقریر پر تبصرہ میں ایک معاہدے کا ذکر بھی کیا جو احراریوں کے قول کے مطابق ان کے اور وزیراعظم کے درمیان ہو چکا تھا اور اس معاہدے کا مقصد یہ تھا کہ ظفر اللہ خان کو، جو ایک سیاسی خطرہ بن چکا ہے مرکزی وزارت سے نکال دیا جائے۔مگر جب یہ کیس شعبہ قانون کے مشیر کے پاس پہنچا تو اس نے ایک اور کیس میں اپنی رائے کا حوالہ دیتے ہوئے حکم صادر کیا کہ فی الحال احراری لیڈروں کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی جائے گی اور حکومت ابھی حالات کا انتظار کرے گی۔[18]

نوائے وقت نے احراریوں کے برخلاف احمدیوں کی حمایت کی۔ مدیر نوائے وقت احمدیوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار نہیں دیتا تھا

صوبائی حکومت کی اس چشم پوشی سے احراریوں کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی اور ان کی فرقہ احمدیہ اور ظفر اللہ خان کے خلاف دشنام طرازی تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ اس صورتحال میں فی الحقیقت یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ مجلس احرار کے یہ فتنہ پرور مولوی قومی یکجہتی کو تباہ و برباد کر دیں گے۔ مسلم لیگ کے لیاقت۔ دولتانہ دھڑے نے پس پردہ احراریوں سے گٹھ جوڑ کر کے جو سیاسی کھیل کھیلا تھا اس کے بڑے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی انتخابی مصلحت کے تحت احراریوں کو فی سبیل اللہ فساد پھیلانے کی اجازت دی تھی اور شب و روز فساد پھیلانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ چونکہ مسلم لیگ کا ممدوٹ دھڑا خطرناک کھیل میں شامل نہیں تھا اس لئے نوائے وقت نے احراریوں کا نام لئے بغیر ان کی انتشار انگیز سرگرمیوں پر بڑی دردمندی کے ساتھ دو ایک اداریے لکھے۔ اس نے پہلے اداریے میں لکھا کہ ''پاکستان میں اسلامی معاشرے، اسلامی نظام یا اسلامی حکومت کے قیام کی آڑ لے کر پاکستان کو کمزور کرنے کی کوشش خواہ وہ کسی طرف سے ہو ہمارے نزدیک شدید مذمت کی مستحق ہے کیونکہ یہ کوشش ملک و ملت سے غداری کے مترادف ہے۔ اسلام کی تاریخ میں اسلام کو کمزور کرنے کے لئے جتنے فتنے اسلام کے نام پر برپا کئے گئے ہیں کسی دوسرے نام پر برپا نہیں کئے گئے۔ اس لئے ہم یہ ماننے پر تیار نہیں کہ کوئی چیز محض اس لئے مسلمانوں کے لئے مفید ہو جاتی ہے کہ اس پر ''اسلامی'' کا لیبل چسپاں کر دیا گیا ہے۔ ہم صاف الفاظ میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہر وہ حرکت جو پاکستان کو کمزور کرنے کے لئے کی جائے خواہ وہ اسلام کے نام پر ہی کیوں نہ کی جا رہی ہو، غیر اسلامی بلکہ اسلام دشمن ہے۔ اس لئے اگر خدانخواستہ ایسی حرکات سے پاکستان ہی ختم ہو گیا تو کم از کم زمین کے اس حصہ میں اسلام کا نام کہاں باقی رہ جائے گا؟ پاکستان کو کمزور بنا کر اسلام کو فروغ دینے کی امید رکھنے والے یا احمق ہیں یا بے ایمان۔ کوئی تیسری بات ممکن ہی نہیں۔''[19]

کچھ عرصہ بعد اس نے دوسرے اداریہ میں لکھا ''آج پاکستان کے مسلمان ایک بہت بڑے خطرے سے دوچار ہیں جس کا اگر بروقت سدباب نہ کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ کہیں ہمارا وہ

شیرازہ ملی نہ بکھر جائے جو حضرت قائداعظم کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ کہیں ہماری قومی وحدت کی لڑی کے وہ موتی الگ الگ نہ ہو جائیں جنہیں بابائے ملت نے بہ مشکل تمام اتحاد کے رشتے میں پرویا تھا۔ ہمارا اشارہ فروعی اختلافات کے اس بیج کی طرف ہے جسے بعض خودغرض، اسلام کے دشمن اور تخریبی عناصر اس اسلامی مملکت کی سرزمین میں بونے کی سعی نامسعود کر رہے ہیں...... اسلام ایک سیدھا سادہ مذہب ہے جس کے بعض واضح بنیادی اصول ہیں۔ ایسے اصول جو ہر مسلمان کا جزو ایمان ہیں اور وہ یہ کہ (1) خدا ایک ہے اور کے سوا کوئی معبود نہیں۔ (2) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے رسول ہیں۔ (3) کلمہ، نماز، روزہ، حج ارکان اسلام ہیں۔ (4) قرآن کلام الٰہی ہے جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اتارا گیا۔ (5) مسلمانوں کا قبلہ کعبتہ اللہ ہے۔ ان بنیادی عقائد سے کسے اختلاف ہو سکتا ہے؟ تو پھر کیا ہم اس احساس پر متحد و متفق نہیں ہو سکتے۔ ان کے علاوہ اگر کسی کے کچھ اور فروعی عقائد ہیں تو انہیں اتحاد اسلامی کے راستے میں سنگ گراں بننے کیوں دیا جائے؟ اس قسم کی تفرقہ انگیزی اور فرقہ بندی سے بہت بلند و بالا ہو کر ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا اور آج پاکستان کو مستحکم و مضبوط بنانے کی بجائے اگر ہم بدقسمتی سے پھر تفرقہ بندی کی طرف مائل ہو جائیں تو ہمارا یہ عمل شجر پاکستان پر کلہاڑے کا کام کرے گا۔ ہمارے لئے صرف یہی کافی ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ قرآن ہمارا رہنما ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اور اسوہ حسنہ ہمارے لئے مشعل ہدایت ہے۔ اسلام نے ہمیں صرف خود اپنے اور اپنے ہم جنس ہی کے ساتھ نہیں بلکہ پوری کائنات کے ساتھ پرامن طریق زندگی اور ان سے ہم آنگی کے ساتھ رہنے سہنے اور اس طرح خدا کی وحدت کا عملی مظاہرہ کرنے کا طریقہ سکھایا ہے...... مسلمانان پاکستان سے ہماری یہ دردمندانہ اپیل ہے اور تاریخ کے ان نازک لمحات میں جبکہ استحکام پاکستان کے لئے اتحاد ملی بہت ضروری ہے اپنی صفوں میں پھوٹ نہ پڑنے دیں۔ فروعی اختلافات کی آگ کو اگر کوئی بدخواہ ہوا دے رہا ہے تو اسے بے نقاب کریں اور تخریبی عناصر کی قطعی حوصلہ افزائی نہ فرمائیں۔''[20]

نوائے وقت کے اس اداریے میں اسلام کے جو پانچ بنیادی عقائد بیان کے گئے تھے ان میں ختم نبوت کا عقیدہ شامل نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس زمانے میں مدیر نوائے وقت فرقہ احمدیہ کو دائرہ اسلام سے خارج تصور نہیں کرتا تھا حالانکہ اس فرقہ کے ارکان مرزا غلام احمد کو نبی مانتے تھے۔ مدیر نوائے وقت اسے ''فروعی عقائد'' میں شمار کرتا تھا اور اسے ''اتحاد اسلامی کے

راستے میں سنگ گراں'' بنانے کے حق میں نہیں تھا۔ اس کے برعکس احراری مولوی اپنی تبلیغی کانفرنسوں میں یہ کہتے تھے کہ ختم نبوت کا عقیدہ اسلام کے بنیادی عقائد میں شامل ہے۔ مرزا غلام احمد جھوٹا ہے اور جو شخص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین نہیں مانتا وہ مسلمان ہی نہیں ہے، وہ مرتد ہے اور واجب القتل ہے۔ یہ مذہبی عقیدہ صرف احراریوں تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مفتی شفیع اور مولانا ابوالحسنات کے علاوہ دوسرے بہت سے سربرآوردہ علما و مشائخ اسی موقف کے حامل تھے۔ مولانا عثمانی نے تو پندرہ بیس سال قبل اس مسئلہ پر ایک کتابچہ بعنوان ''الشہاب'' بھی لکھا تھا جس میں اس نے فرقہ احمدیہ کو مرتد اور واجب القتل قرار دیا تھا۔ دراصل مدیر نوائے وقت کی بھی مشکل وہی تھی جو لیاقت علی خان وغیرہ کی تھی۔ یہ لوگ اسلام کو اپنے سیاسی مفادات کے تحفظ اور فروغ کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے لیکن وہ اسلام کی ایسی تعبیر وتشریح کرتے تھے جو پیشہ ور مُلّاؤں کے لئے قابل قبول نہیں ہوسکتی تھی۔ مدیر نوائے وقت ایک طرف تو مولانا شبیر احمد عثمانی کو شیخ الاسلام کا رتبہ دیتا تھا لیکن دوسری طرف وہ اس کے اس فتوے کو تسلیم نہیں کرتا تھا کہ فرقہ احمدیہ مرتد ہے اور واجب القتل ہے اور تیسری طرف وہ ان احراریوں کو تخریبی عناصر قرار دیتا تھا جو مولانا عثمانی کے فتوے کے مطابق احمدیوں کے خلاف بدترین قسم کی دشنام طرازی کر کے انہیں گردن زدنی قرار دیتے تھے۔ مدیر نوائے وقت جب یہ کہتا تھا کہ اسلام کی رو سے مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں ہیں اور پاکستان اسلامی نظام یا شرعی نظام قائم کرنے کے لئے قائم کیا گیا یا جب لیاقت علی خان یہ کہتا تھا کہ پاکستان اسلام کی ایک تجربہ گاہ کے طور پر قائم ہوا ہے جس میں 1300 سال پہلے کے اسلامی اصولوں پر عملدرآمد ہوگا تو ان کی سیاسی مصلحتیں انہیں یہ احساس نہیں ہونے دیتی تھیں کہ اگر ان کی یہ باتیں صحیح ہیں تو پھر یہاں وہ اسلام چلے گا جس پر پیشہ ور علما و مشائخ مہر تصدیق ثبت کریں گے۔ اور یہ کہ ان علما و مشائخ میں ایسے عناصر کی کمی نہیں تھی جو فرقہ احمدیہ کے علاوہ فرقہ شیعہ کو بھی مرتد اور واجب القتل قرار دیتے تھے۔ احراریوں اور دوسرے مُلّاؤں کے نزدیک ختم نبوت کا مسئلہ فروعی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ ایک ایسا بنیادی مسئلہ ہے کہ جس کو حل کئے بغیر پاکستان میں اسلامی نظام قائم نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ مطالبہ کرتے تھے کہ احمدیوں کو غیر مسلم قرار دو اور ظفر اللہ خان کو وزارت خارجہ کے کلیدی عہدہ سے الگ کرو کیونکہ ان کی رائے میں ایک اسلامی

مملکت میں کوئی غیر مسلم کسی کلیدی عہدے پر فائز نہیں ہوسکتا تھا۔

بظاہر نوائے وقت کے یہ اداریے نیک نیتی پر مبنی تھے۔ احراری عناصر واقعی تخریبی عناصر تھے۔ وہ احمدیوں کے خلاف تبلیغی کانفرنسیں منعقد کر کے واقعی قومی یکجہتی کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا رہے تھے لہٰذا یہ ہر محب الوطن کا فرض تھا کہ وہ ان تخریبی عناصر کی سرگرمیوں کا سد باب کرے۔ لیکن ایسا صرف اسی صورت ہوسکتا تھا کہ قائداعظم کی 11 راگست 1947ء کی تقریر پر خلوص دل سے عمل کیا جاتا اور مذہب کو سیاست سے وابستہ نہ کیا جاتا۔ مدیر نوائے وقت ان عناصر میں سے تھا جنھوں نے جناح کو ان کی اس تقریر کی بنا پر سب سے پہلے ہدف ملامت بنایا تھا اور پھر جب احراریوں نے جنوری 1949ء میں ''سیاست سے کنارہ کشی'' کا اعلان کیا تھا تو نوائے وقت نے ان کے اس فیصلے کا اس امید میں ادارتی خیر مقدم کیا تھا کہ اس مجلس کے سرگرم کارکن مسلم لیگ کے ممدوٹ دھڑے سے گٹھ جوڑ کر لیں گے۔ مگر ایسا نہ ہوا اور احرایوں نے لیاقت۔ دولتانہ دھڑے کے ساتھ ساز باز کر کے زور شور سے اور بلا خوف وخطر اپنی تفرقہ انگیز سرگرمیاں شروع کر دیں۔ اس صورتحال کی ذمہ داری کسی حد تک فرقہ احمدیہ کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود اور وزیر خارجہ ظفر اللہ خان پر بھی عائد ہوتی تھی کہ انھوں نے خود پاکستان کی سیاست میں مذہب کو ملوث کر کے احراریوں کو اپنے خلاف سرگرم عمل ہونے کا موقع مہیا کیا تھا۔ جب ظفر اللہ خان نے 12 رمارچ 1949ء کو دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد پر بحث کے دوران اپنے طویل ''مذہبی خطبے'' میں یہ کہا تھا کہ مذہب کو سیاست سے الگ نہیں کیا جاسکتا تو اسے نہیں معلوم تھا کہ احراری اسی قرارداد مقاصد کے کلہاڑے سے اس کے فرقہ کی مذہبی جڑیں اکھیڑ دیں گے۔

نوائے وقت کا یہ دوسرا اداریہ اس کے 17 ردسمبر کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اسی دن لائل پور میں احراریوں کی ایک تبلیغی کانفرنس ہوئی جس میں کوئی پانچ ہزار حاضرین کے سامنے مولوی غلام غوث سرحدی، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، مولوی محمد علی جالندھری، شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین نے تقریریں کیں۔ ان تقریروں میں احمدیوں کے خلاف اس قدر بدکلامی کی گئی تھی کہ پنجاب کے خفیہ پولیس کے سربراہ انور علی کی رائے یہ تھی کہ اس بنا پر ان احراریوں کے خلاف سیفٹی ایکٹ کے تحت کاروائی ہونی چاہیے۔ انور علی نے یہ تجویز 30 ردسمبر کو پیش کی مگر شعبہ قانون کے مشیر نے اس تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ ''ان لوگوں نے احمدیوں کو

اپنے حملہ کا نشانہ اس لئے بنایا ہے کہ عوام ان کی باتیں سن لیں۔ یہ لوگ ان مذہبی جذبات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں جو عام مسلمانوں کے دلوں میں احمدیوں کے خلاف جاگزیں ہیں۔ لیکن فی الحال احراریوں کو گالیاں دینے کی بنا پر مقدمات چلائے گئے تو یہ لوگ عوام کی نگاہوں میں شہادت کا مرتبہ حاصل کر لیں گے جس کے یہ بالکل مستحق نہیں ہیں۔ لہٰذا احراری لیڈروں کے خلاف کسی قسم کا اقدام نہیں ہونا چاہیے۔'' جب یہ کیس 5 رجنوری 1950ء کو گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر کے سامنے آیا تو اس نے لکھا کہ ''چند روز ہوئے مولوی غلام غوث سرحدی مجھ سے ملنے آیا تھا تو میں نے اس کو آگاہ کر دیا تھا کہ حکومت کسی شخص کو اپنے مذہبی خیالات کی اشاعت سے روکنا نہیں چاہتی لیکن وہ ایسی تقریروں کو برداشت نہ کرے گی جن سے نقص امن کا احتمال ہو۔''[21]

نوائے وقت کے بقول مجلس احرار کے تخریبی عناصر مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان فروعی اختلافات کو ہوا دے کر شجر پاکستان پر کلہاڑے مار رہے تھے اور ملک وقوم کی یکجہتی کو تباہ کر رہے تھے لیکن گورنر نشتر کا خیال تھا کہ کم از کم 5 رجنوری 1950ء تک وہ محض اپنے مذہبی خیالات کی اشاعت کر رہے تھے اور انہوں نے اس وقت تک ایسی کوئی تقریر نہیں کی تھی جس میں نقص امن کا احتمال ہوسکتا تھا۔

لیاقت ۔ دولتانہ دھڑے کی جانب سے احراریوں کی پشت پناہی......

ارباب حکومت اپنے طبقاتی مفاد اور اینگلو۔ امریکی سامراجی مفادات کے لئے اسلام پسند ہوتے جارہے تھے

نوائے وقت کی رائے اور گورنر نشتر کے خیال کے درمیان متذکرہ تضاد دراصل مسلم لیگ کے دولتانہ دھڑے اور ممدوٹ دھڑے کے درمیان تضاد کا مظہر تھا۔ احراری اپنے جلسوں میں کھلم کھلا یہ کہتے تھے کہ لیاقت علی نے ان سے معاہدہ کیا ہوا ہے اور لیاقت علی نے کبھی ان کی تردید نہیں کی تھی اس لئے بے چارا گورنر نشتر کیا کر سکتا تھا۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ وہ وزیراعظم لیاقت علی کا معتمد خاص تھا اور اسے کسی نہ کسی دن ڈپٹی وزیراعظم بننے کی

امید لگی ہوئی تھی۔ گورنر نشتر کی طرف سے احراریوں کے خلاف کوئی اقدام نہ کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان اور دوسرے ارباب اقتدار حتیٰ کہ وزیر خزانہ غلام محمد بھی داخلی اور خارجی وجہ کی بنا پر اسلام کو بطور سیاسی حربہ استعمال کرنے پر مصر تھے۔ اس لئے اسلام کے نام لیوا احراریوں کے خلاف محض ان کی ''تبلیغی سرگرمیوں'' کی وجہ سے تعزیری اقدام کیسے کیا جا سکتا تھا۔

نومبر 1949ء کے آخری ہفتے میں وزیر اعظم لیاقت علی خان اور وزیر خزانہ غلام محمد دونوں ہی نے انٹرنیشنل اسلامک اکنامک کانفرنس میں اسلامی مساوات، اسلامی اخوت اور اسلامی اتحاد کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ 10 /دسمبر کو وزیر اعظم لیاقت کی پشاور میں تقریر یہ تھی کہ ''ہم نے اخوت و مساوات کے اسلامی اصولوں کی بنا پر صحیح اسلامی مملکت قائم کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے...... ہمیں بدلے ہوئے حالات زمانہ کے پیش نظر قرآنی احکام کو اپنے آئین کی اساس بنانا ہے۔ اگر اس مرحلہ پر ایک غلطی بھی سرزد ہوگئی تو ہمارے مستقبل کا تمام ڈھانچہ ناقص رہ جائے گا...... ہم تاریکی میں مستور اور تباہی کی طرف راجع دنیا کو روشنی سکھانے کا عزم کر چکے ہیں۔''[22] غالباً لیاقت علی کے اسی عزم کی وجہ سے اسی دن یہ اعلان ہوا تھا کہ امریکہ کے صدر ٹرومین نے وزیر اعظم لیاقت علی خان اور اس کی بیگم کو مئی 1950ء میں امریکہ آنے کی دعوت دی ہے اور اس کے تقریباً ایک ہفتہ بعد امریکہ کے ہفت روزہ نیوز ویک کا انکشاف یہ تھا کہ لیاقت نے سوویت یونین جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے حالانکہ سٹالن نے کئی ماہ قبل اسے ماسکو کے دورہ کی دعوت دی تھی۔ اور پھر 19 /دسمبر کو پنجاب یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد میں غلام محمد نے ایک طویل اسلامی خطبہ دیا تھا جس میں اس نے اسلامی معیشت اور اسلامی جمہوریت کی برکتیں گنوائی تھیں۔ اس کی رائے یہ تھی کہ اسلامی مملکت صحیح معنوں میں جمہوری فلاحی مملکت ہوگی۔ یہ وہی غلام محمد تھا جو سیکولر نظام حکومت کا علمبردار تھا، قرارداد مقاصد کے خلاف تھا اور علی الاعلان یہ کہا کرتا تھا کہ مذہب کا سیاست سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن اب یہ محض اینگلو۔ امریکی سامراج کے مفاد کی خاطر ''حضرت مولانا'' غلام محمد ککے زئی لاہوری بن گیا تھا۔ یونیورسٹی کے اس جلسہ میں ''حضرت مولانا'' غلام محمد کے علاوہ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کو بھی مشرقی علوم کی ڈاکٹری کی ڈگری دی گئی تھی۔

شبیر احمد عثمانی کا انتقال اور یہ بحث کہ شیخ الاسلام کا سرکاری عہدہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ اس پر کون فائز ہوگا؟

مولانا عثمانی کا انتقال 13 ردسمبر 1949ء کو بغداد الجدید (بہاولپور) میں ہوا تھا۔ وہ والئی بہاولپور کی دعوت پر جامعہ عباسیہ کا معائنہ کرنے کے لئے گیا ہوا تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کے انتقال پر پورے ملک میں سوگ منایا گیا تھا۔ بعض دینی حلقوں کی رائے یہ تھی کہ پاکستان اپنے عظیم المرتبت فقیہ اور عالم دین سے ایک ایسے وقت میں محروم ہوگیا ہے جبکہ دستور سازی کے دشوار اور پرصعوبت کام میں ان کی رہنمائی کی اشد ضرورت تھی۔ تاہم اس سانحہ کے دو تین ہفتے کے بعد 6 رجنوری 1950ء کو جب جمعیت العلمائے اسلام کی ورکنگ کمیٹی کے ایک خاص اجلاس میں مولانا ظفر احمد عثمانی کو مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کی جگہ عارضی طور پر جمعیت کا صدر منتخب کیا گیا تو ایک اور مذہبی مسئلہ نے جنم لیا اور وہ یہ تھا کہ اسلام کی رو سے مملکت پاکستان میں شیخ الاسلام کا کوئی سرکاری عہدہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر ہوسکتا ہے تو اس عہدہ پر کس کو فائز ہونا چاہیے۔ اس عہدہ کے لئے بعض حلقوں کی طرف سے مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا قمر الدین سجادہ نشین سیال شریف کے نام بھی لئے گئے تھے۔ ایک اور متنازعہ مسئلہ یہ تھا کہ تعلیمات اسلامیہ بورڈ میں اور دستور ساز اسمبلی میں مولانا عثمانی کی رحلت سے جو نشستیں خالی ہوئی ہیں انہیں پر کرنے کے لئے کس شخصیت کا انتخاب کیا جائے۔ نوائے وقت کا مطالبہ یہ تھا کہ یہ اعزاز ڈھاکہ کے بہاری مولانا راغب احسن کو دینا چاہیے اور مولانا راغب احسن کی رائے یہ تھی کہ مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی اس اعزاز کا مستحق نہیں ہے۔ وہ ایک سرکاری و درباری آدمی ہے، ایک مدرسہ کا ہیڈ ماسٹر ہے اور اس کا تعلق اعلیٰ خاندان سے بھی نہیں ہے۔

احراری مولویوں کی عوام کے مسائل سے توجہ ہٹانے کے لئے احمدیوں کے خلاف زوردار تحریک اور پنجاب کے جاگیرداروں اور زمینداروں کی طرف سے مُلّاؤں کی سرپرستی

لیکن احراری مُلّاؤں نے اپنے آپ کو مذکورہ بحث میں ملوث نہ کیا کیونکہ ان کے نزدیک تحفظ ختم نبوت کا مسئلہ اسلام کی زندگی و موت کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے پہلے تو

15رجنوری 1950ء کو سیالکوٹ میں احمدیوں کے ایک تبلیغی جلسے کو خشت باری کر کے درہم برہم کر دیا اور پھر 28، 29 جنوری 1950ء کو ملتان میں ایک تبلیغی کانفرنس کی جس میں بہت سے مقررین نے تقریریں کیں۔ ان مقررین میں سید عطا اللہ شاہ بخاری، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، غلام نبی جانباز اور مولوی محمد علی جالندھری بھی شامل تھے۔ اس جلسہ میں حاضرین کی تعداد خاصی زیادہ تھی۔ اس میں مقررین نے مرزا غلام احمد کو ماسٹر تارا سنگھ سے تشبیہ دی۔ چودھری ظفر اللہ خان کے خلاف توہین آمیز اشارات کئے گئے اور انہیں مسلمان قوم کا غدار بتایا گیا۔ اس کے علاوہ جماعت احمدیہ کے بانی اور اس کے موجودہ امام کے متعلق فحش باتیں کہی گئیں۔ جنرل نذیر احمد کو بھی تبصرہ کا نشانہ بنایا گیا۔ سید عطا اللہ شاہ بخاری نے بیان کیا کہ ڈپٹی کمشنر ملتان نے بعض مسجدیں مسلمانوں سے چھین کر مرزائیوں کو دے دی ہیں۔ جب اس جلسے کی روداد 11رفروری 1950ء کو شعبہ قانون کے مشیر کے سامنے آئی تو اس نے اپنی وہی پرانی دلیل دہرادی کہ اگر وزیر خارجہ اور احمدیوں کو گالیاں دینے کی پاداش میں احراریوں کے خلاف کوئی اقدام کیا گیا تو احراری مرتبہ شہادت حاصل کرلیں گے اور عوام کو ان سے بے انتہا ہمدردی ہو جائے گی حالانکہ وہ عوام کی نگاہوں میں ایسا محترم مقام حاصل کرنے کے مستحق نہیں ہیں۔ لیکن جب 13رفروری کو یہ کیس گورنر نشتر نے دیکھا تو اس مرتبہ اس نے اس کا ذرا سختی سے نوٹس لیا۔ اس نے لکھا کہ میرے نزدیک مجلس احرار کو طلب کر کے اس کو آگاہ کر دیا جائے کہ احرار نے مملکت کے فوجی اور غیر فوجی معززین کے خلاف دشنام طرازی کی جو مہم جاری کر رکھی ہے اس کے نتائج اچھے نہ ہوں گے۔ کسی شخص کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ مذہب کا نام لے کر مملکت کی بنیادوں کو کمزور کرے۔ میں نے مسئلے کے اس پہلو پر قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور مولوی غلام غوث سرحدی سے بات چیت کی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان پر اشارے کنائے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اب احراریوں کے ساتھ فرداً فرداً کھلی کھلی بات ہونی چاہیے اور اگر قانون کے مشیر صاحب احراریوں سے گفتگو کرنے میں کوئی دشواری محسوس کرتے ہوں تو میں خود ان سے بات کروں گا۔ چنانچہ 20رفروری 1950ء کو شعبہ قانون کے مشیر نے ماسٹر تاج الدین صدر مجلس احرار کو طلب کر کے تنبیہ کی کہ چودھری ظفر اللہ خان اور جنرل نذیر احمد جیسے معزز و مقتدر ارکان مملکت کو گالی گلوچ کا نشانہ بنانے کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ ماسٹر صاحب سے یہ بھی کہہ دیا گیا کہ حکومت اس تنبیہ کے نتیجے کو دیکھے گی اور اگر اس کا کوئی اثر نظر نہ آیا تو حکومت مجبور ہوگی کہ احرار کے خلاف شدید اقدامات کا

حکم دے۔''[23] مگر احراریوں پر اس تنبیہ کا کوئی اثر نہ ہونا تھا اور نہ ہوا۔ اول اس لئے کہ گورنر نشتر نے انہیں یہ تنبیہ کرنے کی ہدایت نہیں کی تھی کہ وہ عوامی جلسوں میں مسئلہ ختم نبوت کو زیر بحث لا کر فرقہ پرستی کو ہوا نہ دیں، صرف یہ تنبیہ کرنے کی ہدایت کی تھی وہ مملکت کے فوجی اور غیر فوجی معززین کو گالیاں نہ دیں۔ دوئم اس لئے کہ احراریوں کا دولتانہ۔ لیاقت دھڑے سے سیاسی معاہدہ تھا اور پنجاب کے آئندہ انتخابات میں اس دھڑے کو احراریوں کی حمایت کی ضرورت تھی۔

حکومت پنجاب کی جانب سے احراریوں کو کی گئی اس تنبیہ کے بے اثر ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پاکستان کے مختلف عناصر نے اپنے مفادات کے تحفظ و فروغ کے لئے جو مذہبی جھنڈے اٹھائے ہوئے تھے ان میں سب سے اونچا جھنڈا مغربی پاکستان کے نوابوں، جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کا تھا۔ چونکہ پنجاب میں ملتان ڈویژن بڑے زمینداروں کا گڑھ تھا اس لئے ملتان میں ہر رنگ و ہر نوع کے علماو مشائخ کی بڑی پذیرائی ہوئی اور نتیجتاً مجلس احرار اسلام، جماعت اسلامی، انجمن تحفظ حقوق شیعان، جمعیت اہلسنّت والجماعت، جمعیت العلمائے اسلام اور حتیٰ کہ جماعت احمدیہ کی بڑی بڑی کانفرنسیں ملتان میں ہی ہوئی تھیں۔ زمیندار نہ صرف ان سب جماعتوں کو چندے دے کر اسلامی نقطہ نگاہ سے زمینداری نظام کے حق میں پروپیگنڈے کرواتے تھے بلکہ وہ مختلف چھوٹے بڑے مزاروں پر بڑی دھوم دھام سے سالانہ عرس کی تقریبات کا انتظام کر کے غریب کسانوں میں اپنے تقدس کا تاثر پیدا کرتے تھے۔ بہت سے زمیندار یا تو خود پیر تھے یا سجادہ نشین تھے اور وہ ہمہ وقت غریبوں کو تعویز گنڈے کے ذریعے اپنے مصائب سے نجات حاصل کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ مظفر گڑھ کا ایک بڑا زمیندار پیر سید نو بہار شاہ تو ممتاز دولتانہ سمیت ہر اس شخص کو کمیونسٹ اور ملحد قرار دیتا تھا جو مروجہ زمینداری نظام میں ذرا سی بھی ترمیم و اصلاح کا ذکر کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپریل 1949ء میں جاگیرداری کی تنسیخ کے بارے میں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے فیصلے کے بعد ایک انجمن تحفظ حقوق زمینداران اراضی تحت الشریعت بنالی تھی اور جب دسمبر 1949ء میں گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین ملتان کے دورے پر گیا تھا تو اس انجمن کی طرف سے اس کے اعزاز میں شاندار دعوت دی گئی تھی جس میں علاقہ کے سارے بڑے زمینداروں نے شرکت کی تھی۔ ملک فیروز خان نون کے ایوان زراعت یا زمیندارہ لیگ نے بھی اس تقریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

اگرچہ مجلس احرار کی تبلیغی کانفرنسوں کی توپوں کا رخ زیادہ تر جماعت احمدیہ کی طرف ہوتا تھا لیکن نوابوں، جاگیرداروں اور زمینداروں کو بالواسطہ طور پر ان کانفرنسوں سے بہت فائدہ پہنچتا تھا کیونکہ احراریوں کی تقریروں سے غریب عوام کو یہ تاثر ملتا تھا کہ پاکستان کا واحد اسلامی و قومی مسئلہ ختم نبوت کا مسئلہ ہے اور جو لوگ نوابی، جاگیرداری اور زمینداری نظام کو ملک کا سب سے بڑا مسئلہ قرار دیتے ہیں، اسلام دشمن ہیں۔ لہٰذا گورنر نشتر احراریوں کے خلاف کوئی تعزیری کاروائی نہیں کرسکتا تھا۔ لیاقت علی خان نے ممتاز دولتانہ اور فیروز خان نون کی وساطت سے پنجاب کے بیشتر بڑے بڑے زمینداروں سے انتخابی گٹھ جوڑ کر لیا تھا اور زمینداروں کے مفادات کا تقاضا یہ تھا کہ احراریوں کی تبلیغی کانفرنسیں جاری رہیں۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ جہاں تک جاگیرداری زمینداری نظام کے مسئلہ کا تعلق تھا جماعت احمدیہ کو بھی احراریوں اور دوسرے مُلّاؤں سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ چنانچہ احمدیوں کے اخبار ''الفضل'' کا فتویٰ یہ تھا کہ ''اسلام کی رو سے زمینداری اور جاگیرداری دونوں جائز ہیں۔''[24]

شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم بھی نوابیوں، تعلقہ داریوں، جاگیرداریوں اور زمینداریوں کو اسلام کے عین مطابق قرار دیتا تھا۔ اس نے جب 38-1937ء میں دیوبندیوں کی جمیعت العلمائے ہند سے علیحدگی اختیار کی تھی تو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جمعیت العلمائے ہند سیاسی طور پر کانگرس سے وابستہ تھی اور ان دنوں کانگرس کا پروگرام یہ تھا کہ یو۔ پی اور بہار میں مسلمانوں کی تعلقہ داریاں ختم کر دی جائیں گی۔ لاہور کے روزنامہ انقلاب کے بیان کے مطابق اس موقع پر مولانا عثمانی کا فتویٰ یہ تھا کہ ''تعلقہ داریوں کی حفاظت کے لئے جان دینا شہادت ہے۔'' جمعیت سے علیحدگی کے بعد مولانا عثمانی حیدر آباد دکن چلا گیا تھا جہاں اسے نظام دکن کی طرف سے 200 روپے ماہانہ وظیفہ ملتا رہا جو تقسیم کے بعد بند ہوا۔ پاکستان میں مولانا مرحوم کے خان آف قلات اور نواب بہاولپور سے خصوصی تعلقات تھے۔ چنانچہ جب اکتوبر میں مولانا مرحوم پر فالج کا دورہ پڑا تھا تو وہ خان قلات کے مہمان خصوصی کی حیثیت سے بغرض آرام قلات گیا ہوا تھا۔ دسمبر کے دوسرے ہفتہ میں وہ بظاہر جامعہ عباسیہ کا معائنہ کرنے کے لئے بہاولپور آ گیا تھا لیکن اس کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ نواب بہاولپور اپنی ریاست میں اپنی شخصی حکمرانی کے تحفظ کے لئے اسلام کی آڑ لینا چاہتا تھا۔

پاکستان سے الحاق کرنے والی ریاستوں کے عوام کا مطالبہ کہ ریاستی نوابی نظام ختم کیا جائے۔ نواب بہاولپور نے نوابی بچانے کے لئے اسلام کو استعمال کیا

دسمبر 1949ء میں ملک کے جمہوریت پسند حلقوں کی جانب سے یہ مطالبہ زور شور سے جاری تھا کہ پاکستان کے ساتھ جن ریاستوں کا الحاق ہوا ہے وہاں نوابوں کا استبدادی نظام ختم کر کے جمہوری نظام قائم کیا جائے اور ان ریاستوں کے عوام کو یہ حق بھی دیا جائے کہ وہ پاکستان دستور ساز اسمبلی کے لئے اپنے نمائندوں کا انتخاب کریں۔ نواب بہاولپور اس عوامی مطالبے سے پریشان تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے شخصی نظام پر اسلام کی مہر ثبت کرانے کے لئے مولانا عثمانی مرحوم کو بغداد الجدید آنے کی دعوت دی تھی۔ وہ اپنے آپ کو اس علاقہ میں گیارہویں صدی قبل کے بنو عباسیہ کے اقتدار کی یادگار کہتا تھا اور چاہتا تھا کہ اسلام کی رو سے وہ قرون وسطیٰ کے عباسیہ دور کے خلافتی نظام کا احیا کرے مگر جب مولانا یکایک اللہ کو پیارا ہو گیا تو اسے اپنی اس خواہش کے جواز میں کوئی فتویٰ نہ مل سکا۔ تاہم وزیراعظم لیاقت علی خان نے جنوری 1950ء میں اس کی شخصی حکومت کو تسلیم کر لیا جبکہ اس نے مرکزی اسمبلی میں ریاستی مذاکراتی کمیٹی کی رپورٹ میں یہ سفارش کی کہ پاکستان دستور ساز اسمبلی کے لئے ریاستی نمائندوں کی نامزدگی کا اختیار والیان ریاست کو ہو گا۔ میاں افتخار الدین نے لیاقت علی کی اس غیر جمہوری اور غیر اسلامی رپورٹ کی سخت مخالفت کی۔ اس نے والیان ریاست اور ان کے آباؤ اجداد کے لئے عوام کے دشمن، غدار، ڈسپاٹ اور زناکار کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے کہا کہ لیاقت رپورٹ میں ریاستوں کے عوام پر ریاستی حکمرانوں کی ظالمانہ حکمرانی کو قانونی حیثیت دے دی گئی ہے۔ قرارداد مقاصد کی روشنی میں دیکھا جائے تو ریاستی حکمرانوں کے نامزد کردہ نمائندوں کو قبول کرنا ریاستی عوام کے خلاف سنگین جرم ہو گا۔ شوکت حیات خان نے بھی اپنی تقریر میں لیاقت رپورٹ کی مخالفت کی اور کہا کہ ''کشمیر کے بارے میں تو ہمارا موقف یہ ہے کہ اس کی ریاست کے مستقبل کے فیصلے کا اختیار مہاراجہ ہری سنگھ کی بجائے وہاں کے عوام الناس کو حاصل ہونا چاہیے مگر ہم پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے والی ریاستوں کے

عوام کو یہ حق نہیں دیتے۔''[25] مگر لیاقت کی تحریک پر ایوان نے کثرت رائے سے اس رپورٹ کی منظوری دے دی اور اس طرح نواب بہاولپور کی استبدادیت کو قانونی حیثیت مل گئی۔

نواب نے تقریباً ایک ماہ بعد 14 رفروری 1950ء کو اپنی اس حیثیت پر اسلام کی مہر ثبت کر دی جبکہ اس کی سٹیٹ مجلس نے متفقہ طور پر شریعت بل منظور کر لیا۔ یہ بل مجلس میں ولی عہد صاحبزادہ محمد عباس خان عباسی نے پیش کیا تھا اور اس کے تحت یہ قرار دیا گیا کہ آئندہ ریاست بہاولپور میں وراثت، شادی اور طلاق وغیرہ کے مقدمات کا فیصلہ شریعت کے مطابق ہوگا۔ اس مقصد کے لئے بہاولپور میں ایک دارالافتا قائم کیا جائے گا اور یہ ادارہ جو فتوے صادر کرے گا ریاست کی ساری عدالتوں کے لئے ان کی پابندی لازمی ہوگی۔''[26] ریاستی مجلس کا یہ فیصلہ نوابوں، جاگیرداروں، زمینداروں اور ان کے وظیفہ خوار مُلّاؤں کے ''اسلامی نظریہ'' کی صحیح عکاسی کرتا تھا۔

یہ مفاد پرست عناصر عوام کے بنیادی مسائل کے بارے میں تو اسلام کی تعبیر وتشریح استحصالیوں کے حق میں کرتے تھے لیکن چھوٹے چھوٹے اور فروعی معاملات میں عوام الناس کو اسلامی تعلیمات کی پابندی کرنے کی تلقین کرتے تھے مثلاً لاہور کی جمعیت العلمائے پاکستان کے صدر مولانا ابوالحسنات کے لئے زمینداری نظام کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اس کے نزدیک اصل مسئلہ یہ تھا کہ ریڈیو کے پروگرام سے دل آویز نغموں، دل آویز ترانوں اور شہوت انگیز گانوں کو خارج کیا جائے۔ چنانچہ اس نے نومبر 1949ء میں اس مقصد کے لئے پاکستان کے وزیر اطلاعات خواجہ شہاب الدین کے نام ایک زوردار خط بھی لکھا تھا۔ اسی طرح جنوری 1950ء میں ایک اور مُلّا کو یہ مسئلہ لاحق ہوگیا تھا کہ مسجد کی تعمیر کے لئے روپیہ جمع کرنے کی غرض سے مشاعرہ کرانا اسلام کی رو سے جائز ہے یا نہیں؟ اس کی رائے یہ تھی کہ چونکہ شعرا ہجر و وصال کے قصے، حسن وعشق کی داستانیں، بوس وکنار کی کہانیاں، محبوب کے عشوے اور غمزے، رقیب سے لاگ ڈانٹ اور شراب کی توصیف وتعریف بیان کرتے ہیں اور مذہبی اقدار کا بھی مذاق اڑاتے ہیں اس لئے مشاعروں کی رقم سے جو مسجد تعمیر ہوگی اس میں نماز کی ادائیگی جائز نہیں ہوگی۔ غریب کسان اور مزدور کو شب و روز محنت کی کمائی سے دو وقت کی روٹی ملتی ہے یا نہیں، اس سے ان مُلّاؤں کو کوئی سروکار نہیں تھا۔

باب: 10

ملک میں اسلامی نظام کے بارے میں مختلف تاویلیں اور لیاقت کی دورہ امریکہ میں اسلام اور مغربی جمہوریت کی یکسانیت پر تقریریں

آل پاکستان پولیٹیکل کانفرنس میں مولویوں اور دانشوروں کے اسلامی نظام کے بارے میں مختلف نظریات

مارچ 1950ء کے اوائل میں پنجاب یونیورسٹی کے زیراہتمام ایک سہ روزہ آل پاکستان پولیٹیکل سائنس کانفرنس منعقد ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ آل پاکستان پولیٹیکل سائنس ایسوسی ایشن کی تشکیل کی جائے جو اسلام کے مطابق دستور سازی کے کام میں دستور ساز اسمبلی کی مدد کرے۔ اس کانفرنس میں جو مقالے پڑھے گئے ان پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی دستور کے بارے میں پاکستان کے اہل فکر ونظر میں کس قدر اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔ ایک طرف تو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور جسٹس ایس۔ اے رحمان وغیرہ کی قسم کے لوگ تھے جن کا خیال یہ تھا کہ مغرب کا جمہوری نظام حکومت اسلامی اصولوں کے منافی نہیں ہے اور دوسری طرف ڈاکٹر عمر حیات ملک اور ابراہیم علی چشتی وغیرہ جیسے لوگ تھے جو اسلامی نقطہ نگاہ سے عوام یا عوامی نمائندوں کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس کانفرنس کا افتتاح 4/مارچ کو گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر نے کیا۔ اس کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام کا ابتدا سے ہی یہ بنیادی اصول رہا ہے کہ یہ ایک ''نظام حیات'' ہے جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں پر حاوی ہے اور

یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں عبادات میں اجتماعی عبادات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔قرارداد مقاصد کے مطابق پاکستان میں اختیارات کا استعمال لوگوں کے نمائندوں کے ذریعے کیا جائے گا لیکن یہ تفویض شدہ اختیارات ان حدود کے اندر استعمال ہوں گے جو حاکم مطلق نے مقرر کر دیئے ہیں۔صرف پانچ سات فیصدی وہ بنیادی اصول ہیں جن کو واضح طور پر قرآن وحدیث میں بیان کیا گیا ہے۔باقی بہت بڑا حصہ مباحات کا ہے۔مسلمان بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر ان مباحات کے سلسلے میں اللہ کی حدود کے اندر رہ کر اپنے لئے راستہ تیار کر سکتے ہیں۔قومیں محض ایک اچھا آئین بن جانے سے ترقی نہیں کر سکتیں اور نہ ہی بلند ہو سکتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اسلام نے کردار و کریکٹر پر بہت زور دیا ہے۔افراد کی آزادی سے ملک کی آزادی زیادہ قیمتی چیز ہے۔ایک فرد کی آزادی تو اس کی انفرادی ہے لیکن ایک ملک کی آزادی تمام افراد کی آزادی ہے۔اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلام میں اجتماعی زندگی کو انفرادی زندگی پر فضیلت ہے۔

ڈاکٹر عمر حیات ملک کا اسلامی نظریہ یہ تھا کہ بلاشبہ عوام کو اپنے حکمران منتخب کرنے کا حق حاصل ہے لیکن عوام اپنے حکمرانوں پر اختیارات تفویض نہیں کرتے۔ اختیارات کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہے اور حکمران اس امر کے پابند ہیں کہ اختیارات کا استعمال اللہ کی منشا کے مطابق کریں۔اسلام ایک ایسی نظریاتی مملکت کا تصور پیش کرتا ہے جو علاقائی یا نسلی یا لسانی قومی مملکت سے مختلف ہے۔ہمیں دنیا پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ بنی نوع انسان کو آج کل جو ہولناک بحران درپیش ہے اس کا واحد علاج یہ ہے کہ اسلامی نظریے کی بنیاد پر ایک عالمگیر مملکت کی تشکیل کی جائے۔ پاکستان دستور ساز اسمبلی کے صدر مولوی تمیز الدین نے کہا کہ دکھی انسانیت صرف قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر فلاح پا سکتی ہے جو انسانیت کو فلاح کا درس دیتا ہے اور دنیاوی ترقی اور اخروی نجات کے لئے شمع ہدایت کا کام دیتا ہے۔قرآن میں ایک عالمی مملکت کے قیام کی قابل عمل سکیم بھی موجود ہے۔پنجاب کے محکمہ تعمیر اسلامی کے سابق ڈائریکٹر علامہ محمد اسد نے کانفرنس کے پہلے سیشن کے صدارتی خطبے میں کہا کہ نہ تو قرآن مجید سے، نہ ہی رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے اور نہ ہی چاروں خلفائے راشدہ کے سیاسی عمل سے اس دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے کہ شریعت نے ہمیشہ کے لئے اسلامی مملکت کی انتظامیہ کی ہیئت کی تشکیل کر دی ہوئی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ شریعت نے ایسا کوئی قطعی نظام حکومت وضع نہیں کیا جس کی تشکیل کسی مملکت کو اسلامی بنانے کے لئے ضروری ہو اور

نہ ہی شریعت نے کوئی بے لچک آئینی نظریہ پیش کیا ہے۔ اس نے صرف عمومی اصول وضع کئے ہیں جن کے تحت انتظامی اداروں اور طریقہ حکومت کے بارے میں بہت چھوٹ دی گئی ہے۔"

لیکن کانفرنس کے چوتھے سیشن میں مولانا ابراہیم علی چشتی نے علامہ اسد کے اس تصور کو یہ کہہ کر باطل قرار دیا کہ اسلام میں جمہوریت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ معلوم نہیں جمہوریت اور اقلیتوں کے بارے میں کیوں اتنا شور شرابا ہو رہا ہے۔ نوع انسان کی قوموں کی صورت میں تقسیم کو کیوں تسلیم کیا جا رہا ہے۔ اسلام ایک ایسا عالمی انقلاب ہے جو کمیونزم اور جمہوریت کا تختہ الٹ دے گا۔ پاکستان دستور ساز اسمبلی نے 12/مارچ 1949ء کو جو قرارداد مقاصد منظور کی تھی وہ اسلامی اصولوں کے مطابق نہیں ہے کیونکہ اس کے مطابق ایک غیر مسلم نہ صرف سربراہ مملکت بلکہ عدلیہ کا سربراہ بھی بن سکتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک غیر مسلم جج کس طرح شرعی مسئلہ کے بارے میں فتویٰ صادر کر سکے گا۔ اس قرارداد میں کہا گیا ہے کہ کل کائنات پر حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے لیکن اس کے ساتھ پاکستان کی آزاد مملکت کی حاکمیت کا بھی ذکر موجود ہے۔ یہ دونوں باتیں ایک ساتھ نہیں چل سکتیں۔ اگر حاکمیت مملکت کی ہوگی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس مملکت کے حکمران قانون سازی کر سکیں گے۔ حالانکہ اسلام کی رو سے حکومت صرف قرآن و حدیث سے ہی قوانین وضع کرنے کی مجاز ہو سکتی ہے۔ ابراہیم علی چشتی نے پاکستان میں خلافتی نظام حکومت کی سفارش کی۔ اس نے کہا کہ اسلام عالمگیر دین ہے اس لئے اس کی مدنیت، قومی طاقت اور شوکت کو بجائے خود کوئی مقصد قرار نہیں دیتی۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں حالتوں میں اس کا منتہا تقویٰ اور اخروی نجات ہے۔ طریقہ کار امانت و نیابت الٰہی اور عرف عام خلافت ہے۔ خلافت پاکستان کے باشندے تین اقسام پر مشتمل ہوں گے۔ اول تمام عاقل و بالغ انسان جو اللہ پر ایمان لائیں اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کی پابندی کا اقرار کریں، پاکستان کے کسی دارالفتاویٰ سے اس امر کی سند حاصل کر کے پاکستان کے ملتی یعنی شہری بن جائیں گے۔ دوسرے وہ عاقل و بالغ انسان جو اللہ یا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہ لائیں لیکن پاکستان کے سرکاری قوانین کا پابند رہنا قبول کریں، پاکستان کے کسی دارالفتاویٰ سے اس امر کی سند حاصل کر کے پاکستان کے ذمی بن جائیں۔ تیسرے پاکستان کے تمام غیر شہری جو حکومت پاکستان سے کسی معاہدے کے تحت داخل ہوں پاکستان کے معاہد یا حلیف ہوں گے۔ ہر عاقل بالغ انسان جو مندرجہ بالا تینوں اقسام میں داخل

نہ ہو اور پاکستان کی حدود کے اندر پایا جائے ''حربی'' سمجھا جائے گا۔

مولانا نعیم صدیقی نے ابراہیم علی چشتی سے بہت حد تک اتفاق کیا اور کہا کہ اسلامی مملکت کا سربراہ محض آئینی بادشاہ نہیں ہوتا بلکہ اسے قطعی اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ دستور ساز اسمبلی کی حیثیت محض ایک مجلس شوریٰ کی ہوتی ہے اور یہ مجلس امیر کے اختیارات میں حصہ دار نہیں بن سکتی۔ قرآن وحدیث کے مطابق امیر مملکت پر اپنی مجلس شوریٰ کے مشورہ کی پابندی لازمی نہیں۔ مولانا عبدالستار نیازی کی رائے یہ تھی کہ اسلامی آئین کا پہلا اصول یہ ہے کہ اللہ خاتم الحاکمین اور مالک الملک ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبین ہیں اور ان کی امت آخری امت ہے۔ پیغمبر اسلام پر آخری وحی نازل ہوئی ہے۔ دوسرا اصول کرہ ارض پر خدا کی خلافت کا ہے۔ تیسرا اصول یہ ہے کہ دولت اللہ کی امانت ہے اور اس کا استعمال ملت اور نوع انسان کے مفاد کے لئے ہونا چاہیے۔ چوتھا اصول اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کا ہے اور پانچویں اصول میں قربانی یعنی جائیداد کی تقسیم کی تلقین کی گئی ہے۔ پروفیسر مسعود الحسن کا موقف یہ تھا کہ اسلامی مملکت میں سیاسی اقتدار اعلیٰ صرف مسلمانوں کو حاصل ہوتا ہے غیر مسلموں کی حیثیت ذمیوں کی ہوتی ہے، البتہ انہیں ثقافتی خودمختاری کی ضمانت دی جاتی ہے۔

تاہم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان اور قاضی سعید الدین وغیرہ کے اسلامی نقطہ ہائے نگاہ ابراہیم علی چشتی وغیرہ سے مختلف اور غلام اللہ وغیرہ سے ملتے جلتے تھے۔ ڈاکٹر اشتیاق کی رائے یہ تھی کہ وفاقی نظام حکومت اور اسلام میں کوئی تضاد نہیں ہے لیکن مغربی پاکستان کو انتظامی امور کے لئے صرف ایک یونٹ میں تبدیل کر دینے کی تجویز قابل عمل نہیں۔ صوبوں کا اعتماد حاصل کئے بغیر قومی یکجہتی کو برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ پارلیمانی نظام حکومت اسلام کے عین مطابق ہے۔ چونکہ اسلام کے نظریے کا اطلاق زندگی پر ہوتا ہے اس لئے ہمیں عوام پر اعتماد کرنا ہی پڑے گا۔ کسی ایک شخص کے اقتدار کو صرف عوام کے تعاون سے ہی مؤثر بنایا جا سکتا ہے۔ ہم مسلم قوم ہیں اس لئے ہماری حکومت اور ہمارے نظام حیات میں لازمی طور پر اسلامی عکاسی ہوگی۔ اس لئے مسلم ملک کو قائم رکھنے کے لئے مسلم قوم پیدا کیجئے۔ جسٹس رحمان نے کہا کہ قرارداد مقاصد کے مطابق جو وفاقی حکومت قائم ہوگی وہ غیر ترقی یافتہ مذہبی حکومت نہیں ہوگی۔ جو لوگ اس قسم کی تنقید کرتے ہیں وہ اسلامی دور حکومت میں بعض لوگوں کی غلطیوں کو سامنے رکھ کر

کرتے ہیں اور یہ دیکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ اسلامی نظریہ کا اصل ماخذ کیا ہے۔ اسلامی نظریہ اجتہاد میں ترقی کے جو جوہر موجود ہیں وہ عیاں ہو سکتے ہیں۔ قرآن مجید کے الفاظ کے مطابق ''تبدیلی'' خدا کی واضح نشانیوں میں سے ایک ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ مسلم دستور ساز اسمبلی اجتہاد سے پورا فائدہ اٹھائے۔ اجتہاد کے علاوہ اسلامی قانون کے مطابق زندگی کو بہتر بنانے کا ذریعہ ''قیاس'' ہے۔ اصل میں قیاس اجتہاد کا ہی دوسرا نام ہے۔ قاضی سعید الدین کی سکیم یہ تھی کہ مغربی پاکستان کے صوبوں کو یکجا کر کے ایک زونل فیڈریشن قائم کی جائے اور پورے پاکستان کے لئے مشرقی اور مغربی پاکستان پر مشتمل ایک ایسی فیڈریشن قائم کی جائے جو دفاع، امور خارجہ اور دو ایک محکموں کی انچارج ہو۔ اس کانفرنس میں مشرقی بنگال سے بہت کم دانشوروں نے حصہ لیا۔ پروفیسر اجیت کمار، پروفیسر مظفر احمد اور پروفیسر ایچ رحمان کا نظریہ مغربی پاکستان کے قدامت پرست اور جدیدیت پرست دونوں ہی قسم کے اسلام پسندوں سے بالکل مختلف تھا۔ انہوں نے اپنے مقالوں میں سیکولر نظام حکومت کا مشورہ دیا اور کہا کہ جغرافیائی، لسانی، ثقافتی اور تاریخی حالات کا تقاضا یہ ہے کہ مشرقی بنگال کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیئے جائیں۔ چٹاگانگ کا پروفیسر رحمان اسلامی سوشلسٹ تصور کی بنیاد پر ایک عوامی خود مختار مملکت کے قیام کے حق میں تھا۔ اس نے اسلام کی تعبیر سوشلسٹ نقطہ نگاہ سے کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ پاکستان یونین آف اسلامک سوشلسٹ ری پبلکس میں معاشی عدم مساوات کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے اور ہر شہری کو بلا لحاظ مذہب و ملت مساوی حقوق ملنے چاہئیں۔''[1]

قرارداد مقاصد کی منظوری کی پہلی ''سالگرہ'' پر لیاقت علی کے مخالفوں نے اس قرارداد کو ایک مؤثر حربہ کے طور پر استعمال کیا

پولیٹیکل سائنس کانفرنس جب 7 / مارچ کو ختم ہوئی تو اس وقت لاہور اور پنجاب کے دوسرے شہروں میں احراریوں کی جانب سے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کا وہ کتابچہ تقسیم ہو رہا تھا جس میں اس نے احمدیوں کو مرتد اور واجب القتل قرار دیا تھا۔ احرایوں نے یہ کتابچہ 12 / مارچ کو یوم قرارداد مقاصد منانے کے لئے شائع کیا تھا اور اس کے ذریعے یہ تبلیغ مقصود تھی کہ جس آئین کی بنیاد ختم نبوت کے عقیدے پر نہیں ہوگی وہ اسلامی نہیں ہوگا۔ لیکن نوائے وقت کو

دو ایک اور وجوہ کی بنا پر شبہ تھا کہ جب کبھی پاکستان کا جو بھی آئین بنے گا وہ اسلامی نہیں ہوگا۔اس کے نزدیک پہلی وجہ یہ تو یہ تھی کہ مرکزی حکومت کے متعلقہ محکمہ کا وزیر جوگندر ناتھ منڈل ہے، سیکرٹری اے۔آر۔کارنیلیس ہے اور مشیر ایک انگریز ہوگا۔اسلامی اصولوں پر مبنی دستور کی تیاری تو ان اصحاب کا کام نہیں۔یہ منصب تو مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی کے پائے کے بزرگوں کا ہے۔دوسری وجہ یہ تھی کہ ''وزیروں کی بیویاں مغربی بے حجابی اور حد سے زیادہ آزادی کا کھلم کھلا درس دیں تو افسروں کی بیویاں کیا کچھ نہ کریں گی اور عام عورتوں پر اس کا کیا اثر ہوگا۔اسمبلی میں کام کی رفتار سست تھی تو اسمبلی سے باہر ہی لوگوں کو اسلامی آئین کے نفاذ کے لئے تیار کیا جاتا۔افسوس کہ وہ بات بھی نہیں۔''[2]

تاہم حکومت پاکستان کی ہدایت کے مطابق 12 / مارچ کو قرارداد مقاصد کے چارٹ بنوا کر سرکاری دفاتر میں لٹکا دیئے گئے تاکہ سرکاری اہلکاروں کو یہ بات یاد رہے کہ وہ ایک اسلامی حکومت کے ملازم ہیں۔اس پر امروز کے مولانا حسرت کا طنزیہ تبصرہ یہ تھا کہ ''ہمارے نزدیک سرکاری دفتروں میں قرارداد مقاصد کے تعویز بچوں کے گلے میں لٹکائے جاسکتے ہیں۔خاص خاص موقعوں پر یہ تعویز گھول کر پلا دینا بھی خاصا مفید ثابت ہوسکتا ہے بلکہ رفع آسیب کے لئے قرارداد مقاصد کی دھونی بھی دی جاسکتی ہے۔اس قرارداد کو مرتب ہوئے پورا سال بھر ہوگیا ہے لیکن تعجب ہے کہ کسی کو اس سے فائدہ اٹھانے کا خیال نہیں آیا......قرارداد مقاصد 12 / مارچ کو منظور ہوئی تھی اس لئے قرارداد شریف کا ختم شریف بھی اس تاریخ کو ہونا چاہیے اور اسے بارہویں شریف کا ختم کہنا چاہیے۔یہ ٹھیک ہے کہ جماعت اسلامی والے اس پر بھی مطمئن نہیں ہوں گے لیکن اگر یہ وہابی قسم کے لوگ بارہویں شریف پر بھی مطمئن نہ ہوں تو انہیں مطمئن کرنے کی اور کیا صورت باقی رہ گئی ہے۔'' اس موقع پر امروز کا ادارتی تبصرہ یہ تھا کہ جس وزیراعظم نے قرارداد مقاصد پیش کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ''خدا نے سوائے جمہور کے کسی کو اختیارات نہیں سونپے'' اسی وزیراعظم نے ریاستی عوام کے بجائے والیان ریاست کو حاکم و مقتدر یعنی اپنی اپنی ریاستوں کا ''ظل الٰہی'' منوانے کی خاطر ایڑی چوٹی کا زور لگالیا اور بالآخر پاکستان کے آئین میں ترمیم کروا کے ہی دم لیا۔ پاکستان کے آئین میں یہ ترمیم بھی کر لی گئی کہ حکومت ہر شہری کو بلا مقدمہ چلائے قید کرسکتی ہے۔ آئین ساز اسمبلی سے یہ بھی منظور کروالیا گیا کہ پنجاب کی خالی نشستوں کو پر کرنے کا اختیار صوبائی

عوام کو نہیں بلکہ انہیں بھی برسر اقتدار افراد ہی نامزد کریں گے۔ گویا ایک طرف تو حکومت نے خود ہی تسلیم کیا کہ خدا نے جمہور کو اختیارات سونپے ہیں دوسری طرف حکومت ہی نے جمہور کو ان اختیارات کے استعمال سے محروم بھی کر دیا۔"[3]

نوائے وقت اور امروز کی طرح لاہور، کراچی، پشاور اور ڈھاکہ کے دوسرے بہت سے اخبارات و رسائل نے بھی قرارداد مقاصد کے اس پہلے "یوم ولادت" کے موقع پر مخالفانہ تبصرے شائع کئے جو اس امر کی علامت تھے کہ 1950ء کا سال اس "قرارداد شریف" کے والد محترم وزیر اعظم لیاقت علی خان کے لئے سیاسی لحاظ سے کوئی اچھا سال نہیں ہوگا۔ اگرچہ لیاقت علی خان نے 1949ء میں پنجاب کے دولتانہ، سرحد کے قیوم خان، سندھ کے ایوب کھوڑو، بلوچستان کے نواب جوگیزئی و خان قلات اور بہاولپور کے نواب کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے، مشرقی بنگال میں نورالامین کے ہاتھوں بنگالی حقوق کے علمبردار حمید الحق چودھری کو صوبائی کابینہ سے نکلوا کر، پنجاب میں احراریوں سے ساز باز کر کے، مولانا عثمانی کے انتقال کے بعد جمعیت العلمائے اسلام کو سو فیصدی سرکاری و درباری جماعت بنا کر، جمعیت العلمائے پاکستان کے بہت سے فتویٰ فروش مُلّاؤں کو خرید کر، امیر جماعت اسلامی ابوالاعلیٰ مودودی کی میعاد نظر بندی میں توسیع کر کے، مرکزی سیفٹی آرڈیننس نافذ کر کے اور پاکستان دستور ساز اسمبلی کی خالی نشستوں کے لئے اپنے پٹھوؤں کی نامزدگی کر کے بظاہر اپنے اقتدار کو مستحکم کر لیا تھا، لیکن دراصل اس کے اقتدار کی بنیادیں بدستور کھوکھلی تھیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس نے سیاسی، انتظامی اور معاشی طور پر ایسے اقدامات کئے تھے جن کی وجہ سے کراچی کے سوا ملک کے سارے دوسرے شہروں کے درمیانہ طبقہ کے بیشتر عناصر اس کے خلاف ہو گئے تھے اور تقریباً سارے ہی صوبوں میں قومیتی و طبقاتی تضادات کی بڑی تیزی سے نشوونما ہونے لگی تھی۔ بالخصوص اس عرصے میں پنجابی شاونزم کو جو زبردست تقویت ملی تھی وہ اس کے لئے بہت خطرناک تھی کیونکہ سول اور ملٹری بیوروکریسی پر پنجابیوں کا غلبہ تھا اور درمیانہ طبقہ کے ان پنجابیوں کو مسلسل خفا رکھ کر پاکستان میں کوئی شخص زیادہ دیر تک برسر اقتدار نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ لیاقت علی خان کی بہت بڑی بھول تھی کہ جب تک پنجاب کے بڑے بڑے زمیندار اس کے ساتھ رہیں گے اس کے اقتدار کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ پاکستان میں اس کے سب سے بڑے حریف حسین شہید سہروردی نے اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لیا

تھا۔ چنانچہ اس نے مارچ کے تیسرے ہفتے میں لاہور کے ایک جلسہ عام میں اپنی آل پاکستان عوامی مسلم لیگ کے قیام کا اعلان کر کے لیاقت علی خان کے خلاف پنجاب ہی کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا تھا۔ سہروردی کا سب سے پہلا نعرہ یہ تھا کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی غیر نمائندہ ہے اس لئے اسے توڑ کر نئے انتخابات کرائے جائیں۔ دستور ساز اسمبلی کے یہ مٹھی بھر ارکان آئین سازی کے کام میں بہت لیت ولعل کر کے لیاقت کی آمریت کو طول دے رہے ہیں۔ پنجاب کا درمیانہ طبقہ اس نعرے میں سہروردی کا ہمنوا تھا اور اس بنا پر اس کی بے اطمینانی و بے چینی میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ لیاقت نے مارچ 1949ء میں قرارداد مقاصد کے ذریعے پنجاب کے اسلام پسند درمیانہ طبقہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی مگر اب مارچ 1950ء میں یہی قرارداد اس کے خلاف ایک مؤثر سیاسی حربہ کے طور پر استعمال ہونے لگی تھی۔ پنجاب کے سارے شہروں سے یہ آوازیں اٹھ رہی تھیں کہ قرارداد مقاصد پر عمل درآمد کے لئے آئین سازی کا کام جلدی مکمل کرو۔ پنجابی شاونسٹوں کے ترجمان اخبار نوائے وقت کا انتباہ یہ تھا کہ ”موجودہ صورتحال اطمینان بخش نہیں۔ سچی بات کڑوی ضرور لگتی ہے مگر ارباب اقتدار کے اپنے نفع وبھلائی کی خاطر ہم ان کی خدمت میں عرض کریں گے کہ وہ روش جس سے عوام میں بددلی پھیلے، نہ ملک وملت کے لئے مفید ہے نہ بالآخر ان کے حق میں بہتر۔ دستور ساز اسمبلی اپنے کام کو جتنا لمبا کرے گی عوام میں اتنی ہی بددلی پھیلے گی اور دستور ساز اسمبلی کا کام اسلام سے جتنا دور ہوگا، عوام اتنے ہی غیر مطمئن ہوں گے کیونکہ پاکستانیوں کو، جن میں اس وقت تک زبان ونسل کا اتحاد مفقود ہے صرف اسلام کا رشتہ ہی ایک دوسرے سے وابستہ رکھ سکتا ہے۔“[4]

23 مارچ کو قرارداد پاکستان کا ”یوم ولادت“ تھا۔ اس دن سرکاری طور پر کسی جلسے یا تقریب کا انتظام نہ کیا گیا البتہ پنجاب کے مختلف شہروں میں جو غیر سرکاری جلسے ہوئے ان میں اس مہم کی خود بخود ابتدا ہو گئی کہ پاکستان کے لئے اسلامی آئین کی ترتیب کا کام بلا تاخیر مکمل کیا جائے۔ نوائے وقت کا اداریہ یہ تھا کہ ”قرارداد مقاصد کی رو سے ہماری قومی زندگی کی متعینہ حدیں مقرر ہو گئی ہیں۔ اب یہ ہمارے تخیل اور ہماری محنتوں پر ہے کہ ہم صالح زندگی کی تعمیر کریں...... انگریز نے پاکستان میں جو غیر اسلامی طرز حکومت، طرز سیاست اور طرز تمدن کی نعش چھوڑی تھی ہمارے ارباب اقتدار اور رہنما ابھی اسی سڑی نعش سے چمٹے ہوئے ہیں اور سحر افرنگ کے زیر اثر

قیام پاکستان کے اصل مقصد اور اپنے ملک و نصب العین کو فراموش کر کے اس راہ پر گامزن ہو رہے ہیں جس کی منزل کعبہ کی بجائے انگلستان اور امریکہ ہے...... ہمارے پاس ایک روحانی ہدایت نامہ اور لائحہ عمل ہے جو ہمیں اپنی منزل مقصود کی طرف لے جائے گا۔ آیئے آج ہم تہیہ کریں کہ پاکستان کو ایک ایسی آزاد جمہوری مملکت بنا کر دم لیں گے جو دنیا کے سامنے ساڑھے تیرہ سو برس قبل کا نقشہ پیش کر سکے۔"[5] جنوری 1949ء میں ممدوٹ وزارت کی برطرفی سے پہلے نوائے وقت کو اسلامی آئین کی ترتیب میں کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ لکھا کرتا تھا کہ "بس دستور ساز اسمبلی یہ اعلان کر دے کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے اور اس کا دستور اسلام کے اصولوں پر مبنی ہوگا تو آئین کی بحث ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔ جہاں تک مکمل دستور کی ترتیب کا تعلق ہے اس میں وقت لگے گا۔"[6] چنانچہ 12/ مارچ 1949ء کو دستور ساز اسمبلی نے بذریعہ قرارداد مقاصد اس امید میں مطلوبہ اعلان کر دیا کہ اب آئین کی بحث ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔ مگر اب خود نوائے وقت نے ہی آئین سازی کی بحث زور شور سے چھیڑی ہوئی تھی۔ اس کے متذکرہ 23/ مارچ کے اداریے کا عنوان یہ تھا کہ "تیز ترک گامزن منزل ما دور نیست۔" وجہ یہ تھی کہ ان دنوں ممدوٹ کے خلاف پروڈا کے ماتحت مقدمہ چل رہا تھا۔ اس اداریے سے ایک دن قبل ممدوٹ کے وکیل صفائی حسین شہید سہروردی نے بھی لاہور میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ اس کی عوامی مسلم لیگ حکومت کو مجبور کرے گی کہ ملک کا آئین جلد از جلد تیار کیا جائے اور جب تک آئین تیار نہیں ہوتا اس وقت تک پبلک سیفٹی ایکٹ اور فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز کو منسوخ کر دیا جائے۔"[7] اور 24/ مارچ کو پاکستان جماعت اسلامی کے سربراہ مولانا عبدالجبار غازی نے ملتان میں قرارداد مقاصد کو جلد از جلد جامہ عمل پہنانے کی ضرورت پر زور دیا اور پبلک سیفٹی ایکٹ کی مذمت کی۔"[8] 27/ مارچ کو راولپنڈی میں جماعت اسلامی کی کانفرنس ہوئی تو اس میں بھی اس مطالبہ کا اعادہ کیا گیا۔ تاہم 29/ مارچ کو مرکزی حکومت کے وزیر صنعت چودھری نذیر احمد خان نے آئین سازی میں تاخیر پر نکتہ چینی کا یہ جواب دیا کہ اس تاخیر کی ذمہ داری حکومت پر عائد نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے ایوان کا ہر رکن ذمہ دار ہے۔ اس نے کہا کہ "جو لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ قرارداد مقاصد کو جامہ عمل پہنانے میں دیر ہو رہی ہے انہیں اپنی رنگ دار عینکیں اتار کر اس مسئلہ کا بغور جائزہ لینا چاہیے۔"[9]

چودھری نذیر احمد پنجاب کا نہایت موقع پرست، رشوت خور، منافق اور بددیانت وکیل تھا۔ وہ محض بیان بازی کی وجہ سے لیڈر بن گیا تھا۔ اس کی لیڈری کو کوئی عوامی تائید و حمایت حاصل نہیں تھی۔ اسے لیاقت علی خان نے ممدوٹ وزارت کی برطرفی کے بعد محض اس لئے مرکزی حکومت میں شامل کیا تھا کہ اس کی مفاد پرستی اسے حکم عدولی کی کبھی اجازت نہیں دے گی۔ یہ شخص بیک وقت اسلامیت اور پنجابیت کا علمبردار تھا۔ جب تک حکومت میں شامل نہیں ہوا تھا تو اس کی سیاسی بصیرت محض نوائے وقت کے اداریوں تک محدود ہوتی تھی اور وہ مطالبہ کیا کرتا تھا کہ اسلامی نظام یعنی خلافتی نظام کا نفاذ کیا جائے اور جب سردار نشتر پنجاب کا گورنر مقرر ہوا تھا تو اس کو اعتراض یہ تھا کہ کسی پنجابی کو یہ عہدہ ملنا چاہیے تھا۔ لیکن اب یہ آئین سازی کے کام میں تاخیر کے لئے حکومت کو ذمہ دار نہیں ٹھہراتا تھا۔ اس سلسلے میں اس کی پارلیمنٹ میں متذکرہ بے معنی بیان کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت تک لیاقت علی خان اور دوسرے ارباب اقتدار نے آئین سازی کے بارے میں پنجابی شاونسٹوں کی مہم کا کوئی خاص سنجیدگی سے نوٹس نہیں لیا تھا۔

اقلیتوں کے تحفظ کے لئے لیاقت ۔ نہرو معاہدہ اور لیاقت کی جانب سے قرارداد مقاصد کے حوالے سے اقلیتوں کے تحفظ کی غلط تشریح

حکومتی حلقوں کے اس ردعمل کی وجہ یہ تھی کہ مارچ میں مغربی اور مشرقی بنگال میں زبردست فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے وہاں مہاجرین اور شرنارتھیوں کی بڑے پیمانے پر آمدورفت شروع ہوگئی تھی۔ ان فسادات نے ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات اتنے خراب کر دیئے تھے کہ بقول جواہر لال نہرو دونوں ممالک تباہی کے کنارے پر پہنچ گئے تھے جبکہ مغربی بنگال کے بعض ہندو لیڈر اور اخبارات کھلم کھلا مطالبہ کرتے تھے کہ مشرقی بنگال پر حملہ کر کے اسے بزور قوت ہندوستانی یونین میں شامل کیا جائے۔ لیاقت علی خان اس سنگین صورتحال میں نئی دہلی گیا اور وہاں اس نے نہرو سے دو تین دن تک بات چیت کے بعد 8/اپریل کو ایک معاہدے پر دستخط کئے جس میں دونوں ممالک کی اقلیتوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ضمانت دی گئی تھی اور یہ عہد کیا گیا تھا کہ مذہب کی وجہ سے کسی شہری سے کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا۔ 10/اپریل کو لیاقت علی خان نے دستور ساز اسمبلی میں

اس معاہدے کی تفصیلات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اس معاہدہ میں جن بنیادی حقوق کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس قرارداد مقاصد کے مطابق ہیں جو پاکستان دستور ساز اسمبلی نے مارچ 1949ء میں منظور کی تھی۔ ان حقوق میں بلا لحاظ مذہب ہر فرد کے لئے کامل مساوی حقوق، شہریت، جان و مال، ذاتی آبرو اور ثقافت کا تحفظ اور قانون اور عوامی اخلاقیات کے مطابق، پیشہ، تقریر اور عبادت کے حقوق شامل ہیں۔ جو لوگ ایک اسلامی ملک کا مفہوم صحیح معنوں میں نہیں سمجھ سکے وہ وقتاً فوقتاً اس خدشے کا اظہار کرتے ہیں کہ ایسی ریاست مذہبی انداز والی ہوگی اور جو اقلیتیں اس ملک میں بستی ہیں ان کے بارے میں مساوی معیار، حقوق اور شہریت کے اصول اس کی پالیسی کی اساس نہیں رہ سکیں گے۔ ایسے خدشے قطعی بے بنیاد ہیں۔ ایسے خدشوں کا اظہار اقلیتی فرقہ کے اطمینان کے لئے باعث مضرت ہے۔ جس کسی نے پاکستان دستور ساز اسمبلی کی منظور کردہ قرارداد مقاصد کا مطالعہ کیا ہے اس پر واضح ہوگا کہ اسلامی ریاست کے تصور کی بنیاد لامحالہ ملک کے تمام باشندوں کی بلا لحاظ مذہب، آزادی، مساوات اور مجلسی انصاف پر ہے۔ ساتھ ہی اکثریت اور اقلیت والے فرقوں کی ثقافت اور طریق زندگی کی حفاظت لازم ہے۔ مجھے امید ہے کہ اب اس قسم کی باتیں بند ہو جائیں گی کہ پاکستان ایک ایسی ریاست ہے جہاں تمیز مذہب موجود ہے۔''[10] اسی روز جواہر لال نہرو نے بھی ہندوستانی پارلیمنٹ میں اس معاہدے کی وضاحت کرتے ہوئے ان شکوک کا ذکر کیا کہ مملکت پاکستان کی بنیادیں ایک فرقہ وارانہ نظریہ پر استوار کی گئی ہیں لہٰذا یہاں تمام رعایا کو مساوی حقوق نہیں مل سکتے۔ نہرو نے کہا کہ ''وزیر اعظم پاکستان نے پورے زور شور سے اس شک وشبہ کا ازالہ کر دیا ہے اور انہوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ حکومت پاکستان دور حاضر کے جمہوری مملکت کے نظریات پر یقین رکھتی ہے۔''[11]

لیاقت علی خان نے 8/اپریل 1950ء کے بین المملکتی معاہدے میں اور اس معاہدے کے بارے میں ہندوستان کے وزیر اعظم نہرو سے بات چیت کے دوران جو یقین دلایا تھا کہ پاکستان ایک ایسی مذہبی مملکت نہیں ہوگی جس میں غیر مسلموں کو مساوی حقوق حاصل نہیں ہوں گے بلکہ یہ ایسی مملکت ہوگی جس میں تمام شہریوں کو بلا لحاظ مذہب وملت ہر شعبہ زندگی میں کامل مساوی حقوق حاصل ہوں گے اور پھر 10/اپریل کو اس نے اسمبلی میں اس

معاہدے کا جو توضیحی بیان دیا تھا وہ یقیناً قرارداد مقاصد کے مطابق نہیں تھا بلکہ وہ قائداعظم جناح کی 11 راگست 1947ء کی تقریر کے عین مطابق تھا۔ یہ ''عظیم الشان اور تاریخی'' قرارداد مقاصد شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کے مشورے اور رضامندی سے مرتب کی گئی تھی اور مولانا عثمانی نے 12 رمارچ 1949ء کو اسمبلی میں اس قرارداد کی جو توضیح کی تھی وہ لیاقت علی خان کی توضیح سے بالکل مختلف تھی۔ شبیر احمد عثمانی اسلامی مملکت پاکستان میں غیر مسلموں کو مساوی حقوق دینے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ اسلامی نظام حکومت کے نظریہ کی تعبیر وتشریح اس طرح کرتا تھا کہ ''اس نظام میں غیر مسلموں کو پالیسی ساز اور قانون ساز اداروں میں شامل نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی انہیں کلیدی مناصب پر فائز کیا جاسکتا ہے۔'' مولانا عثمانی کے علاوہ ابوالاعلیٰ مودودی، ابراہیم علی چشتی، عبدالستار نیازی اور دوسرے تقریباً سارے علما اور مشائخ اس غیر جمہوری موقف کے حامل تھے اور ایسے ''پروفیسروں'' کی بھی کمی نہیں تھی جو انگریزی زبان میں یہی موقف پیش کرتے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کا وائس چانسلر ڈاکٹر عمر حیات ملک ان اسلام پسند ''پروفیسروں'' کا سب سے بڑا نمائندہ تھا۔ لیاقت علی خان نے تو قرارداد مقاصد محض مسلم عوام الناس کو یہ فریب دینے کے لئے منظور کروائی تھی کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہوگی اور اس کا آئین اسلامی اصولوں کی بنیاد پر بنے گا۔ وہ اس قرارداد کے مطابق مذہبی حکومت قائم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ دراصل مغربی نظام حیات اور نظام حکومت کا قائل تھا۔ وہ صرف چاہتا یہ تھا کہ اس پر اسلام کا لیبل لگا دیا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے 1949ء کے پورے سال کے دوران اس قرارداد کو جامہ عمل پہنانے کے لئے کوئی ٹھوس اقدام نہیں کیا تھا۔ سوائے اس کے کہ ایک مشاورتی تعلیمات اسلامیہ بورڈ کی تشکیل ہوئی تھی، اسٹیشنوں پر قبلہ نما لگا دیئے گئے تھے، سرکاری دفاتر میں قرارداد مقاصد کے چارٹ لگا دیئے گئے تھے۔ 13 رمارچ 1950ء کو وزیر خزانہ غلام محمد نے ایک زکوٰۃ کمیٹی مقرر کی تھی۔ اسی دن غلام محمد نے جو بجٹ پیش کیا تھا اس کی ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کی گئی تھی اور پھر اس نے اپنی تقریر میں اسلامی تعلیمات کے حوالے دیئے تھے جبکہ مرکزی سیکرٹریٹ کے 2000 کلرک پارلیمنٹ کے سامنے اپنی بھوک، فاقے اور افلاس کا رونا رو رہے تھے اور کلرکوں کی ایسوسی ایشن کا صدر سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند ہو چکا تھا۔

سیفٹی ایکٹ کی تنسیخ اور اس کے تحت مودودی سمیت تمام نظر بندوں کی رہائی کے لئے مہم، جماعت اسلامی اور ممدوٹ دھڑے کے مابین تعاون

مارچ 1950ء کے دوران پنجاب میں ''جلدی اسلامی آئین بناؤ'' کی مہم کے ساتھ ساتھ سیفٹی ایکٹ کی تنسیخ اور ابوالاعلیٰ مودودی کی رہائی کی مہم بھی زور شور سے شروع ہوگئی تھی۔ صوبہ کے ترقی پسند اور جمہوریت پسند حلقے اس مہم میں پیش پیش تھے کیونکہ شہری آزادیوں پر سیفٹی ایکٹ کی تلوار لٹکے رہنے سے وہ اپنی سیاسی سرگرمیوں کو جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ مزید برآں کئی کمیونسٹ لیڈر بھی اس ایکٹ کے تحت بلا مقدمہ چلائے نظر بند تھے۔ مودودی کی نظر بندی کی میعاد 3راپریل کو ختم ہونے والی تھی۔ چنانچہ یکم اپریل کو امروز نے اپنے ایک ادارتی نوٹ میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی غیر مشروط رہائی کا مطالبہ کیا اور 3راپریل کو نوائے وقت نے ایک ادارتی نوٹ میں لکھا کہ ''مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی نظر بندی کا مسئلہ پھر موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ مولانا اور ان کے رفقا کی نظر بندی کی بظاہر وجوہ یہ تھیں کہ مسئلہ کشمیر کے متعلق انہوں نے جو روش اختیار کی وہ مفاد پاکستان کے خلاف تھی۔ اسی طرح فوجی بھرتی کے متعلق بھی ان کا مسلک ملک کے لئے مضر تھا۔ اب جماعت اسلامی کی طرف سے یہ کہا جارہا ہے کہ حالات بدل گئے ہیں اس لئے جماعت نے بھی اپنا نظریہ بدل لیا ہے۔ اندریں حالات مولانا اور ان کے ساتھیوں کی نظر بندی کا مسئلہ نظر ثانی کا محتاج ہے۔ حکومت کو اس پر غور کرنا چاہیے۔''[12] نوائے وقت کے اس نوٹ میں حالات بدلنے کے ساتھ جماعت اسلامی کے نظریے میں تبدیلی کا جو ذکر کیا گیا تھا وہ کسی حد تک صحیح تھا لیکن اس سے زیادہ صحیح بات جس کا اس نوٹ میں کوئی ذکر نہیں تھا وہ یہ تھی کہ حالات بدلنے کے ساتھ مودودی خارجیت کے بارے میں خود نوائے وقت کے نظریے میں بھی تبدیلی آ گئی تھی۔

جب اکتوبر 1948ء میں مودودی اور اس کے ساتھیوں کو صوبائی سیفٹی ایکٹ کے تحت مقدمہ چلائے بغیر نظر بند کیا گیا تھا تو جماعت کا الزام یہ تھا کہ ممدوٹ وزارت نے یہ آمرانہ کاروائی مدیر نوائے وقت کے مشورے کے تحت کی تھی۔ اب ممدوٹ وزارت کی برطرفی کو ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ ممدوٹ کے خلاف پروڈا کے تحت مقدمہ چل رہا تھا۔ مسلم لیگ کے اندر ممدوٹ دھڑے نے پنجابی شاونزم کی آڑ لے کر لیاقت علی خان کی حکومت کے خلاف محاذ آرائی

شروع کر رکھی تھی اور اس امر کا قوی امکان تھا کہ اس محاذ آرائی کو آگے بڑھانے کے لئے ممدوٹ دھڑے اور جماعت اسلامی کے درمیان گٹھ جوڑ ہو جائے گا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ گورنر نشتر کی صوبائی حکومت نے اس وقت امیر جماعت اسلامی کی رہائی کے مطالبات کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور 3 اپریل کو مودودی اور اس کے دوساتھیوں طفیل محمد اور امین احسن اصلاحی کی نظر بندی کی میعاد میں مزید چھ ماہ کی توسیع کر دی۔ حکومت پنجاب کی اس کاروائی کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ ان دنوں اقلیتوں کے مسئلہ کے بارے میں ہندوستان اور پاکستان کے بارے میں بات چیت ہو رہی تھی۔ ایسے مواقع پر مودودی کی رہائی اس بات چیت کی کامیابی میں رکاوٹ پیدا کر سکتی تھی کیونکہ یہ شخص پاکستان کی اسلامی مملکت میں اقلیتوں کو مساوی حقوق دینے کے خلاف تھا۔ چنانچہ جب مارچ 1949ء میں پاکستان دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد زیر بحث تھی تو جماعت اسلامی کے ایک وفد نے کراچی جا کر حزب اختلاف کے قائد سریش چندر چٹو پاڈھیا کو مودودی کی ایک کتاب دی تھی جس میں لکھا تھا کہ ''اسلام میں جمہوریت کی گنجائش نہیں ہے۔'' اس پر چٹو پاڈھیا نے اگلے دن ایوان میں مودودی کے اس ''اسلامی نظریے'' کے خلاف بہت واویلا کیا تھا تو سردار نشتر نے اس موقع پر مداخلت کر کے بتایا تھا کہ یہ شخص آج کل جیل کی ہوا کھا رہا ہے اور اس کے بعد لیاقت علی خان نے اپنی تقریر میں اس قسم کا پروپیگنڈا کرنے والے مُلّاؤں کو پاکستان اور اسلام کا دشمن قرار دیا تھا۔

4 اپریل کو جماعت اسلامی کے قائم مقام سربراہ عبدالجبار غازی نے ایک بیان میں مودودی اور اس کے ساتھیوں کے خلاف حکومت پنجاب کی اس کاروائی کو قرارداد مقاصد کے سراسر منافی قرار دیا اور عوام سے اپیل کی کہ وہ پنجاب کے آئندہ انتخابات میں نازیوں کی اس آمرانہ حکومت کا تختہ الٹ دیں۔ 5 اپریل کو پاکستان ٹائمز نے اپنے اداریے میں مودودی کے خلاف صوبائی حکومت کے اس اقدام پر سخت نکتہ چینی کی کیونکہ اخبار کی رائے میں کسی بھی شخص کو مقدمہ چلائے بغیر مقید رکھنا انصاف اور جمہوریت کے اصولوں کے منافی تھا۔ 6 اپریل کو لاہور کے مختلف سیاسی حلقوں کے لیڈروں کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں فیصلہ کیا گیا کہ مودودی کی نظر بندی کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے 9 اپریل کو ایک جلسہ عام ہو گا۔ اس فیصلہ پر دستخط کرنے والوں میں مولانا مفتی محمد حسین، مولانا مطیع الحق، مولانا احمد علی، مولانا داؤد غزنوی،

ماسٹر تاج الدین، مولانا عبدالستار نیازی، مولانا اظہر امرتسری، محمود علی قصوری، ملک نصراللہ خان عزیز اور حکیم غلام نبی انصاری شامل تھے۔ ان دستخط کنندگان میں مسلم لیگ کے ممدوٹ دھڑے کے کسی لیڈر کا نام شامل نہیں تھا جس کی بظاہر وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک ممدوٹ دھڑا مسلم لیگ سے الگ نہیں ہوا تھا اس لئے اس کے اور جماعت اسلامی کے درمیان انتخابی اتحاد کی بات چیت ابھی پکی نہیں ہوئی تھی۔ تاہم اس فیصلے کے مطابق 9/اپریل کو پہلے تو ایک خاموش احتجاجی جلوس نکالا گیا اور پھر باغ بیرون دہلی دروازہ میں ایک جلسہ عام ہوا جس میں مختلف مقررین نے مودودی کی میعاد نظر بندی میں توسیع کو انسانی آزادی پر کلیدی ضرب قرار دے کر ارباب اقتدار کی اس غیر جمہوری، غیر اسلامی اور ڈکٹیٹرانہ روش کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ جلسہ کے آخر میں ایک طویل قرارداد منظور کی گئی جس میں سیفٹی ایکٹ کی تنسیخ اور مودودی اور اس کے ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ اسی دن سرگودھا، نارووال اور متعدد شہروں میں بھی احتجاجی جلسے ہوئے۔ احتجاجی جلسوں اور جلوسوں کا یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا۔

اس دوران احراریوں نے بھی راولپنڈی کے کمپنی باغ میں ایک چارروزہ تبلیغی کانفرنس کی جس میں انہوں نے حسب معمول احمدیوں اور ظفراللہ خان کو گالیاں دیں اور حاضرین سے اپیل کی کہ مولانا شبیر احمد عثمانی کا کتابچہ خریدیں جس میں احمدیوں کو مرتد اور واجب القتل قرار دیا گیا تھا۔ مولانا مرحوم نے یہ کتابچہ 1924ء میں لکھا تھا جبکہ افغانستان میں ایک احمدی نعمت اللہ کو مرتد قرار دے کر موت کی سزا دی گئی تھی۔ یہ سزا اسے اس طرح دی گئی تھی کہ پہلے اسے شیر کوٹ کے مقام پر کمر تک زمین میں زندہ گاڑ دیا گیا تھا اور اس کے بعد اسے برسر عام پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ اسے اس طرح ہلاک کرنے کا فتویٰ افغانستان کے مقامی مولویوں نے دیا تھا اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنے کتابچے میں اس فتوے کو اسلام کی رو سے جائز اور صحیح قرار دیا تھا۔ پنجاب کی خفیہ پولیس کے سربراہ انور علی کو احراریوں کی جانب سے اس کتابچے کی وسیع پیمانے پر تقسیم سے تشویش لاحق تھی۔ اس کو خدشہ یہ تھا کہ کوئی شخص مولانا عثمانی کے اس فتوے سے مشتعل ہو کر کسی احمدی کو ہلاک کر دے گا۔ تاہم فوری طور پر ایسا نہ ہوا اور جب وزیر اعظم لیاقت علی خان 29/اپریل کو امریکہ کے دورے پر روانہ ہوا تو احراریوں اور جماعتیوں کے ''اسلامی محاذ'' پر نسبتاً خاموشی تھی۔

لیاقت علی نے دورہ امریکہ کے دوران ''اسلامی طرز زندگی'' کی تشریح کی اور اسے مغربی جمہوری نظام کے عین مطابق قرار دیا

لیکن لیاقت علی خان نے 4 رمئی 1950ء کو امریکہ پہنچ کر اپنا ''اسلامی محاذ'' کھول دیا۔ اس کے پولیٹیکل سیکرٹری نواب صدیق علی خان کے بقول ''نوشیرواں عادل کے خاندان کے اس چشم و چراغ'' نے اپنے دورہ امریکہ کے دوران جو تقریریں کیں ان پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ مالی امداد یا اسلحہ کی امداد لینے کے لئے نہیں، اسلام کی تبلیغ کے لئے امریکہ گیا تھا۔ اس کی اس اسلامی تبلیغ کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کی امریکہ کے لئے روانگی سے قبل نوائے وقت اور بعض دوسرے اخبارات نے اس کی 10 راپریل کی اس تقریر پر نکتہ چینی کی تھی جس میں اس نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ پاکستان مذہبی مملکت نہیں ہے اور اس میں بلالحاظ مذہب وملت تمام شہریوں کو ہر شعبہ زندگی میں مساوی حقوق حاصل ہیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ امریکہ میں اسلامی جمہوریت، اسلامی سوشلزم، اسلامی نظام حیات اور اسلامی فلاحی مملکت کی اس طرح تشریح کرنا چاہتا تھا کہ امریکی ارباب اقتدار اور عوام کے یہ اندیشے دور ہو جائیں کہ پاکستان مُلّاؤں کی ریاست بن جائے گا۔ اور تیسری وجہ یہ تھی کہ وہ امریکی سامراجیوں کو یہ یقین دلانا چاہتا تھا کہ سوویت یونین اور چین سے کمیونزم کا جو طوفان اٹھ رہا ہے اس کا سدباب اسلام کے زور سے کیا جا رہا ہے۔

لیاقت علی خان کی پہلی تقریر 4 رمئی کو امریکہ کے سینیٹ کے اجلاس میں تھی جس کا اس مقصد کے لئے کورم پورا ہونے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگا تھا۔ اس کی اس تقریر کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ ''پاکستان خودمختار یونٹوں پر مشتمل ایک فیڈریشن ہوگا جس میں بنیادی انسانی حقوق اور سب کے لئے مساوی مدارج و مواقع کی ضمانت دی جائے گی۔ قانون کی نظر میں سب مساوی ہوں گے، سب سے معاشی، معاشرتی اور سیاسی انصاف ہوگا اور سب کو تحریر و تقریر، عقائد، عبادات اور جماعت سازی کی آزادی ہوگی...... مملکت عوام کے منتخب نمائندوں کی وساطت سے اختیارات کا استعمال کرے گی۔ اس سلسلے میں ہم نے جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف کے اصولوں کو پیش نظر رکھا ہے جو اسلام میں وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

پاکستان میں تھیوکریسی کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ اسلام ضمیر کی آزادی کا علمبردار ہے اور جبر واکراہ کی مذمت کرتا ہے۔ اسلام میں مُلّا ئیت نہیں ہے اور وہ ذات پات سے نفرت کرتا ہے۔ اسلام سارے انسانوں کے درمیان مساوات کے اصول کو مانتا ہے اور ہر فرد کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنی محنت، کاروبار، صلاحیت اور کاریگری کا پھل کھائے بشرطیکہ وہ ان سب کو دیانتداری کے ساتھ بروئے کار لائے۔''[13] ظاہر ہے کہ لیاقت علی خان کی یہ اسلامی تبلیغ مغرب کے بورژوا جمہوری نظام حکومت کے اصولوں سے ذرا بھر بھی مختلف نہیں تھی۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ اس نے دیانت داری سے کام لیتے ہوئے یہ نہیں کہا تھا کہ پاکستان میں سیکولر جمہوریت کارفرما ہوگی بلکہ اس نے منافقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پاکستان کی جمہوریت کے ساتھ اسلام کا نام چسپاں کر دیا تھا۔ اس کا یہ ''اسلامی نظریہ'' مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا ابراہیم علی چشتی، ڈاکٹر عمر حیات ملک، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالستار نیازی، سید عطاءاللہ شاہ بخاری اور دوسرے بے شمار سند یافتہ اور جید علماو مشائخ کو قبول نہیں تھا۔ وہ اسلام کی رو سے اقلیتوں اور عورتوں کو مساوی حقوق نہیں دیتے تھے اور ان کے اسلام میں جمہوریت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ علی الاعلان قرون وسطیٰ کا شرعی نظام یا خلافتی نظام مانگتے تھے۔

لیاقت علی خان کی دوسری تقریر اسی دن واشنگٹن کے نیشنل پریس کلب کے ایک ظہرانے میں تھی۔ اس میں اس نے یقین دلایا کہ بعض لوگوں نے ''اسلامی طرز زندگی'' کی اصطلاح کی بہت سے مواقع پر غلط تعبیر کی ہے۔ وہ اس کی تعبیریوں کرتے ہیں کہ اس اصطلاح کا مطلب مذہبی عدم رواداری، مُلّا ئیت کی حکمرانی اور قرون وسطیٰ کی جانب مراجعت وغیرہ ہے۔ لہٰذا ''میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے ذہن میں مُلّاؤں کی مملکت کا تصور نہیں ہے۔ ہمارے ذہن میں یہ بھی نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں مسلمانوں کو شہریت کی خصوصی مراعات حاصل ہوں گی اور ہم اپنے غیر مسلم شہریوں پر مذہبی یا ثقافتی جبر کے تصور سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن ہمارا پختہ عقیدہ یہ ہے کہ ہمارے مذہب نے ہمیں معاشرتی ومعاشی انصاف کے ایسے اصولوں اور ایسی انسانی اقدار کا سبق سکھایا ہے جن کے کاروبار حکومت میں اطلاق سے انسانی فلاح کو لازماً فروغ حاصل ہوگا...... ہمارے ذہنوں میں یہ خیال جاگزیں ہے کہ دنیا میں امن واستحکام کے لئے ضروری ہے کہ ایشیا میں امن واستحکام ہو۔ ہمیں ایسی تخریبی تحریکوں پر تشویش ہے جو ایشیا میں

استحکام کو خطرے میں ڈال سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے انڈونیشیا اور برما کی حکومتوں سے دوستانہ تعلقات قائم کئے ہیں...... متصادم نظریات کی موجودہ دنیا میں جن قوموں نے حال ہی میں مکمل خودمختاری حاصل کی ہے وہ ذہنی خلفشار اور نتیجتاً عدم استحکام کا شکار ہو سکتی ہیں، تو پھر کیا یہ امر انتہائی اطمینان بخش نہیں ہے کہ ان اقوام میں کم از کم ایک قوم ایسی ہے جو کسی ذہنی خلفشار میں مبتلا نہیں ہے اور جس نے روایتاً اور عقیدۃً جمہوریت اور معاشی ومعاشرتی انصاف کے اصولوں پر چلنے کا عہد کیا ہے۔"[14]

7 رمئی کو لیاقت علی خان نے نیویارک میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "اسلامی سوشلزم کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ خیرات تقسیم کرنے کے لئے بازار میں جائیں تو آپ کو خیرات لینے والا کوئی نہ ملے۔ اسلام نجی ملکیت اور انفرادی کاروبار اور صنعتکاری کے حق کو تسلیم کرتا ہے لیکن وہ چند ہاتھوں میں ایسی دولت کے ارتکاز کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا جو کمائی ہوئی نہ ہو۔"[15]

8 رمئی کو اس نے کولمبیا یونیورسٹی میں ڈاکٹری کی ڈگری وصول کرنے کے بعد اپنے "اسلامی طرز زندگی" کی ذرا اور کھل کر تشریح کی۔ اس نے کہا کہ "ہم جمہوریت کے نظریہ کے حامل ہیں یعنی ہم ایسے بنیادی انسانی حقوق کو مانتے ہیں جس میں نجی ملکیت کا حق شامل ہے اور عوام کا یہ حق بھی شامل ہے کہ وہ حکومتی اختیار اپنے آزادانہ طور پر منتخب شدہ نمائندوں کو سپرد کریں۔ ہم سب کو، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، مساوی شہریت، مساوی مواقع اور قانون کی نظر میں مساوی درجہ دینے کے حق میں ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ ہر فرد کو خواہ مرد ہو یا عورت، اپنی محنت کا پھل ملنا چاہیے اور ہم بھی یہ مانتے ہیں کہ ہم میں سے جو لوگ دولت یا علم یا جسمانی صحت کے لحاظ سے خوش قسمت ہیں ان کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ بدنصیبوں کی امداد کریں۔ ہم ان اصولوں کو اسلامی طرز زندگی کہتے ہیں۔ آپ ان کو جو چاہیں نام دے لیں۔"[16] پھر لیاقت علی خان نے 11، 13، 16 اور 18 رمئی کو علی الترتیب شکاگو، کنساس سٹی، کیلی فورنیا یونیورسٹی اور لاس اینجلز میں جو تقریریں کیں ان میں بھی بار بار حاضرین کو یقین دلایا کہ پاکستان میں مُلّائیت کی حکمرانی نہیں ہوگی بلکہ ایسی جمہوریت کی کارفرمائی ہوگی جس میں بلالحاظ مذہب وملت سب شہریوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ اس نے عورتوں کو ہر شعبہ زندگی میں مساوی حقوق دینے کا بھی ذکر کیا اور یہ بھی یقین

دلایا کہ پاکستان میں ہر شہری کو نجی ملکیت اور نجی کاروبار اور نجی صنعتکاری کا پورا حق حاصل ہوگا اور آخر میں اس نے یہ بھی بتایا کہ ان سب اصولوں کے مجموعہ کا نام ''اسلامی طرز زندگی'' ہے۔ اس نے 31 رمئی کو کینیڈا کی پارلیمنٹ میں بھی اپنے ''اسلامی طرز زندگی'' کی یہی تشریح کی اور پھر یقین دلایا کہ پاکستان میں مُلّائیت کی حکمرانی نہیں ہوگی بلکہ سیاسی جمہوریت، معاشی و معاشرتی انصاف، مساوی شہریت، نجی ملکیت اور نجی کاروبار اور صنعتکاری کا دوردورہ ہوگا۔ ہم نے یہ طرز زندگی اس لئے اختیار کیا ہے کیونکہ بحیثیت مسلمان ہم کسی اور نظریے پر عمل نہیں کر سکتے یا اللہ کے سوا کسی اور کی رہنمائی طلب نہیں کر سکتے۔''[17]

مختصر یہ کہ لیاقت علی خان نے امریکہ اور کینیڈا کے اپنے اس دورہ میں جتنی تقریریں کیں ان سب کا مرکزی نکتہ ایک ہی تھا اور وہ یہ تھا کہ امریکہ اور یورپ کا سرمایہ دارانہ جمہوری نظام حکومت یا بورژوا طرز زندگی اسلام کے عین مطابق ہے۔ اس نے اپنی کسی ایک تقریر میں بھی اپنی عظیم الشان اور تاریخی قرارداد مقاصد کا ذکر نہیں کیا تھا اور نہ ہی پاکستان کی اسلامی مملکت کی اصطلاح کا استعمال کیا تھا اور نہ ہی اپنے اس اعلان کا اعادہ کیا تھا کہ پاکستان کے آئین کی بنیاد اسلامی اصولوں پر ہو گی۔ اس نے 1300 سال پہلے کے اسلامی اصولوں کا بھی ذکر نہیں کیا تھا اور نہ ہی کہا تھا کہ آج کل کی دکھی دنیا کو ان اسلامی اصولوں پر عمل کرنے سے نجات کا راستہ مل سکتا ہے۔ اس نے صرف ''اسلامی طرز زندگی'' کی مبہم سی اصطلاح استعمال کی تھی اور اپنی اس اصطلاح کی تشریح اس نے اس طرح کی تھی کہ یہ طرز زندگی امریکہ اور یورپ کے طرز زندگی کے عین مطابق ہے۔

لیاقت علی خان کا مخالف پنجابی شاونسٹ درمیانہ طبقہ اور مُلّا بدستور لیاقت حکومت کو غیر اسلامی قرار دیتے رہے اور قرارداد مقاصد کو اس کے خلاف استعمال کرتے رہے

قدرتی طور پر لیاقت علی خان کی امریکہ اور کینیڈا میں اس ''اسلامی تبلیغ'' کا پاکستان بالخصوص پنجاب کے اسلام پسند حلقوں میں کوئی خوشگوار ردعمل نہ ہوا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ اگر مغربی طرز زندگی پر ''اسلامی'' کا زریں کام کیا ہوا غلاف چڑھا دیا جائے تو وہ اسلامی طرز زندگی بن

جائے گا۔ لیاقت علی خان کی امریکہ کو روانگی سے قبل پنجابی شاونسٹوں نے اسلام کی آڑ لے کر لیاقت علی خان اوراس کی بیگم کے غیر اسلامی طرز زندگی پر بھر پور حملے شروع کر دیئے تھے اور پنجاب کے شہروں میں یہ تاثر عام ہو چکا تھا کہ لیاقت کی غیر اسلامی حکومت میں بے پردگی، عریانی، بے حیائی اور فحاشی کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ نوائے وقت کی رائے یہ تھی کہ ''وزیروں کی بیویاں مغربی بے حجابی اور حد سے زیادہ آزادی کا کھلم کھلا درس دیں تو افسروں کی بیویاں کیا کچھ نہ کریں گی اور عام عورتوں پر اس کا کیا اثر ہوگا۔''[18] اور یہ کہ ''انگریز نے پاکستان میں جو غیر اسلامی طرز حکومت، طرز سیاست وطرز تمدن کی نعش چھوڑی تھی، ہمارے ارباب اقتدار ورہنما ابھی اسی سڑی نعش سے چمٹے ہوئے ہیں اور سحر افرنگ کے زیر اثر قیام پاکستان کے اصل مقاصد اور اپنے مسلک ونصب العین کو فراموش کر کے اس راہ پر گامزن ہو رہے ہیں جس کی منزل کعبہ کی بجائے انگلستان اور امریکہ ہے۔''[19] اور یہ کہ ''پاکستان کے قیام کو تین سال ہونے کو آ رہے ہیں مگر اسلامی مملکت کی داغ بیل تک نہیں پڑی۔ وہی فرنگی نظام حکومت اپنی تمام بدعنوانیوں اور لعنتوں کے ساتھ بدستور موجود ہے۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ آقا بدل گئے ہیں۔ پہلے بدیسی تھے اب دیسی ہیں اور دیسی آقا اس نظام کو چلانے میں بدیسی آقاؤں سے زیادہ سرگرم عمل ہیں...... بے حسی کی وجہ سے ایک مکتب خیال ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو اسلام اور اسلامی مملکت کے تصور سے شرما جاتا ہے جیسے یہ دقیانوسی حرکت اور فرسودہ نظام ہو۔ یہی مکتب خیال ذمہ دار ارباب کی زبان سے پاکستان کے باہر اس ''اسلامی مملکت'' کی عجیب وغریب توضیح اس انداز میں پیش کرتا ہے جیسے وہ معذرت خواہ ہو۔''[20] اور مزید یہ کہ ''ہم جو قرآن کے پیرو اور رسول عربی ﷺ کے امتی ہیں، شراب پر کامل امتناع عائد نہ کر سکے۔ اگر کہیں ایسا ہوا بھی تو قواعد میں ایسی لچک رکھ دی گئی ہے کہ غیر مسلم تو ایک طرف رہے جتنے مسلمان بھی چاہیں ڈاکٹری سرٹیفکیٹ پیش کر کے حرام شے کو جائز طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ ہر قسم کی قمار بازی کی شرعی ممانعت کے باوجود گھڑ دوڑ کے مقابلے ہوتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ان کے سرپرست بھی وہی ہیں جن کے ہاتھوں میں مملکت اسلامیہ کی زمام اقتدار ہے۔ ہمارے ہاں آج بھی جمعہ ایک کاروباری دن ہے اور اتوار کو چھٹی ہوتی ہے۔ مساجد کے سامنے یہاں بھی باجہ نوازی ہو سکتی ہے۔ تبلیغ جیسے اہم فریضہ سے ہم نے اتنی غفلت برتی کہ صرف صوبہ پنجاب ہی میں امریکن مشنریز نے پرستاران توحید کو ہزاروں کی تعداد میں فرزندان

تثلیث بنالیا ہے۔"[21]

لیاقت علی خان اپنے خلاف اسلام کی آڑ میں اس قدر زہریلے پروپیگنڈے کے دوران پاکستان کے اندر یا باہر کسی "تبلیغی مشن" کو پورا نہیں کرسکتا تھا۔ اگر اس کی سیاست کاری، فریب اور منافقت پر مبنی نہ ہوتی تو وہ مارچ 1949ء میں قرارداد مقاصد کبھی منظور نہ کرواتا۔ بقول نوائے وقت اس نے اس قرارداد کا اس زور شور سے پروپیگنڈا کروایا تھا کہ "گویا بس یہی وہ الہ دین کا چراغ ہے جس کی برسوں سے تلاش جاری تھی" اور جس کی محض ایک رگڑ سے پاکستان آن کی آن میں ایک مثالی اسلامی مملکت بن جائے گا۔ اس نے سمجھا تھا کہ اس قرارداد کی منظوری کے بعد پاکستان میں کسی حلقے کی جانب سے اسلام کی آڑ لے کر اس پر کوئی مؤثر سیاسی حملہ نہیں ہو سکے گا۔ اس نے اپنی اس غلط فہمی کی بنا پر 1949ء میں اپنی بیگم کو یہ اجازت دی کہ وہ ایک آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن (اپوا) بنا کر پاکستان کے خوشحال طبقوں کی بے پردہ اور فیشن ایبل عورتوں کے لئے ثقافتی سرگرمیوں کا بندوبست کرے۔ چنانچہ جب اس ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام مینا بازاروں، کھیلوں اور مشاعروں وغیرہ کا انعقاد ہونے لگا تو اسلام پسندوں کی جانب سے بے پردگی، بے حیائی، عریانی اور فحاشی کے الزامات عائد ہونے لگے۔

پنجاب میں 1950ء کے اوائل تک لیاقت علی کی بیگم کے خلاف ان الزامات کا اتنا بڑا انبار لگ گیا تھا کہ قرارداد مقاصد اس میں کہیں بھی نظر نہیں آتی تھی۔ اب قرارداد مقاصد مُلّاؤں کے ہاتھ میں تھی اور وہ اس لاٹھی کے ساتھ پورے پاکستان کو لہولہان کر رہے تھے۔ چونکہ ان مُلّاؤں کا "اسلامی طرز زندگی" لیاقت علی خان اور اس کی بیگم کے "اسلامی طرز زندگی" سے بالکل مختلف تھا اس لئے ان کے لئے اسلام کی آڑ میں سیاسی جارحیت کے مواقع کی کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ مثلاً لیاقت علی کی امریکہ کے لئے روانگی سے تقریباً تین ہفتے قبل لاہور میں بیگم لیاقت کی انجمن خواتین کے زیر اہتمام عورتوں کا جو مشاعرہ ہوا، اس کی جو خبر چھپی اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ یونیورسٹی ہال کو بڑے التزام سے سجایا گیا تھا۔ اسٹیج کی رنگین فضا سامعین اور ان سے بڑھ چڑھ کر شعرا کے زرق برق رنگ برنگ لباس سے دو چند ہو گئی تھی۔ رنگ وصوت کی یہ محفل تین گھنٹے تک جاری رہی۔ انجمن کی لاہور شاخ کی صدر نے اپنی صدارتی تقریر میں اعلان کیا کہ ایسا مشاعرہ ہر سال ہوا کرے گا۔"[22] اس خبر کے چند دن بعد ایک مقامی اخبار میں ایک تصویر چھپی جس میں

جوان لڑکیوں کو ہاکی کھیلتے دکھایا گیا تھا۔ ہاکی کا یہ میچ 19 / اپریل کو جمخانہ گراؤنڈ میں جمخانہ ایسوسی ایشن الیون اور سی۔ ایس۔ سی الیون کے درمیان ہوا تھا۔ تصویر میں تین لڑکیاں سکرٹ پہنے ہوئے تھیں اور دو شلوار قمیض میں ملبوس تھیں مگر دوپٹہ کسی کے سر پر نہیں تھا۔''[23] اسی دن کراچی میں قومی ہاکی چمپئن شپ کے لئے عورتوں کی صوبائی ٹیم کے انتخاب کی غرض سے سٹریکلرز اور گلائیڈرز ٹیموں کے درمیان میچ ہوا جس کی تصویریں اور خبریں کراچی کے سارے اخبارات میں شائع ہوئیں۔ لاہور کے پاکستان ٹائمز نے بھی اس خبر کو ''مس'' نہ کیا۔''[24]

اور مُلّاؤں نے بھی ان ساری خبروں کی طرف توجہ مبذول کرانے میں ذرا تاخیر نہ کی۔ چنانچہ اگلے جمعہ بہت سی جامع مساجد میں حکمران طبقہ کی ننگی بانہوں، ننگی رانوں، لٹکتے کولہوں اور ابھرے ہوئے سینوں کا بڑی تفصیل سے ذکر ہوا۔ مُلّاؤں کے نزدیک اس سے زیادہ غیر اسلامی طرز زندگی کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا تھا جسے بیگم لیاقت علی خان فروغ دے رہی تھی۔ بے حجابی، بے حیائی اور عریانی کی انتہا ہو گئی تھی۔ ان مُلّاؤں میں ایسے مُلّاؤں کی تعداد کم نہیں تھی جو شاعری، موسیقی اور تصویر کشی کو ازروئے شریعت ناجائز قرار دیتے تھے۔ بعض مُلّاؤں نے تو ان دنوں تصویر کشی کے خلاف ''شرعی مہم'' شروع کی ہوئی تھی۔ اس مہم کی ابتدا جمعیت العلمائے سرحد کے سیکرٹری صاحبزادہ عبدالباری نے 26 / مارچ کو کی تھی جبکہ اس نے وزارت خارجہ کے سیکرٹری کو ایک بیان ارسال کیا تھا کہ ''عازمین حج بیت اللہ کے لئے ''حج پاس'' پر فوٹو لگانا جو زیر تجویز ہے، یہ شریعت محمدی میں کسی طرح درست اور جائز نہیں۔ اس لئے میں مسلمانان صوبہ سرحد کی طرف سے یہ آواز آپ تک پہنچاتا ہوں کہ ''حج پاس'' پر فوٹو لگانے کا قانون نہ بنایا جائے۔ قرارداد مقاصد کے پاس ہو جانے کے بعد ایک اسلامی ریاست میں اس قسم کی خلاف شریعت حرکت اور زیادہ دیر تک قابل برداشت نہیں۔''[25] چند دن بعد علمائے پنجاب نے صاحبزادہ عبدالباری کے اس شرعی بیان کی تصدیق کر دی اور پھر اپریل کے اوائل میں علمائے کراچی نے بھی یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ کسی جاندار کی تصویر کھینچنا، کھنچوانا یا اپنے پاس رکھنا ازروئے شریعت ناجائز ہے۔''[26] امیر جماعت اسلامی ابوالاعلیٰ مودودی اس سے بہت پہلے موسیقی، بے پردگی اور تصویر کشی کو اسلام کی رو سے حرام قرار دے چکا تھا۔

لیاقت علی خان پاکستان کے اس قسم کے معاشرے میں اسلام کا نام لے کر مغرب کا

جدید طرز زندگی رائج کرنا چاہتا تھا۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ وہ اسلام کی جو ترقی پسندانہ تشریح کرتا تھا پاکستان کا تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ اس کی تائید وحمایت کرے گا۔ مگر بوجوہ ایسا نہ ہوا۔ بالخصوص پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے مفاد پرست عناصر نے اس کی حکومت کے خلاف محاذ آرائی کے لئے مُلّاؤں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے پاکستانی معاشرے میں قدامت پرستی اور رجعت پسندی کو بہت تقویت پہنچائی۔

مودودی کی رہائی اور نوائے وقت کی طرف سے مودودی کی مدح سرائی،

مودودی اور ممدوٹ دھڑے کا لیاقت کے خلاف متحدہ محاذ

لیاقت حکومت کے مخالف مُلّاؤں میں امیر جماعت اسلامی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سب سے آگے تھا۔ مولانا کو 4/اکتوبر 1948ء کو پنجاب کی ممدوٹ حکومت نے اس الزام میں سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کیا تھا کہ وہ اور اس کی جماعت کے ارکان مسلمان عوام کو یہ ''اسلامی مشورہ'' دیتے تھے کہ وہ پاکستان کی ''غیر اسلامی مملکت'' کی فوج میں بھرتی نہ ہوں۔ لیکن 19 ماہ بعد 29/مئی 1950ء کو اسے اور اس کے دو ساتھیوں میاں طفیل محمد اور مولانا امین احسن اصلاحی کو اس بنا پر رہا کر دیا گیا کہ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس محمد منیر نے 24/مئی کو دو کمیونسٹ لیڈروں رحمت اللہ اسلم اور ایرک سپرین کی نظر بندی کے ایک مقدمہ کے فیصلہ میں یہ قرار دیا تھا کہ کسی شخص کو سیفٹی ایکٹ کے تحت 18 ماہ سے زیادہ عرصہ تک نظر بند نہیں رکھا جا سکتا۔

نوائے وقت نے چیف جسٹس کے اس فیصلے کے تحت کمیونسٹ لیڈروں کی رہائی پر تو کوئی تبصرہ نہ کیا البتہ اس نے مولانا مودودی کی رہائی کا ادارتی خیر مقدم کیا۔ اس نے لکھا کہ ''مولانا مودودی سے اختلاف رکھنے والے لوگ بھی ان کے اسلامی دل و دماغ کی صلاحیت کے معترف ہیں۔ طویل نظر بندی کے بعد اس باعزت رہائی پر ہم مولانا کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آزادی کے بعد وہ اپنا لائحہ عمل اس طرح مرتب کریں گے کہ ملک و ملت کو ان کی صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع ملے اور اللہ نے مولانا کو جو قوت عطا کی ہے وہ اسلام کی اساس پر ملک کی تعمیر کے مبارک کام میں صرف ہو۔''[27] یہ وہی ابوالاعلیٰ مودودی تھا جس کے بارے میں 4/اکتوبر 1948ء سے چند دن قبل نوائے وقت کی رائے یہ تھی کہ یہ شخص اسلام کا دشمن

ہے، خارجی ہے، پاکستان کا دشمن ہے، ملک وقوم کا غدار ہے، منافق ہے، مردود ہے، بے ایمان ہے، عبدالدینار ہے، اسلام فروش ہے، ہندوستان کا ایجنٹ ہے اور کانگرس کا اجیر ہے۔ لیکن اب نوائے وقت اس کے اسلامی دل ودماغ کی صلاحیت کا معترف تھا اور امید کرتا تھا کہ اس کی یہ صلاحیت اسلامی اساس پر ملک کی تعمیر کے مبارک کام میں صرف ہوگی۔ یعنی یہ کہ وہ مسلم لیگ کے ممدوٹ دھڑے کے ساتھ مل کر لیاقت علی خان کی حکومت کے خلاف محاذ آرائی میں شریک ہوگا۔ اکتوبر 1948ء سے قبل نوائے وقت کے کسی شخص کے بارے میں اسلامی یا غیر اسلامی یا محب الوطن یا غدار ہونے کا اولین معیار یہ تھا کہ وہ ممدوٹ وزارت کا حامی ہے یا مخالف ہے اور اب مئی 1950ء میں نوائے وقت کی نظر میں کسی شخص کے اسلام پسند یا اسلام دشمن ہونے کا سب سے بڑا معیار یہ تھا کہ وہ لیاقت علی خان کی حکومت کا مخالف ہے یا حامی ہے۔

ابوالاعلیٰ مودودی جیل سے باہر آیا تو لاہور کے ریگل سینما میں ''بلبل چودھری'' کا رقص وسرود کا شو زبردست رش لے رہا تھا۔ اس نے جون کے دوسرے ہفتہ میں اپنی مجلس شوریٰ کا اجلاس منعقد کیا جس نے پانچ دن میں پانچ قراردادیں منظور کیں۔ ان قراردادوں میں لیاقت علی خان کی کارگزاریوں پر نکتہ چینی کی گئی۔ اسلامی حکومت کے قیام کے لئے عام انتخابات کا مطالبہ کیا گیا اور مہاجرین کے بارے میں حکومت کی پالیسی کی مذمت کی گئی۔ مودودی نے 15رجون کو ایک پریس کانفرنس میں یہ قراردادیں برائے اشاعت تقسیم کیں اور پھر اس نے ان کی توضیح کے لئے اپنے جن نئے سیاسی و مذہبی نظریات کا اعلان کیا ان کے مطابق وہ نوائے وقت کے آخری معیار پر پورا اترا۔ اس نے اپنے 1948ء کے موقف کے برعکس یہ تو مان لیا کہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے لیکن یہ نہ مانا کہ لیاقت علی خان کی حکومت ایک اسلامی حکومت ہے۔ اس نے کہا کہ ''دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد کے پاس ہوجانے کے بعد ریاست پاکستان ایک اسلامی ریاست بن چکی ہے اور اب ہمارے لئے دوسرا اہم مرحلہ یہ ہے کہ حکومت پاکستان کو بھی ایک اسلامی حکومت میں تبدیل کردیا جائے۔ اس تبدیلی کی سعی کا ایک ضروری جزیہ بھی ہے کہ جہاں جہاں انتخاب کا موقع پیدا ہو وہاں ہم ایسے صالح لوگوں کو منتخب کرانے کی کوشش کریں جو اپنی ذہنیت اور سیرت کے اعتبار سے سچے مسلمان ہوں، جن پر یہ بھروسہ کیا جاسکے کہ اقتدار کی امانت پاکر وہ خدا اور اس کے دین اور ملت پاکستان کے ساتھ خیانت نہ کریں گے اور جن سے یہ امید کی

جاسکے کہ وہ حکومت کے نظام کو خلافت راشدہ کے طریق پر ڈال سکیں گے......جس شخص کو بھی سب لوگ مل کر صالح تر قرار دیں گے خواہ وہ جماعت اسلامی کا رکن ہو یا نہ ہو اس کی کامیابی کے لئے جماعت کوشش کرے گی...... ملک کی زمام کار اس وقت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے ان کے رویے کو دیکھ کر یہ امید باقی نہیں رہی کہ وہ قرارداد مقاصد کو اس کی صحیح سپرٹ میں عملی جامہ پہنائیں گے......زمینداری اور جاگیرداری کے معاملہ میں مجلس شوریٰ نے خیال ظاہر کیا کہ قرارداد مقاصد کے پاس ہو جانے کے بعد پاکستان میں نہ صرف اس مسئلہ کا بلکہ کسی مسئلہ کا بھی ایسا حل تجویز کرنے کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں ہے جو اسلام کے اصولوں اور احکام کے خلاف ہو۔ اس بنا پر مجلس کی رائے یہ ہے کہ ان کو صحیح طور پر حل کرنے کے لئے باقاعدہ تحقیقات کی ضرورت ہے تا کہ اسلامی قوانین کی روشنی میں یہ معلوم کیا جائے کہ کن لوگوں کو فی الواقع اراضی پر حقوق ملکیت حاصل ہیں اور کن کو نہیں۔ لیکن جب تک تحقیقات نہ ہو جماعت اسلامی کے لئے مجلس نے ایک ایسا لائحہ عمل بنایا ہے جس کے ذریعے ملک میں طبقاتی جنگ کی آگ بھڑکنے کو روکا جائے اور مالکان اراضی اور مزارعین کے درمیان اسلامی عدل اور اخلاقی فیاضی کی بنیاد پر مصالحت کرائی جائے...... جماعت اسلامی جاگیرداری کو حرام تصور نہیں کرتی۔ پنجاب کے جاگیرداروں کے متعلق فی الحال یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کن کے قبضہ میں جاگیریں جائز ہیں اور کس کے پاس ناجائز ہیں۔ اس لئے اسلامی نقطہ نگاہ کے مطابق تحقیقات کے بعد ہی پنجاب کے موجودہ جاگیرداروں کے متعلق مناسب رویہ اختیار کرنا ہوگا۔"[28] اور مزید یہ کہ "صحیح اسلامی حکومت کے نفاذ پر کسی غیر مسلم کو کوئی بھی کلیدی عہدہ نہیں سونپا جائے گا بلکہ غیر مسلموں کی مجلس قانون ساز بھی الگ ہوگی۔ اگر ہندوستانی حکومت ہندوستانی مسلمانوں سے بھی یہی رویہ اختیار کرے، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"[29]

مودودی کی جاگیرداری اور زمینداری نظام کے حق میں تاویلیں اسے پنجابی درمیانہ طبقہ میں مقبول نہ کر سکیں

ابوالاعلیٰ مودودی نے پاکستان، بالخصوص پنجاب کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کے بہت سے عناصر کو بہت مایوس کیا۔ یہ عناصر اس بات پر حیران و پریشان ہوئے کہ یہ شخص برطانوی سامراج کی جانب سے اپنے پٹھوؤں کو عطا کردہ بڑی بڑی جاگیرداریوں اور زمینداریوں کو

از روئے شریعت جائز قرار دے کر اسلام کو رسوا کر رہا ہے۔ ان عناصر کے بقول مودودی کا مقام اچھے ادیب کا تو ہو سکتا ہے لیکن مفتی کا نہیں۔ اسے یہ اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ اسلام کی سپرٹ اور روح کو نظر انداز کر کے اسلام کے نام پر جاگیرداری کی حمایت کرے۔ انہیں اس بات پر حیرت تھی کہ یہ شخص کل تک تو مغربی جمہوریت کو غیر اسلامی قرار دیتا تھا لیکن آج اپنی جماعت کی جانب سے اسی جمہوریت کے انتخابی عمل میں حصہ لینے کے عزم کا اظہار کرتا ہے۔ انہیں ہندوستان کے ساڑھے تین کروڑ مسلمانوں کے بارے میں اس کی شقی القلبی پر بہت غصہ تھا۔ یہ اپنے اسلامی تصور کے مطابق پاکستان کے ہندوؤں کو مساوی حقوق دینے پر آمادہ نہیں تھا خواہ اس کے نتیجے میں ہندوستان کے ساڑھے تین کروڑ مسلمانوں سے شودروں کا سا سلوک کیوں نہ کیا جائے۔ نوائے وقت نے مودودی کی اس پریس کانفرنس پر کوئی ادارتی تبصرہ نہ کیا۔ اس کی وجہ مودودی کا غیر واضح سیاسی رویہ تھا۔ وہ ایک طرف تو نوائے وقت کے نقطہ نگاہ سے صحیح طور پر لیاقت کی حکومت کو غیر اسلامی حکومت قرار دیتا تھا لیکن دوسری طرف وہ لیاقت کے حلیف جاگیرداروں اور زمینداروں کی اسلام کے حوالے سے حمایت کرتا تھا۔ تاہم پاکستان ٹائمز نے مودودی کی سیاسی جرأت کی تعریف کی کیونکہ اس نے غیر مبہم الفاظ میں اپنے معاشی پروگرام کا اعلان کر دیا تھا۔ وہ کھلم کھلا جاگیرداریوں و زمینداریوں کی حمایت کرتا تھا۔ جبکہ مسلم لیگی ارباب اقتدار اس سلسلے میں منافقانہ رویہ اختیار کئے ہوئے تھے۔ مودودی کے اس بیان کا ایک فوری پس منظر یہ تھا کہ حکومت پنجاب نے 2رمئی 1950ء کو ایک آرڈیننس کے ذریعہ مزارعین کی بیدخلی پر کچھ پابندیاں عائد کر دی تھیں اور 15رجون 1949ء کے بعد کی ساری بیدخلیوں کو ناجائز قرار دے دیا تھا۔ اگرچہ اس قانون میں زمینداروں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ اگر کوئی مزارع طے شدہ شرائط کے مطابق بٹائی نہ دے یا بٹائی کی عدم ادائیگی کی مہم میں حصہ لے تو اسے عدالتی کاروائی کے ذریعے بیدخل کیا جا سکتا ہے۔ تاہم اس قانون کے نفاذ کے بعد ضلع ملتان میں مزارعین اور زمینداروں کے درمیان سخت کشیدگی پیدا ہو گئی تھی اور پاکستان ٹائمز کی 30رمئی 1950ء کی رپورٹ کے مطابق صرف ایک ماہ میں ملتان، کبیر والا، خانیوال اور میلسی کی تحصیلوں کی عدالتوں میں 1500 مقدمات دائر کئے گئے تھے اور دوسرا پس منظر یہ تھا کہ 5رمئی 1950ء کی ایک اخباری رپورٹ کے مطابق حکومت پنجاب کے زیر غور یہ تجویز آئی تھی کہ قیام پاکستان سے قبل خضر وزارت نے جو جاگیریں اور زمینیں عطا کی

تھیں انہیں بحق سرکار ضبط کر لیا جائے گا۔

چند دن بعد جب مودودی کو اپنی سیاسی غلطی کا احساس ہوا یا احساس دلایا گیا تو اس نے ایسوسی ایٹیڈ پریس کے نامہ نگار کو بلا کر جاگیرداری و زمینداری کے مسئلہ پر ایک طویل ''شرعی انٹرویو'' دیا۔ جس میں اس نے جاگیرداروں اور زمینداروں کے بارے میں اپنے ''اسلامی نظریے'' کی تاویلیں کر کے جو رائے ظاہر کی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلامی احکامات کی بنیاد پر تعمیر شدہ معاشرے میں کسی طبقے کی جانب سے دوسرے طبقے کے معاشی استحصال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس اسلامی مملکت میں شریعت کی کارفرمائی ہو گی اس میں بحیثیت مجموعی عوام کے روزمرہ کے مسائل بآسانی حل ہو جائیں گے اور دہشت پسندی یا کمیونسٹ طریقے اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ اسلام نجی ملکیت کے خلاف نہیں ہے لیکن اسلام نے نجی مالکان جائیداد پر جامع شرائط عائد کی ہیں۔ وہ اپنی جائیداد کے حقدار صرف اسی صورت ہو سکتے ہیں جب وہ ان شرائط کو پورا کریں۔ اگر زمینداروں کو مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی جائیداد کے بارے میں اسلامی اصولوں پر عمل کریں تو اسی طرح نہ صرف کوئی طبقاتی تصادم نہیں ہو گا بلکہ چند ہاتھوں میں دولت اور زرعی جائیداد کا ارتکاز بھی نہیں ہو گا۔ اسلامی قانون کے تحت بڑی زمینداریاں خودبخود چھوٹی زمینداریوں میں منقسم ہو جائیں گی۔ میری رائے میں مناسب چھان بین کے بغیر زمینداری کا خاتمہ غیر اسلامی فعل ہو گا۔ ہمارا نصب العین یہ نہیں ہے کہ صنعتی شعبہ میں طبقاتی اختلافات کو ہوا دی جائے اور انتشار کی صورتحال پیدا کی جائے بلکہ آجر اور مزدور کے درمیان تعلقات کے مسائل اسلامی اصولوں کے اطلاق سے دونوں طبقوں کی اخلاقی اصلاح کر کے حل کئے جائیں اور اگر پھر بھی یہ مسائل حل نہ ہوں تو انہیں آخری حربے کے طور پر سارے آئینی ذرائع بشمول مزدوروں کی ہڑتال سے حل کیا جائے۔ میں سبوتاژ یا تشدد کے تخریبی ذرائع کے خلاف ہوں۔ میں ایک ایسی حقیقی اسلامی مملکت بنانا چاہتا ہوں جس کے تمام شعبوں کی سرگرمیوں میں شریعت کا نفاذ ہو۔ میری جماعت ایک ایسا باشعور اخلاقی معاشرہ قائم کرنا چاہتی ہے جس میں فرد کو زیادہ سے زیادہ آزادی ہو اور پاکستان میں کسی قسم کی آمریت قائم نہ ہونے پائے۔[30]

چونکہ مودودی کی اس پریس کانفرنس اور بعد میں اس کے تاویلی بیان کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ اس کی جماعت کسانوں اور مزدوروں کی طبقاتی جدوجہد کی اسلام کے زور سے مخالفت کرے

گی، اس لئے یہ شخص پاکستان کے حکمران طبقوں کی ہر قسم کی پشت پناہی پر مکمل انحصار کرسکتا تھا بالخصوص ایسی حالت میں کہ حکمران طبقوں کے سب سے بڑے ''اسلامی ستون'' مولانا شبیر احمد عثمانی کا انتقال ہو چکا تھا۔ یوں تو مُلّاؤں کی باقی جماعتیں بھی جاگیرداری، زمینداری اور سرمایہ داری نظام کی حمایت کرتی تھیں لیکن جس طریقے سے مودودی کی جماعت نے اشتراکیت کی مخالفت کے مسئلہ کو اپنا اولین نصب العین قرار دیا تھا اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ مثلاً مولانا عبدالحامد بدایونی کی جمعیت العلمائے پاکستان اور مولانا داؤد غزنوی کی جمعیت اہلحدیث بھی اشتراکیت کی سخت مخالفت کرتی تھیں اور جاگیرداروں، زمینداروں اور سرمایہ داروں کی بھرپور حمایت کرتی تھیں لیکن عملاً ان کا اولین مسئلہ مذہبی اختلافات کا مسئلہ تھا۔ وہ زیادہ تر توجہ مذہبی فرقہ پرستی پر دیتی تھیں اور اس بنا پر آئے دن سنی، وہابی، شیعہ اور دوسرے فرقوں کے درمیان جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔

احراریوں کی احمدیوں کے خلاف یلغار میں اضافہ۔ لیاقت۔ دولتانہ دھڑے نے احراریوں سے سیاسی اتحاد کی وجہ سے ان کے خلاف کاروائی نہ کی

مجلس احرار اسلام کے بڑے بڑے مُلّا بھی مروجہ معاشی نظام کو جوں کا توں رکھنے کے حق میں تھے اور جو شخص بھی اس استحصالی نظام میں تبدیلی کا مطالبہ کرتا تھا وہ اسے اشتراکی اور ملحد قرار دیتے تھے۔ لیکن عملی طور پر ان کا اولین مسئلہ ختم نبوت کا مسئلہ تھا۔ تبلیغی کانفرنسوں میں ان کا سارا زور خطابت اس مطالبہ پر صرف ہوتا تھا کہ احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور ظفر اللہ خان کو وزارت خارجہ سے الگ کیا جائے۔ احراری مُلّا اپنے اس اہم ترین مذہبی مسئلہ پر انتہائی اشتعال انگیز تقریروں کے دوران نہ صرف فرقہ احمدیہ کے سربراہوں کے خلاف بڑی بدزبانی کرتے تھے بلکہ وہ بے بنیاد الزامات بھی عائد کرتے تھے۔ مثلاً مئی 1950ء میں ان کا ایک الزام یہ تھا کہ سر ظفر اللہ خان نے جب جولائی 1947ء میں سرحدی کمیشن کے روبرو مسلم لیگ کے موقف کی وکالت کی تھی تو اس نے اپنے فرقہ کی طرف سے یہ موقف بھی پیش کیا تھا کہ ضلع گورداسپور کے قصبہ قادیان کو ایک ''کھلا شہر'' قرار دیا جائے کیونکہ فرقہ احمدیہ مسلمانوں کے سواد اعظم سے الگ ایک اقلیتی فرقہ ہے اور یہ کہ اس کے اس موقف کے پیش نظر ہی سرحدی کمیشن نے ضلع گورداسپور کو مسلم اقلیتی ضلع قرار دے کر اسے ہندوستان کی تحویل میں دے دیا تھا۔ یہ الزام بعض اردو

اخبارات میں مضامین کی صورت میں عائد کیا گیا۔ چنانچہ حکومت پاکستان نے 28 رمئی کو اس الزام کا نوٹس لے کر اسے قطعی طور پر بے بنیاد قرار دیا۔[31] احراری مُلاّؤں کی تقریروں میں اس قدر اشتعال انگیزی اور بدزبانی ہوتی تھی کہ حافظ آباد میں منعقدہ ایک تبلیغی کانفرنس کی رپورٹ موصول ہونے پر ایک پولیس آفیسر نے 19 رجون کو سرکاری طور پر یہ رائے قلمبند کی کہ ''اگر احرار کی تقریروں کے لہجے پر کوئی قید عائد نہ کی گئی تو عنقریب حکومت کو بلوے اور قتل کے چند واقعات کا سامنا کرنا پڑے گا۔'' اس کی اس رائے سے ایک سینیئر پولیس افسر نے اتفاق کیا اور لکھا کہ ''حالات بہت زیادہ بگڑ چکے ہیں اور شائستگی اور سیاسی اخلاق کی حدود و قیود توڑی جا چکی ہیں۔ اب تک مندرجہ ذیل قابل ذکر باتیں ظہور میں آئی ہیں۔

1۔ مرزا غلام احمد کی تحریروں کے اقتباسات ناگوار حد تک نقل کئے جا رہے ہیں اور ان کو توڑ مروڑ کر ان سے فحش اور غلیظ مطالب نکالے جا رہے ہیں۔

2۔ مرزا غلام احمد اور موجودہ خلیفہ کو زنا کار اور خلاف فطرت حرکات کا مرتکب ظاہر کیا جا رہا ہے۔

3۔ احمدیوں کو غدار کہا جا رہا ہے اور دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ پاکستان کے وفادار نہیں ہیں

4۔ سر ظفر اللہ خان کے خلاف بدگوئی اور دشنام طرازی جاری ہے۔ اس کو اکثر گدھا، مکار بتایا جاتا ہے اور اس پر یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ وہ قادیان میں احمدی مفادات کے تحفظ کی خاطر کشمیر کو فروخت کر دے گا۔

5۔ یہ کہہ کر عوام کو دہشت زدہ کیا جا رہا ہے کہ پاکستان پر احمدیوں کی حکومت ہے جو ملک کے غدار ہیں۔ اس مقصد کی خاطر فوجی اور غیر فوجی احمدی عہدیداروں کی فہرستیں اکثر شائع کی جاتی ہیں۔

6۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے بارہا کہا ہے کہ اگر مرزا غلام احمد نے اس کی زندگی میں نبوت کا دعویٰ کیا ہوتا تو وہ اس کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیتا۔

7۔ پچھلے دنوں احراریوں کے ایک جلسہ میں جذبات اس قدر مشتعل کئے گئے کہ حاضرین میں سے ایک شخص نے اٹھ کر اعلان کیا کہ میں مرزا بشیر الدین کو قتل کرنے کے لئے خدمات پیش کرتا ہوں۔

8۔ ملتان کے ایک جلسے میں عطا اللہ شاہ بخاری کی تقریر سن کر ایک شخص اٹھا اور کہنے لگا کہ اگر حکم ہو تو میں جا کر سر ظفر اللہ خان کو قتل کر دوں۔

9۔ ''الشہاب'' کے نام سے ایک کتابچہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے لکھا تھا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ احمدی مرتد ہیں لہٰذا ہر مسلمان ان کو قتل کر سکتا ہے۔ یہ کتابچہ دوبارہ چھاپ کر شائع کیا جا رہا ہے۔

اس سینیئر پولیس آفیسر نے آخر میں اپنی رائے ظاہر کی کہ جب عوام کے جذبات کو اس حد تک مشتعل کر دیا جائے کہ قتل، بلوے اور توہین و تضحیک وغیرہ کے خطرات پیدا ہو جائیں تو اس کو روکنا قطعی طور پر لازمی ہے۔ لہٰذا احراریوں کے خلاف سیفٹی ایکٹ کے تحت کارروائی ہونی چاہیے۔ مجلس احرار کو خلاف قانون جماعت قرار دیا جائے اور شبیر احمد عثمانی کے کتابچہ الشہاب کو ضبط کر لیا جائے۔ مگر صوبائی حکومت نے خفیہ پولیس کے سربراہ کی اس رائے پر عمل نہ کیا اور گورنر نشتر نے صرف یہی کافی سمجھا کہ مجلس احرار کے صدر ماسٹر تاج الدین کو ایک مرتبہ اور متنبہ کر دیا جائے۔[32] اس کی وجوہ پولیس افسروں کو بھی معلوم تھیں لیکن وہ سرکاری فائلوں میں اس کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ مسلم لیگ کے لیاقت۔ دولتانہ دھڑے کو پنجاب کے آئندہ عام انتخابات میں احراریوں کی حمایت کی ضرورت تھی۔ نوائے وقت کی اطلاع کے مطابق مولانا عطا اللہ شاہ بخاری، مولانا محمد علی جالندھری اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی مارچ 1950ء میں مسلم لیگ کے ممبر بن گئے تھے اور اس وقت سے انہوں نے اپنی خدمات مسلم لیگ کے سپرد کر دی تھیں۔[33] دوسری وجہ یہ تھی کہ قرارداد مقاصد کی منظوری کے بعد ختم نبوت کا مسئلہ اٹھانے والوں کے خلاف کسی تعزیری اقدام کے لئے عوامی تائید حاصل نہیں ہو سکتی تھی بالخصوص ایسی حالت میں کہ مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور دوسرے بے شمار علما و مشائخ کے فتووں کے مطابق فرقہ احمدیہ واقعی مرتدوں کا فرقہ تھا اور اس کے ارکان از روئے شریعت واجب القتل تھے۔ لیاقت علی خان نے 12 / مارچ 1949ء کو مذہب کو سیاست کے ساتھ بذریعہ قرارداد مقاصد رسمی طور پر منتھی کرنے کی جو کارروائی کی تھی اس کا یہی نتیجہ نکل سکتا تھا۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ پنجاب کے جاگیرداروں اور زمینداروں کو احراریوں کی یہ روش بری نہیں لگتی تھی کیونکہ غریب عوام کی توجہ معاشی مسائل کے بجائے صرف مذہبی مسائل کی طرف مبذول رہتی تھی۔ احراری مُلّا اپنی

تقریروں میں ملک کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کا کوئی ذکر نہیں کرتے تھے۔ ان کا پروگرام صرف یہی تھا کہ مسئلہ ختم نبوت کی آڑ لے کر عوام الناس میں اپنی کھوئی ہوئی ساکھ کو بحال کیا جائے اور اس میں انہیں کامیابی ہوئی تھی۔ پنجاب مسلم لیگ دو دھڑوں میں بری طرح منقسم تھی۔ اگر حکومت پاکستان کی جانب سے احراریوں کے خلاف کوئی کاروائی کی جاتی تو اس سے ممدوٹ دھڑا انتخابی فائدہ اٹھانے میں ذرا بھی تامل نہ کرتا۔ اس دھڑے کے حامی علما اور مشائخ پہلے ہی لیاقت علی خان کی حکومت کو غیر اسلامی حکومت قرار دے رہے تھے اور اس سلسلے میں تازہ ترین ثبوت یہ پیش کر رہے تھے کہ لیاقت علی خان اور اس کی بیگم امریکہ میں قیام کے دوران ہالی وڈ گئے تھے اور انہوں نے وہاں اپنی تصویریں کھنچوائی تھیں۔

مذہبی انتہا پسندی کے ماحول میں مودودی کی طرف سے حکومت کے خلاف ملک گیر مہم......لیاقت کے دورہ امریکہ اور اس کی اسلام کی تشریح پر تنقید

ان علما و مشائخ کی ''تبلیغ'' کی وجہ سے بعض عناصر میں کس حد تک مذہبی انتہا پسندی پیدا ہو گئی تھی، اس کا اندازہ ان تین خبروں سے لگایا جا سکتا ہے: (1) ''ایس۔ ڈی۔ او کی عدالت میں چونیاں اور قصور کے بعض تانگے والوں کے چالان پیش ہوئے۔ جن تانگہ والوں کو نماز آتی تھی انہیں دو دو اور جنہیں نہیں آتی تھی انہیں بیس بیس روپے جرمانہ کیا گیا۔''[34] (2) ڈیرہ اسماعیل خان کے سٹی مجسٹریٹ نے دو صحت مند مضبوط نوجوانوں کو کھاتے پیتے دیکھا اور رمضان المبارک کا احترام نہ کرنے کی سزا کے طور پر ان کا منہ کالا کر کے ان کو شہر کے گلی کوچوں میں چکر لگوائے گئے۔ ان کے ساتھ عوام کا ہجوم تھا۔ یہ سب اس لئے کیا گیا تا کہ دوسروں کو عبرت ہو۔ یہاں کے تمام ہوٹل وغیرہ دن بھر بند رہے۔''[35] (3) ''کوٹ نجیب آباد (ہزارہ) کے تین اشخاص کو جنہوں نے روزہ نہیں رکھا تھا، ایک ایک سال قید با مشقت کی سزا دی گئی۔''[36] ان خبروں پر لاہور کے روزنامہ امروز کو شکایت یہ تھی کہ ''یہ سزائیں کس قانون کے تحت دی گئی ہیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ضابطہ فوجداری اور تعزیرات ہند میں روزہ نہ رکھنے یا نماز نہ پڑھنے کے متعلق کوئی دفعہ موجود نہیں ہے۔''

لیکن مودودی خارجیت کے لئے مذہبی انتہا پسندی کی یہ فضا بہت سازگار تھی۔ چنانچہ

امیر جماعت اسلامی نے اپنی 15 رجون کی پریس کانفرنس کے فوراً بعد ایک رسالہ چھپوایا جس میں اس نے ہارون الرشید کے عہد کے زرعی نظام کو اسلامی نظام حیات کی حیثیت سے پیش کر کے یہ ''ثابت'' کیا کہ جاگیرداریت اسلام کے عین مطابق ہے۔ پھر جولائی کے پہلے ہفتے میں اس نے پنجاب کے مختلف اضلاع کا دورہ شروع کیا۔ وہ سب سے پہلے مظفر گڑھ پہنچا جہاں اس نے جامع مسجد میں تقریباً ڈیڑھ ہزار افراد کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے پاکستان کی اسلامی ریاست پر غیر اسلامی اصولوں کی فرمانروائی اور نااہل قیادت کے تسلط کا ذکر کیا۔ اس نے یہ رائے ظاہر کی کہ ''قرارداد مقاصد پاس کرنے والے لوگ اسلام اور مغربی جمہوریت کو ایک بتا رہے ہیں۔''[37]
اس کا مطلب یہ تھا کہ لیاقت علی خان نے امریکہ میں جس اسلامی طرز زندگی کی تبلیغ کی ہے اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ دراصل مغرب کا جمہوری طرز زندگی ہے۔ 24 رجولائی کو اس نے لاہور کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے دستور ساز اسمبلی کی کارگردگی کی مذمت کی اور کہا کہ ''جو لوگ قرارداد مقاصد کے سخت مخالف ہیں انہیں آئین سازی کے لئے اسمبلی کی کمیٹیوں میں شامل کیا گیا ہے۔''[38] اس نے اعلان کیا کہ ''میں عوام کے مسائل کو اسلامی طریق زندگی سے حل کرنے کا متمنی ہوں۔ ہر طرف طبقاتی جنگ نظر آ رہی ہے۔ ہماری قوم حال ہی میں ہندو۔ مسلم تنازعہ کی آگ سے گزری ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہماری قوم پھر کسی دوسری مشکل میں پھنس جائے۔ جماعت اسلامی چاہتی ہے کہ جمہوری آئینی اصولوں کی بنیاد پر معاشرتی نظام کا قیام ہو۔ کسی قریبی تاریخ میں ملک میں عام انتخابات کا انعقاد عمل میں لایا جائے کیونکہ موجودہ آئین ساز اسمبلی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ عوام کو تعلیم دی جائے تا کہ وہ صالح نمائندوں کو منتخب کر سکیں۔ جاگیرداروں، کاشتکاروں، مزدوروں اور سرمایہ داروں کے درمیان تعلقات بہتر بنانے کے لئے مصالحتی بورڈ قائم کئے جائیں۔''[39]

مودودی کی مذکورہ تقریر سے ہفتہ عشرہ قبل لیاقت علی خان امریکہ سے واپس کراچی پہنچ چکا تھا لہٰذا یہ تقریر لیاقت کے نام ایک دھمکی آمیز پیغام کی حیثیت رکھتی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے سرکاری طور پر مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کا رتبہ دو ورنہ میں پنجابی شاونسٹوں یعنی ممدوٹ دھڑے کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے پنجاب میں تمہارے لئے بہت سیاسی مشکلات پیدا کروں گا۔ جب دو تین دن تک کراچی سے اس پیغام کا کوئی مثبت جواب نہ ملا تو وہ خود کراچی پہنچا اور اس نے

28رجولائی کو کراچی کے جہانگیر پارک میں ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے الزام عائد کیا کہ حکومت نے قرارداد مقاصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے کوئی اقدام نہیں کیا۔ اس نے اعلان کیا کہ میری جماعت کا اولین نصب العین یہ ہے کہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے عام انتخابات کرائے جائیں۔ میری جماعت کو موجودہ دستور ساز اسمبلی پر اعتماد نہیں ہے کیونکہ یہ اسمبلی ملک میں اسلامی ریاست قائم کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ اس نے جاگیرداری اور زمینداری کے بارے میں اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''ہر جاگیرداری اور زمینداری کے مستقبل کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس کی ابتدائی حیثیت کی چھان بین ضروری ہے۔ میں جاگیرداری نظام کے مکمل خاتمہ کے حق میں نہیں ہوں۔ جو جاگیریں عوامی خدمات کے اعتراف کے طور پر دی گئی تھیں اور جو پہلے ابتدأ سرکاری اراضی تھیں وہ برقرار رہنی چاہئیں۔ جاگیروں کے سائز بس اتنے ہی ہونے چاہئیں کہ جاگیردار درمیانہ طبقہ کے رکن کی حیثیت سے اطمینان کی زندگی بسر کر سکے۔ دوسری ساری جاگیریں منسوخ کر دینی چاہئیں۔ جو زمیندار اپنی زمین پر ملکیتی حقوق رکھتے ہیں انہیں اپنی زمین اپنے پاس رکھنے کی اجازت ہونی چاہیے لیکن وہ زمینداریاں منسوخ کر دینی چاہئیں، زمیندار جن کا صرف مالیہ ہی وصول کرتا ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ یا تو ان ٹیکس کلکٹروں کو معاوضہ ادا کرے یا انہیں ان کی خدمات سے سبکدوش کر دے۔ حکومت کو جاگیرداروں اور زمینداروں کے حقوق و مراعات کی حد بندی کرنی چاہیے۔''

29رجولائی کو مودودی نے کراچی میں ایک اور جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے دستور ساز اسمبلی پر عدم اعتماد کا اظہار کیا۔ اس نے کہا کہ ''قرارداد مقاصد کی منظوری کے بعد دستور ساز اسمبلی نے کوئی قدم نہیں اٹھایا جس سے یہ ثابت ہو کہ وہ پاکستان کا آئین بنانے کی مخلصانہ خواہش رکھتی ہے۔ اس نے کراچی کے سکولوں اور کالجوں میں مخلوط تعلیم اور ویمنز نیشنل گارڈز کی تنظیم کی سرگرمیوں پر سخت تنقید کی اور کہا کہ یہ سب کچھ قرارداد مقاصد کی روح کے منافی ہے۔''[40] اس نے یہ الزام عائد کیا کہ لیاقت علی خان نے اپنے دورہ امریکہ پر عوامی خزانہ سے 25 لاکھ روپے ضائع کئے ہیں۔

مودودی کے کراچی میں قیام کے دوران 4راگست کو لاہور میں اس کے اخبار ''تسنیم'' کے ایڈیٹر مولانا نصر اللہ خان عزیز کو سیفٹی ایکٹ کے تحت اس الزام میں گرفتار کر لیا گیا کہ اس نے

ایک شخص کے اس الزام پر تنقیدی تبصرہ کیا تھا کہ حکومت پنجاب کے ہوم سیکرٹری سید احمد علی نے اسے بطور ڈرائیور ملازم نہیں رکھا تھا صرف اس لئے کہ اس نے داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ تاہم مودودی واپس لاہور نہ آیا اور وہ کراچی سے کوئٹہ چلا گیا جہاں اس نے 7/اگست کو ایک جلسہ عام کو خطاب کیا۔ اس نے کہا کہ ''میری جماعت چاہتی ہے کہ ملک میں مذہبی واخلاقی اقدار کے انحطاط کے رجحان کا سدباب کیا جائے اور عوام میں معاشی تفاوت کو کم کیا جائے۔ موجودہ حکومت یہ تبدیلیاں لانے کی اہلیت نہیں رکھتی اور چونکہ سیاسی اقتدار کے بغیر ایسا کرنا ممکن نہیں اس لئے جماعت کا مطالبہ یہ ہے کہ عام انتخابات کرائے جائیں تاکہ ایسی جماعت برسراقتدار آئے جو اس پروگرام کو عملی جامہ پہنا سکے۔''[41] مودودی کی اس تقریر کا مطلب یہ تھا کہ اب اس نے لیاقت علی خان کی حکومت کے خلاف محاذ آرائی کا فیصلہ کر لیا تھا اور وہ کھلم کھلا سیاسی اقتدار کا متمنی تھا۔ اب وہ اس سلسلے میں الفاظ کا ہیر پھیر نہیں کرتا تھا۔

وزیراعظم لیاقت علی خان نے مودودی کی ان تقریروں کا 14/اگست کو نوٹس لیا جبکہ اس نے کراچی کے ایک جلسہ عام میں مودودی کا نام لئے بغیر ''ایک مولانا'' کے اس الزام کی تردید کی کہ اس کے دورہ امریکہ پر 25 لاکھ روپے خرچ ہوئے ہیں۔ اس نے کہا اس ''الزام میں پانچ فیصدی بھی سچائی نہیں ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس قسم کے لوگ سچ اور جھوٹ کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ عوام الناس علما کا احترام کرتے ہیں لیکن اس قسم کے مولانا علما کی عزت کو نقصان پہنچاتے ہیں...... اس مولانا نے یہ بھی الزام عائد کیا کہ ہم پاکستان کو اسلامی مملکت نہیں بنا رہے ہیں۔ میں اس سے پوچھتا ہوں کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اسلامی مملکت کی بنیادیں جھوٹ پر رکھی جائیں؟ یہ لوگ پاکستان کی نیشنل ویمنز گارڈز پر بھی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا وہ چاہتے ہیں کہ پاکستان کی عورتیں گھروں کی چاردیواری میں مقید رہیں؟ کیا ان کی خواہش ہے کہ پاکستان کی چار کروڑ عورتیں اپنی عزت وآبرو کی حفاظت نہ کریں اور مفلوج ہو کر رہ جائیں؟''[42]
لیاقت علی خان کی یہ تقریر مودودی کے الزامات کا مسکت جواب نہیں تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ لیاقت نے قرارداد مقاصد کی منظوری کے بعد پاکستان کو مُلّاؤں کے تصور کی اسلامی مملکت بنانے کے لئے کوئی نمایاں کاروائی نہیں کی تھی۔ وہ اسلامی طرز زندگی کے نام پر مغربی طرز زندگی کو فروغ دے رہا تھا اور اس کی بیگم عورتوں کی مختلف تنظیموں کی سرگرمیوں کے ذریعے ابوالاعلیٰ مودودی جیسے مُلّاؤں

کے ایمان کو متزلزل کر رہی تھی۔ پنجاب کی مسجدوں میں بیگم لیاقت علی کی ''بے حجابی'' کا عام تذکرہ ہوتا تھا اور بعض اخبارات میں اس کے ''غیر شرعی لباس'' پر بڑے سوقیانہ حملے ہوتے تھے۔

پنجاب کی یہ صورتحال یقیناً ابوالاعلیٰ مودودی کے حق میں تھی اور لیاقت علی خان کے خلاف تھی۔ چنانچہ مودودی نے سندھ، بلوچستان اور ملتان ڈویژن کا دورہ کرنے کے بعد 17 راگست کو لاہور میں ایک انٹرویو کے دوران اپنے اس اعلان کا اعادہ کیا کہ اس کی جماعت پنجاب اسمبلی کے آئندہ انتخابات میں حصہ لے گی۔ جماعت ہر اس امیدوار کی حمایت کرے گی جو صالح ہوگا خواہ وہ جماعت اسلامی کا رکن ہو یا نہ ہو۔ جماعت ایک مثالی اسلامی جمہوریت کے حق میں ہے اس لئے وہ ہر قسم کی آمریت کی سرتوڑ مخالفت کرے گی۔ تاہم جماعت نے 21 راگست کو کمیونسٹ پارٹی اور عوامی لیگ کے ساتھ مل کر لاہور میں ایک جلسہ عام منعقد کیا جس میں مطالبہ کیا گیا کہ رائے دہندگان کی موجودہ ناقص فہرستیں مسترد کر دی جائیں اور ان کے بجائے نئی فہرستوں کی ترتیب واشاعت کا انتظام کیا جائے۔ 10 ر ستمبر کو جماعت اسلامی، عوامی مسلم لیگ اور کمیونسٹ پارٹی کے ایک مشترکہ وفد نے گورنر نشتر سے دو گھنٹے تک ملاقات کر کے اس مطالبہ کا اعادہ کیا اور یہ یقین دہانی حاصل کی کہ صوبائی انتخابات بالکل آزادانہ ہوں گے اور پھر 15 ر ستمبر کو جماعت نے ''یوم کشمیر'' کے جلسوں میں بڑی سرگرمی سے شرکت کی اور مودودی نے ایک بیان میں کہا کہ ''کشمیر کے معاملے میں سر اوون ڈکسن (Owen Dixon) کی ناکامی نے ثابت کر دکھلایا ہے کہ آج دنیا میں ہر مسئلہ کا حل فقط طاقت ہے۔''

لیاقت۔ دولتانہ دھڑے اور مودودی کے مابین بیان بازی...... پنجاب کے انتخابات میں لیگ اور اس کے مخالفوں، دونوں نے اسلام کو استعمال کیا

مودودی کے اس بیان سے تقریباً ایک ہفتہ قبل پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ کو لاہور ہائیکورٹ کے ایک ٹریبونل نے پروڈا کے تحت عائد کردہ الزامات سے بری کر دیا تھا۔ اس طرح پنجاب میں ممدوٹی عناصر یعنی درمیانہ طبقہ کے پنجابی شاونسٹوں اور جماعت اسلامی کے درمیان انتخابی گٹھ جوڑ کی راہ ہموار ہو گئی تھی اور دولتانوی عناصر یعنی بڑے بڑے زمیندار یہ صورتحال پیدا ہونے سے قدرتی طور پر پریشان ہوئے تھے۔ چنانچہ 16 ر ستمبر کو

ممتاز دولتانہ نے لائل پور میں ایک انتخابی جلسے کو خطاب کرتے ہوئے پہلی مرتبہ جماعت اسلامی کو ہدف تنقید بنایا۔ اس نے کہا کہ ''مسلم لیگ کے مخالفوں میں سب سے بلند آہنگ جماعت اسلامی ہے۔ اس جماعت کا کہنا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے اس لئے اس کا آئین جماعت اسلامی کو بنانا چاہیے۔ میں پوچھتا ہوں کہ جس وقت حصول پاکستان کی جدوجہد جاری تھی تو مولانا مودودی کیا کر رہے تھے۔ وہ پاکستان کی مخالفت اسلام کے نام پر کر رہے تھے۔ آج اس اسلام کو وہ پاکستان میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہر سمجھدار آدمی اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ یا تو یہ ''اسلام'' مودودی صاحب کے اپنے دماغ کی اختراع ہے یا پھر مولانا مودودی محض ابن الوقت ہیں۔''[43] دولتانہ کی اس تقریر کے تین چار دن بعد سیالکوٹ میں مولانا مودودی نے ایک جلسہ عام میں جب ایک سوال کے جواب میں تسلیم کیا کہ اس نے تقسیم ہند کی مخالفت کی تھی تو حاضرین نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ امروز کی رپورٹ کے مطابق ''حاضرین نے پاکستان زندہ باد اور غداران پاکستان مردہ باد کے نعرے لگائے۔''

اسی دن سیالکوٹ کے ایک سکول ماسٹر مولوی محمد صادق بی۔ اے نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ ''وہ خدا کی طرف سے نبی مقرر کیا گیا ہے۔ وہ مسیح موعود ہے اور اسے باقاعدہ الہام ہوا ہے۔ خدا کی طرف سے اسے چار ہزار فرشتے مدد کے لئے دیئے گئے ہیں۔ اس نے کہا کہ خدا دراصل مسلم لیگ کے ساتھ ہے۔ انتخابات سے پہلے ان فرشتوں نے لیگ کے لیڈروں کو عوام سے پھر روشناس کروا دیا ہے۔'' ظاہر ہے کہ مولوی محمد صادق کی جانب سے یہ اعلان مذہبی دیوانگی کی انتہا تھی لیکن اس کی یہ دیوانگی ابوالاعلیٰ مودودی اور بعض دوسرے مُلّاؤں کی دیوانگی سے بہت زیادہ نہیں تھی جو یہ فتوے صادر کرتے تھے کہ پاکستان کی اسلامی مملکت میں کسی غیر مسلم کو کوئی کلیدی عہدہ نہیں دیا جا سکتا۔ لونڈی غلام کی خرید وفروخت ہو سکتی ہے، جاگیرداری اسلام کے عین مطابق ہے۔ غیر مسلموں اور عورتوں کو مساوی حقوق نہیں دیئے جا سکتے۔ تصویر کشی، فلم سازی، موسیقی، اور شاعری حرام ہے وغیرہ وغیرہ۔

مولوی محمد صادق کی مذہبی دیوانگی لیاقت علی خان جیسے ان ''جدیدیت پسندوں'' کی دیوانگی سے بھی بہت زیادہ نہیں تھی جو یورپ اور امریکہ کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کی ہر شے کو 1350 سال پہلے کے اسلامی اصولوں کے سانچے میں ڈھالنے کی مضحکہ خیز کوشش کرتے

تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر مغرب کے نظام سیاست، نظام معیشت اور نظام معاشرت پر قرارداد مقاصد کے ذریعے اسلام کا لیبل لگا دیا گیا تو پاکستان کے مُلّاؤں کے منہ بند ہو جائیں گے اور عوام الناس یہ باور کر لیں گے کہ پاکستان اسلامی مملکت بن گیا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اسلام کا نام لینے سے نہ صرف زمینداری نظام کو برقرار رکھا جاسکے گا، نہ صرف سندھ، بلوچستان، سرحد اور مشرقی بنگال کی پسماندہ قومیتوں کے حقوق کو غصب کیا جا سکے گا بلکہ اس طرح غیر ملکی سامراجی آقاؤں کے عالمی مفاد کو بھی فروغ دیا جاسکے گا۔

باب: 11

آئین سازی کے لئے بنیادی اصولوں اور بنیادی حقوق کی رپورٹوں کو مُلّاؤں نے خلاف اسلام قرار دیا

آئین سازی کے لئے بنیادی اصولوں کی کمیٹی اور بنیادی حقوق کی رپورٹوں میں اسلامی تمہید کے بعد سیکولر جمہوریت پیش کی گئی

وزیراعظم لیاقت علی خان نے 28 ستمبر کو دستور ساز اسمبلی میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی اور بنیادی حقوق کی کمیٹی کی رپورٹیں پیش کیں۔ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کی ابتدا تو اس طرح کی گئی تھی کہ (1) قرارداد مقاصد کو حکومت کی پالیسی کے سب سے بڑے اصول کے طور پر آئین میں شامل کر دیا جائے بشرطیکہ وہ بنیادی حقوق کو آئین میں مناسب جگہ دینے کے مسئلہ پر اثر نہ ڈالے۔ (2) حکومت کی سرگرمیوں کے دائرے میں ایسے اقدامات کئے جائیں تاکہ مسلمان اپنی زندگی کو قرارداد مقاصد کے سانچے میں ڈھال سکیں اور ان کی مشعل راہ قرآن حکیم اور سنت نبوی ہی ہو۔ لیکن اس کے آگے اس رپورٹ میں جو کچھ لکھا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ پاکستان میں سیکولر وفاقی نظام حکومت رائج ہوگا۔ سربراہ حکومت کا انتخاب مرکزی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں کیا جائے گا۔ یہ سربراہ مملکت ایسے شخص کو وزیراعظم مقرر کرے گا جسے پارلیمنٹ کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہوگا۔ باقی ماندہ وزراء کا تقرر وزیراعظم کے مشورے کے مطابق عمل میں آئے گا۔ سربراہ مملکت وزارت کے مشورے کے مطابق کام کرنے کا پابند ہوگا۔ ایک مرکزی پارلیمنٹ قائم کی جائے گی جو دو ایوانوں پر مشتمل ہوگی۔ (1) ہاؤس آف یونٹس (جو یونٹوں کی مجالس قانون ساز اسمبلیوں کی نمائندگی کے فرائض انجام دے گی)۔

(2) ہاؤس آف پیپلز (جسے عوام منتخب کریں گے) ایوان اعلیٰ (ہاؤس آف یونٹس) میں تمام موجودہ صوبوں، جن میں بلوچستان بھی شامل ہے کی مساوی نمائندگی ہوگی۔ اگرچہ مرکزی انتظام سے تعلق رکھنے والے علاقوں کو ہاؤس آف یونٹس میں نمائندگی نہیں دی جاسکتی تاہم ان علاقوں کو ہاؤس آف پیپلز (ایوان زیریں) میں دوسرے صوبوں کی بنیاد کے مطابق نمائندگی ملے گی۔ دونوں ایوانوں کا مشترکہ اجلاس حسب ذیل صورتوں میں منعقد ہوگا۔

1۔ جب دونوں میں کسی وجہ سے اختلاف پیدا ہوجائے گا

2۔ سربراہ مملکت کے انتخاب یا اس کی برطرفی کا معاملہ پیش ہوگا۔

3۔ بجٹ اور دوسرے مالی بلوں پر غور مطلوب ہوگا۔

4۔ کابینہ میں عدم اعتماد کی تحریک پر غور کرنا ہوگا۔

پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے اختیارات مساوی ہوں گے اور اگر کسی مسئلہ پر دونوں ایوانوں میں جھگڑا شروع ہوجائے تو اس صورت میں دونوں ایوانوں کا مشترکہ اجلاس طلب کیا جائے گا تاکہ کوئی مناسب فیصلہ کیا جاسکے۔ صوبوں کے صدروں کے اختیارات اپنے اپنے صوبوں میں سربراہ مملکت کے اختیارات کے تقریباً مماثل ہوں گے اور وہ سربراہ مملکت کی منشا تک اپنے عہدہ پر فائز رہیں گے۔ اگر صوبائی صدر صوبائی وزراء کو برطرف کریں گے تو اس اختیار کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکے گا لیکن صوبائی وزراء صوبائی وزیر اعلیٰ کے مشورہ پر مقرر کئے جائیں گے جو اپنے وزراء کے ساتھ صوبائی مجلس قانون کے سامنے جوابدہ ہوگا۔ صوبوں اور مرکز کے درمیان اختیارات کی تقسیم تین طرح ہوگی۔

1۔ ایسے امور جو بالکل مرکز کے ماتحت ہوں گے۔

2۔ ایسے امور جو بالکل صوبوں کے ماتحت ہوں گے۔

3۔ اور ایسے امور جو صوبائی حکومتوں اور مرکزی حکومتوں دونوں کے ماتحت ہوں گے اور بقیہ اختیارات صرف مرکز کو حاصل رہیں گے۔

دفاع، تعلقات خارجہ اور رسل ورسائل کے علاوہ مرکزی امور میں صنعتی ترقی، معدنی وسائل، زکوٰۃ، سینماٹوگراف فلموں کی نمائش کی اجازت اور ملک کے کسی حصے میں ہنگامی صورتحال پیدا ہونے پر ضروری اقدام اٹھانے کے اختیارات شامل ہیں۔ اگر صوبائی قانون اور مرکزی

قانون متصادم ہوں گے تو مرکزی قانون کو ترجیح دی جائے گی۔ صوبوں کو اس کا اختیار دیا جائے گا کہ وہ وفاقی عدالت کے ذریعہ مرکزی قانون کی توضیح کرائیں۔ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہو گی۔[1] بنیادی حقوق کی کمیٹی کی رپورٹ کا خلاصہ یہ تھا کہ پاکستان کے ہر شہری کو تقریر، اظہار خیال، باہم ملنے جلنے، اسلحہ کے بغیر پر امن اجتماع، کوئی پیشہ، تجارت یا کاروبار شروع کرنے اور جائیداد کی خرید و فروخت کی آزادی ہوگی۔ ہر شخص کو آزادی ضمیر حاصل ہوگی۔ وہ کسی بھی مذہب پر عمل پیرا ہو سکے گا اور اس کی تبلیغ کر سکے گا بشرطیکہ یہ امن عامہ اور اخلاق کے منافی نہ ہو۔ پاکستان کے تمام شہری قانون کی نظر میں برابر سمجھے جائیں گے۔ ہر شخص کو قانون کا مساوی تحفظ حاصل ہوگا اور ہر اہل اور مستحق شہری کو بلا امتیاز مذہب و ملت اور نسل، جنس اور جائے پیدائش کا لحاظ کئے بغیر سرکاری عہدہ دیا جائے گا۔ اقلیت یا کسی گروہ کے لئے مناسب نمائندگی دینے کے مقصد سے ملازمتیں محفوظ رکھنے کی گنجائش رکھی جائے گی۔ ہائیکورٹ میں حبس بے جا کی درخواست دائر کرنے کا حق ہر شہری کو بدستور حاصل رہے گا سوائے ان حالات کے جب ملک کی سلامتی کو اندرونی یا بیرونی خطرات کا سامنا ہو یا ہنگامی حالت ہو۔ غلام داری کی اجازت نہیں ہوگی۔[2]

تعلیمات اسلامیہ بورڈ کی سفارشات میں مغربی جمہوریت کی نفی کی گئی اور قانون ساز اداروں پر مُلّاؤں کی بالادستی کا مطالبہ کیا گیا

لیاقت علی خان نے دستور ساز اسمبلی میں یہ رپورٹیں پیش کرنے سے قبل تقریباً ایک ہفتہ تک نتھیا گلی کی خوشگوار فضا میں ان پر اچھی طرح غور کیا تھا۔ اس موقع پر اس کے پاس تعلیمات اسلامیہ بورڈ کی وہ تین رپورٹیں بھی موجود تھیں جو بورڈ نے 10 / اپریل 1950ء، 27 / جولائی 1950ء اور 7 / اگست 1950ء کو پیش کی تھیں۔ ان رپورٹوں کا خلاصہ یہ تھا کہ چونکہ قرارداد مقاصد کی منظوری کے بعد پاکستان ایک اسلامی مملکت یعنی نظریاتی مملکت بن گیا ہے اور اس کی حیثیت ایک قومی مملکت کی نہیں ہے اس لئے اس میں قرآن و سنت کی فرمانروائی ہوگی۔ جیسا کہ مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم نے 9 / مارچ 1949ء کو قرارداد مقاصد پر بحث کے دوران اپنی تقریر میں کہا تھا، اگر کسی مملکت کی بنیاد بعض اصولوں پر ہے تو ظاہر ہے کہ اس مملکت کو صرف وہی لوگ چلا سکتے ہیں جو ان اصولوں کو مانتے ہوں۔ جو افراد ان اصولوں کو نہیں مانتے ان سے انتظامی مشینری

میں تو کام لیا جا سکتا ہے لیکن انہیں مملکت کی عمومی پالیسی کی تشکیل کا کام نہیں دیا جا سکتا اور نہ ہی انہیں مملکت کی حفاظت اور سلامتی کے اہم معاملات سپرد کئے جا سکتے ہیں۔ لہٰذا بورڈ کو امید ہے کہ قرارداد مقاصد کے منطقی نتیجے کے طور پر کسی مناسب موقع پر آئین میں یہ شق شامل کی جائے گی کہ مملکت کا جو قانون یا حکم شریعت کے منافی ہوگا اسے کالعدم تصور کیا جائے گا اور شریعت کے ماہرین کی کمیٹی یہ قطعی فیصلہ کرے گی کہ متعلقہ قانون شریعت کے مطابق ہے یا نہیں ہے۔ اسلامی روایات کے مطابق ملک میں صدارتی نظام حکومت رائج ہونا چاہیے۔ اسلام کی 1350ء سال کی تاریخ میں عنان اقتدار ہمیشہ ایک فرد کے ہاتھ میں ہی رہی ہے جو ملت کے روبرو جوابدہ ہوتا تھا لہٰذا جس آئین کی بنیاد اسلامی مسلمات پر ہوگی اس میں اسلامی تاریخ کی اس روایت کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بالخصوص اسلام کے زریں عہد میں اس روایت کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اب ہمیں اس روایت سے انحراف کر کے دوسروں کی روایت پر عمل کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ سربراہ مملکت صرف مسلمان ہی ہوسکتا ہے۔ اس کا مرد ہونا بھی ضروری ہے۔ (گویا کوئی عورت سربراہ مملکت کے عہدہ پر فائز نہیں ہوسکتی) اور اس کو دینی علوم پر پوری طرح دسترس بھی حاصل ہونی چاہیے۔ ماہرین شریعت کی کمیٹی کے ارکان بلحاظ عہدہ ایوان بالا کے رکن ہوں گے اور جب دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں سربراہ مملکت کا انتخاب ہوگا تو رائے شماری میں کمیٹی کے ارکان کو بھی حصہ لینا چاہیے۔ سربراہ مملکت کو قرآن وسنت کی حدود کے اندر کلی اختیارات حاصل ہونے چاہئیں البتہ وہ قانون سازی اور عاملہ اور عدلیہ کے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اپنے لئے مشاورتی کونسل کی تشکیل کر سکتا ہے۔ قانون سازی کے کام کے لئے دو ایوانی مقننہ ہو تو یہ امر شریعت کے منافی نہیں ہوگا۔ سربراہ مملکت اور ایگزیکٹو کونسل کے درمیان کسی مسئلہ پر اختلاف پیدا ہو جائے تو سربراہ مملکت کا فیصلہ حتمی تصور ہوگا لیکن اگر یہ شبہ ہو کہ اس کا فیصلہ شریعت کے منافی ہے تو پھر متنازعہ مسئلہ ماہرین شریعت کی کمیٹی کے سپرد کیا جائے گا اور اس کمیٹی کے فیصلے کو قطعیت حاصل ہوگی۔ سربراہ مملکت کو جمعے اور عیدین کی نمازوں کی امامت کرنی چاہیے۔ اسے ایک جوڈیشل کونسل مقرر کرنی چاہیے تاکہ اس کونسل کے مشورے کے مطابق مملکت کی جوڈیشل مشینری کو کنٹرول میں رکھا جا سکے اور اسے مناسب طریقے سے چلایا جا سکے۔ اسے ایک کلچرل کونسل بھی قائم کرنی چاہیے تاکہ اس کونسل کے مشورے کے مطابق وہ ملک کے اندر اور باہر اسلامی

طرز زندگی کی تبلیغ کر سکے۔ سربراہ مملکت کو اپنے عہدے کا حلف اٹھاتے وقت یہ عہد کرنا چاہیے کہ وہ خود اسلام کے احکامات کے مطابق زندگی بسر کرے گا، اسلام کی عظمت کے لئے اسلامی خطوط پر پاکستان کی ترقی وخوشحالی کے لئے صدق دل سے کام کرے گا اور اس امر کو یقینی بنانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا کہ مملکت کی ساری مشینری کو شریعت کے مطابق چلایا جائے۔ جہاں تک قانون ساز اداروں کے اختیار اور کام کا تعلق ہے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ایک کلی طور پر جمہوری مملکت اور اسلامی مملکت میں فرق یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں اللہ کے احکامات کی تعمیل بنیادی حیثیت کی حامل ہوتی ہے اور عوام کی منشا کی تعمیل کو ثانوی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں کلی طور پر جمہوری مملکت کا نصب العین یہ ہوتا ہے کو عوام کی منشا کی غیر مشروط طور پر تعمیل کی جائے۔ اسلامی مملکت میں قانون ساز ادارے کا اصلی کام یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کے مطابق قانون سازی کرے اور اگر اسلام کی تعبیر وتشریح کے بارے میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اس کا فیصلہ اہل دانش و کردار سے کروایا جائے۔ اصولی طور پر اسلامی مملکت میں کسی غیر مسلم کو قانون سازی کے کام میں شریک نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم بورڈ اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں اور عصر حاضر کے تقاضوں کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اگر اسلامی احکامات اور اسلامی تقاضوں کے متاثر ہونے کا امکان نہ ہو تو غیر مسلموں کو قانون ساز ادارے میں شامل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا تاکہ وہ نہ صرف اپنے فرقہ کے مفادات اور جذبات کی نمائندگی کر سکیں بلکہ وہ ملک کے عمومی مفادات سے متعلقہ مسائل کے بارے میں بھی اپنی رائے کا اظہار کر سکیں۔ اسلام کے مطابق عورت کا اصلی کام یہ ہے کہ وہ اپنے گھر کا انتظام کرے اور بچوں کی اس طرح پرورش کرے کہ وہ اچھے مسلمانوں کی طرح زندگی بسر کر سکیں۔ اگر کسی ہنگامی حالت میں عورت کو گھر سے باہر جانا ہی پڑے تو یہ پابندی ہے کہ وہ نمائشی زیب وزینت سے پرہیز کرے، زیادہ خوشبو نہ لگائے۔ اس طرح نہ چلے کہ اس کے زیورات کی جھنکار سنائی دے۔ صرف اتنی ہی بات کرے جتنی کہ ضروری ہو۔ اپنے آپ کو ڈھانپ کر رکھے اور میٹھی میٹھی باتیں نہ کرے وغیرہ وغیرہ۔ ان اسلامی احکامات کی روشنی میں مناسب یہی ہوگا کہ اگر عورت کو قانون ساز ادارے میں شامل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو اس کی رکنیت کے لئے یہ شرائط ہونی چاہئیں کہ (1) اس کی عمر پچاس سال تک پہنچ گئی ہو۔ اور (2) وہ شریعت کے مطابق پردہ کرے۔[3]

ظاہر ہے کہ تعلیمات اسلامیہ بورڈ کے ان اسلامی مشوروں کا لیاقت علی خان کے اس ''اسلامی طرز زندگی'' سے جس کی وہ مئی۔ جون میں امریکہ اور کینیڈا تبلیغ کرتا رہا تھا کوئی تعلق نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے 28 ستمبر کو دستور ساز اسمبلی میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی اور بنیادی حقوق کی کمیٹی کی جو رپورٹیں پیش کیں وہ اس کے اپنے ''اسلامی نظریہ زندگی'' کے تو عین مطابق تھیں لیکن وہ علما کے اسلامی تصور کے سراسر منافی تھیں۔ مزید برآں وہ مغرب کے وفاقی نظام حکومت سے بھی مطابقت نہیں رکھتی تھیں اور ان میں پاکستان کے جغرافیہ کے اس لاثانی پہلو کو بھی نظر انداز کیا گیا تھا کہ ملک کے دونوں حصوں کے درمیان دس بارہ سو میل کا فاصلہ تھا۔

بنیادی اصولوں اور بنیادی حقوق کی رپورٹوں میں مشرقی بنگال کی مخصوص جغرافیائی اور قومیتی حیثیت کو نظر انداز کرنے پر بنگالی عوام کا احتجاج

ان رپورٹوں کے خلاف سب سے پہلے زوردار آواز مشرقی بنگال سے اٹھی کیونکہ بقول پاکستان آبزرور ''بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کا متن پڑھ کر ڈھاکہ اور مشرقی بنگال کے دوسرے علاقوں کے ہر مکتب فکر اور ہر شعبہ زندگی کے لوگ ششدر رہ گئے تھے۔ ان لوگوں میں اعلیٰ حکام، پروفیسر، اساتذہ، طلبا، ڈاکٹر اور پولیس کے اہلکار بھی شامل تھے۔ ان کا پہلا ردعمل حیرانی و پریشانی کا تھا۔''[4] دو ایک دن کے بعد وہ فوری صدمے کی کیفیت سے باہر نکلے تو ان کے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پر جو اعتراضات تھے ان میں ''اسلامی اعتراض'' کوئی نہیں تھا۔ مختصراً ان کے اعتراضات یہ تھے کہ (1) اس رپورٹ میں مشرقی بنگال کو مغربی پاکستان کے، بلوچستان سمیت، سارے صوبوں کی طرح محض ایک صوبہ قرار دیا گیا ہے حالانکہ جغرافیائی، تاریخی، ثقافتی اور نسلی لحاظ سے مشرقی بنگال کی حیثیت پاکستان کے ایک مشرقی بازو کی ہے۔ (2) اگرچہ مشرقی بنگال کی آبادی مغربی پاکستان کی ساری آبادی سے زیادہ ہے تاہم مرکزی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں اس کے نمائندے اقلیت میں ہوں گے لہٰذا مشرقی بنگال کی حیثیت عملاً مغربی پاکستان کی ایک نوآبادی کی سی ہوگی۔ ایوان بالا اور ایوان زیریں کے ارکان کی تعداد کا یقین نہ ہونے کی وجہ سے اور دونوں ایوانوں کے اختیارات برابر ہونے کی وجہ سے اس خدشہ کو تقویت ملتی ہے۔ (3) بظاہر رپورٹ میں وفاقی پارلیمانی نظام حکومت کی سفارش کی گئی ہے لیکن

صوبوں اور مرکز کے درمیان اختیارات کی تقسیم کی جو تجویز کی گئی ہے اگر اس پر عمل ہوا تو پاکستان میں بہت حد تک وحدانی نظام حکومت ہوگا اور مشرقی بنگال سمیت سارے صوبوں کی حیثیت میونسپلٹیوں سے زیادہ نہیں ہوگی۔(4) مشرقی بنگال کے عوام کے اس مطالبہ کو نظرانداز کر دیا گیا ہے کہ اردو کے ساتھ بنگالی زبان کو بھی سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ ان اعتراضات پر عوامی احتجاج نے بہت جلد ایک ایسی زبردست ایجی ٹیشن کی صورت اختیار کرلی کہ وہاں کے بہت سے سیاسی مبصروں کو پاکستان کے دونوں حصوں کی یکجہتی کے بارے میں خطرہ لاحق ہوگیا۔

بنیادی اصولوں اور بنیادی حقوق کی رپورٹوں پر کراچی اور پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے تعلیم یافتہ مگر دقیانوسی حلقوں اور مُلّاؤں کی جانب سے اسلام اور قرارداد مقاصد کے حوالے سے شدید مخالفت

لیکن مغربی پاکستان، بالخصوص پنجاب کے اخباری، سیاسی اور مذہبی حلقوں کو مشرقی بنگالیوں کی اس ایجی ٹیشن کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ انہیں اعتراض تھا تو صرف یہ کہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی اور بنیادی حقوق کی کمیٹی کی رپورٹوں کا ''اسلام یا اسلام کے اصولوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ اسلام کا امریکن ایڈیشن ہے اور وہ بھی سستا ایڈیشن۔ ان رپورٹوں کی بنیاد قرآن حکیم پر نہیں بلکہ امریکن کتاب دستور پر ہے۔ قرارداد مقاصد کو تبرک کے طور پر آئین میں شامل کر لئے جانے کی مشروط سفارش کی گئی ہے مگر شرط ایسی ہے کہ اس کے بعد قرآن کے نام پر منظور کردہ قرارداد مقاصد کی حیثیت ایوان حکومت میں وہی رہ جائے گی جو ہمارے اکثر ارباب اقتدار کے گھروں میں خود قرآن پاک کی حیثیت ہے۔ یعنی برکت کے لئے رکھا جائے...... اگر آئین امریکہ، آئین ترکی، آئین فرانس اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء یہ چار کتابیں کسی ذہین آدمی کے سپرد کر دی جائیں تو ہمیں یقین ہے کہ وہ دو دن میں ان رپورٹوں سے بہتر رپورٹ مرتب کر دے گا...... بنیادی حقوق کی کمیٹی دفعہ 9 (الف) کی رو سے شہری کو آزادی تقریر اور آزادی رائے کا حق تو دیتی ہے مگر اسی دفعہ 9(2) کی رو سے یہ شرط عائد کر کے کہ حکومت کو حق حاصل ہوگا کہ وہ پبلک مفاد یا پبلک آرڈر کی خاطر ان میں سے کسی آزادی کو محدود کر دے یا ان پر پابندیاں عائد کر دے، یہ حق اس

سے واپس لے لیتی ہے۔ پبلک آرڈر اور پبلک مفاد ایسی مبہم اور وسیع اصطلاحات ہیں کہ زندگی کا ہر شعبہ ان کی لپیٹ میں آجاتا ہے اور حکومت جب چاہے آزادی تقریر اور اظہار رائے کی آزادی کو اس بہانے سے سلب کر سکتی ہے۔ کمیٹی کی سفارش یہ ہے کہ ''سخت ایمرجنسی'' کی صورت میں شہری کا ہیبئس کرپس (حبس بے جا) حق بھی معطل ہو جائے گا یعنی سخت ایمرجنسی کے نام پر حکومت جس شخص کو چاہے مقدمہ چلائے بغیر جیل میں ڈال دے۔ وہ ہیبئس کرپس درخواست پیش کرنے کا مجاز نہیں ہوگا اور ایمرجنسی کا فیصلہ کون کرے گا؟ وہی ایگزیکٹو، جو ایک سرکاری افسر کو جائز نکتہ چینی سے بچانے کے لئے پبلک سیفٹی ایکٹ کے استعمال میں بھی کوئی عار نہیں محسوس کرتی۔ بنیادی حقوق کی کمیٹی کی سفارشات سب کے سامنے ہیں۔ انہیں اسلام کے اصولوں پر جانچنے کی کوشش تو بہت بڑی جسارت ہوگی۔ برطانیہ، امریکہ اور یو۔ این کے معیار پر بھی جانچ لیجئے یہ ان پر بھی قطعاً پوری نہیں اترتیں۔''[5]

5؍ اکتوبر کو آل پاکستان پولیٹیکل سائنس کانفرنس کے سیکرٹری ڈاکٹر عزیز احمد نے ایک انٹرویو میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی اور بنیادی حقوق کی کمیٹی نے صبر آزما تاخیر کے بعد جو سفارشات پیش کی ہیں، اگر دستور ساز اسمبلی نے بدقسمتی سے ان پر مہر تصدیق ثبت کر دی تو اسلامی نظام کے وعدے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ ان کمیٹیوں کی رپورٹوں میں نہ تو حکومت کا نام بتایا گیا ہے اور نہ ہی اسلامی سیاسی اصولوں کو اختیار کرنے کے عزم کا اظہار کیا گیا ہے۔ اسلامی حکومت کی بنیاد ذیل کے تین اصولوں پر ہوتی ہے:

1۔ شریعت کی فضیلت

2۔ امیر مملکت۔ حقیقی عاملہ

3۔ خودمختار عدلیہ۔ ثالث کی حیثیت سے ہو۔

مملکت کا نام ''جمہوریہ اسلامیہ پاکستان'' ہونا چاہیے اور صدر مملکت کا خطاب ''امیر پاکستان'' ہونا چاہیے۔ مجلس مقننہ ایوان بالا اور ایوان عام پر مشتمل ہونی چاہیے۔ امیر مملکت کی مجلس مشاورت (وزارت) کو مجلس شوریٰ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اسلامی تخیل کے مطابق صدر مملکت کا انتخاب براہ راست عوام کرتے ہیں۔ اسلامی آئین میں امیر مملکت اور رائے دہندگان کے متعلق شرائط کا واضح طور پر ذکر موجود ہے۔ کسی رائے دہندہ کے لئے ضروری ہے کہ:

1۔ وہ اعلیٰ اخلاق کا حامل ہو

2۔ وہ اسلامی قانون سے واقف ہو۔

3۔ امیدواروں کے درمیان تمیز کر سکتا ہو۔

اور امیر مملکت کے متعلق شرائط یہ ہیں کہ:

1۔ وہ اعلیٰ اخلاق کا حامل ہو۔

2۔ اسے شریعت پر مکمل عبور حاصل ہو۔

3۔ مملکت کی سرحدوں کی حفاظت کرنے کا اہل ہو۔

4۔ اس نے ملت اسلامیہ کی بے انتہا خدمت کی ہو۔

عدلیہ مکمل طور پر خود مختار ہونی چاہیے۔ فیڈرل ججوں کا تقرر امیر کرے اور ان کے انتخاب میں خاص احتیاط کی جائے۔ جج صاحبان خود مختار، غیر جانبدار اور شریعت سے کماحقہٗ واقف ہوں۔ عدلیہ امیر مملکت کے ہر منظور کردہ ''بل'' کو شریعت کے خلاف ہونے کی وجہ سے ناقابل عمل قرار دے سکتی ہے۔ اگر پاکستان کا آئین متذکرہ اصولوں پر مبنی نہیں ہوگا تو اس آئین پر اسلام کا لیبل لگانا انتہائی ستم ظریفی ہوگی۔''[6]

ڈاکٹر عزیز احمد پنجاب یونیورسٹی کے پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ تھا اور وہ مارچ 1950ء میں پہلی آل پاکستان پولیٹیکل سائنس کانفرنس کا منتظم اعلیٰ تھا۔ اس لحاظ سے اس سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ آئینی وسیاسی ڈھانچے کے بارے میں ایسے نظریات کا حامل ہوگا کہ جن پر عمل کرنے سے پاکستان فی الحقیقت ترقی اور خوشحالی کی راہ پر چل نکلے گا۔ لیکن اس سے یہ توقع عبث تھی۔ وہ ''ڈاکٹر'' برائے نام تھا اور اس کی جدید علم سیاسیات اور علم تاریخ سے واقفیت واجبی تھی۔ وہ دراصل نظریاتی طور پر نہایت قدامت پرست مُلاّ تھا۔ وہ قرون وسطیٰ کے استبدادی خلافتی نظام کو اسلامی نظام قرار دیتا تھا اور وہی نظام پاکستان میں رائج کرنا چاہتا تھا۔ اس کے اس قسم کے ''اسلامی نظریے'' کے حامل ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان دنوں پنجاب یونیورسٹی کا وائس چانسلر ڈاکٹر عمر حیات ملک تھا جو نظریاتی لحاظ سے قدامت پرست مُلاّؤں کی صف اول میں تھا۔ بظاہر ڈاکٹر عزیز احمد کا ''اسلامی نظریہ'' یہ تھا کہ اگر وہ وائس چانسلر کا منظور نظر رہے تو پاکستان کی ترقی وخوشحالی کی راہیں کھلیں یا نہ کھلیں اس کی اپنی ذاتی ترقی وخوشحالی کی راہیں کھلی رہیں گی۔ مغربی

پاکستان میں، بالخصوص کراچی اور پنجاب میں ایسے پروفیسروں اور لیکچراروں کی تعداد کم نہیں تھی جو اپنی سوچ کے لحاظ سے دراصل دورافتادہ دیہات کے مُلّا تھے۔ ان میں اور دیہاتی مُلّاؤں میں فرق صرف یہ تھا کہ دیہاتی مُلّا بالعموم مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب ''بہشتی زیور'' کے حوالے دے کر مقامی زبان میں مسئلے مسائل بیان کرتے تھے اور یونیورسٹیوں اور کالجوں کے یہ اساتذہ کرام اپنے ایسے ہی مذہبی خیالات کا اظہار انگریزی زبان میں کرتے تھے۔ گویا فرق صرف زبان کا ہوتا تھا نفس مضمون کا نہیں۔

تاہم 6 /اکتوبر کو دستور ساز اسمبلی میں بنیادی حقوق کی کمیٹی کی رپورٹ کثرت رائے سے منظور کر لی گئی۔ اسمبلی کی اس جلد بازی پر نوائے وقت کا تبصرہ یہ تھا کہ ''جن ممبروں نے خوف خدا کو وزیروں کی خوشنودی پر ترجیح دی اور اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق ان مہلک سفارشات کی مخالفت کی، وہ عوام کے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ گو اسمبلی میں ان کی تعداد صرف 15 تھی اور وزیروں کے اشارے پر ہاتھ اٹھانے والے 37 تھے مگر جہاں تک عام لوگوں کا تعلق ہے یہ حقیقت اب کسی سے مخفی نہیں رہی کہ ملک کی 99 فیصد اکثریت مجوزہ سفارشات کے خلاف ہے۔''
اور نوائے وقت مکتب فکر کے ایک بڑے ستون خواجہ عبدالرحیم کی رائے یہ تھی کہ ''مجوزہ بنیادی حقوق میں قرارداد مقاصد کے خاص اسلامی اور پاکستانی نقشے کو قانونی منظوری نہیں دی گئی۔ بطور مجموعی قرارداد مقاصد کو حکومت کی پالیسی کے مجوزہ بنیادی اصولوں کے دائرۂ عمل میں پھینک دیا گیا ہے۔ بعض حقوق اور آزادیاں بعض موزوں استثناؤں اور تحفظات کے ماتحت ناقابل سماعت عدالت قرار دے دی گئی ہیں۔ اگر قرارداد مقاصد کے خاص طور پر ظاہر کردہ اسلامی حصوں کو محض اخلاقی اور سبق آموز قرار دینا مقصود نہیں تو اس صورت میں لازمی ہے کہ قرآن حکیم کے حق استرداد (ویٹو) کو پاکستان کے آئین کے قابل سماعت بنیادی حقوق میں اہم جگہ دی جائے کیونکہ صرف اس طریقے سے پاکستان کے قیام اور قرارداد مقاصد کی منظوری کی ساکھ رکھی جا سکتی ہے...... بہتر یہ ہوگا کہ قانون کو جائز یا ناجائز قرار دینے کا سوال ایک غیر جانبدار ادارے (بالخصوص جوڈیشری) کے سامنے پیش کیا جائے۔ لیکن آئین میں صاف طور پر مرقوم ہونا چاہیے کہ قرآن حکیم کے حق استرداد کا معاملہ کسی ایسی عدالت میں پیش نہیں کیا جا سکتا جس کا درجہ ہائی کورٹ سے کم ہو...... ہائی کورٹ کے لئے لازمی ہوگا کہ وہ ایسے اسیسروں سے مشورہ لے جو شریعت حقہ کے قوانین سے

اچھی طرح واقف ہوں...... اس کا متبادل طریق کار یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایسے سوالوں کو حل کرنے کے لئے ایک دفعہ رکھی جائے البتہ اس کے طریق کار اور طریق استحصال شہادت کو کچھ نرم کر دینا چاہیے۔''[7] یہ خواجہ عبدالرحیم قیام پاکستان سے قبل انڈین سول سروس کا افسر تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ 32-1930ء کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے دوران انگلستان کی کیمبرج یونیورسٹی کے جن تین چار مسلمان طلبا نے چودھری رحمت علی کے ساتھ مل کر پاکستان کی سکیم بنائی تھی ان میں یہ بھی شامل تھا اور بعد میں قائداعظم کے ساتھ جو معدودے چند افراد قیام پاکستان کے ذمہ دار تھے ان میں بھی وہ شامل تھا۔ پھر 14/اگست 1947ء کو پاکستان ظہور میں آ گیا تو یہ پنجاب کے پہلے وزیراعلیٰ نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ کی غیرسرکاری کابینہ کا رکن تھا اور عملاً یہ صوبہ کے انتظامی امور کا انچارج تھا۔ چنانچہ جب 1949ء میں نواب ممدوٹ کی حکومت کی برطرفی کے بعد اس کے خلاف ہائی کورٹ کے ایک ٹربیونل کے سامنے بدعنوانیوں کے الزامات کے تحت مقدمہ چلایا گیا اور جب ٹربیونل نے اس پر عائد کردہ بعض الزامات کو صحیح قرار دے دیا تو اسے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا تھا۔ تاہم اس کی ''اسلام پسندی'' کا یہ عالم تھا کہ یہ قرآن حکیم کی آڑ لے کر مُلّاؤں کو ملکی قوانین کے بارے میں ویٹو کے اختیارات دینا چاہتا تھا۔ ان مُلّاؤں کو جو غیرمسلموں اور عورتوں کو پاکستان کی اسلامی مملکت میں مساوی حقوق دینے کے خلاف تھے، جو جاگیرداری، زمینداری اور سرمایہ داری پر اسلام کا دلکش غلاف چڑھاتے تھے، جو لونڈی غلام رکھنے کو عین اسلام قرار دیتے تھے اور جن کے فتوے یہ تھے کہ تصویر کشی، فلمسازی، موسیقی، شاعری اور دوسرے فنون لطیفہ از روئے شریعت حرام ہیں۔

9/اکتوبر کو لاہور میں پنجاب کی جمعیت العلمائے اسلام کے زیراہتمام ایسے ہی مُلّاؤں کا جلسہ ہوا جس میں متفقہ طور پر ایک قرارداد کے ذریعے یہ رائے ظاہر کی گئی کہ ''بنیادی اصولوں کی کمیٹی اور بنیادی حقوق کی کمیٹی نے پاکستان کے دستور کے لئے جو سفارشات کی ہیں وہ ان وعدوں، اعلانوں اور فیصلوں پر پوری نہیں اترتیں جو اس وقت تک قومی رہنماؤں اور حکومت پاکستان کے ترجمانوں کی طرف سے ملک وملت کے سامنے کئے گئے ہیں۔ علی الخصوص اس قرارداد مقاصد کو بڑی حد تک بالائے طاق رکھا گیا ہے جو دستور ساز اسمبلی نے 12/مارچ 1949ء کو منظور کی تھی۔ مثلاً بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے اس امر کی کوئی صراحت نہیں کی کہ ریاست

پاکستان ایک اسلامی ریاست ہوگی۔قرارداد مقاصد کو آئندہ دستور کا جزو قرار دینے کی سفارش نہیں کی گئی بلکہ صرف یہ کہا گیا ہے کہ ریاست کی بنیادی پالیسی کے لئے قرارداد مقاصد مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی رہنمائی کرے گی۔ بشرطیکہ وہ دستور کے متعین کردہ بنیادی حقوق کے لئے مضرت رساں نہ ہو۔جس کے یہ معنی ہیں کہ کمیٹی کے نزدیک اسلام کے اور پاکستان کے بنیادی حقوق دو جداگانہ چیزیں ہیں اور دونوں میں تصادم کی صورت میں قرارداد مقاصد کو نظر انداز کیا جائے گا۔کمیٹی کی سفارشات میں اس امر کا کوئی نشان نہیں ملتا کہ آیا پاکستان کی ریاست کے دستور اور قانون کے لئے کتاب وسنت رد یا قبول ہوں گے'' مولانا داؤد غزنوی نے قرارداد کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی کہ ''اسلامی روایات کے مطابق امیر مملکت کا انتخاب براہ راست عوام کے ذریعے ہونا چاہیے۔خلفائے راشدین کا انتخاب جمہور اسلام نے کیا تھا مگر صدر پاکستان کا انتخاب غیر اسلامی طریقہ پر ایوان بالا اور ایوان عام مشترکہ طور پر کریں گے۔'' مولانا محمد علی قصوری نے اپنی تقریر میں وزیر اعلیٰ مشرقی بنگال نورالامین کی اس پارلیمانی تقریر کی مذمت کی جس میں مسٹر نورالامین نے بنیادی حقوق کی کمیٹی کی سفارشات کی تائید کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ان سفارشات سے یہ پروپیگنڈا ختم ہوجائے گا کہ پاکستان ایک مذہبی ریاست ہوگی۔مولانا قصوری نے کہا کہ ''وزیر اعلیٰ مشرقی بنگال کی اس تقریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارباب اقتدار کی یہ نیت ہی نہیں کہ پاکستان کا آئین اسلامی اصولوں پر مبنی ہو۔'' علامہ علاؤالدین صدیقی نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''ارباب اقتدار نے آئین مرتب کرتے ہوئے جمہور اسلام کی خواہش کے مطابق ارباب یثرب سے مہذب ہونے کا سرٹیفکیٹ لینے کی بجائے امریکہ اور برطانیہ کی غیر اسلامی حکومتوں کی نگاہ میں ''متمدن اور مہذب'' بننے کی کوشش کی ہے......ارباب اقتدار نے غیر اسلامی آئین نافذ کرنے کے عزم کا اظہار کرکے علامہ اقبال کی توہین کی ہے۔'' علامہ صدیقی نے حکومت کو متنبہ کیا کہ ''جو آئین علمائے اسلام کے مشورہ کے بغیر امریکہ اور برطانیہ کی تقلید میں مرتب کیا جائے گا، جمہور اسلام اسے ہرگز تسلیم نہیں کریں گے۔''[8]

امیر جماعت اسلامی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے باغ بیرون موچی دروازہ کے اس جلسے میں شرکت نہ کی۔البتہ اس نے اسی دن ایک طویل بیان میں بنیادی اصولوں اور بنیادی حقوق سے متعلقہ دستور ساز اسمبلی کی قائم کردہ کمیٹیوں کی سفارشات پر کڑی نکتہ چینی کی۔اس نے کہا کہ

اب اس امر میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ پاکستان میں اسلامی اور جمہوری حکومت قائم کرنے کے بارے میں ارباب اقتدار کے وعدے حقیقت سے تہی تھے...... کمیٹیوں کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کی صورت میں قرارداد مقاصد ایک بیکار دستاویز بن کر رہ جائے گی جس کے مطابق پاکستان میں تمام اقتدار کا مرکز خدائے قدوس کی ذات کو قرار دیا گیا تھا...... پاکستان کو ایک اسلامی مملکت بنانے کے بلند بانگ دعووں کے باوجود پاکستان عملی طور پر ایک غیر مذہبی مملکت ہے۔'' [9] ابوالاعلیٰ مودودی کی اس رائے سے جماعت احمدیہ کے لاہوری فرقہ کے ترجمان اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کو پورا اتفاق تھا۔ اس اخبار کا تبصرہ یہ تھا کہ ''جو آئین بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کی بنیاد پر بنے گا وہ محض برائے نام اسلامی ہوگا۔ وہ ہیئت کے اعتبار سے غیر مذہبی ہوگا اور اصلاً آمرانہ ہوگا۔ اس رپورٹ میں سربراہ مملکت کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ شہنشاہیت کا تصور ہے۔'' [10]

احراری مُلّاؤں کی اشتعال انگیز تقریریں اور دو احمدیوں کا قتل

سول اینڈ ملٹری گزٹ نے اسی دن ایک ادارتی نوٹ میں نورالامین کی اس تقریر پر بھی اعتراض کیا تھا کہ ''اب یہ پروپیگنڈا بند ہو جائے گا کہ پاکستان ایک مذہبی ریاست ہوگا۔'' لیکن اس اخبار کو یہ پتہ نہیں تھا کہ اگر پاکستان اس کے تصور کے مطابق مذہبی مملکت بن گیا تو اس کے فرقہ کے لئے اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ اس کے اس اداریے سے تقریباً ایک ہفتہ قبل اوکاڑہ کے نزدیک ایک احمدی سکول ماسٹر غلام محمد کو ایک غیر احمدی نوجوان محمد اشرف نے محض مذہبی جذبات سے مغلوب ہو کر قتل کر دیا تھا۔ اس واقعہ کا پس منظر یہ تھا کہ یکم اکتوبر 1950ء کو ایک احمدی مولوی نوردین سات دوسرے احمدیوں کے ساتھ تبلیغی مہم پر چک نمبر 5 میں گیا۔ یہاں غیر احمدیوں نے ان مبلغوں کو گھیر لیا۔ ان پر کیچڑ پھینکی۔ ان کے چہروں پر کالک ملی اور گندے پانی میں سے انہیں ہنکا کر ریلوے اسٹیشن اوکاڑہ تک پہنچایا۔ پولیس میں اس واقعہ کی رپورٹ لکھائی گئی جس پر ایک شخص مولوی فضل الٰہی کو زیر حراست لے لیا گیا۔ اس گرفتاری کے خلاف احتجاج کے طور پر اوکاڑہ میں دکانیں بند ہو گئیں اور 3/اکتوبر کو رات کو ایک جلسہ عام ہوا جس میں ہزاروں اشخاص شامل ہوئے۔ بہت سے مقررین نے تقریریں کیں جو بے انتہا اشتعال انگیز تھیں۔ ایک مقرر نے جلسہ کے نوجوان حاضرین سے اپیل کی کہ مرزائی فتنہ سے قوم کو نجات دلاؤ۔ دوسرے دن محمد اشرف

نے، جو یہ تقریریں سن چکا تھا، ایک چھرے سے مسلح ہو کر غلام محمد کا تعاقب کیا جبکہ وہ اپنے گاؤں سے اوکاڑہ جارہا تھا۔ محمد اشرف نے غلام محمد کو ایک نہر کے قریب جالیا اور اس کے چھرا گھونپ دیا۔ غلام محمد کا زخم کاری تھا چنانچہ تھانے لے جانے سے پہلے ہی مرگیا۔ محمد اشرف کو ایک مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا جہاں اس نے اقبال کیا کہ اس نے جلسہ عام میں تقریروں سے مشتعل ہو کر اس جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس نے ایک کافر کو قتل کر کے غازی علم دین کی طرح کا نیک کام کیا تھا۔''[11] یہ واقعہ قتل احراری مُلّاؤں کی اس ''تبلیغی مہم'' کا منطقی نتیجہ تھا جو انہوں نے جنوری 1949ء میں ممتاز دولتانہ کے ساتھ خفیہ سمجھوتے کے تحت شروع کر رکھی تھی۔ چند ماہ بعد لیاقت علی خان نے اپنی انتخابی مصلحت کے تحت اس سمجھوتے کی توثیق کر دی تھی۔ پنجاب کی خفیہ پولیس نے 1950ء کے اوائل کے بعد ایک سے زیادہ مرتبہ گورنر پنجاب کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی تھی کہ اگر احراری مولویوں کو لگام نہ دی گئی تو وہ عنقریب بلووں اور قتل کی وارداتوں کا موجب بنیں گے مگر گورنر نے مجلس احرار کے صدر ماسٹر تاج الدین اور بعض دوسرے احراری لیڈروں کو زبانی تنبیہ کرنے کے سوا ان کے خلاف کوئی اور کارروائی کرنا مناسب نہ سمجھا تھا کیونکہ لیاقت علی خان کی انتخابی مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔ اوکاڑہ کے قتل کے چند دن بعد راولپنڈی کے باغ گوالمنڈی میں بھی ایک شخص ولایت خان نے بدر دین احمدی کو گولی سے مار ڈالا۔

جماعت اسلامی کی جانب سے بنیادی اصولوں اور بنیادی حقوق کی رپورٹوں کے خلاف پنجاب بھر میں مہم اور جماعت کے اخبارات کی بندش

فرقہ احمدیہ کے دو ارکان کے قتل کی ان وارداتوں کے باوجود پاکستان کی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو احراریوں کے خلاف کسی کارروائی کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ البتہ انہیں یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ جماعت اسلامی کے مُلّاؤں کی تقریروں اور تحریروں پر کوئی نہ کوئی پابندی عائد کی جائے کیونکہ اس امر کی واضح علامتیں موجود تھیں کہ یہ جماعت پنجاب کے آئندہ انتخابات میں حزب اختلاف سے گٹھ جوڑ کرے گی اور یہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی اور بنیادی حقوق کی کمیٹی کی رپورٹوں کے خلاف مذہب کے نام پر جو مہم چلائے گی وہ زیادہ مؤثر ہوگی۔ چنانچہ 10 راکتوبر کو حکومت آزاد کشمیر کے ایک ترجمان نے ایسوسی ایٹیڈ پریس کو بتایا کہ ''امیر جماعت اسلامی مولانا

مودودی ابھی تک مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا کر رہا ہے۔ حال ہی میں اس کے ایک اخبار ''قاصد'' نے اپنے کشمیر نمبر میں بعض ایسے مضامین شائع کئے ہیں جن میں قائداعظم اور حکومت پاکستان پر بے بنیاد الزامات عائد کر کے یہ تاثر دیا گیا ہے کہ پاکستان کو کشمیری مسلمانوں کی فلاح میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' اس خبر کی اشاعت کی بعد اخبارات ''قاصد'' اور ''تسنیم'' کی اشاعت پر پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت ایک سال کے لئے پابندی عائد کر دی گئی۔

اسی دن امیر جماعت اسلامی ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک جلسہ عام کیا جس میں اس نے بنیادی اصولوں کی کمیٹی اور بنیادی حقوق کی کمیٹی کی طرف سے پیش کردہ سفارشات کو غیر اسلامی اور غیر جمہوری قرار دیا۔ اس نے انکشاف کیا کہ ''پاکستان کے آئین کے متعلق سفارشات پیش کرنے کے لئے حکومت نے جو ''مجلس تعلیمات اسلامیہ'' قائم کی تھی اس کی ایک سفارش کو بھی قبول نہیں کیا گیا۔ چنانچہ اب مجلس نے مطالبہ کیا ہے کہ اس کی پیش کردہ سفارشات کو شائع کر دیا جائے تاکہ عوام کو یہ معلوم ہو جائے کہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی اور بنیادی حقوق کی کمیٹی نے جو غیر اسلامی سفارشات پیش کی ہیں ان کی ذمہ داری مجلس تعلیمات اسلامیہ پر عائد نہیں ہوتی۔ بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے اپنی سفارشات مرتب کرتے وقت اسلامی اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں یہ اشارہ بھی نہیں کیا کہ شریعت خداوندی بالاتر ہے اور قرآن وسنت کے خلاف کوئی آئین مرتب نہیں ہوگا۔ ان سفارشات کے مطابق حکومت پر بھی پابندی نہیں ہوگی کہ وہ خلاف شریعت کوئی کاروائی نہیں کرے گی۔ صدر مملکت، وزراء اور ارکان مجالس قانون ساز خدا اور رسول ﷺ کی بجائے آئین کے وفادار رہنے کا حلف اٹھائیں گے۔ مسلمانوں کے لئے اگرچہ مذہبی تعلیم لازمی قرار دے دی گئی ہے مگر شراب نوشی اور اس قسم کی دیگر برائیاں بدستور قائم رہ سکیں گی۔ گویا ''معروف'' کو قائم کرنے اور ''منکر'' کو مٹانے کا کوئی بندوبست نہیں ہوگا...... بنیادی حقوق کی کمیٹی کی سفارشات قرآن وحدیث کی بجائے امریکہ اور برطانیہ کے آئین سے اخذ کی گئی ہیں۔ ان سفارشات میں اسلامی اصولوں کی صریح مخالفت کی گئی ہے۔ صدر مملکت اور صدر صوبہ کو قانون سے بالاتر رکھا گیا ہے۔ اسلامی قانون کے مطابق کوئی شخص قانون سے بالاتر نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ رسول کریم ﷺ بھی قانون سے بالاتر نہیں تھے۔ ان سفارشات میں نہ صرف اسلام کی توہین کی گئی ہے بلکہ رائج الوقت جمہوریت کی مٹی بھی پلید کی گئی ہے۔ ایوان بالا اور ایوان عام کے

اختیارات مساوی ہونے کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ صدر مملکت کی حیثیت ایک خودمختار ڈکٹیٹر کی ہوگی۔ مسولینی اور ہٹلر نے بھی اپنے لئے ایسے ہی اختیارات مخصوص کرر کھے تھے۔'' [12]

ابوالاعلیٰ مودودی نے یہ جلسہ باغ بیرون موچی دروازہ میں رات کو نماز عشا کے بعد منعقد کیا تھا اور اس وقت تک اخبارات کے دفتروں میں کراچی سے تعلیمات اسلامیہ بورڈ کا اس مضمون کا بیان موصول ہو چکا تھا کہ ''بنیادی اصولوں کی کمیٹی اور بنیادی حقوق کی کمیٹی کی رپورٹوں کا بورڈ کی اسلامی سفارشات سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ بورڈ کی حیثیت محض ایک مجلس مشاورت کی ہے اس لئے بورڈ کو ان رپورٹوں کا ذمہ دار نہیں ٹھہرانا چاہیے۔ بورڈ کے ارکان بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح اسلامی آئین کے متمنی ہیں اور وہ اس مقصد کے لئے حتی المقدور کوشش کرتے رہیں گے۔''

جماعت اسلامی کے اس جلسے کے بعد پورے پنجاب کے مُلاّؤں نے بنیادی اصولوں کی کمیٹی اور بنیادی حقوق کی کمیٹی کی رپورٹوں کے خلاف ایک ایسی ہی زبردست مہم شروع کردی۔ 4راکتوبر کو راولپنڈی، چنیوٹ، سیالکوٹ اور صوبہ کے دوسرے شہروں کی تقریباً ساری بڑی مسجدوں میں جلسے ہوئے جن میں بنیادی اصولوں اور بنیادی حقوق کی رپورٹوں کو قرآن وسنت کے خلاف ٹھہرایا گیا اور یہ اعلان کیا گیا کہ عوام الناس ان رپورٹوں کی بنیاد پر مرتب کردہ غیر اسلامی آئین کو قبول نہیں کریں گے۔ یہ مہم بڑے زور شور سے جاری رہی حالانکہ 14راکتوبر کو دستور ساز اسمبلی کا اجلاس بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کی منظوری کے بغیر ہی غیر معین عرصہ کے لئے ملتوی کر دیا گیا تھا۔ 17راکتوبر کو بہاولپور اور دریا خان مری سے بھی اسی قسم کے جلسوں کی رپورٹیں موصول ہوئیں اور اسی دن نوائے وقت نے اس مسئلہ پر ایک اور اداریے میں یہ مطالبہ کیا کہ ''(1) آئین میں اولیت اس دفعہ کو دی جائے کہ پاکستان ایک اسلامی جمہوری ریاست ہوگا۔ (2) اس کے قانون و آئین کی منہاج قرآن کریم ہوگا۔ (3) قرارداد مقاصد کو باقاعدہ قانونی و دستوری زبان میں آئین کے ایک جزولاینفک کی مانند اس طرح آئین میں شامل کیا جائے کہ کوئی شہری اس کی بنا پر عدالت عالیہ میں حق طلبی کا مجاز ہو۔''

18راکتوبر کو راجن پور، خانقاہ شریف، سمہ سٹہ، باماں بالا تحصیل اوکاڑہ، عارف والا، جہلم، گرجاکھ ضلع گوجرانوالہ، ڈسکہ ضلع سیالکوٹ، گجرات، حویلی رحیم آباد، قصبہ ٹھل حمزہ

(بہاولپور)، تاندلیانوالہ، نوشہرہ، کبیروالا اور خانیوال سے احتجاجی جلسوں کی خبریں آئیں جن میں منظور کردہ قراردادوں کا لب لباب یہ تھا کہ جو بنیادی حقوق منظور کئے گئے ہیں وہ سراسر غیر اسلامی اور غیر جمہوری بلکہ قرارداد مقاصد کی روشنی میں توہین آمیز ہیں...... ہم ان سفارشات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں...... پاک دستور یہ مذکورہ سفارشات کو ردی کی ٹوکری میں پھینک کر کتاب وسنت کی روشنی میں ملک وقوم کے معتمد علمائے دین کے ہاتھوں ملک کا دستور نئے سرے سے مرتب کر کے فی الفور عوام کی خوشنودی اور دلجمعی کا سامان پیدا کرے...... ہم برسر اقتدار طبقہ سے پرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ مستعفی ہو جائے اور ملک کے سچے خیر خواہ اور صالح آدمیوں کو قانون بنانے کا موقع دے۔ موجودہ دستور یہ پاکستان قطعاً غیر نمائندہ ہے اسے توڑ دیا جائے اور نئے انتخابات جلد از جلد کرائے جائیں تاکہ صالح نمائندے منتخب ہوں۔[13] یہ جلسے زیادہ تر جماعت اسلامی کے زیر اہتمام ہوتے تھے اور جماعت کے کارکن ہی ان کی خبریں اخبارات کو بھیجتے تھے۔ ان خبروں میں ایک بات بالکل واضح ہوتی تھی، وہ یہ تھی کہ امیر جماعت اسلامی ابوالاعلیٰ مودودی کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ گئی ہوئی تھی کہ ایک سیاسی جماعت کا پروپیگنڈا سیل بہت مضبوط ہونا چاہیے اور اس سیل میں اتنی صلاحیت واہلیت ہونی چاہیے کہ وہ جماعت کی چھوٹی چھوٹی سرگرمیوں کی بھی اس طرح تشہیر کرے کہ وہ بہت بڑی سرگرمیاں معلوم ہوں۔ چنانچہ ان خبروں میں صرف مذہبی عقائد کی پاکیزگی کا ہی ذکر نہیں ہوتا تھا بلکہ ان میں جمہوری اصولوں کی پابندی پر بھی زور دیا جاتا تھا اور پنجابی شاونزم کی تسکین کے لئے یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ لیاقت علی خان کی آمرانہ حکومت صوبوں کے حقوق کو بھی غصب کر رہی ہے۔

ان خبروں کی سب سے زیادہ تشہیر نوائے وقت میں ہوتی تھی کیونکہ یہ اخبار پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے شاونسٹوں کے ترجمان کی حیثیت سے لیاقت حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے ہر حربے کو جائز تصور کرتا تھا۔ ویسے بھی تجارتی نقطہ نگاہ سے اسے فائدہ تھا کیونکہ جماعت اسلامی کے اخبارات ''قاصد'' اور ''تسنیم'' بند ہو جانے کی وجہ سے جماعت کے ارکان اور ہمدرد یہی اخبار خریدتے تھے۔ 22/اکتوبر کو نوائے وقت نے اپنے ادارتی صفحہ پر ایک چوکھٹے میں اپنے قارئین سے اپیل کی کہ ''اپنا فرض ادا کیجئے'' اس اپیل میں لکھا تھا کہ ''دستور ساز اسمبلی جو آئین منظور کرے گی وہ صرف آپ پر ہی نہیں آپ کی آئندہ نسلوں پر بھی اثر انداز ہوگا اس لئے آپ کا فرض

ہے کہ اس سلسلہ میں اپنا فرض ادا کریں۔ اسمبلی کو سفارشات کی خامیوں اور نقائص سے آگاہ کیجئے۔ مگر صرف اعتراض کی خاطر اعتراض نہ کریں۔ تعمیری تجاویز بھی پیش کیجئے۔ جلسے، قرارداد، تار یا خط کے ذریعے دستور ساز اسمبلی سے مطالبہ کیجئے کہ:

1۔ پاکستان کے متعلق اعلان کیا جائے کہ یہ ایک اسلامی جمہوری مملکت ہوگی۔

2۔ پاکستان کے دستور و قانون کی منہاج قرآن کریم ہوگا۔

3۔ قرارداد مقاصد کو غیر مشروط طور پر آئینی و دستوری زبان میں اس طرح شامل کیا جائے کہ یہ آئین کا جزو لاینفک ہو اور اس بنا پر ہر شہری عدالت میں حق طلبی کا مجاز ہو۔

اس اپیل کا، جو چار پانچ دن تک شائع ہوتی رہی، مطلب یہ تھا کہ وزیراعظم لیاقت علی خان چار پانچ دن میں پنجاب کے دورے پر آ رہا ہے۔ جب وہ یہاں پہنچے تو ایسا ہنگامہ کرو کہ اسے دن میں تارے نظر آ جائیں۔ چونکہ ان دنوں حسین شہید سہروردی کی عوامی مسلم لیگ، صوبائی مسلم لیگ کے ممدوٹ دھڑے، جماعت اسلامی، کمیونسٹ پارٹی، جمعیت العلمائے اسلام اور جمعیت اہلحدیث وغیرہ نے اور ان سب سے بڑھ کر پنجاب کے دریاؤں کے سیلاب نے لیاقت علی خان کے لئے صوبہ کی سیاسی فضا خاصی مکدر کر رکھی تھی اس لئے نوائے وقت کی اس اپیل کا خاصا اثر ہوا۔ آئندہ تین چار دن میں ماموں کانجن، لودھراں، رحیم یار خان، شاہ پور، لائل پور (فیصل آباد)، قصور، لاہور اور صوبہ کے دوسرے بہت سے چھوٹے بڑے قصبوں اور شہروں کی مسجدوں میں احتجاجی جلسے ہوئے جن میں نوائے وقت کی اپیل کے مطابق قراردادیں منظور کی گئیں۔

مُلّاؤں اور نوائے وقت کی جانب سے پیدا کردہ شدید مخالفانہ فضا میں لیاقت کا دورۂ پنجاب اور اس کی بے عزتی

25 / اکتوبر 1950ء کو لیاقت علی خان لاہور پہنچا۔ 26 / اکتوبر کو اس نے گورنر نشتر کے ہمراہ ضلع گوجرانوالہ کے سیلاب زدہ علاقوں کا دورہ کیا اور شام کو اس نے گوجرانوالہ شہر میں ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ”جو لوگ بنیادی حقوق اور بنیادی اصولوں کی سفارشات کو غیر اسلامی قرار دیتے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ قوم کے سامنے اسلامی اصولوں پر مبنی اپنی سفارشات پیش کریں تاکہ قوم یہ فیصلہ کر سکے کہ ان میں سے کونسی سفارشات اسلامی اصولوں کے مطابق

ہیں۔'' اس نے سفارشات کو غیر اسلامی قرار دینے والوں کو خود غرض پروپیگنڈسٹوں کا نام دیا اور کہا کہ ''اگر پاکستان کی بنیادیں اسلامی اصولوں پر استوار نہ کی گئیں تو پاکستان کا وجود برقرار نہیں رہ سکتا۔ میں اس مسئلہ پر قوم کا متفقہ فیصلہ تسلیم کرنے پر تیار ہوں۔''[14] لیاقت علی خان کا یہ موقف کمزور تھا کیونکہ کونسی چیز اسلامی ہے اور کونسی چیز غیر اسلامی ہے اس کے بارے میں عوام الناس کی رائے کا تعین اس کے کہنے پر نہیں ہو سکتا تھا۔ اسلام کی تعبیر و تشریح کی اجارہ داری مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مفتی محمد شفیع، مفتی جعفر حسین مجتہد، مولانا احمد علی، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا داؤد غزنوی اور اس قسم کے دوسرے بہت سے مُلّاؤں کے پاس تھی اور یہ سب بنیادی اصولوں کی کمیٹی اور بنیادی حقوق کی کمیٹی کی سفارشات کو ''غیر اسلامی'' قرار دے چکے تھے۔

دستور ساز اسمبلی نے مارچ 1949ء میں جو تعلیمات اسلامیہ بورڈ قائم کیا تھا اس کی اپریل، جولائی اور اگست 1950ء میں پیش کردہ ''اسلامی تجاویز'' لیاقت علی خان کی ''غیر اسلامی سفارشات'' سے بالکل مختلف تھیں۔ ان دونوں میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں تھی۔ اس بورڈ کا صدر مولانا سید سلیمان ندوی اکتوبر 1950ء کے اوائل میں لکھنؤ سے کراچی پہنچ گیا تھا لیکن نوائے وقت کی ایک رپورٹ کے مطابق اس نے 27 اکتوبر تک اپنا عہدہ نہیں سنبھالا تھا کیونکہ وہ بورڈ کی موجودہ مشاورتی پوزیشن سے مطمئن نہیں تھا۔ اسے شکایت تھی کہ بورڈ کی طرف سے پیش کردہ کسی سفارش کو بنیادی اصولوں کی رپورٹ میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔

لیاقت علی خان نے ان سارے تلخ حقائق کو نظر انداز کر کے 28 اکتوبر کی شام کو لاہور کی یونیورسٹی گراؤنڈ میں ایک جلسہ عام کو خطاب کرنے کی کوشش کی۔ صوبہ لیگ کے زیر اہتمام اس جلسہ عام کے لئے کئی دن سے مختلف قسم کے انتظامات کئے جا رہے تھے۔ دو تین دن پولیس اس سلسلہ میں انتہائی مصروف رہی تھی تا کہ اس جلسہ میں کوئی مخالفانہ مظاہرہ نہ ہونے پائے۔ صوبہ لیگ نے صوبہ کے مختلف اضلاع سے بہت سے دیہاتی لوگوں کو بلا کر نیشنل گارڈز کی وردیاں پہنا رکھی تھیں۔ یہ لوگ مناسب انتظامات کے لئے جگہ جگہ کھڑے تھے اور خفیہ پولیس کی بھی بھاری جمعیت جلسہ گاہ میں متعین تھی۔ لیکن ان سب احتیاطی اقدامات کے باوجود جب لیاقت علی خان تقریر کرنے کے لئے مائیکروفون کے سامنے کھڑا ہوا تو حاضرین کے ایک حصے نے یکا یک ہنگامہ شروع کر دیا۔ بہت سے لوگوں نے مسلم لیگ مردہ باد، اور پنجاب کو ذلیل کرنے

والے مردہ باد کے نعرے لگائے اور کچھ لوگوں نے سیاہ جھنڈیاں بھی لہرائیں۔ یہ ہنگامہ تقریباً نصف گھنٹہ تک جاری رہا اور اس دوران لیاقت علی خان خاموشی سے مائیکروفون کے سامنے حیرانی و پریشانی کی حالت میں کھڑا لگاتار سگریٹ پیتا رہا۔ بظاہر اسے احساس ہو گیا تھا کہ پنجابی شاؤنسٹوں اور مُلّاؤں کی معاندانہ مہم کی بدولت کم از کم پنجاب کے شہروں کی حد تک اس کی سیاسی ہوا اکھڑ چکی تھی۔ یہ ہنگامہ مسلم لیگ کے ممدوٹ دھڑے نے کرایا تھا اور نوائے وقت اس مقصد کے لئے کئی دن سے لاہور کی سیاسی فضا ہموار کرتا رہا تھا۔ نواب صدیق علی خان کے بیان کے مطابق ''وزیراعظم کے مائیکروفون کے سامنے تشریف لاتے ہی طاغوتی ٹولیاں جو ایک منظم سازش کے تحت مورچے سنبھالے بیٹھی تھیں برسرِ پیکار ہو گئیں۔ انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو ایک غیرت مند اور آزاد مسلم قوم کے افراد کو نہ کرنا چاہیے تھا۔ انہوں نے آوازے کسنے اور مغلظات بکنے کا ایک کھلا مقابلہ کیا اور ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی بڑی دیر تک مسلسل کوشش کرتے رہے۔ جب جوش زیادہ بڑھا تو وفورِ جذبہ تضحیک و سفلگی میں مبتلا ہو کر بھنگڑا ناچ بھی ناچنے لگے۔ جب ان کی اس فنی مظاہرے سے بھی پوری تسلی نہیں ہوئی تو انہوں نے بے حیائی کا آخری حربہ بھی استعمال کیا۔ یعنی بھنگڑا ناچ کو زیادہ دلکش بنانے کے لئے آپے سے اتنے باہر ہوئے کہ جامے سے بھی بے نیاز ہو گئے۔ سمجھدار شریفِ شرکائے جلسہ انگشت بدنداں بے بسی کے عالم میں ندامت سے سر جھکائے خون کے گھونٹ پیتے رہے۔''[15]

چونکہ اس جلسہ سے دو تین دن قبل ممدوٹ دھڑے کے ذکی الدین پال اور دو تین دیگر کارکن مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کر چکے تھے اس لئے اس جلسہ کے بعد یہ امر یقینی نظر آنے لگا تھا کہ اب نواب ممدوٹ بھی دو ایک دن میں مسلم لیگ سے قطع تعلق کر کے اپنی الگ سیاسی دکان لگائے گا۔ لیاقت نے اس متوقع واقعہ کا سدباب کرنے کے لئے اسی رات آخری کوشش کے طور پر نواب ممدوٹ کو گورنر ہاؤس میں بلا کر اسے مسلم لیگ میں ہی رہنے کی ترغیب دی مگر اسے کامیابی نہ ہوئی۔ دو تین دن کے بعد نواب ممدوٹ نے جب مسلم لیگ سے الگ ہو کر اپنی جناح مسلم لیگ قائم کر لی اور اس طرح پنجاب میں صوبائی شاؤنزم اور مُلّائیت کے درمیان سیاسی رشتہ داری کی بات پکی ہو گئی۔ مُلّا ابوالاعلیٰ مودودی اس مقصد کے لئے 31/اکتوبر کو ہی گوجرانوالہ، گجرات، جہلم، راولپنڈی اور کیمبل پور کے دورے پر روانہ ہو چکا تھا اور جمعیت اہلحدیث و

جمعیت العلمائے اسلام بھی اسی مقصد کے لئے سرگرم عمل تھیں۔ جہلم میں جمعیت اہلحدیث کے ایک جلسہ عام میں مولانا داؤد غزنوی کا اعلان یہ تھا کہ ''موجودہ دستور ساز اسمبلی کو مسلمانان پاکستان کی نمائندگی کا کوئی حق نہیں...... برسر اقتدار اصحاب کی اسلام سے عدم واقفیت کے طفیل آج پاکستان میں ناانصافی ہو رہی ہے۔ غریب پہلے سے زیادہ غریب ہو گیا ہے۔ جب غریب پاکستان کے حصول کے لئے برسرپیکار تھا یہ نوابزادے کوٹھیوں میں بیٹھ کر پاکستان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ مگر جب پاکستان بن گیا تو پاکستان کو آبائی ورثہ سمجھ کر کسی کی بات ہی سننا گوارا نہیں کرتے...... بنیادی اصولوں کی سفارشات میں ایک بھی لفظ ایسا نہیں جسے اسلامی کہا جا سکے...... یہ رپورٹ قرارداد مقاصد کے ساتھ مذاق ہے۔ خداوند تعالیٰ ہمیں اس ملحدانہ اور غیر اسلامی آئین سے بچائے جس کو ہم پر زبردستی مسلط کرنے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔''[16] 3 رنومبر کو منٹگمری (ساہیوال) میں جمعیت العلمائے اسلام کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں دستور ساز اسمبلی کو برخاست کر دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں کہا گیا کہ ''بنیادی اصولوں اور بنیادی حقوق کی سفارشات اسلام اور جمہوریت کے بنیادی اصولوں کے منافی ہیں۔ پاکستان کے مسلمان ایسی غیر اسلامی سفارشات کو ہرگز قبول نہیں کر سکتے۔''[17]

4 رنومبر کو تعلیمات اسلامیہ بورڈ کے رکن مفتی محمد شفیع نے ایک بیان میں حکومت پاکستان سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ آئینی اصولوں کے بارے میں بورڈ کی سفارشات شائع کر دے۔ اس نے کہا کہ بنیادی اصولوں کی پیش کردہ سفارشات کا بورڈ کی سفارشات سے دور کا تعلق بھی نہیں۔ دونوں سفارشات میں کونسی اسلامی اور کونسی غیر اسلامی ہیں اس سوال کا فیصلہ میں پاکستانی عوام پر چھوڑتا ہوں کیونکہ بہرحال پاکستان کے عوام ہی یہ فیصلہ کریں گے کہ کن سفارشات میں اسلام کے نظریات کی نمائندگی کی گئی ہے۔''[18] مفتی محمد شفیع کے اس بیان سے قبل نوائے وقت میں یہ خبر چھپ چکی تھی کہ ''سید سلیمان ندوی بہت جلد ہندوستان واپس تشریف لے جا رہے ہیں اور اب وہ صرف پرمٹ کا انتظار کر رہے ہیں۔ تین ماہ ہوئے مولانا سلیمان ندوی تعلیمات اسلامیہ بورڈ کی صدارت کرنے کی غرض سے کراچی تشریف لائے تھے لیکن انہوں نے بورڈ کے اختیارات سے مایوس ہو کر صدارت نہ سنبھالی۔ بورڈ کے ایک اور رکن ڈاکٹر حمید اللہ پہلے ہی مستعفی ہو چکے ہیں اور اب پیرس جا رہے ہیں۔''[19]

3 اور 4 نومبر کو سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی نے جہلم اور راولپنڈی کے جلسوں میں مطالبہ کیا کہ موجودہ دستور ساز اسمبلی کو برخاست کر کے تازہ انتخابات کے ذریعے ایک نئی اسمبلی قائم کی جائے جو اسلامی اصولوں پر ملک کا آئین بنائے اور 7 نومبر کو اس نے کیمبل پور میں بنیادی حقوق کی کمیٹی کی سفارشات کی ہر شق پر روشنی ڈالی اور قرآنی آیات سے یہ ثابت کیا کہ ان سفارشات کا اسلام سے دور کا تعلق بھی نہیں۔ اس نے انتخابات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''جو شخص انتخابات میں خود کھڑا ہو اسے ہرگز ووٹ نہ دیں بلکہ پنچائتیں جس شخص کو صالح قرار دیں اسے انتخابات میں حصہ لینے پر مجبور کیا جائے اور کامیاب کرایا جائے۔''[20]

پنجاب میں مُلّاؤں کی یہ ''شرعی مہم'' کئی روز تک جاری رہی اور ہر روز اس مہم کے زور میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ اس مہم کے دوران مُلّاؤں کی جانب سے اپنے لئے اقتدار کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ وہ اپنی تقریروں اور قراردادوں میں کہتے تھے کہ ''دستوری سفارشات سامنے آنے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہے کہ موجودہ دستور ساز اسمبلی فی الواقع نہ تو ایک اسلامی دستور بنانے کا ارادہ رکھتی ہے نہ ہی اس کی اہل ہے۔ لہٰذا اب ہم آخری چارہ کار کے طور پر یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ موجودہ دستور یہ فوراً مستعفی ہو اور ایک نئی دستور یہ عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو۔ ہمارے لئے کوئی ایسا آئین قابل قبول نہ ہوگا جو اسلام کے اصولوں سے ٹکرائے۔''[21] پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے جو عناصر اس مہم میں زور شور سے مُلّاؤں کا ساتھ دیتے تھے وہ یہی مطالبہ مختلف الفاظ میں کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ''بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کو دستور ساز اسمبلی سے منظور کرانے سے پہلے اسمبلی سے یہ ترمیمات منظور کرائی جائیں:

1۔ قرارداد مقاصد کو دستوری و آئینی زبان میں اس طور پر پاکستان کے آئین میں شامل کیا جائے کہ یہ آئین ملک کا ایک جزو لاینفک ہو اور ہر شہری اس بنا پر عدالت میں حق طلبی کا مجاز ہو۔

2۔ اعلان کیا جائے کہ پاکستان ایک اسلامی ری پبلک ہوگا۔ آئین میں اس مضمون کی ایک دفعہ کا اضافہ کیا جائے کہ مملکت کی ہیئت کے بارے میں مذکورہ بالا دفعہ میں کبھی ترمیم نہ ہوسکے گی۔

3۔ آئین میں اس دفعہ کا اضافہ کیا جائے کہ ہر وہ قانون جو قرآن کی روح کے منافی ہوگا

ناجائز متصور ہوگا۔"

ان کا مزید کہنا یہ تھا کہ "پاکستانی عوام کوخوش کرنے کے لئے زبان سے اسلام کا نام لینا مگر عملاً اسلام سے گریز بزدلی ہی نہیں بلکہ بددیانتی بھی ہے۔ حقیقت پرستی کی سیاست کا تقاضا بھی یہی ہے کہ پاکستان کے ایک اسلامی مملکت ہونے کا غیر مبہم اعلان کیا جائے۔ اس لئے کہ پاکستان کو ایک "سیکولر نیشن" سٹیٹ بنانے کی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوگی کیونکہ زبان، نسل اور جغرافیائی اعتبار سے پاکستانی نیشن کا وجود ہی ناپید ہے۔ ملت پاکستان "نیشن" کے مروجہ معنوں میں ہرگز ایک "نیشن" نہیں۔ اس کی واحد اساس اسلامیت ہے۔ اگر اسلامیت سے ہی انحراف کیا گیا تو ملت کی وحدت پارہ پارہ ہوجائے گی۔"[22]

لیکن دوسری طرف مشرقی بنگال کے درمیانہ طبقہ کا مطالبہ پنجاب کے ان اسلام پسند عناصر کے مطالبہ سے بالکل مختلف تھا۔ ان کی "مجلس عمل برائے جمہوری وفاق" کا جگہ جگہ تقریروں اور قراردادوں میں مطالبہ یہ تھا کہ قرارداد لاہور کے مطابق پاکستان کے دونوں حصوں (مشرقی ومغربی پاکستان) کے ساتھ آزادانہ وحدتوں کا سا سلوک روا رکھنا چاہیے اور مرکز کو صرف دفاع، امور خارجہ اور کرنسی سے متعلق اختیارات تفویض کئے جائیں۔ بنیادی اصولوں کی رپورٹ قرارداد لاہور کی اساس پر از سرنو مرتب کی جائے۔ مرکزی پارلیمنٹ کی تشکیل اس طرح کی جائے کہ اس میں مشرقی بنگال کی اکثریت اقلیت میں تبدیل نہ ہو اور اردو کے ساتھ ساتھ بنگالی زبان کو بھی سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔"

مشرقی بنگال کی جانب سے اسے ملک کا برابر کا حصہ قرار نہ دیئے جانے پر شدید احتجاج، لیاقت کی یقین دہانی مگر نوائے وقت کا مطالبہ کہ بنگالیوں کو ان کا حق نہ دیا جائے

ستم ظریفی یہ تھی کہ پنجاب کے مُلّاؤں اور اسلام پسند صوبائی شاونسٹوں کو بنیادی اصولوں کی اس سفارش پر اسلامی نقطہ نگاہ سے کوئی اعتراض نہیں تھا کہ جس میں یہ تو کہا گیا تھا کہ پاکستان کے وفاق کے ایوان بالا اور ایوان زیریں کے اختیارات مساوی ہوں گے اور سالانہ

میزانیہ کی منظوری ان دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں حاصل کی جائے گی لیکن یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ ان دونوں ایوانوں کے ارکان کی تعداد کتنی ہوگی۔انہیں مشرقی بنگال کے درمیانہ طبقہ کی تشویش کی بھی اسلامی نقطہ نگاہ سے کوئی بنیاد نظر نہیں آتی تھی کہ پنجاب اور کراچی کے استحصالی عناصر مشرقی بنگال کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کر کے سنہری ریشے والے اس علاقے کو مستقل طور پر اپنی نو آبادی بنانے کا عزم رکھتے تھے۔چونکہ مشرقی بنگال کے درمیانہ طبقہ کے مسلم لیگیوں سمیت سارے عناصر نے اس حقیقی خدشہ کی بنا پر متحد ہو کر زبردست ایجی ٹیشن شروع کر دی تھی۔اس لئے 13 ر اکتوبر کو مرکزی اسمبلی میں وہاں کے مسلم لیگی رہنماؤں نے کراچی میں وزیر اعظم لیاقت علی خان سے ملاقات کی اور پھر انہوں نے ایک مشترکہ بیان میں اپنے ووٹروں کو یقین دلایا کہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی سفارشات کے متعلق ان کے یہ خدشے بے بنیاد ہیں کہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کی منظوری سے مرکزی مجلس قانون ساز میں مشرقی پاکستان کی اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو جائے گی اور یہ کہ صوبائی حکومت کے اختیارات کم ہو جائیں گے''ہم نے اس مسئلہ پر پارٹی کے لیڈر (یعنی لیاقت علی خان) سے تبادلہ خیالات کیا ہے۔اس تبادلہ خیالات سے ہم مطمئن ہیں۔مشرقی پاکستان کے مفادات کو نقصان پہنچے گا نہ ہی اس کی اکثریت اقلیت میں تبدیل ہوگی۔'' اس مشترکہ بیان میں جن 23 ارکان اسمبلی کے دستخط تھے ان میں اے۔کے۔فضل الحق، مولانا محمد اکرم خان، فضل الرحمان، خواجہ شہاب الدین، نورالامین، ڈاکٹر محمود حسین اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی بھی شامل تھے۔''[23]

نوائے وقت نے اس مشترکہ بیان کا سخت نوٹس لیا اور اپنے اداریے میں اس کی یہ تعبیر کی کہ لیاقت علی خان نے صوبہ مشرقی بنگال کی نمائندگی کرنے والے ارکان اسمبلی کو یہ یقین دلایا ہے کہ''پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں اکثریت مشرقی بنگال کے ممبروں کی ہی ہوگی۔''اگرچہ مشترکہ بیان کے الفاظ یہ نہیں تھے لیکن لیاقت علی خان کے خلاف پنجابی شاونزم کی بوتل سے زہر چھڑکنے کے لئے اسے مسخ کرنا ضروری تھا۔اس اداریے میں آگے چل کر لکھا گیا تھا کہ''ہم ارباب متعلقہ سے لگی لپٹی رکھے بغیر یہ عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ وقتی طور پر بنگال کے چند ممبروں کو اپنے ساتھ رکھنے کے لئے وہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جو وفاق اور جمہوریت کو ایک صوبہ کی حکومت میں بدل کر رکھ دے۔وقتی اقتدار کے لئے ایسی غلطی کی گئی تو اس ملک میں فتنوں کا

مستقل باب کھل جائے گا......کیا ہم دستور ساز اسمبلی کے نمائندگان پنجاب سے پوچھ سکتے ہیں کہ بنیادی حقوق کی کمیٹی اور بنیادی اصولوں کی کمیٹی کے سلسلے میں انہوں نے اپنے ووٹروں کا حق نمائندگی کہاں تک ادا کیا ہے یا پنجاب میں ان ووٹروں کو ان سفارشات پر سرے سے کوئی اعتراض ہی نہیں؟ پنجاب کے ممبروں میں سے سردار عبدالرب نشتر صاحب، ملک فیروز خان نون صاحب اور ملک عمر حیات صاحب تو اب سرکاری عہدوں پر فائز ہیں۔ باقی ممبران ماشاءاللہ جی حضوریئے ہیں جن کا کام محض اس قدر ہے کہ وزارتی بنچوں سے کوئی تجویز بعد میں پیش ہو اور یہ ''منظور'' ''منظور'' کے نعرے پہلے لگانے شروع کر دیں۔ سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس وقت ہی نہیں کہ وہ اجلاس میں شرکت کر سکیں یا جو اپنے ووٹروں کا حق نمائندگی ادا کرنے کی ہمت ہی نہیں رکھتے وہ ممبری سے مستعفی کیوں نہیں ہو جاتے؟''[24]

تقریباً ایک ماہ بعد نوائے وقت نے اس مسئلہ پر پھر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اگر لیاقت علی خان کا ''مطمع نظر ذاتی اقتدار نہیں بلکہ ملک کی بہتری ہے اور مقصود کسی خاص صوبہ کے ووٹ نہیں بلکہ سب صوبوں کا تعاون ہے تو پھر دستور ساز اسمبلی کو (1) ایوان بالا کو امریکن سینیٹ کی طرح بعض خصوصی اختیارات دینے چاہئیں۔(2) ایوان بالا میں نشستوں کا تعین اس طرح کیا جانا چاہیے کہ کوئی بڑا صوبہ کسی چھوٹے صوبہ پر حاوی نہ ہو اور دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں کسی ایک صوبہ کو مستقل اکثریت نہ حاصل ہو۔''[25] اس تبصرے کا مطلب یہ تھا کہ اگر بلوچستان سمیت مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے نمائندوں کی مجوزہ دونوں ایوانوں میں اکثریت رہے تو کوئی حرج نہیں ہو گا۔ یہ امر وفاقی جمہوریت اور اسلام کے عین مطابق ہو گا لیکن اگر ان دونوں ایوانوں میں مشرقی بنگال کی اکثریت حاوی ہو گئی تو قیامت آ جائے گی کیونکہ یہ امر اسلام اور جمہوریت دونوں ہی کے منافی ہو گا یعنی اس طرح پنجابی شاونزم اور مُلّائیت دونوں ہی کے مفادات کو نقصان پہنچے گا۔ ان کے نزدیک بنگالیوں کا یہ مطالبہ اسلامی نقطہ نگاہ سے درخور اعتنا نہیں تھا کہ مشرقی بنگال کو مغربی پاکستان کے صوبوں کی طرح کا ایک صوبہ تصور نہ کیا جائے بلکہ جغرافیائی، تاریخی، نسلی، تہذیبی حقائق کے پیش نظر اسے پاکستان کے ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق کا ایک خودمختار یونٹ تصور کیا جائے اور ملک کا آئینی ڈھانچہ قرار داد لاہور کی اساس پر مرتب کیا جائے تاکہ نہ تو مشرقی پاکستان مغربی پاکستان پر حاوی ہو اور نہ ہی

مغربی پاکستان کے مشرقی پاکستان پر غلبے کو دوام ملے۔ وہ بنگالیوں کے اس مطالبے کو غیر اسلامی اور غیر جمہوری قرار دیتے تھے اور ان کی نظر میں پنجاب کے ''حقوق'' کی علمبرداری اسلام اور جمہوریت کے عین مطابق تھی۔

لیاقت علی نے بنیادی اصولوں کی رپورٹ کی منظوری کو ملتوی کر دیا، وہ اپنی مرضی کی نئی اسمبلی منتخب کروا کر اپنے مطلب کا آئین منظور کروانا چاہتا تھا

وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اس صورت حال کے پیش نظر 21 ر نومبر کو دستور ساز اسمبلی میں ایک قرارداد کے ذریعے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی عارضی رپورٹ پر بحث ملتوی کر دی۔ اس نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''کمیٹی کی رپورٹ پر بحث ملتوی کرنا اس لئے ضروری ہو گیا ہے کہ جو لوگ بنیادی اصولوں کے سلسلے میں ٹھوس تجاویز پیش کرنے کے متمنی ہیں ان کے لئے ایسا کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ ایسے اصحاب 31 ر جنوری 1951ء تک آئین ساز اسمبلی کے دفتر میں اپنی تجاویز پیش کر سکتے ہیں۔'' اس نے کہا کہ ''آئین ساز اسمبلی نے قرارداد مقاصد کو خلوص اور دیانت کے جذبے کے ماتحت منظور کیا تھا کیونکہ آئین ساز اسمبلی کے ارکان کی دلی خواہش یہ ہے کہ پاکستان میں ایسا آئین مرتب ہو جو قرآن حکیم اور سنت بنوی کی سپرٹ کے منافی نہ ہو۔ آئین ساز اسمبلی کے ارکان اس خیال پر متفق ہیں کہ یہی وہ اصول ہیں جن پر کار بندرہ کر دکھی دنیا میں مرفہ الحالی اور خوش وقتی کا دور دورہ ہو سکتا ہے۔ آئین ساز اسمبلی کے ارکان کا یہ پختہ یقین ہے کہ اسلام کے اصول کسی خاص قوم یا ملک کی فلاح و بہبود تک محدود نہیں بلکہ دنیا کی ساری قومیں اور سارے ملک (بشرطیکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوں) ان اصولوں سے مساوی طور پر استفادہ کر سکتے ہیں۔ پاکستان کے باشندوں کا فرض ہے کہ وہ اسلامی اصولوں کی روشنی میں ایسا آئین مرتب کریں کہ ان کا اقدام دنیا بھر کے ملکوں اور قوموں کے لئے مشعل راہ ثابت ہو اور ساری دنیا کے لئے بہترین مواقع پیدا کرنے کا موجب بنے۔''[26]

لیاقت علی خان کی اس تقریر کا نفس مضمون کوئی نیا نہیں تھا۔ وہ مارچ 1949ء میں قرارداد مقاصد کی منظوری کے بعد جگہ جگہ اسی مضمون کی تقریریں کیا کرتا تھا۔ وہ پاکستان کے عوام الناس کو شب و روز یہ مژدہ سنایا کرتا تھا کہ پاکستان کا ایسا آئین مرتب ہو رہا ہے جو دنیا میں آپ

اپنی مثال ہوگا۔ وہ کرہ ارض پر مشعل ہدایت بن کر چمکے گا۔ اس کے آگے سارے آئینی تجربے ماند پڑ جائیں گے۔ مادیت پرست دنیا اس سے سبق حاصل کرے گی اور پاکستان گم کردہ راہ ملکوں کو صراط مستقیم دکھائے گا۔ تاہم اس کی اس 21 نومبر کی تقریر کا مطلب یہ تھا کہ اس نے 1948ء اور 1950ء میں پنجاب کے مُلّاؤں اور ''اسلام پسندوں'' کی شرعی اور اسلامی مہموں سے کوئی سبق نہیں سیکھا تھا۔ وہ مذہب کو بدستور بطور سیاسی حربہ استعمال کرنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ مذہب کی اجارہ داری اس کے مخالفین کے پاس تھی جو اسے مداری، مکار، فریب کار، بہروپیا اور منافق قرار دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ''بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی سفارشات کی پٹاری مرکزی حکومت کے مداری نے تماشائی دنیا کے سامنے ڈرامائی انداز میں کھولی تو بجائے اس کے کہ اس میں سے اسلامی اصولوں کا دستور نکلے، اخوت و مساوات اور حریت و عدالت کا آئین نکلے، جبر وظلم، اجارہ داری، مکر و فریب، غلامی و محکومی اور مجبوری و بیچارگی کا عفریت نکل کر رقص کرنے لگا...... حق یہ ہے کہ ہم نے کبھی ایک لمحے کے لئے اس غیر معمولی حسن ظن کو اپنے زور اعتبار سے قلب میں جگہ نہیں دی تھی کہ موجودہ دستور ساز اسمبلی اپنی اس ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے کوئی اسلامی یا جمہوری دستور تیار کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ مگر خدا شاہد ہے کہ اتنی بڑی دھاندلی، اتنی بڑی ڈھٹائی اور اتنے بڑے فریب کی توقع ہم بھی نہیں رکھتے تھے۔''[27] اور یہ کہ ''جب اقبال کے خواب اور قائداعظم کی تمناؤں کی تکمیل کا زمانہ آیا تو ان کی آنکھیں بند ہونے کے بعد ان کے جانشین امریکی مارکہ اینٹیں، برطانوی چھاپ چونا استعمال کر کے پاکستان کے قبلہ کا رخ کعبہ کی بجائے لندن اور واشنگٹن کی طرف موڑ رہے ہیں اور ستم یہ ہے کہ بڑی دیدہ دلیری سے اس پر اسلام کا لیبل چسپاں کیا جا رہا ہے...... اسلامی سلطنت کے نام پر ایک ایسی مملکت کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے جو آمریت، فسطائیت، جمہوریت، ملوکیت، غرض ان سب کا عجیب وغریب مجموعہ ہے۔ لطف یہ ہے کہ اسلامی اصولوں کا خون کرنے والے خود ہی پکار پکار کر اسلام زندہ باد کے نعرے لگا رہے ہیں تا کہ ان چیخوں میں اسلام کی درد و کراہ کوئی نہ سن سکے...... اسلامی مملکت کے رہنماؤں پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے انہیں چاہیے کہ پہلے اپنے آپ کو اسلامی اسوہ کا نمونہ بنا کر عوام کے سامنے پیش کریں پھر اسلام کا نام لیں، عمل میں فقدان ہو اور دل زبان کا ساتھ نہ دے تو پھر ان نعروں کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا...... اس وقت تک وہ خدا کے لئے اسلام کے پاک نام کا بے جا

استعمال نہ کریں۔''[28]

آئین کے مسئلے پر لیاقت علی خان کی اس پسپائی کا سیاسی منظر یہ تھا کہ چودھری محمد علی کے بیان کے مطابق اس نے اس وقت تک یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آئین سازی کا کام نئی منتخب دستور ساز اسمبلی سے کرائے گا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ پہلے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کرائے جائیں گے اور جب ملک کے سارے صوبوں میں اس کے مطلب کی حکومتیں بن جائیں گی تو پھر وہ مرکزی اسمبلی کے انتخابات کرائے گا اور پھر اس اسمبلی سے اپنے مطلب کا آئین منظور کرائے گا۔ اس نے یہ فیصلہ نومبر کے مہینے میں مشرقی بنگال اور پنجاب میں بعض واقعات کے پیش نظر کیا تھا جو اس کے لئے نیک شگون کی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ 9ر نومبر کو مشرقی بنگال کے سارے جمہوریت پسند عناصر کے نمائندوں کا ایک قومی کنونشن ہوا تھا جس میں ایک آئینی رپورٹ کے ذریعے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ پاکستان کا آئین قرارداد لاہور کی اساس پر مرتب کیا جائے اور مرکزی حکومت کی تحویل میں صرف تعلقات خارجہ، دفاع اور کرنسی کے امور رکھے جائیں۔ اس کنونشن سے قبل اس مطالبہ کے حق میں مشرقی بنگال کے طول و عرض میں کم از کم دو ہزار جلسے ہو چکے تھے۔

10ر نومبر کو میاں افتخار الدین نے لاہور میں اپنی ''آزاد پاکستان پارٹی'' کے قیام کا اعلان کیا جس کے منشور میں ایک مطالبہ یہ تھا کہ ''موجودہ دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا جائے۔ بالغ حق رائے دہی کے اصولوں پر نئے انتخابات کرائے جائیں اور پھر نئی اسمبلی سے فوراً ایک نیا اور جمہوری آئین منظور کروایا جائے۔ مسلم لیگی لیڈروں کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے کہ ان کا فرمان اسلام کا فرمان ہے اور مسلم لیگ کی مخالفت اسلام کی مخالفت ہے۔'' 17ر نومبر کو پورے پنجاب میں جمعیت العلمائے اسلام کے زیر اہتمام ''یوم شریعت'' منایا گیا اور تقریروں اور قراردادوں کے ذریعے یہ اعلان کیا گیا کہ ''پاکستانی عوام کسی ایسے آئین کو ہرگز قبول نہیں کریں گے جو قرارداد مقاصد اور اسلامی اصولوں کے منافی ہوگا۔'' اور پھر 20ر نومبر کو پنجاب میں مسلم لیگ کے مقابلے میں مختلف سیاسی جماعتوں کے متحدہ محاذ قائم کرنے کے امکانات کا جائزہ لینے کے لئے امیر جماعت اسلامی مولانا مودودی کی زیر صدارت عوامی مسلم لیگ، جناح مسلم لیگ، آزاد پاکستان پارٹی، جمعیت العلمائے اسلام اور جمعیت اہلحدیث کے نمائندوں کا ابتدائی اجلاس ہوا جبکہ مس فاطمہ جناح اپنے آپ کو لیاقت علی خان کے مخالفین کے ساتھ روز بروز زیادہ سے زیادہ وابستہ کر رہی تھیں۔ اس

وقت تک نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ اور حسین شہید سہروردی کے درمیان جناح مسلم لیگ اور عوامی مسلم لیگ کے ادغام کی گفت وشنید کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ مختصر یہ کہ جب لیاقت علی خان نے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کو معرض التوا میں ڈالا، اس وقت مشرقی بنگال میں قومیتی حقوق کی تحریک نے رفتہ رفتہ علیحدگی کی تحریک کی صورت اختیار کرنا شروع کر دی تھی اور پنجاب میں ''اسلامی آئین'' کی مہم دراصل ایک زبردست انتخابی مہم بن چکی تھی۔

باب:12

پنجاب کی انتخابی مہم ...... پنجابی شاونسٹوں اور مُلّاؤں کی جانب سے لیاقت کے خلاف نفاذ اسلام کی مہم

اسلامی آئین اور اسلامی نظام کے مطالبے اور یہ سوال کہ اسلامی نظریہ سے کیا مراد ہے؟ مختلف نظریات!

غالباً لیاقت علی خان کا خیال یہ تھا کہ بنیادی اصولوں کی رپورٹ پر بحث ملتوی کئے جانے سے پنجاب میں ''اسلامی مہم'' کا زور ٹوٹ جائے گا مگر ایسا نہ ہوا بلکہ اس سے اس کے مخالفین کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی اور انہوں نے اپنی مہم میں اور تیزی پیدا کردی کیونکہ ان کی مہم دراصل اسلامی نہیں تھی بلکہ یہ انتخابی تھی۔ ان کا انتباہ یہ تھا کہ ''اس التوا کو تشکیل آئین میں مزید تعویق کا بہانہ نہ بنایا جائے۔ اس معاملہ میں پہلے ہی بڑی ناروا تاخیر ہوچکی ہے...... عوام سے قطعی تجاویز طلب کرنے کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ عوام متبادل تجاویز مرتب کر کے دیں...... اگر التوا محض ایک سٹنٹ ہے تو حکومت کو تعلیمات اسلامیہ بورڈ کی سفارشات شائع کردینی چاہئیں اور لوگوں کو بتانا چاہیے کہ ان سفارشات میں یہ خرابیاں اور نقائص ہیں اور ان وجوہ سے انہیں مسترد کیا گیا ہے۔''[1] اور ابوالاعلیٰ مودودی کا اعلان یہ تھا کہ ''پاکستان میں اسلامی نظام کا قیام ناگزیر ہے۔ اس کے قیام کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کی جاسکتی ہیں اور اس میں تاخیر ہوسکتی ہے مگر اسے قائم ہونے سے روکا نہیں جاسکتا...... اس وقت ملک میں نہایت اہم فیصلے ہورہے ہیں جن کا اثر حال اور مستقبل پر پڑے گا۔ زندہ قومیں اپنے آئین کی تشکیل کو چند اشخاص کے سپرد کر کے خود خاموش نہیں بیٹھی رہتیں...... پاکستانیوں کو چاہیے کہ وہ اس وقت ہوشیار ہوجائیں اور اپنے ملک کے آئین کی تشکیل

میں پورا پورا حصہ لیں کیونکہ اگر اس وقت ہم نے کسی غیر اسلامی آئین کو قبول کر لیا تو ہمیں اور ہماری آنے والی نسلوں کو سخت پریشانی ہوگی اور اس برائی کا انسداد مشکل ہو جائے گا...... حکمران طبقہ قیام پاکستان کے بعد اسلامی نظام کے قیام کا خیال بھول چکا ہے لیکن لوگوں کے پیہم مطالبات کے باعث اسے قرارداد مقاصد پاس کرنا پڑی لیکن اب اس کو بھی پس پشت ڈالا جا رہا ہے۔ عوام کو چاہیے کہ وہ موجودہ آئین ساز اسمبلی کو توڑنے کا مطالبہ کریں تا کہ ایک نئی صحیح معنوں میں نمائندہ اسمبلی ان کے لئے مناسب آئین تیار کر سکے۔''[2]

لطف کی بات یہ تھی کہ جن دنوں ابوالاعلیٰ مودودی اور اس قسم کے دوسرے عناصر بڑے تحکمانہ انداز میں اسلامی آئین، اسلامی نظام اور اسلامی مملکت کا مطالبہ کر رہے تھے ان ہی دنوں پنجاب یونیورسٹی کے اہل علم و دانش اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں سرگرداں تھے کہ اسلامی نظریہ سے کیا مراد ہے؟ یونیورسٹی نے کچھ عرصہ قبل یہ عقدہ حل کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی مقرر کی تھی۔ اس سب کمیٹی نے اس سوال کا جو جواب تلاش کیا اس پر 27 نومبر کو یونیورسٹی کی ساری فیکلٹیز کے اجتماع میں بڑی گرما گرم بحث ہوئی۔ سب کمیٹی کا تلاش کردہ جواب یہ تھا کہ ''اسلامی نظریہ سے مراد یہ ہے کہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ کی زیر نگیں ہے۔ سارے انسان اخوت کے رشتے میں منسلک ہیں اور سب کے سب مکمل طور پر برابری کا درجہ رکھتے ہیں۔ کسی انسان کی دوسروں پر سبقت و برتری کی واحد بنیاد یہ ہے کہ اس کا اخلاق و کردار اچھا ہو جیسا کہ ان انبیا کرام کی زندگیوں سے واضح ہوتا ہے جن کا سلسلہ محمد ﷺ پر ختم ہو گیا تھا۔'' فیکلٹیز کے اجلاس میں اس مسئلہ پر طویل بحث کے باوجود کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور بالآخر ایک اور کمیٹی مقرر کر کے اسے یہ ہدایت کی گئی کہ وہ اس مسئلہ کے بارے میں دو ماہ کے اندر اپنی رپورٹ پیش کرے۔ یہ کمیٹی اورینٹل کالج کے پرنسپل مولوی محمد شفیع (کنوینر)، خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر، ڈاکٹر نیاز احمد، پروفیسر تاج محمد خیال، علامہ علاؤالدین صدیقی اور محکمہ تعلیم کے ڈپٹی ڈائریکٹر شیر محمد ترمذی پر مشتمل تھی۔''[3]

10 دسمبر کو لاہور میں ایک سول لبرٹیز کانفرنس منعقد ہوئی جس میں امیر جماعت اسلامی ابوالاعلیٰ مودودی کے علاوہ آزاد پاکستان پارٹی کے لیڈر افتخار الدین اور کمیونسٹ پارٹی کے ایک لیڈر فیروز الدین منصور نے تقریریں کیں۔ کانفرنس میں مطالبہ کیا گیا کہ تمام غیر جمہوری اور جابرانہ قوانین منسوخ کئے جائیں۔ مقدمہ چلائے بغیر نظر بندی کا سلسلہ بند کیا جائے اور

سارے صوبوں کے سیاسی نظر بندوں کو رہا کیا جائے۔ 13 ردسمبر کو ایسوسی ایٹیڈ پریس کے حوالے سے یہ خبر شائع ہوئی کہ جمعیت العلمائے اسلام کے زیر اہتمام 14 اور 15 رجنوری 1951ء کو علامہ سید سلیمان ندوی کی زیر صدارت ایک خصوصی کانفرنس منعقد ہوگی جس میں قرآن حکیم کی اساس پر آئین کا مسودہ تیار کیا جائے گا اور پھر یہ مسودہ لیاقت علی خان کی دعوت کے مطابق دستور ساز اسمبلی کو پیش کیا جاسکے گا۔ دستور ساز اسمبلی کے دفتر سے اس خبر کا ایسوسی ایٹیڈ پریس کے ہی حوالے سے یہ جواب دیا گیا کہ اب تک اسمبلی کو صرف چار ٹھوس تجاویز موصول ہوئی ہیں اور وہ بھی غیر متعلق اور سطحی ہیں۔ مثلاً ایک تجویز میں یہ کہا گیا ہے کہ سربراہ مملکت کو اللہ کی وفاداری کا حلف اٹھانا چاہیے اور دوسری تجویز یہ ہے کہ زنا کاری، رشوت ستانی اور دوسرے اسی قسم کے جرائم کے سدباب کے لئے فوجداری قوانین میں ترامیم کی جائیں۔ 17 ردسمبر کو خبر یہ تھی کہ حکومت پاکستان ایک کمیشن مقرر کر رہی ہے جو شریعت کی روشنی میں ملک کے موجودہ قوانین پر نظر ثانی کرے گا۔

پنجاب کے بعض نیم تعلیم یافتہ لوگ قوانین میں کس قسم کی ترمیمیں چاہتے تھے اور ان کا ''اسلامی پروگرام'' کیا تھا۔ اس کی چند ایک تصویریں وہاڑی کی انجمن اشاعت اسلام کے سیکرٹری محمد علی مجاہد نے کھینچی تھیں اور انہیں اکتوبر کے اواخر میں روزنامہ امروز کو بھیجا تھا۔ سب سے پہلے قاضی کی تصویر تھی جو جامع مسجد کا امام بھی تھا اور وارنٹ بھی جاری کر سکتا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں قرآن تھا دوسرے میں بید تھا۔ جس سے وہ ایک شخص کو پیٹ رہا تھا۔ یہ شخص باقاعدہ نماز نہیں پڑھتا تھا۔ قاضی زور سے اسے نمازی بنا رہا تھا۔ اس کے نیچے ایک اور ملزم کی تصویر تھی جو روزے نہیں رکھتا تھا اسے بھی مار مار کر روزے دار بنایا جا رہا تھا۔ اس تصویر کے داہنے ہاتھ میں راشی افسر کی تصویر تھی جس کے منہ اور ہاتھ کالے کر کے ایک گدھے پر سوار کر دیا گیا تھا۔ اس کی ناک میں نکیل تھی اور ایک ''اسلامی سپاہی'' جو سبز وردی میں ملبوس تھا نکیل تھامے ہوئے تھا۔ بائیں طرف تین چار ''اسلامی سپاہی'' ایک ملزم کو پکڑے ہوئے تھے اور قاضی ایک ہاتھ میں تسبیح لئے دوسرے ہاتھ سے ملزم کو بید رسید کر رہا تھا۔[4] ایسے عناصر نے اپنے ذہنوں میں اسلامی نظام کے بارے میں اس قسم کی تصویریں قدامت پرست مُلّاؤں سے قرونِ وسطیٰ کے خلافتی عہد کے قصے سن کر بنائی ہوئی تھیں اور جب وہ وزیر اعظم لیاقت علی خان سے لے کر دور افتادہ گاؤں کے مُلّا تک سے یہ سنتے تھے کہ مذہب کو سیاست سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور

1350ء سال پہلے کے اسلامی اصولوں کا عصر حاضر میں بھی بعینہٖ اطلاق ہوسکتا ہے تو ان کے ذہنوں میں ایسی تصویروں کے نقوش اور بھی گہرے ہوجاتے تھے۔

مشرق وسطیٰ کے بعض زعما کے بیانات سے اسلام پسندوں کے اس خیال کو تقویت کہ اسلامی نظام کے نفاذ سے پاکستان ساری دنیا کے لئے مشعل ہدایت بن جائے گا

مشرق وسطیٰ کے بعض ممالک مثلاً ایران، عراق، شام، مصر اور سعودی عرب کے بعض زعما بھی مختلف وجوہ کی بنا پر اسی قسم کے بیانات دیتے رہتے تھے اور ان کے بیانات سے پاکستان کے ان اسلام پسند حلقوں کی بڑی حوصلہ افزائی ہوتی تھی جو واقعی یہ سمجھتے تھے کہ جب پاکستان فی الحقیقت ایک اسلامی مملکت بن جائے گا اور اس میں ان کے تصور کے مطابق اسلامی نظام نافذ ہوگا تو ہمارا ملک کرہ ارض پر مشعل ہدایت کی طرح چمکے گا اور ساری دنیا اس مثالی مملکت سے سبق حاصل کرے گی۔ 18 ر دسمبر کو پاکستانی اخبارات میں مصر کی اخوان المسلمین کے نائب صدر شیخ صالح الشماوی کا اسی مضمون کا ایک بیان شائع ہوا۔ اس کا موقف یہ تھا کہ ''اگرچہ اخوان المسلمین ایک مذہبی تنظیم ہے تاہم سیاسیات سے بے تعلق نہیں رہ سکتی کیونکہ اسلام کی رو سے مذہب کو سیاسیات سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ اس میں معاشرتی و معاشی پالیسی اور حکومت کے بہت سے شعبوں کے بارے میں احکامات موجود ہیں۔ حقیقی مسلمان بننے کے لئے ضروری ہے کہ قرآنی احکامات پر عمل کیا جائے۔''[5]

20 ر دسمبر کو شام کے سفیر عمر بہاالامیری نے کراچی میں عید میلاد کی ایک محفل میں یہ خوشخبری سنائی کہ شام میں قرآن وسنت کی اساس پر آئین مرتب کیا گیا ہے۔ شام ساری دنیا میں پہلا ملک ہے جس کے آئین کی بنیاد کلیتہً قرآن وسنت پر ہے۔ اس نے امید ظاہر کی کہ عنقریب دوسرے سارے ممالک بالخصوص پاکستان میں بھی قرآنی آئین نافذ ہوجائے گا۔''[6] 21 ر دسمبر کو کراچی کے کامرس کالج میں عید میلاد کی تقریب ہوئی تو اس موقع پر بھی شام کے سفیر نے تقریر کی۔ اس نے کہا کہ ''بعض ممالک اور ادارے یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ انہوں نے بنیادی انسانی

حقوق وضع کئے ہیں۔ ان کا دعویٰ غلط ہے۔ کیونکہ اسلام نے 1350ء سال پہلے یہ بنیادی حقوق پوری جامعیت کے ساتھ وضع کر دیئے تھے۔ نوجوانوں کا فرض ہے کہ مذہب نے ان پر جو ذمہ داری عائد کی ہے وہ اسے سنبھالیں اور ساری دنیا میں اپنے بہترین نظام کی تبلیغ کا مشن لے کر باہر نکلیں۔ مسلم دنیا نے اسلام کی سابقہ عظمت کی بحالی کے لئے اپنی ساری امیدیں پاکستان اور اس کے نوجوانوں سے وابستہ کر رکھی ہیں۔'' سعودی عرب کے سفیر عبدالحمید خطیب نے بھی اس موقع پر طلبا سے خطاب کیا اور کہا کہ ''مسلمانان عالم کو اسلامی اصولوں کی روشنی میں اپنے دلوں کو ٹٹولنا چاہیے اور آج کل کی بیمار دنیا کو وہ کچھ دینا چاہیے جس کا ہمارے مذہب میں وعدہ کیا گیا ہے۔'' آخر میں مولانا سلیمان ندوی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ''آج کل کی دنیا میں کمیونزم اور مغربی جمہوریت نے بہت سے مسائل پیدا کر رکھے ہیں اس لئے پاکستان کا عظیم ترین کام یہ ہے کہ وہ دنیا کو ایک تیسرا نظام یعنی اسلام پیش کرے۔ اس مقصد کے لئے بہت محنت وجدوجہد کی ضرورت ہوگی اور پاکستان کے نوجوانوں کو اس جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کرنا ہوگا۔''[7] چونکہ اس قسم کی تقریروں سے پاکستان کے غریب عوام الناس اپنے ملک کے مستقبل کے بارے میں بے انتہا خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے تھے اور چونکہ انہیں یہ تاثر ملتا تھا کہ عنقریب پاکستان ایک مثالی اسلامی مملکت بن جائے گا۔ اس میں اسلامی نظام نافذ ہو جائے گا۔ ان کی اپنی زندگی میں آسودگی آجائے گی اور ان کا ملک ساری دنیا کی رہنمائی کرے گا، اس لئے جب انہیں ارباب اقتدار کے ''غیر اسلامی کردار'' سے اس کا امکان نظر نہیں آتا تھا تو وہ مایوس و برہم ہوتے تھے۔

لیاقت علی کی اسلامی تقریریں اور پنجابی شاونسٹوں اور مُلّاؤں کی جانب سے پنجاب کی انتخابی مہم میں اس پر غیر اسلامی ہونے کے الزامات کی شدت

وزیراعظم لیاقت علی خان ان دنوں ہفتہ عشرہ کے لئے مشرقی بنگال کے دورے پر گیا ہوا تھا۔ اس کے دورے کا اولین مقصد نورالامین کی وزارت کو سہارا دینا تھا جو آئینی رپورٹ پر دو ماہ کی ایجی ٹیشن سے بالکل ڈانواں ڈول ہو چکی تھی۔ اس نے اس مقصد کے تحت میمن سنگھ میں مشرقی بنگال مسلم لیگ کونسل کے ہنگامہ خیز اجلاس میں شرکت کے علاوہ کئی مقامات پر عمائدین کے اجتماعات اور پبلک جلسوں کو بھی خطاب کیا۔ 23 دسمبر کو اس نے راجشاہی میں عید میلاد النبی ﷺ

کے سلسلے میں منعقدہ ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہم بطور شعائر زندگی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے رہنمائی حاصل کریں تو ہمارے سارے مسائل...... دفاع، غربت، مہاجرین کی بحالی اور آئین سازی...... حل ہو سکتے ہیں۔ اس نے کہا کہ ''جدید ازموں'' میں سے کوئی ''ازم'' بھی غربت کے انسداد کے لئے اسلام سے بہتر معاشرتی نظام پیش نہیں کرتا۔ اگر پاکستان کے مقامی باشندے مدینہ کے انصار کی طرح خدمت کریں تو مہاجرین کی آبادکاری میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی اور اگر ہم شہادت کے جذبے سے سرشار ہوں تو دفاعی مسئلہ بھی بآسانی حل ہو جائے گا۔ اس نے کہا کہ پاکستان کے سامنے ایک مشن ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمیں حقیقی اسلامی اصولوں کی، جنہیں دنیا فراموش کر چکی ہے، اساس پر آئین سازی کرنا ہے۔''[8]

لیکن لیاقت علی خان کی اس ''اسلامی تقریر'' کا بھی پنجاب کے ''اسلام پسندوں'' پر کوئی اثر نہ ہوا۔ لیاقت علی خان جب اسلام کے حوالہ سے اس قسم کی تقریریں کرتا تھا تو اس کے ذہن میں کبھی یہ حقیقت جاگزیں نہیں ہوتی تھی کہ اس طرح وہ عوام میں ایسی امیدیں پیدا کرتا تھا جنہیں وہ کبھی پورا نہیں کر سکتا تھا اور یہ کہ وہ اس طرح عوام کو ہمہ وقت سبز باغ دکھا کر زیادہ دیر تک برسر اقتدار نہیں رہ سکتا تھا...... پنجاب کے مُلّاؤں اور شاونسٹوں کو اس کی اس کمزوری کا اچھی طرح علم تھا۔ چنانچہ وہ آئے دن اس کے اور اس کی بیگم کے ''غیر اسلامی طرز زندگی'' پر ناروا حملے کر کے اس کی منافقانہ سیاست کو بے نقاب کرتے تھے۔ اس کی راجشاہی کی ''اسلامی تقریر'' کے دو تین دن بعد 26/دسمبر کو لائل پور (فیصل آباد) میں نواب ممدوٹ کی جناح مسلم لیگ کے زیر اہتمام جلسہ میں بھی اس کی سیاسی فریب کاری پر سخت نکتہ چینی کی گئی۔ اس جلسہ میں صوبہ مسلم لیگ کے سابق صدر عبدالباری کی تقریر یہ تھی کہ ''ساڑھے تین سال میں پاکستان نے صرف ایک قرارداد مقاصد منظور کی ہے حالانکہ اس کے مقابلہ میں ہندوستان نے آئین آٹھ مہینے میں مکمل کر لیا اور قوم نے اسے دو سال گیارہ ماہ میں قبول کر لیا۔ قرارداد مقاصد میں لیاقت علی خان نے کہا تھا کہ پاکستان پر حکومت کا حق صرف خداوند تعالیٰ کو ہے لیکن جب بنیادی حقوق کی رپورٹ آئی تو اس میں اللہ تعالیٰ کا نام ہی نہیں تھا۔ اس پر بھی نادم ہونے کی بجائے آپ نے پنجاب کا دورہ کر کے ہر جگہ یہی فرمایا کہ یہی اسلامی آئین ہے۔ اگر یہ اسلامی آئین نہیں تو پھر خود بنا کے بھیجو۔ اسلامی آئین میں ایک بنیادی اصول ہونا چاہیے کہ پاکستان میں کوئی قانون ساز اسمبلی کوئی ایسا قانون منظور کر کے نافذ نہیں کر سکے

گی جو احکام قرآن وحدیث کے مخالف ہوگا۔ دوسرے پاکستانیوں پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور مسلمان حاکم کی اطاعت فرض ہوگی۔ یہاں منڈل کی طرح کوئی غیر مسلم حاکم نہیں بن سکتا اور اگر کسی مسئلہ پر جھگڑا شروع ہو جائے تو قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کا فیصلہ کیا جائے۔ ایسا فیصلہ کرنے میں ان کو کسی لعنت ملامت سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ اگر لیاقت صاحب کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ اسلامی آئین کیا ہے تو وہ وزارت عظمیٰ کے قابل نہیں اور اگر علم ہے اور جان بوجھ کر اغماض کر رہے ہیں تو تب بھی آپ اس منصب کے قابل نہیں۔ ہم پاکستان میں اسلامی آئین بنوا کر چھوڑیں گے چاہے اس کے لئے ہمیں کتنی ہی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ پاکستان مشیت ایزدی سے بنا ہے اور پاکستان کو قائداعظم کی رہنمائی میں پاکستانی قوم کی قربانیوں سے حاصل کیا گیا ہے۔ مسٹر لیاقت علی خان نے حاصل نہیں کیا۔ آپ کی تو پتلون کی کریز تک بھی خراب نہیں ہوئی۔"[9]

میاں عبدالباری کی یہ تقریر دراصل انتخابی تقریر تھی کیونکہ اسمبلی کے عام انتخابات کے لئے مختلف سیاسی جماعتوں کی طرف سے دسمبر 1950ء میں پورے زور شور سے انتخابی مہم شروع ہو چکی تھی۔ بعض اخبارات کی معتبر ذرائع سے خبر یہ تھی کہ یہ انتخابات 10 / مارچ سے لے کر 20 / مارچ 1951ء تک ہوں گے۔ جماعت اسلامی اس انتخابی مہم میں پیش پیش تھی حالانکہ مولانا مودودی ایک سے زیادہ مرتبہ یہ اعلان کر چکا تھا کہ اس کی جماعت عام سیاسی پارٹیوں کی طرح جماعتی ٹکٹ کی بنیاد پر انتخابات میں حصہ نہیں لے گی البتہ وہ صالح امیدواروں کی حمایت کرے گی خواہ ان کا تعلق کسی بھی پارٹی سے ہو۔ مودودی اور اس کی جماعت اسلامی کے دوسرے لیڈر لیاقت علی خان اور دوسرے مسلم لیگی لیڈروں کی سیاسی اور معاشرتی زندگیوں پر شدید حملے کر کے عوام کو یہ باور کراتے تھے کہ ان لوگوں کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں اور یہ ابتدا ہی سے پاکستان میں اسلامی نظام رائج کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔

پنجاب کی انتخابی مہم میں دولتانہ کی طرف سے مودودی کے مُلّا ازم کے خلاف تقریریں مگر احراری مُلّاؤں کی حوصلہ افزائی

جماعت اسلامی کے جلسوں میں شہروں کے درمیانہ طبقہ کے نیم تعلیم یافتہ لوگ خاصی تعداد میں شریک ہوتے تھے اور یہ بات صوبائی مسلم لیگ کے لیڈر ممتاز دولتانہ کے لئے تشویشناک

تھی۔ چنانچہ اس نے دسمبر 1950ء میں صوبائی مسلم لیگ کا جو انتخابی منشور شائع کیا اس میں اس نے جماعت اسلامی کو اس طرح ہدف تنقید بنایا تھا کہ "ہمارے ملک میں ایسی جماعتیں موجود ہیں جنہوں نے اسلام کو ایک سیاسی سٹنٹ بنا رکھا ہے۔ ایسی جماعتوں سے ہمارا ایک ہی سوال ہے اور وہ یہ کہ کیا اس برصغیر میں قیام پاکستان کے بغیر اسلامی طرز زندگی کا کوئی امکان تھا۔ اگر اس کا جواب صریح نفی ہے تو پھر ان سے پوچھتے ہیں کہ جب پاکستان کی جنگ لڑی جارہی تھی تو اس وقت وہ اور ان کے لیڈر کہاں تھے؟ ہم نے انہیں صف اول میں تلاش کیا جو اسلام کے سچے پرستاروں اور مجاہدین کا صحیح مقام ہوتا ہے لیکن وہ وہاں نہ تھے۔ ہم نے انہیں پچھلی صف میں ڈھونڈا لیکن وہاں بھی ان کا نشان نہ ملا۔ وہ نظر آئے تو صرف دشمنوں کے کیمپ میں، کبھی ان سے ساز باز کرتے ہوئے اور کبھی ان کی شدومد کے ساتھ اعانت کرتے ہوئے۔ آخر میں ہم ان سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا وہ جنہوں نے ایک وقت اسلام کے لئے جہاد کیا اور اس میں فتح مبین حاصل کی، اپنے اس مستقبل کی تعمیر کے اہل ہیں جس کی داغ بیل خود انہوں نے ڈالی یا وہ جن کے دلوں میں اسلام کے لئے تڑپ اچانک اس وقت پیدا ہوئی جبکہ اسلام کا نام لینے سے فوری اور بآسانی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔"[10]

2؍جنوری 1951ء کو ممتاز دولتانہ نے سیالکوٹ کے ایک جلسہ عام میں جماعت اسلامی کا نام لے کر اس کی ملک دشمن سیاست کا ذکر کیا۔ اس نے کہا کہ "ذلیل مُلّا ازم اپنے اینٹی نیشنل ماضی کے پیش نظر اس ملک میں پنپ نہیں سکتا۔ اسلام نے آئین کے کوئی سخت اور مستقل قواعد پیش نہیں کئے۔ بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے جو سفارشات پیش کی ہیں وہ اسلامی اصولوں کے عین مطابق ہیں۔"[11]

دولتانہ نے اپنی اس تقریر میں احراریوں کے مُلّا ازم کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا جنہوں نے گزشتہ تقریباً دو سال سے مسئلہ ختم نبوت کی آڑ لے کر ایک فتنہ برپا کر رکھا تھا۔ احراریوں کے بارے میں دولتانہ کی خاموشی کی وجہ پنجاب کے ہر سیاسی کارکن کو معلوم تھی۔ سب کو پتہ تھا کہ دولتانہ نے احراریوں سے یہ سمجھوتہ کر رکھا ہے کہ وہ عام انتخابات میں مسلم لیگ کے غیر احمدی امیدواروں کی بھرپور حمایت کریں گے اور وہ خود انتخابات میں حصہ نہیں لیں گے۔ احراریوں نے اس شیطانی سمجھوتے کی پوری پابندی کی تھی۔ انہوں نے بطور جماعت انتخابات میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ انہوں نے کوئی انتخابی منشور شائع نہیں کیا تھا۔ وہ بظاہر انتخابی سرگرمیوں سے بالکل الگ تھلگ رہے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی اینٹی لیاقت یا اینٹی مسلم لیگ مہم میں حصہ نہیں لیا تھا۔ حتیٰ

کہ وہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی سفارشات کے خلاف اسلامی مہم سے بھی بے تعلق رہے تھے۔ ان کا ایک ہی مسئلہ تھا اور وہ یہ کہ فرقہ احمدیہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور ظفر اللہ خان کو وزارت خارجہ کے عہدہ سے الگ کیا جائے اور وہ اس مسئلہ کا اپنے حق میں فیصلہ کرانے کے لئے جگہ بہ جگہ فتنہ پرور تبلیغی کانفرنسیں کرتے تھے۔ جبکہ صوبائی حکومت خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی۔ لیاقت علی خان نے بھی احراریوں کی ان سرگرمیوں کی کبھی مذمت نہیں کی تھی۔

مرکزی اور صوبائی حکومتیں احراریوں کی شر انگیز سرگرمیوں کو اس حقیقت کے باوجود نظر انداز کر رہی تھیں کہ اکتوبر 1950ء میں اوکاڑہ اور راولپنڈی میں دو احمدیوں کے قتل کے بعد کراچی کی جماعت احمدیہ نے شدید صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ جماعت احمدیہ کی قرارداد یہ تھی کہ ''احمدیوں کے قتل کی یہ وارداتیں اشتعال انگیز تقریروں کا نتیجہ ہیں جو احراری لیڈر احمدی جماعت کے خلاف کر رہے ہیں۔ جماعت کو تشویش ہے کہ صوبائی اور مرکزی حکومتیں پاکستانی شہریوں کے ایک طبقہ کے خلاف احراریوں کی شرارت آمیز سرگرمیوں کی طرف اب تک توجہ نہیں کر سکیں۔ اس قسم کی سرگرمیوں سے خطرناک صورتحال پیدا ہو چکی ہے۔ دونوں حکومتوں کو چاہیے کہ وہ اس معاملے میں مناسب اقدام کریں۔'' یہ قرارداد جماعت احمدیہ کراچی کے ایک جلسہ میں 20/اکتوبر 1950ء کو منظور کی گئی تھی اور مرکزی حکومت نے اپنی ایک چٹھی کے ساتھ یہ قرارداد 2/نومبر 1950ء کو حکومت پنجاب کو بھیج دی تھی۔ اس پر حکومت پنجاب کا جواب یہ تھا کہ احمدیوں کے خلاف کسی متشددانہ ہنگامے کا کوئی خطرہ نہیں۔ دونوں واقعات قتل کے مقدمات کی سماعت عدالت میں ہو رہی ہے اور اگر احرار (حسب اطلاع) مسلم لیگ کے ساتھ تعاون پر رضامند ہو گئے تو جس فرقہ بندانہ تبلیغ میں وہ مصروف ہیں وہ خود بخود ختم ہو جائے گی۔''[12] ظاہر ہے کہ گورنر نشتر کی صوبائی حکومت کا یہ جواب حقیقت پسندانہ نہیں تھا بلکہ اس کی بنیاد سراسر مسلم لیگ کی سیاسی مصلحت پر تھی لہٰذا صوبائی حکومت کی یہ امید پوری نہ ہو سکتی تھی اور نہ ہوئی۔

احراری۔ دولتانہ گٹھ جوڑ اور احراریوں کی احمدیوں کے خلاف متشددانہ مہم......

جماعت احمدیہ نے پھر بھی پنجاب کے انتخابات میں مسلم لیگ کا ساتھ دیا

احراریوں نے جنوری 1949ء میں اپنی اس قسم کی سرگرمیوں کا آغاز کیا تھا

جبکہ پنجاب مسلم لیگ بری طرح دو دھڑوں میں تقسیم ہو چکی تھی اور عوام الناس مسلم لیگیوں کی باہمی کشمکش اقتدار سے تنگ آ چکے تھے۔ احراریوں نے اس سازگار صورتحال میں ابتدأً سیاست سے کنارہ کشی کا اعلان کیا تھا اور پھر انہوں نے پے در پے تبلیغی کانفرنسیں شروع کر دی تھیں۔ دو تین ماہ تک ان کی تقریروں کے خصوصی نکات یہ ہوتے تھے کہ ''ہم پاکستان کے وفادار ہیں۔ مسلم لیگ کو ملک بھر کی واحد سیاسی جماعت تسلیم کرتے ہیں۔ جہاد کشمیر بالکل حق بجانب تھا اور ملک کے دفاع کو مضبوط کرنے کے لئے عوام کی سعی و جہد کو منظم کرنا چاہیے۔'' مئی 1949ء میں انہوں نے احمدیوں کے خلاف تقریریں شروع کر دی تھیں اور پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کی تقریروں کا لہجہ بد سے بدتر ہوتا چلا گیا تھا تا آنکہ انہوں نے وزیر خارجہ ظفر اللہ خان پر حملے شروع کر دیئے اور یہ الزام عائد کرنا شروع کر دیا تھا کہ ''نہ صرف ظفر اللہ خان بلکہ ملک کی سول اور فوجی انتظامیہ میں جتنے احمدی ہیں وہ سب کے سب غدار ہیں اور مذہبی نقطہ نگاہ سے یہ مرتد اور واجب القتل ہیں۔'' دسمبر 1950ء کے اواخر میں ربوہ میں جماعت احمدیہ کی سہ روزہ کانفرنس ہوئی تو جماعت کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود نے احراریوں کی اشتعال انگیز سرگرمیوں پر پھر تشویش کا اظہار کیا۔ تاہم اس نے اپنے فرقہ کے ارکان کو ہدایت کی کہ ''وہ ملک کے موجودہ ہنگامی حالات میں مسلم لیگ کا ساتھ نہ چھوڑیں۔ جماعت احمدیہ نے مسلم لیگ کے خلاف جناح مسلم لیگ میں شامل ہونے کا کوئی فیصلہ نہیں کیا اور نہ ہی یہ جماعت اپنے کسی الگ پروگرام کے تحت انتخابات میں حصہ لے گی۔ اگرچہ بعض مسلم لیگی اخبارات اور احراریوں نے جماعت کے خلاف الزام تراشی کی رسوا کن مہم شروع کر رکھی ہے تاہم احمدیوں کو فرض اور خدمت کی راہ ترک نہیں کرنی چاہیے۔ ہمارے خلاف یہ الزام جھوٹا ہے کہ ہم ملک کے وفادار نہیں ہیں۔ ہم برصغیر کے مسلمانوں کی جدوجہد کی صف اول میں تھے۔ ہم پاکستان کو ایک اسلامی مملکت تصور کرتے ہیں اس لئے ہم اس سے غداری کرنے کے بارے میں کیسے سوچ سکتے ہیں۔''[13]

مگر مرزا بشیر الدین محمود کی یہ صدائے احتجاج بھی صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ احراریوں نے اپنی اینٹی احمدیہ مہم جاری رکھی اور ارباب اقتدار میں سے کسی نے یہ نہ سوچا کہ اگر ان کی مذہبی اشتعال انگیزی کا بروقت سدباب نہ کیا گیا تو زود یا بدیر اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ وزیر اعظم لیاقت علی

خان اور اس کے رفقا اس لحاظ سے بہت ہی کوتاہ اندیش تھے۔ انہوں نے ایک طرف تو پنجاب میں احراری مُلّاؤں کے ساتھ انتخابی گٹھ جوڑ کر رکھا تھا اور دوسری طرف وہ یہ توقع کرتے تھے کہ غیر احراری علما مذہب کے نام پر اپنی سیاسی دکانیں نہ چمکائیں۔ وہ ایک طرف تو یہ اعلان کرتے تھے کہ پاکستان ایک ایسی مثالی اسلامی مملکت ہوگا جو ساری دنیا کے لئے مشعل ہدایت کی طرح چمکے گا لیکن دوسری طرف وہ پیشہ ور مُلّاؤں سے یہ امید کرتے تھے کہ وہ مغربی طرز کا نیم جمہوری آئین محض اس لئے قبول کرلیں کہ اس پر اسلام کا لیبل چسپاں تھا۔

مُلّاؤں کی جانب سے آئینی تجاویز......سلیمان ندوی کی زیر صدارت مشرقی بنگال جمعیت العلمائے اسلام کانفرنس

لیاقت علی خان نے آئین کے بنیادی اصولوں کے بارے میں تجاویز کی وصولی کے لئے آخری تاریخ 31 ؍جنوری 1951ء مقرر کی ہوئی تھی۔ غالباً اس کا خیال یہ تھا کہ اس طرح ''اسلامی آئین'' کا معاملہ کھٹائی میں پڑا رہے گا اور دریں اثنا وہ صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے انتخابات کے بارے میں اپنے منصوبہ کی تکمیل کر سکے گا مگر یہ اس کی بہت بڑی بھول تھی۔ مذہبی پیشواؤں نے اس کے فیصلے سے خوب فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے پہلے تو ایک ڈیڑھ ماہ تک ان پڑھ اور نیم تعلیم یافتہ عوام میں اسلامی آئین کے بارے میں اپنے ناقابل عمل تصورات کی تبلیغ کی اور پھر وہ لیاقت علی خان کے لئے اپنی تجاویز مرتب کرنے میں لگ گئے۔ اس سلسلے میں پہلی کاروائی 16 ؍جنوری 1951ء کو سلہٹ میں مشرقی بنگال کی جمعیت العلمائے اسلام کی کانفرنس کی صورت میں ہوئی۔ اس کانفرنس کی صدارت علامہ سید سلیمان ندوی نے کی جو اس وقت تک 1500 روپے ماہوار پر تعلیمات اسلامیہ بورڈ کا عہدہ سنبھال چکا تھا۔ ندوی نے اس کانفرنس میں افتتاحی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''پاکستانی عوام کو کمال پاشا کے ترکیہ کی تقلید نہیں کرنی چاہیے۔ پاکستان کی پالیسی یا تو قومیت پر مبنی قرار دی جاسکتی ہے یا اسلامیت پر۔ لیکن اگر یہ پالیسی قومیت کی کمزور بنیادوں پر قائم ہوئی تو ہزاروں بنگالی، پنجابی، پٹھان اور سندھی قومیت کے جذبات سے غلط طور پر فائدہ اٹھا کر پاکستان کے اتحاد کو پاش پاش کرنے کی کوشش کریں گے لہٰذا ہمارے لئے صرف یہ طریق کار باقی رہ جاتا ہے کہ پاکستان کی پالیسی صرف

اسلامیات پر مبنی قرار دیں تا کہ بابائے ملت کے فرمان کے مطابق اس مقدس ملک کے اتحاد کو قائم رکھ سکیں۔ فقہ کے ماہروں کو چاہیے کہ وہ میدان میں آ کر اسلامی آئین مرتب کریں اور اس سلسلے میں عوام کی رہنمائی کریں۔''[14]

17 رجنوری کو کانفرنس نے ملک کے لئے ایک دستوری مسودہ تیار کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ''پاکستان کی حاکمیت خدا کے لئے ہوگی۔ مملکت میں حدود شریعت کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ انسانی زندگی مقدس خیال کی جائے گی اور شریعت کی اجازت کے بغیر انسانی زندگی کو تباہ نہیں کیا جا سکے گا۔ امیر شریعت (ہیڈ آف دی سٹیٹ) اپنی کونسل کی مدد سے حکومت کرے گا۔ حکومت کا نظام وفاقی ہوگا جس میں صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیئے جائیں گے۔ امیر کو پارلیمنٹ منتخب کرے گی۔ وہ ایک نیک اور صالح شخص ہونا چاہیے اور جب تک عوام اس پر اعتماد کریں وہ برسر حکومت رہے گا۔ امیر اپنے ذاتی اور سرکاری اعمال کے لئے عوام کے سامنے جوابدہ ہوگا اور قرآن و سنت کے کسی اصول سے روگردانی کرنے پر عام آدمی کی طرح اس پر عدالت میں مقدمہ چلایا جائے گا۔ امیر شریعت کی امداد کے لئے مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کو آبادی کی بنیاد پر عوام منتخب کریں گے۔ عوام کو امیر کی وفاداری کا حلف اٹھانا ہوگا۔ حکومت کے لئے جماعتی طریقہ کار استعمال نہیں کیا جائے گا بلکہ صرف ان ہی لوگوں کو انتخابات میں کھڑے ہونے کی اجازت دی جائے گی جنہیں عوام پسند کریں گے۔ ہر بالغ کو، جو ریاست کے بنیادی اصولوں پر عمل پیرا ہوگا، ووٹ دینے کا اختیار حاصل ہوگا۔ امیر ''شوریٰ'' کا صدر ہوگا اور اس کی غیر موجودگی میں نائب صدر کو صدر منتخب کیا جائے گا۔ امیر اور شوریٰ کے درمیان اختلاف رائے ہوا تو اس کا فیصلہ شوریٰ کرے گی لیکن جہاں شریعت خاموش ہوگی وہاں شوریٰ کو قرآن و سنت کے ماتحت اس مسئلہ کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہوگا۔ لوگوں کے انفرادی اور اجتماعی امور انصاف کے ساتھ چکانے کے لئے ایک عدلیہ ہوگی جس کا تقرر امیر شریعت کرے گا۔ لیکن یہ امیر کے انتظامی اختیارات کے ماتحت نہ ہوگی۔ عدالت کے دروازے ہر شخص پر کھلے ہوں گے اور ہر ایک کے ساتھ بلا معاوضہ انصاف کیا جائے گا۔ کسی شخص کو اپنی حیثیت، اختیارات یا مرتبہ کی وجہ سے عدالتوں میں پیش ہونے سے مستثنیٰ نہیں کیا جائے گا۔ عدالت ان قوانین کے مطابق انصاف کرے گی جو مجلس شوریٰ میں منظور کئے جائیں گے۔ ہر یونٹ کے لئے ایک عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) ہوگی جہاں ادنیٰ عدالتوں کی اپیلوں کی

سماعت ہوا کرے گی۔ ملک میں ایک سپریم کورٹ بھی ہوگی جسے عدالت عظمیٰ کا نام دیا جائے گا۔ شوریٰ ججوں کے ناموں کی ایک فہرست امیر کو ارسال کیا کرے گی جس میں سے وہ ایسے لوگوں کو نامزد کرے گا جو اسلامی قوانین کی واقفیت میں مہارت رکھتے ہوں گے۔ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دی جائے گی۔ مشرقی بنگال کا دفاع مرکز کے ہاتھ میں ہوگا لیکن مالیات اور دوسرے امور کے اختیارات صوبے کو سونپ دیئے جائیں گے۔'' کانفرنس میں دو قراردادیں بھی منظور کی گئیں جن میں سے ایک میں کہا گیا تھا کہ بنگلہ کو عربی رسم الخط میں رائج کیا جائے اور دوسری قرارداد میں اس بات پر شدید احتجاج کیا گیا کہ سنسر بورڈ پاکستان نے ''حج'' کی فلم دکھانے کی اجازت دے دی ہے۔[15]

جمعیت العلمائے اسلام کے اس مسودۂ دستور کا نفس مضمون بھی تقریباً ایسا ہی تھا جیسا کہ تعلیمات اسلامیہ بورڈ کی اپریل، جولائی اور اگست 1950ء کی تجاویز کا تھا۔ یہ مسودۂ دستور بھی بورڈ کی تجاویز کی طرح ابہامات اور تضادات سے بھرپور تھا۔ اس میں ایک طرف تو قرون وسطیٰ کے خلافتی نظام کا مطالبہ کیا گیا تھا اور دوسری طرف وفاقی حکومت کا بھی ذکر تھا اور مشرقی بنگال کی اس وقت کی مخصوص سیاسی صورتحال کے پیش نظر یہ بھی کہا گیا تھا کہ یونٹوں کو، بالخصوص مشرقی بنگال کو زیادہ سے زیادہ اختیارات ملنے چاہئیں۔ لیکن جمعیت کے مسودۂ دستور اور بورڈ کی تجاویز میں ایک چیز مشترک تھی اور وہ یہ تھی کہ عدلیہ کو غیر محدود اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔ علما کے ہر فرقہ کی طرف سے اس مطالبہ پر زور دینے کی سب سے بڑی وجہ ہر مولوی کی اس خواہش میں مضمر تھی کہ وہ ایسا قاضی بنے کہ جس کے روبرو حکومت کے سارے چھوٹے بڑے اہلکار جوابدہ ہوں۔ بالفاظ دیگر وہ قوم کے ہر شعبہ زندگی میں مولوی کی آمریت کا متمنی تھا جسے عرف عام میں مُلّا ازم، مُلّا ئیت یا تھیوکریسی کہا جاتا تھا۔ قدرتی طور پر وزیراعظم لیاقت علی خان کے لئے مولویوں کا یہ مطالبہ قابل قبول نہیں تھا۔ وہ خود بلاشرکت غیرے اپنی جاگیردارانہ سلطنت، آمریت یا بادشاہت قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس کا پروگرام یہ تھا کہ ایک طرف تو جمہوریت کا ڈھونگ رچایا جائے اور دوسری طرف اسلام کو بطور سیاسی حربہ استعمال کیا جائے۔ وہ مُلّاؤں کو کسی صورت بھی اپنے اقتدار میں شریک کرنے کا خواہاں نہیں تھا۔ گویا اس کی سیاست دوغلی یا منافقانہ تھی۔ وہ جمہوریت یا اسلام کے بارے میں نیک نیت نہیں تھا۔

پنجاب کی انتخابی مہم میں ممدوٹ دھڑے نے مُلاّؤں کی آئینی تجاویز کی حمایت کی

پنجاب میں جنوری 1951ء کی انتخابی مہم کے دوران نواب ممدوٹ کا لیاقت علی خان کے خلاف سب سے بڑا الزام یہی تھا۔ اس سلسلے میں اس کی جنوری کے تیسرے ہفتے میں ایک تقریر یہ تھی کہ ''مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ تعلیمات اسلامیہ بورڈ کے قیام کے وقت بھی موجودہ برسراقتدار طبقہ کی نیت نیک نہیں تھی اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ جب بورڈ تجاویز مرتب کرنے کے لئے بیٹھے گا تو شیعہ۔ سنی اور اس قسم کے تفرقاتی مسائل پیدا ہو جائیں گے اور یہ علما تجاویز مرتب کرنے میں ناکام ہو جائیں گے جس سے ہم عوام کو کہہ سکیں گے کہ اسلامی آئین کے نفاذ میں خود علمائے کرام متفق نہیں ہیں۔ اس طرح سے یہ مسئلہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ علما متفق ہو گئے اور انہوں نے اسلامی آئین کے نفاذ کا مسودہ مرتب کر دیا۔ اب جب ہمارے برسراقتدار طبقہ نے یہ دیکھا کہ ہمیں اسلامی آئین نافذ کرنا پڑے گا اور اس کے نفاذ کے بعد نئے انتخابات کرانے ہوں گے جس سے ہماری وزارتی گدیاں جو ہمیں اتفاقاً میسر آ گئی ہیں چھن جائیں گی تو انہوں نے نہ صرف تعلیمات اسلامیہ بورڈ کی سفارشات کو ماننے سے انکار کر دیا بلکہ سفارشات کو عوام کے سامنے نہ لانے کے ساتھ ساتھ بورڈ کے ممبران کو ہدایت کر دی کہ وہ کسی شخص کو کچھ نہ بتائیں اور ان لوگوں سے جو شریعت سے قطعاً ناواقف ہیں چند سفارشات مرتب کروا کر عوام کے سامنے پیش کر دیں جن میں اسلامی آئین کی بو تک نہیں اور جسے ملک کے تمام علما، عوام اور اخبارات غیر اسلامی قرار دے چکے ہیں۔ مگر ہمارے برسراقتدار اصحاب جو تعلیمات اسلامی سے بے بہرہ ہیں، اسے اسلامی کہہ رہے ہیں۔''[16]

نواب ممدوٹ کا یہ الزام بے بنیاد نہیں تھا۔ لیاقت علی خان کے علاوہ پاکستان میں ایسے دوسرے بہت سے لوگ بھی موجود تھے جو پختگی سے اس رائے کے حامل تھے کہ اسلام کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے علما کسی بھی مسئلہ پر متفق نہیں ہو سکتے چنانچہ یہ لوگ آئے دن اخبارات میں مسلمانوں کی تاریخ کے حوالے دے کر اپنی اس رائے کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ ان کی رائے بودی یا بے وزن نہیں ہوتی تھی۔ تعلیمات اسلامیہ بورڈ نے 1950ء میں جو تجاویز پیش کی

تھیں ان کی حیثیت آئین کے مکمل مسودہ کی نہیں تھی۔ اگر بورڈ کے سپرد مکمل آئین مرتب کرنے کا کام کر دیا جاتا کہ شیعوں، حنفیوں، وہابیوں، دیوبندیوں، بریلویوں، مالکیوں، شافعیوں، حنبلیوں اور دوسرے فرقوں کے مُلّاؤں میں ناگزیر طور پر اختلافات منظر عام پر آجاتے اور پھر جب دیوانی اور فوجداری قوانین کی ازسرنو ترتیب کا سوال اٹھتا تو یہ اختلافات اور بھی شدید ہو جاتے۔ ان مُلّاؤں کے مذہبی اختلافات کی شدت کا یہ عالم تھا کہ یہ ایک دوسرے کے خلاف کفر کے بے شمار فتوے دے چکے تھے۔ یہ ایک دوسرے کی امامت میں نماز نہیں پڑھتے تھے بلکہ کسی ایک جگہ ایک صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا گناہ کبیرہ سمجھتے تھے۔ مثلاً کسی بریلوی کا کسی وہابی کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ کسی بھی مسئلہ پر بہنی سے اتفاق نہیں کرتا تھا۔ اورنگزیب کے عہد میں شیعوں اور سنیوں کے درمیان معاندانہ تضاد پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ راسخ العقیدہ سنی شہنشاہ نے اپنی سلطنت میں حنفی فقہ نافذ کرنے کی کوشش کی تھی۔

مختلف فرقوں کے 35 مُلّاؤں کا دستوری خاکہ پر اتفاق رائے نہ ہو سکا......

محض چند بنیادی اصولوں پر اتفاق رائے...... بقول مودودی اس کی فقط علمی حیثیت تھی

پاکستان کے بیشتر علما کو اپنی مذکورہ کمزوری کا احساس تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے دامن پر سے اس تاریخی دھبے کو دھونے کے لئے جنوری کے تیسرے ہفتے میں کراچی میں ایک مجلس منعقد کی جس میں دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث، شیعہ اور دوسرے بڑے بڑے فرقوں کے تقریباً 35 علما نے شرکت کی۔ لیکن ان میں بابائے پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے اسماعیلی فرقہ اور کراچی کے بہت سے سرمایہ داروں کے بوہرہ فرقہ اور فرقہ اہل قرآن کا کوئی نمائندہ شامل نہیں تھا۔ ظفراللہ خان کے فرقہ احمدیہ کے کسی نمائندے کی شرکت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ یہ سب علما اس فرقہ کو مرتد اور واجب القتل قرار دیتے تھے۔ ایسوسی ایٹیڈ پریس کی اطلاع کے مطابق یہ مجلس پاکستان دستور ساز اسمبلی کے سامنے دستوری تجاویز پیش کرنے کے لئے منعقد ہوئی تھی کیونکہ لیاقت علی خان نے دستوری تجاویز پیش کرنے کے لئے 31 رجنوری 1951ء کی تاریخ

مقرر کر رکھی تھی۔ حسب توقع یہ علما چار دن کی مغز ماری کے باوجود اتفاق رائے سے کوئی مسودہ تیار نہ کر سکے۔ سلہٹ میں 16 رجنوری کو علامہ سید سلیمان ندوی کی زیر صدارت جمعیت العلمائے اسلام کی کانفرنس میں جو مسودہ دستور مرتب ہوا تھا وہ بھی دھرا کا دھرا رہ گیا۔ تاہم اس مجلس میں اسلامی دستور کے بعض بنیادی اصولوں پر اتفاق ہو گیا اور ان اصولوں کا مسودہ علما نے اس مجلس کے اختتام کے بعد دستور ساز اسمبلی کے حکام کو بھیج دیا۔ اس پر امیر جماعت اسلامی ابوالاعلیٰ مودودی بہت جز بز ہوا اور اس نے 31 رجنوری کو اس سلسلے میں اپنے موقف کی وضاحت کی۔ اس کا بیان یہ تھا کہ ''یہ مجلس صرف اس غرض کے لئے منعقد کی گئی تھی کہ مسلمانوں کے تمام بڑے بڑے مذہبی فرقوں کے چیدہ چیدہ اور معتمد علما جمع ہو کر بالاتفاق اسلامی حکومت کے بنیادی اصول وضع کریں تا کہ ساری دنیا کے سامنے ایک طرف غلط فہمی بھی رفع ہو جائے کہ مسلمانوں کے مذہبی فرقوں میں کوئی ایسی چیز متفق علیہ نہیں ہے جس پر ایک اسلامی ریاست قائم کی جا سکے...... اس مجلس میں جو اصول طے کئے گئے ہیں وہ محض ایک علمی اور دینی مقصد کے لئے ہیں نہ کہ کسی خاص ملک کے واضعان دستور کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے۔ ان اصولوں کو دنیا کا ہر وہ ملک قبول کر سکتا ہے جو حق کی پیروی کرنا چاہتا ہو خواہ وہ پاکستان ہو یا ترکی یا مصر یا کوئی اور ملک...... یہ مجلس مختلف عناصر پر مشتمل تھی جن میں سے کوئی ان اصولوں کو دستور ساز اسمبلی کے سامنے پیش کرنے کا قائل تھا اور کوئی صرف ایک علمی خدمت سرانجام دے کر اپنے دوسرے علمی اور تعمیری مشاغل کی طرف واپس جانا چاہتا تھا اور کسی سیاسی جدوجہد میں شریک ہونے کے لئے تیار نہ تھا۔ مختلف عناصر کے درمیان اگر اتفاق ممکن تھا تو صرف اس امر پر کہ اسلامی حکومت کا ایک واضح اور مکمل اور متفق علیہ تصور علمی حیثیت سے پیش کر دیا جائے۔ رہا اس تصور کے مطابق جدوجہد کرنے کے لئے کوئی عملی اقدام، تو اس کے بارے میں کوئی اتفاق وہاں ممکن نہ تھا...... مجلس نے سب سے پہلے بالاتفاق اسلامی حکومت کے بنیادی اصول مرتب کئے۔ اس کے بعد وہ چاہتی تھی کہ ان ہی اصولوں پر دستور کا ایک خاکہ بھی مرتب کرے اور اس غرض کے لئے اس نے مجلس دستور ساز پاکستان سے درخواست کی تھی کہ تعلیمات اسلامیہ بورڈ کے نام سے جو ادارہ اسلامی دستور کی ترتیب میں مدد دینے کے لئے سرکاری طور پر مقرر کیا گیا تھا اس کی مرتب کردہ سفارشات کی ایک نقل اس مجلس کو فراہم کر دی جائے تا کہ جو کام اب تک ہو چکا ہے اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے اور نئے سرے سے

ایک خاکہ مرتب کرنے میں مجلس کا وقت اور محنت ضائع نہ ہو۔لیکن باوجودیکہ مجلس دستور ساز کے صدر محترم کو یہ اطمینان دلایا گیا تھا کہ تعلیمات اسلامیہ بورڈ کی سفارشات کو شائع نہیں کیا جائے گا انہوں نے مجلس علما کو اس کے دیکھنے کی اجازت عطا نہیں فرمائی۔اب چونکہ ممکن نہ تھا کہ مجلس کے شرکا زیادہ دیر تک کراچی میں ٹھہر سکتے اس لئے مجبوراً یہ طے کیا گیا کہ سر دست جو اصول مرتب کئے گئے ہیں ان کو شائع کر دیا جائے اور آئندہ ماہ اپریل میں دوبارہ ایک تفصیلی خاکہ مرتب کرنے کے لئے علما جمع ہوں۔اس مجلس نے بالاتفاق بنیادی حقوق اور بنیادی اصولوں کی سفارشات کو جو دستور ساز اسمبلی کی مقرر کردہ کمیٹیوں نے مرتب کی ہیں اصول اسلامی کے خلاف قرار دیا۔"[17]

ابوالاعلیٰ مودودی کا یہ بیان کئی لحاظ سے مضحکہ خیز اور صداقت سے بعید تھا۔اس نے حسب معمول اپنے اس بیان میں الفاظ کے ہیر پھیر سے حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی تھی۔اس بیان کی ابتدا میں تو یہ کہا گیا کہ علما کی یہ مجلس "محض علمی اور دینی مقصد کے تحت اسلامی حکومت کے بنیادی اصول وضع کرنے کی غرض سے منعقد کی گئی تھی۔" پھر یہ کہا گیا کہ اس مجلس میں اس امر پر اتفاق نہ ہو سکا کہ یہ بنیادی اسلامی اصول دستور ساز اسمبلی کو پیش کئے جائیں یا نہ کئے جائیں اور اس امر پر علما متفق نہ ہو سکے کہ اسلامی حکومت کے تصور کے مطابق جدوجہد کے لئے عملی اقدام کیا جائے یا نہ کیا جائے۔کئی علما کو سیاسی جدوجہد میں کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ صرف اپنا علمی کام ہی کرنا چاہتے تھے اور پھر اس بیان سے آخر میں یہ کہا گیا کہ علما کی یہ مجلس اسلامی حکومت کے بنیادی اصول مرتب کرنے کے بعد دستور کا ایک خاکہ بھی مرتب کرنا چاہتی تھی مگر وہ ایسا اس لئے نہ کر سکی کہ دستور ساز اسمبلی کے صدر نے اسے تعلیمات اسلامیہ بورڈ کی مرتب کردہ سفارشات کی ایک نقل فراہم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ایک ہی بیان میں اس قسم کی تضاد بیانی ابوالاعلیٰ مودودی اچھی طرح کر سکتا تھا۔بقول حمید نظامی وہ کوئی عالم دین نہیں تھا بلکہ محض ایک اچھا انشا پرداز اور ادیب تھا اور بقول چراغ حسن حسرت اسے الفاظ کا طلسم باندھنا اور باتوں کے طوطا مینا بنانا خوب آتا تھا۔لکھنے بیٹھتا تھا تو منطقی مغالطوں کی سلیں اور ردے چنتا چلا جاتا تھا۔وہ مطالب کو خوشنما الفاظ کا ایسا دلفریب جامہ اڑھاتا تھا کہ لوگ مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔مثلاً وہ یہ نہیں لکھتا تھا کہ اسلام کی رو سے بردہ فروشی جائز ہے کہ بلکہ یہ لکھتا تھا کہ "معاوضہ لے کر لونڈی غلاموں کے حقوق ملکیت منتقل کئے جا سکتے ہیں۔"

اس مجلس میں جن علما نے شرکت کی تھی ان میں تعلیمات اسلامیہ بورڈ کے چھ ارکان سید سلیمان ندوی، مفتی محمد شفیع، مفتی جعفر مجتہد، مولانا ظفر احمد انصاری، پروفیسر عبدالخالق اور مولانا محمد اظہر بھی شامل تھے اور ان سب کو معلوم تھا کہ بورڈ نے 1950ء میں دستور ساز اسمبلی کی بنیادی اصولوں کی کمیٹی کو کیا سفارشات کی تھیں لیکن مودودی کا موقف یہ تھا کہ چونکہ دستور ساز اسمبلی کے صدر نے ان سفارشات کی نقل فراہم کرنے سے انکار کر دیا تھا اس لئے مجلس علما دستور کا کوئی خاکہ مرتب نہ کر سکی۔ اس کا یہ موقف غلط تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ مجلس علما اسلامی دستور کا مسودہ مرتب کرنے کے لئے منعقد ہوئی تھی مگر ایسا اس لئے نہیں ہو سکا تھا کہ دستور کی تفصیلات کے بارے میں سارے فرقوں کے علما کے درمیان اتفاق رائے ممکن نہیں تھا۔ مثلاً کوئی وہابی عالم ساری احادیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دستور کی اساس بنانے پر رضامند نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی طرح کوئی شیعہ عالم خلافت راشدہ کے عہد کی روایات کی بنیاد پر مرتب کردہ کسی دستور کو تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم یہ علما جن بنیادی اصولوں پر متفق ہو سکے وہ یہ تھے:

1۔ تمام کائنات پر اختیار اعلیٰ اور تمام قوانین اللہ رب العالمین کے قبضہ میں ہیں۔

2۔ ملک کا قانون قرآن وسنت کی بنیاد پر ہوگا۔ قرآن اور سنت کے خلاف نہ کوئی قانون منظور کیا جائے گا اور نہ کوئی انتظامی حکم جاری کیا جائے گا۔

وضاحتی نوٹ:۔ اگر ملک میں کوئی ایسا قانون رائج ہو جو کہ قرآن اور سنت کے خلاف ہو تو یہ لازمی ہوگا کہ (آئین کے اندر) ایسے قوانین کو ایک مقررہ مدت کے اندر بتدریج ترمیم کر کے اسلامی قانون کے مطابق بنایا جائے یا منسوخ کر دیا جائے۔

3۔ ریاست کی بنیاد جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور مادی تصور پر نہیں ہوگی بلکہ اسلامی نظام حیات کے اصول وضوابط پر ہوگی۔

4۔ ریاست پر لازم ہوگا کہ وہ قرآن اور سنت میں بتائے گئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی پابند ہو اور اسلامی قواعد کے احیا اور ترقی کے لئے اہم اقدامات اٹھائے نیز مختلف مسلمہ مکاتب فکر کی ضروریات کے مطابق اسلامی تعلیم کا بندوبست کرے۔

5۔ ریاست کا فرض ہوگا کہ وہ ملک کے تمام مسلمان شہریوں کے مابین اتحاد اور بھائی چارہ کو مضبوط بنائے اور اس قسم کے غیر اسلامی تعصّبات کی نشوونما کا سدباب کرے جو

نسل، زبان، علاقے یا کسی اور مادی پہلو سے امتیازات کو جنم دیتے ہیں تا کہ ملت اسلامیہ کے اتحاد کو محفوظ اور مضبوط بنایا جا سکے۔

6۔ حکومت پر یہ ذمہ داری عائد ہوگی کہ وہ بلا امتیاز مذہب و نسل ایسے تمام شہریوں کی بنیادی انسانی ضروریات مثلاً خوراک، لباس، رہائش، طبی امداد اور تعلیم کی فراہمی کی ضمانت دے جو کہ عارضی یا مستقل طور پر بے روزگاری، بیماری یا کسی اور وجہ سے اپنی روزی کمانے کے قابل نہیں رہے۔

7۔ شہریوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو اسلامی قانون کے تحت ان کو دیئے گئے ہیں۔ ان کو قانونی حدود میں رہتے ہوئے جان و مال اور عزت و ناموس کے مکمل تحفظ، مذہب و عقیدے کی آزادی، عبادت کی آزادی، شخصی آزادی، نقل و حمل کی آزادی، میل جول کی آزادی، پیشہ کی آزادی، مواقع کے مساوی ہونے اور سرکاری ملازمتوں کے حق کی ضمانت دی جائے گی۔

8۔ کسی شہری کو کسی بھی موقع پر سوائے زیر ضابطہ ان آزادیوں سے محروم نہیں کیا جائے گا اور کسی کو صفائی کا پورا موقع فراہم کئے بغیر اور عدالت کے فیصلہ کے بغیر کسی جرم کی سزا نہیں دی جائے گی۔

9۔ مسلمانوں کے مسلمہ مکتبہ ہائے فکر کو قانونی حدود میں رہتے ہوئے مکمل مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور اپنے پیروکاروں کے لئے مذہبی تعلیم اور اپنے خیالات کے پروپیگنڈا کا مکمل حق حاصل ہوگا۔ ان کے شخصی نوعیت کے معاملات کا انتظام متعلقہ فقہ کے اصولوں کے مطابق کیا جائے گا۔ اس شق کا اہتمام کیا جائے گا کہ اس قسم کے معاملات کا انتظام متعلقہ قاضیوں کے ذریعہ کیا جائے۔

10۔ ریاست کے غیر مسلم شہریوں کو قانونی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے مذہب، عبادت، طرز زندگی، ثقافت اور مذہبی تعلیم کی مکمل آزادی حاصل ہوگی۔ انہیں یہ اختیار ہوگا کہ وہ اپنے شخصی نوعیت کے معاملات کا انتظام اپنے مذہبی قوانین، رہن سہن اور رسم ورواج کے مطابق کریں۔

11۔ غیر مسلموں کے بارے میں شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے ریاست پر جو

ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کو پوری طرح نبھایا جائے گا۔ انہیں مسلمان شہریوں کے برابر وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جن کا پیرا (7) میں ذکر کیا جا چکا ہے۔

12۔ سربراہ مملکت ایک ایسے مسلمان مرد کو ہونا چاہیے جس کی پاکبازی، قابلیت اور فیصلہ صادر کرنے کی اہلیت کے بارے میں عوام یا ان کے نمائندوں کو مکمل اعتماد ہو۔

13۔ ریاست کی انتظامیہ کی ذمہ داری بنیادی طور پر سربراہ مملکت کو حاصل ہوگی اگر وہ چاہے تو اپنے اختیارات کا کوئی جز و کسی فرد یا باڈی کے سپرد کر سکتا ہے۔

14۔ سربراہ مملکت کی حکمرانی مطلق العنان نہیں ہوگی بلکہ شورائی ہوگی یعنی وہ اپنے فرائض کی بجا آوری حکومت میں اہم عہدوں پر فائز افراد اور عوام کے منتخب نمائندوں سے مشورہ کر کے عمل میں لائے گا۔

15۔ سربراہ مملکت کو یہ اختیار حاصل نہیں ہوگا کہ وہ آئین کو کلی یا جزوی طور پر معطل کر دے یا انتظامیہ کو شورائی طریقہ کے بجائے کسی اور طریقے سے چلانا شروع کر دے۔

16۔ جس باڈی کو سربراہ مملکت کے انتخاب کا اختیار دیا جائے گا اسے یہ حق بھی حاصل ہوگا کہ وہ اکثریتی ووٹ سے اسے اقتدار سے علیحدہ بھی کر سکے۔

17۔ شہری حقوق کے سلسلہ میں سربراہ مملکت کو باقی مسلمانوں کے برابر سمجھا جائے گا اور وہ قانون سے بالاتر نہیں ہوگا۔

18۔ تمام شہری، خواہ وہ مملکت کے رکن ہوں، سرکاری افسر ہوں یا نجی حیثیت کے حامل ہوں، یکساں قوانین کے پابند ہوں گے اور ان کا اطلاق یکساں عدالتوں کے ذریعہ عمل میں لایا جائے گا۔

19۔ عدلیہ انتظامیہ سے علیحدہ اور خودمختار ہوگی تا کہ اپنے فرائض کی بجا آوری میں انتظامیہ اس پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

20۔ ایسے نظریات و خیالات کی نشر و اشاعت ممنوع ہوگی جو اسلامی ریاست کے بنیادی اصولوں اور قاعدوں کے منافی سمجھے جائیں گے۔

21۔ ملک کے مختلف حصوں اور علاقوں کو ایک واحد ریاست کا انتظامی یونٹ سمجھا جائے گا۔ وہ نسلی، لسانی یا قبائلی یونٹ نہیں ہوں گے بلکہ محض انتظامی علاقے ہوں گے جن کو

انتظامی سہولت کے پیش نظر جن اختیارات کو ضروری سمجھا جائے گا، مرکز کی بالادستی کے تحت تفویض کر دیئے جائیں گے۔ انہیں علیحدگی اختیار کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔

22۔ آئین کی کوئی وضاحت درست نہیں سمجھی جائے گی جو قرآن اور سنت کے منافی ہوگی۔[18]

ظاہر ہے کہ محض علمی اور دینی مقصد کے تحت وضع کردہ ان اصولوں میں قرون وسطیٰ کے خلافتی نظام حکومت کا مبہم سا نقشہ کھینچا گیا تھا البتہ فرق یہ تھا کہ اس عہد میں خلیفہ کے حکم کو قطعیت حاصل ہوتی تھی اور قاضی بالعموم اہم مسائل پر خلیفہ کی خواہش اور اس کے حکومتی مفاد کو پیش نظر رکھ کر فتوے صادر کرتے تھے لیکن ان اصولوں کے تحت مجوزہ نظام حکومت میں ملک کے ہر قانون یا انتظامی حکم کے اسلام کی رو سے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں فیصلہ کرنے کا قطعی اختیار بظاہر قاضی کو دیا گیا تھا۔ گویا ان علما کی خواہش یہ تھی کہ پاکستان کی اسلامی مملکت میں عملاً قاضیوں یعنی مُلّاؤں کی آمریت قائم کی جائے اور غیر مسلموں اور عورتوں کو پالیسی یا قانون ساز اداروں میں کوئی مقام نہ دیا جائے۔ اس کے باوجود کراچی کی جمعیت العلمائے اسلام کے سیکرٹری مولانا اسد القادری کو ان بنیادی اصولوں سے پوری طرح اتفاق نہیں تھا۔ اس کا ایک اعتراض تو یہ تھا کہ ان اصولوں میں آمرانہ رجحان کے سدباب کے لئے کوئی تجویز شامل نہیں ہے۔ اس کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ ''اگر عدلیہ کو انتظامیہ سے علیحدہ اور خودمختار رکھنا مقصود ہے تو یہ بتانا چاہیے تھا کہ عدلیہ کا سربراہ کون ہوگا اور یہ کہ اگر انتظامیہ کے سربراہ اور عدلیہ کے سربراہ میں اختلاف رائے ہوگا تو کس کا فیصلہ قطعی تصور کیا جائے گا'' اور اس کا تیسرا اعتراض یہ تھا کہ ''اگر قرآن کی آیات کی تفسیر و تعبیر کے بارے میں دو یا دو سے زیادہ فرقوں کے درمیان اختلاف ہوگا تو اس کا تصفیہ کیسے کیا جائے گا۔''[19]

لطف کی بات یہ تھی کہ جن علما نے فرقہ وارانہ اختلافات کو وقتی طور پر پس پشت ڈال کر یہ اصول وضع کئے ان میں ریاست قلات کا قاضی القضاۃ مولانا شمس الحق اور ریاست بہاولپور کا شیخ الجامعۃ العباسیہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی بھی شامل تھے۔ ان دونوں ریاستوں میں بدترین قسم کا جاگیردارانہ استبدادی نظام رائج تھا اور دونوں علما اسلام کے زور سے اس عوام دشمن نظام کی تائید و حمایت کرتے تھے۔ قلات کے قاضی القضاۃ نے کبھی یہ فتویٰ نہیں دیا تھا کہ خان قلات کا

نافذ کردہ کوئی قانون یا انتظامی حکم غیر اسلامی ہے۔ اس کے رویے کا مطلب یہی سمجھا جاسکتا تھا کہ اس کی نظر میں ریاست قلات کا نظام حکومت ان بنیادی اسلامی اصولوں کے عین مطابق تھا۔ اسی طرح بہاولپور کے شیخ الجامعہ نے بھی کبھی امیر بہاولپور کی مطلق العنانیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کی تھی مزید برآں ان علما کی بھاری اکثریت مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا داؤد غزنوی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جیسے علما پر مشتمل تھی جو بار بار یہ فتوے دے چکے تھے کہ جاگیرداری اور زمینداری نظام اسلام کے عین مطابق ہے اور جو لوگ اس نظام کی تنسیخ کا مطالبہ کرتے ہیں وہ ملحد اور کافر ہیں۔ بایں ہمہ نوائے وقت نے علمائے کرام کے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا اور امید ظاہر کی کہ ''عزت مآب لیاقت علی علمائے کرام کا احترام کرتے ہوئے مجوزہ آئین میں ان بنیادی اصولوں کو شامل کرنے کی کوشش کریں گے جو صحیح معنوں میں اسلامی ہیں۔''[20]

پنجاب کی انتخابی مہم میں مُلّاؤں اور مسلم لیگ دونوں نے نفاذ اسلام کے نعرہ کو اپنے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کی...... لیگ نے انتخاب میں دھاندلی کی

اسلامی حکومت کے ان بنیادی اصولوں کی ترتیب میں امیر جماعت اسلامی ابوالاعلیٰ مودودی نے بہت دلچسپی لی تھی۔ وہ کراچی میں اس کام سے فارغ ہو کر جنوری 1951ء کے اواخر میں واپس لاہور پہنچا تو اس نے ان اصولوں کو اخبارات میں اس اعلان کے ساتھ چھپوا دیا کہ ''ان اصولوں کو دنیا کا ہر وہ ملک قبول کر سکتا ہے جو حق کی پیروی کرنا چاہتا ہو خواہ وہ پاکستان ہو یا ترکی یا مصر یا کوئی اور ملک۔'' اس کے بعد اس نے 11رفروری کو لاہور میں انتخابی مہم کا آغاز کرتے ہوئے اعلان کیا کہ جماعت اسلامی کی طرف سے 37 صالحین پنجاب اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیں گے۔ اس وقت تک (25رجنوری 1951ء کو) نواب ممدوٹ کی جناح مسلم لیگ اور حسین شہید سہروردی کی عوامی مسلم لیگ کا ادغام ہو چکا تھا اور ان دونوں نے اپنی نئی جماعت جناح عوامی مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اپنی انتخابی مہم شروع کی ہوئی تھی۔

چونکہ اس مہم میں اسلام کا نام بڑی کثرت سے استعمال ہو رہا تھا اس لئے مسلم لیگی

ارباب اقتدار نے پنجاب کے رائے دہندگان کو یہ باور کرانا ضروری سمجھا کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے ٹھوس اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے 16رفروری کو حکومت پاکستان کے گزٹ میں یہ اعلان کیا گیا کہ فیڈرل کورٹ کے ایک جج محمد اکرم کی زیر صدارت ایک کمیشن مقرر کیا گیا ہے جو ملک کے موجودہ قوانین کو پاکستان دستور ساز اسمبلی کی منظور کردہ قرارداد مقاصد کے سانچے میں ڈھالے گا۔ اس کمیشن میں جسٹس محمد اکرم کے علاوہ محمد بخش میمن، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مفتی جعفر حسین مجتہد، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین اور وزارت قانون کے سیکرٹری شیخ عبدالمجید شامل ہوں گے۔"[21] لیکن حسین شہید سہروردی اس سرکاری اعلان سے مطمئن نہیں تھا اور اس کا اعلان یہ تھا کہ "جب تک مسلم لیگ برسر اقتدار ہے پاکستان اسلامی اصولوں پر مبنی آئین کبھی حاصل نہیں کر سکتا...... اگر آپ نے مسلم لیگ کو شکست نہ دی تو آپ اسلامی اصولوں پر مبنی آئین کبھی حاصل نہیں کر سکیں گے۔"[22] اس کے جواب میں پاکستان کے "اسلام پسند" وزیر صنعت چودھری نذیر احمد خان کا فتویٰ یہ تھا کہ پارلیمانی حزب اختلاف کا نظریہ غیر ضروری اور غیر اسلامی ہے اس لئے عوام کو چاہیے کہ وہ صرف مسلم لیگ کو ووٹ دیں۔"[23] اور وزیر اعظم لیاقت علی خان کا "اسلامی نقطہ نگاہ" یہ تھا کہ اگر عوام پاکستان میں ایک مثالی اسلامی مملکت کے خواب کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو انہیں مسلم لیگ کو مضبوط بنانا چاہیے۔[24]

البتہ ایک لیڈر ایسا تھا جو اسلام کے نام پر ووٹ نہیں مانگتا تھا۔ اس کا نام افتخار الدین تھا۔ تاہم اسے جگہ جگہ "اسلام پسندوں" کی مخالفت درپیش ہوتی تھی۔ اس نے 7رمارچ کو گوجرانوالہ میں ایک جلسہ کیا تو حاضرین میں سے جماعت اسلامی کے ایک رکن نے اسے عجیب امتحان میں ڈال دیا۔ اس "جماعتی صالح" نے کلام پاک کی ایک آیت پڑھی اور پھر افتخار الدین سے دریافت کیا کہ اس کا ترجمہ کیا ہے؟[25] 8رمارچ کو لیاقت علی خان نے گوجرانوالہ میں اسی جگہ انتخابی جلسہ کیا تو اس سے کسی نے کسی قرآنی آیت کا ترجمہ نہ پوچھا۔ اس کی بظاہر وجہ یہ تھی کہ پولیس کا انتظام بڑا سخت تھا۔ لیاقت کی اس موقع پر تقریر یہ تھی کہ "ہمیں اس نصب العین کو فراموش نہیں کرنا چاہیے جس کی تشکیل کے لئے پاکستان بطور ایک آزاد و خود مختار مملکت ظہور میں آیا تھا۔ لاکھوں مسلمانوں نے پاکستان کے لئے اپنی جانیں اس لئے قربان نہیں کی تھیں کہ دنیا کے نقشے پر ایک اور ملک کا اضافہ ہو جائے یا پاکستانیوں کو مادی آسودگیاں مہیا ہوں، انہوں نے یہ بے مثال

قربانی اس لئے دی تھی کہ مسلم قوم کو ایک ایسا علاقہ مل جائے جہاں وہ بلا روک ٹوک اسلامی اصولوں کے مطابق زندگیاں بسر کر سکیں اور اپنے عمل سے دنیا پر ظاہر کر سکیں کہ بنی نوع انسان کے لئے امن، ترقی اور خوشحالی کا راستہ یہ ہے کہ وہ اسلامی طرز زندگی اختیار کرے۔"[26] لیاقت علی خان کی اس تقریر کا مطلب یہ تھا کہ اس نے امریکہ میں "اسلامی طرز زندگی" کی جو اصطلاح اپنائی تھی وہ اس پر مصر تھا حالانکہ پاکستان کے مفتیان دین متین کا فتویٰ یہ تھا کہ خود اس کا اور اس کی بیگم کا طرز زندگی اسلامی نہیں تھا اور وہ پاکستان میں اسلامی طرز زندگی رائج کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

لیاقت علی خان کی اس تقریر کے دو ایک دن بعد صوبائی اسمبلی کے لئے پولنگ شروع ہو گیا جو ہفتہ عشرہ تک جاری رہا۔ اس پولنگ کے دوران ایک حقیقت بالکل واضح تھی کہ اس وقت تک پنجاب کے چھوٹے بڑے شہروں میں مسلم لیگ کی سیاسی ساکھ تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ تاہم جب مارچ کے اواخر میں انتخابی نتائج کا اعلان ہوا تو پتہ چلا کہ مسلم لیگ نے صوبائی ایوان کی 196 نشستوں میں سے 140 نشستیں جیت لی تھیں۔ جناح عوامی مسلم لیگ نے 32 نشستیں حاصل کی تھیں اور جماعت اسلامی کا صرف ایک امیدوار کامیاب ہوا تھا۔ چونکہ ان انتخابات کے دوران کئی جگہ کھلم کھلا دھاندلی ہوئی تھی اس لئے صوبہ میں مسلم لیگ کو اس کی "شاندار" انتخابی کامیابی کے باوجود سیاسی لحاظ سے سخت نقصان پہنچا۔ پنجاب کے شہروں میں یہ تاثر عام ہو گیا تھا کہ لیاقت علی خان اور مسلم لیگ کو بذریعہ انتخابات اقتدار کی گدی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ انتخابی نتائج کے اس اعلان سے قبل 17 رمارچ کو صوبہ سرحد کی اسمبلی نئے انتخابات کی غرض سے توڑی جا چکی تھی اور اس کے ارکان کی تعداد 50 سے بڑھا کر 88 کر دی گئی تھی اور پھر 19 رمارچ کو مرکزی اسمبلی کا بجٹ سیشن شروع ہو چکا تھا۔

باب:13

ملک میں مذہبی جنون کی فضا اور لیاقت علی کا قتل

ہسٹری کانفرنس اور مرکزی اسمبلی میں نفاذ اسلام کے مختلف اقدامات کی قراردادیں اور تقریریں

31/مارچ 1951ء کو کراچی میں پہلی سہ روزہ ہسٹری کانفرنس ہوئی تو وزیر بحالیات ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ''اب ہمیں برصغیر میں مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ اس طرح کرنا چاہیے کہ پاکستان میں صوبہ پرستی پر قابو پایا جاسکے اور جذبہ حب الوطنی کو فروغ ملے۔ ہمارے آباؤاجداد نے نہ صرف برصغیر کے بلکہ ساری دنیا کے ثقافتی ورثہ میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔'' اس نے برصغیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت پیدا کرنے کی ذمہ داری انگریزوں پر عائد کی ''جنہوں نے اس مقصد کے لئے نیا نظام تعلیم رائج کیا تھا۔'' 2/اپریل کو اس کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں سید سلیمان ندوی نے مسلمانوں کے عہد اقتدار کی نئے سرے سے تاریخ لکھنے کی ضرورت پر زور دیا تاکہ قوم کی تعمیر میں تاریخ سے مدد مل سکے۔ اس نے کہا کہ ''انگریزوں نے نصاب تعلیم میں مسلمانوں کی تاریخ کے مسخ شدہ حقائق شامل کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خلیج حائل کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوئے۔ تاہم مسلمانوں کے لئے اس برائی کا اچھا نتیجہ برآمد ہوا کیونکہ اب انہوں نے اپنی ایک آزاد مملکت قائم کرلی ہے۔''[1]

4/اپریل کو مرکزی اسمبلی میں غیر سرکاری کاروائی کا دن تھا۔ چنانچہ اس دن مشرقی بنگال کے مسلم لیگی رکن نور احمد کے پانچ بل پیش ہوئے جو کسی بحث کے بغیر منتخب کمیٹی کے سپرد کر

دیئے گئے۔ ان بلوں میں ایک بل یہ تھا کہ ''زنا کاری کا الزام ثابت ہونے پر مرد کے ساتھ عورت کو بھی اسلامی احکامات کے مطابق درّوں کی سزا دی جائے اور رشوت خوروں، اغوا کنندگان اور غاصبوں وغیرہ کے لئے بھی دروں کی سزا مقرر کی جائے کیونکہ اسلامی مملکت پاکستان میں ایسی عبرتناک سزاؤں کے بغیر معاشرے کی تطہیر ممکن نہیں ہوگی۔''[2] عام حالات میں نور احمد کا یہ بل اسمبلی میں پیش نہیں ہونا چاہیے تھا اور نہ ہی اس کی اخبارات میں کوئی تشہیر ہونی چاہیے تھی کیونکہ مرکزی حکومت موجودہ قوانین کو قرارداد مقاصد کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے پہلے ہی فیڈرل کورٹ کے ایک جج کی زیر صدارت ایک کمیشن مقرر کر چکی تھی۔ لیکن اس قرارداد مقاصد نے گزشتہ دو سال میں اسلام فروشی کا بازار اس قدر گرم کر دیا تھا کہ ہر شخص اپنی سیاسی دکان کی مشہوری کے لئے اس جنس کا شب و روز کاروبار کرتا تھا۔ اسلام فروشی کی انتہا یہ تھی کہ پاکستان میں بیشتر طبیب، یونانی طب کو اسلامی طب کہنے پر مصر تھے۔ ہومیو پیتھک ڈاکٹر اپنے طریقۂ علاج کو اسلامی قرار دیتے تھے۔ کراچی کے حجام نہ صرف اپنی اسلامی تنظیم بلکہ اپنی اسلامی یونیورسٹی قائم کرنے کا اعلان کرتے تھے۔ زندہ ناچ گانے کرانے والے بھی رنگارنگ پروگرام میں کوئی نہ کوئی اسلامی رنگ ضرور شامل کرتے تھے اور پنجاب کا نیا وزیراعلیٰ ممتاز دولتانہ جمعہ کو بادشاہی مسجد میں جا کر نمازیوں کی شکایات سنتا تھا اور ان سے درخواستیں وصول کرتا تھا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور سید سلیمان ندوی یہ نہیں کہتے تھے کہ برصغیر میں مسلم عہد کی تاریخ نویسی کی بنیاد حقائق پر ہونی چاہیے بلکہ یہ کہتے تھے کہ تاریخ اس طرح کی ہونی چاہیے کہ جو پاکستان کے حکمران طبقہ کے آج کل اسلامی مفادات کے فروغ میں مددگار ثابت ہو۔

7 اپریل کو مرکزی اسمبلی نے مشرقی بنگال کے ایک رکن اسد اللہ جان کی پیش کردہ ایک قرارداد منظور کی جس میں حکومت پاکستان کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ قرآن پاک کی تعلیم لازمی قرار دینے کے لئے بلا تاخیر مؤثر اقدامات کرے۔ یہ اسد اللہ جان مولانا شبیر احمد عثمانی کی جگہ مرکزی اسمبلی میں لایا گیا تھا چنانچہ یہ اپنی اس قرارداد کے ذریعے یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ اسلام کا اتنا ہی علمبردار ہے جتنا کہ مولانا عثمانی مرحوم تھا۔ ڈان کی رپورٹ کے مطابق اس قرارداد پر بحث کے دوران پورا ایوان مذہبی جذبے سے مغلوب رہا۔ جن ارکان نے اس مسئلہ پر تقریریں کیں انہوں نے اسلام کے لئے بڑی عقیدت کا اظہار کیا اور اپنی تقریروں کی ابتدا بسم اللہ الرحمن الرحیم

سے کی۔ چودھری معظم حسین نے اپنی تقریر قرآن پاک کی ایک آیت سے شروع کی۔ وہ اس مقصد کے لئے قرآن کا ایک نسخہ اپنے ساتھ لایا ہوا تھا۔[3] جب 8/اپریل کو مرکزی اسمبلی کا اجلاس ہوا تو یہ مسئلہ زیر بحث آگیا کہ پاکستان میں ہفتہ وار چھٹی جمعہ کو ہونی چاہیے یا اتوار کو۔ اس پر وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین نے یقین دلایا کہ حکومت اس کے بارے میں ایک ماہ کے اندر کوئی نہ کوئی فیصلہ کر دے گی۔[4]

دوسری آل پاکستان پولیٹیکل سائنس کانفرنس میں اسلامی آئین اور نظام حکومت کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر

9/اپریل کو پشاور میں دوسری سہ روزہ پولیٹیکل سائنس کانفرنس منعقد ہوئی تو صوبائی گورنر آئی۔ آئی۔ چندریگر نے اپنی افتتاحی تقریر میں یہ رائے ظاہر کی کہ ''اسلام ایک ترقی پسند مذہب ہے۔ قرآن پاک نے ہمیں جو احکامات دیئے ہیں ان کے لئے عمومی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔ اس طرح ہمیں یہ اختیار دیا گیا ہے کہ ہم اپنے حالات کے مطابق جس طرح کا چاہیں آئین مرتب کر لیں اور جس طرح کا چاہیں نظام حکومت قائم کر لیں۔ رسول اکرم ﷺ نے بھی ہمیں کوئی بے لچک ہدایات نہیں دی ہوئی ہیں اور خلفائے راشدین کی روایات میں بھی یکسانیت نہیں ہے۔'' پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ایم۔ غیور نے اپنے استقبالیہ خطبہ میں گورنر کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ ''قرآن و حدیث میں مملکت کے آئین، سرکاری اہلکاروں کے اختیارات اور طریقہ انتخابات کے بارے میں کوئی واضح ہدایات موجود نہیں ہیں۔ خلفائے راشدین میں سے ہر ایک کا تقرر مختلف طریقے سے ہوا تھا اور ہر ایک نے اپنے وقت کے حالات کے مطابق طریق حکومت اختیار کیا تھا۔[5]

اگرچہ اس کانفرنس میں زیادہ تر ایسے دانشوروں کو مدعو کیا گیا تھا جو اسلامی آئین اور اسلام نظام حکومت کے بارے میں سرکاری نقطہ نگاہ سے اتفاق کرتے تھے۔ تاہم کانفرنس کے سیکرٹری ڈاکٹر محمد عزیز احمد نے 1950ء کی کانفرنس میں مقرر کردہ آئینی کمیٹی کی جو رپورٹ پیش کی وہ قدامت پرست مُلّاؤں کے ''اسلامی تصورات'' پر ہی مشتمل تھی۔ ڈاکٹر عزیز نے بتایا کہ ''کمیٹی نے پاکستان کے لئے ایک ایسے وفاقی طرز حکومت کی سفارش کی ہے جو موجودہ وفاقی حکومتوں سے

مختلف ہو گی۔ کمیٹی کی رائے میں اسلامی مملکت پاکستان میں ایک سے زیادہ پارٹیوں کی گنجائش نہیں ہو گی۔ عالم لوگ محدود حق رائے دہی کے اصول پر ''امیر'' کا انتخاب کریں گے۔ امارت کے امیدواروں اور رائے دہندگان کے لئے یہ عہد لازم ہو گا کہ وہ شریعت اسلامی کے پابند رہیں گے۔ امیر، مرکزی وزیراعظم، صوبائی وزرائے اعظم اور دیگر وزرا کو مقرر کرے گا۔ صوبائی حکومتوں کے کام کی معاونت کے لئے یہ امیر نائب امیر مقرر کرے گا۔ امیر فوج کا سپہ سالار ہو گا اور اسلامی حکومت کے مخصوص کردار کو قائم رکھے گا۔ امیر کو قانون اسلامی سے بالاتر شمار نہیں کیا جائے گا اور رائے دہندگان کی ایک مقررہ تعداد اسے اس کے عہدہ سے برطرف کر سکے گی۔ کمیٹی کی رائے یہ ہے کہ حکومت کو شریعت اسلام کے خلاف کوئی قانون بنانے کا اختیار نہیں ہونا چاہیے۔ عدلیہ کے ارکان، مجلس قانون ساز اور کابینہ سے آزاد ہونے چاہئیں اور عدلیہ کو اختیار ہونا چاہیے کہ وہ کسی ایسے قانون کو مسترد کر دے جسے امیر منظور کر چکا ہو۔'' یہ کمیٹی 14 ارکان پر مشتمل تھی لیکن ان میں سے جن ارکان نے یہ تجویز مرتب کرنے کے کام میں شرکت کرنے کی زحمت کی تھی ان کی تعداد صرف چھ تھی اور ان چھ میں سے پانچ پنجابی تھے اور ایک یو۔ پی کا تھا۔

صوبہ سرحد کے وزیراعلیٰ عبدالقیوم خان نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''پاکستان کا ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ پاکستان کا دستور قرآن حکیم اور سنت نبوی کی روشنی میں تیار ہو۔ لیکن پاکستان میں ایک چھوٹی سی جماعت ایسی بھی موجود ہے جو دوسروں کی نسبت اپنے آپ کو زیادہ مذہبی تصور کرتی ہے۔ اس کی غرض و غایت یہ ہے کہ اسلامی قوانین کے بارے میں اس نے جو خاص مفہوم طے کر رکھا ہے پاکستان کے سارے باشندے اس کو درست تسلیم کریں۔ اگر اس چھوٹے سے گروہ کا یہ مفہوم منظور کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے عوام کے نمائندوں کی وساطت سے دستور بنانے کا جو جمہوری اقدام اختیار کر رکھا ہے اس پر پانی پھر جائے۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کو مخالفین کے نعروں سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے اور جلد سے جلد پاکستان کا دستور بنا لینا چاہیے۔ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا ہمارے آئین میں اسلامی مقتضیات کے پیش نظر خود بخود ترمیمیں ہوتی رہیں گی۔[6] اس نے کہا کہ ''قرآن کی رو سے ایک مسلم مملکت میں ایگزیکٹو افسروں کی اطاعت دراصل امیر کی اطاعت ہے، رسول پاک ﷺ کی اطاعت ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ اسلامی مملکت میں ایک ایگزیکٹو افسر کو صرف دنیاوی امور پر ہی نہیں بلکہ اسے دینی

امور کے بارے میں بھی اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ اسلامی مملکت میں کثیر الجماعتی نظام قائم نہیں ہوسکتا۔ جولوگ قوم کومختلف پارٹیوں میں منقسم کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ دراصل فرعونوں کی سنت پرعمل پیرا ہیں۔ لہٰذا اسلامی مملکت کی حکومت کا فرض ہے کہ وہ عوام الناس کو پوری طرح متحد رکھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس مقصد کے لئے جنگ کی تھی حالانکہ بعض احباب نے انہیں ایسا نہ کرنے مشورہ دیا تھا۔"[7]

وزیر مملکت ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے "حاکمیت اور ایگزیکٹو گورنمنٹ کے تصور" کے موضوع پر تقریر کی۔ اس نے کہا کہ "جب ہم کہتے ہیں کہ پوری کائنات پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ہے تو اس سے ہمارا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ دنیاوی امور پر عوام الناس کو کلی اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ اسلام کی رو سے عوام دنیاوی امور میں مختار مطلق ہیں۔ وہ چاہیں تو صراط مستقیم کو چھوڑ کر گمراہی کا راستہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ پاکستان کے عوام صراط مستقیم سے منحرف ہو جائیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ کائنات پر اللہ کی حاکمیت ختم ہو جائے گی۔ اس نے کہا کہ "اسلام کے ترقی پسندانہ پہلو کا تقاضا یہ ہے کہ ہم شریعت کی از سرنو تعبیر وتشریح کریں۔ اگرچہ اسلام کے علما کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وہ اغراض پرستی سے بالاتر رہتے ہیں لیکن ہمیں ایسی بہت سی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ جن کے مطابق علما نے اپنی پوزیشن سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ملک کو نقصان پہنچایا تھا۔ اسلام ایک ایسے سیکولر معاشرے کا تصور پیش کرتا ہے جو اسلام کے اصولوں کو مانتا ہو اور اس بنا پر اس کی تعلیمات پر عمل کرتا ہو۔"[8]

لیاقت اور دولتانہ کی غیر جمہوری روش اور اس کے خلاف مس فاطمہ جناح کی مہم

پشاور میں مذکورہ کانفرنس 11 راپریل کو ختم ہوئی تو پنجاب میں ممتاز دولتانہ کی حکومت نے اسی دن اسلام اور پنجاب کے نام پر لیاقت علی خان کے شدید ترین مخالف روزنامہ نوائے وقت کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی اور پھر 13 راپریل کو کراچی سے یہ خبر آئی کہ دستور ساز اسمبلی کو ملک کے مختلف حلقوں کی جانب سے جو آئینی تجاویز موصول ہوئی ہیں ان پر غور کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی مقرر کر دی گئی ہے۔ 13 ارکان کی یہ سب کمیٹی اکتوبر یا نومبر 1951ء میں اپنی رپورٹ پیش کرے گی۔ لیاقت علی خان کے اس فیصلے کی تعبیر یہ تھی کہ اب اسے آئین سازی کے کام میں کوئی

جلدی نہیں تھی۔ وہ پنجاب اسمبلی کے ''انتخاب'' کروا چکا تھا۔ اب اس کا پروگرام یہ تھا کہ وہ اسی طرح کے انتخابات صوبہ سرحد کی اسمبلی، صوبہ سندھ کی اسمبلی، مشرقی بنگال کی اسمبلی اور مرکزی اسمبلی کے کرائے گا اور پھر وہ اپنی مرضی کی دستور ساز اسمبلی سے اپنی مرضی کا آئین بنوائے گا۔ اگرچہ اس نے اپنے اس پروگرام کا باقاعدہ اعلان تو نہیں کیا تھا لیکن بہت سی علامتوں سے بہت سے سیاسی مبصرین کو اس کا پتہ چل گیا تھا۔ چنانچہ مس فاطمہ جناح، جو اس وقت تک خاصی کھل کر لیاقت علی خان کے مخالف محاذ آرائی پر اتر آئی تھیں، انہوں نے 28/ اپریل کو گجرات میں زمیندارہ کالج کے طلبا کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''ہمارا نیا دستور ہنوز زیر ترتیب ہے اور تین طویل سال گزرنے کے باوجود اب بھی اس کے بسرعت پایہ تکمیل تک پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میرے حالیہ دورہ لاہور کے موقع پر مجھے دستور کی تدوین میں تاخیر کی طرف متوجہ کیا گیا۔ اس غیر معمولی تاخیر کو سمجھنے سے میں خود قاصر ہوں۔ کسی قوم کی آزادی کی بنیاد اس کے دستور پر ہوتی ہے اور وہ اس وقت تک ترقی کے مدارج طے نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کے دستور کا نفاذ نہ ہو جائے۔ اس لئے اس اہم قومی ضرورت کی تکمیل کی طرف فوری توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ نوجوانو! ایک آزاد ملک میں تم کو اپنی ذمہ داریاں یاد رکھنی چاہئیں...... ہمارے عوام کا یہی مطالبہ ہے کہ پاکستان کی بنیاد صحیح جمہوریت کے اصولوں پر رکھی جائے جس میں مساوات اور عدل و انصاف کی بنیاد پر ہر شخص ترقی کر سکے۔''[9]

مدیر نوائے وقت نے اپنے ادارتی کالم میں خاتون پاکستان کی تقریر کے اس پیراگراف کا حوالہ دے کر یہ تبصرہ کیا کہ ''یہ الفاظ ہماری طرف سے کسی اضافہ کے محتاج نہیں۔ کاش خاتون پاکستان کی یہ تنبیہ ان سست گام بزرگوں کے لئے جو پاکستان کے نئے آئین کی تشکیل کے لئے ذمہ دار ہیں، تازیانۂ شوق کا کام دے۔''[10] اور روزنامہ امروز کا تبصرہ یہ تھا کہ ''ابتداً آئین سازی میں تاخیر کی تاویل کرتے ہوئے بہانہ کیا گیا کہ پاکستان میں اس کام میں مدد لینے کے لئے کتب خانہ نہیں ہے اور دوسرے ملکوں سے کتابیں حاصل کرنے میں تاخیر ہو رہی ہے۔ پھر یہ بھی خیال تھا کہ شاید ہمارے ملک کا نہایت ہی مکمل اور مثالی آئین بنایا جا رہا ہے اس لئے تاخیر ہونا بالکل فطری ہے لیکن جب ''بنیادی اصولوں'' اور ''بنیادی حقوق'' کی رپورٹیں منظر عام پر آئیں تو رائے عامہ کو سخت مایوسی ہوئی۔ اول تو یہ امر تعجب خیز تھا کہ ایسی رپورٹیں مدون کرنے میں جو 1935ء کے آئین حکومت ہند سے بہت مشابہ ہیں اس قدر تاخیر کیوں ہوئی۔ دوسرے اس پر افسوس کہ جن رپورٹوں میں جمہوریت کے بنیادی

اصولوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہو وہ ہمارے قومی عزائم کی کس طرح تشفی کر سکتی ہیں..... محترمہ فاطمہ جناح قوم کے شکریہ کی مستحق ہیں کہ انہوں نے عوام کے جذبات وخواہشات کی ترجمانی کر دی۔"[11] مس فاطمہ جناح کی اس تقریر اور اس پر لاہور کے اخبارات کے اس قسم کے تبصروں کا مطلب یہ تھا کہ آئندہ پنجاب میں لیاقت علی خان کی مخالفت اس بنیاد پر ہو گی کہ یہ شخص آئین سازی کے کام میں تاخیر کر کے ملک کی ترقی کے راستے مسدود کر رہا ہے۔

مس فاطمہ جناح نے اپنی اس تقریر میں اسلامی آئین یا اسلامی نظام کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ اول اس لئے کہ وہ خود اسماعیلیہ فرقہ سے تعلق رکھتی تھیں اور اس حیثیت سے اس اسلامی تصور سے کوئی تعلق نہیں تھا جس کا عام طور پر مُلّاؤں کی جانب سے ذکر کیا جاتا تھا۔ دوئم اس لئے کہ وہ اپنے مرحوم بھائی کی طرح مغرب کی جدید جمہوریت کی قائل تھیں اور مُلّائیت کے سخت خلاف تھیں۔ اور سوئم اس لئے کہ مُلّاؤں کے اسلامی تصور میں عورتوں کے لئے کوئی مقام نہیں تھا۔

پنجاب کے انتخابات میں لیاقت، دولتانہ دھڑے کی کامیابی پر احراریوں کے "یوم تشکر" احمدیوں کے خلاف پرتشدد مہم بن گئے...... مذہبی جنون کی فضا نے جنم لے لیا

ان دنوں احراری مُلّا سب سے زیادہ سرگرم تھے۔ جماعت اسلامی اور دوسری مذہبی جماعتوں کے مُلّا قدرے خاموش تھے کیونکہ پنجاب کے انتخابات میں بری طرح شکست کھانے کے بعد وہ ابھی تک سنبھل نہیں پائے تھے۔ احراریوں کے غیر معمولی طور پر سرگرم ہونے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے پنجاب اسمبلی کے انتخابات میں اس لحاظ سے شاندار کامیابی حاصل کی تھی کہ کوئی ایک احمدی امیدوار بھی کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ البتہ ایک احراری نوابزادہ نصر اللہ خان مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہو گیا تھا۔ احراریوں کی یہ "شاندار" فتح ان کی گزشتہ تقریباً دو سال کی تبلیغی کانفرنسوں اور مسلم لیگ کے ساتھ گٹھ جوڑ کا نتیجہ تھی۔ اس گٹھ جوڑ کی بنیاد یہ تھی کہ مجلس احرار صوبائی انتخابات میں مسلم لیگی امیدواروں کی حمایت کرے گی ماسوا ان لیگی امیدواروں کے جو احمدی ہوں گے۔ چنانچہ جب مارچ کے اواخر میں انتخابی نتائج کا اعلان مکمل ہوا تھا تو انہوں نے اعلان کیا

تھا کہ وہ دو ماہ تک ''یوم تشکر'' منائیں گے۔ گوجرانوالہ میں ''یوم تشکر'' کا پہلا جلسہ 30 ر مارچ کو ہوا۔ 29 ر مارچ کو جب اس جلسہ کا اعلان کیا جارہا تھا تو اس کی وجہ سے ایک احمدی اور ایک غیر احمدی کے درمیان جھڑپ ہوگئی۔ جس میں غیر احمدی زخمی ہوا۔[12]

منٹگمری (ساہیوال) میں یہ یوم 15 ر اپریل کو جامعہ رشیدیہ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر منایا گیا۔ مولوی محمد علی جالندھری نے اپنی تقریر میں مارچ 1951ء کے راولپنڈی سازش کیس میں ایک احمدی میجر جنرل نذیر احمد کے ملوث ہونے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''پاکستان کی ہوائی فوج میں اسی فیصد پائلٹ احمدی ہیں۔ راولپنڈی کی سازش کے انکشاف سے احمدی افسروں کی غداری بے نقاب ہو چکی ہے۔ اس سازش نے حکومت کو حقائق کی طرف سے خبردار کردیا ہے۔ میرے پاس تحریری شہادتیں موجود ہیں جن سے اس سازش میں احمدیوں کی شمولیت ظاہر ہے اور چودھری ظفر اللہ خان نے امریکہ میں پریذیڈنٹ کے محل کے عین سامنے ایک عظیم الشان عمارت خریدی ہے تاکہ وہاں احمدیت کی تبلیغ کی جائے۔'' لائل پور (فیصل آباد) میں ''یوم تشکر'' کا ڈرامہ 20 ر اپریل کو کھیلا گیا۔ جہاں ایک بہت بڑے جلسے میں غلام نبی جانباز نے ایک احمدی دکاندار فضل دین کو دھمکی دی کہ تمہارا حشر برا ہوگا۔''[13] احراریوں کی اس قسم کی تقریروں سے پنجاب کی مسلم رائے عامہ میں فرقہ احمدیہ کے خلاف اس قدر اشتعال پیدا ہوگیا تھا کہ ''حسین شہید سہروردی کو گجرات میں یہ اعلان کرنا پڑا کہ ''احمدیوں کو جناح عوامی مسلم لیگ کا ممبر نہیں بنایا جائے گا۔''[14]

4 ر مئی کو کراچی کے آرام باغ میں پہلی ختم نبوت کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت مولانا عبدالحامد بدایونی نے کی۔ خطبہ استقبالیہ سندھ اسمبلی کے ایک رکن حاجی مولا بخش نے پڑھا اور احراری زعما قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور عطاء اللہ شاہ بخاری نے تقریریں کیں۔[15] 7 ر مئی کو لائل پور (فیصل آباد) میں دن دہاڑے اس احمدی دکاندار پر حملہ ہوا، جسے 20 ر اپریل کو غلام نبی جانباز نے جلسہ عام میں دھمکی دی تھی۔ اس پر دکان کے اندر حملہ کیا گیا۔ 13 ر مئی کو ایک ہجوم نے لائل پور کے قصبہ سمندری میں ایک احمدی مسجد کو آگ لگادی اور نمازیوں کو زدوکوب کیا۔

لاہور میں ''یوم تشکر'' 25 اور 26 ر مئی 1951ء کو منایا گیا۔ اس سلسلے میں پہلے دن تمام پنجاب اور صوبہ سرحد کے اضلاع پشاور اور ہری پور ہزارہ کے احراری رضاکاروں کے دستے لاہور کے بازاروں سے بشکل جلوس گزرے۔ ان کے ساتھ بینڈ باجے بھی تھے۔ شام کو جلسہ ہوا (جس

میں بہت سے معززین مثلاً مسلم لیگی ارکان اور عہدیدار بھی شامل تھے) اور احراری لیڈروں نے تقریریں کیں۔ صاحب زادہ فیض الحسن نے اپنی تقریر میں مطالبہ کیا کہ احمدیوں کو اقلیت قرار دیا جائے یا انہیں مجبور کیا جائے کہ اس ملک کو چھوڑ دیں اور بھارت میں آباد ہو جائیں۔ صدر جلسہ مولانا احمد علی نے ایک قرارداد پیش کی جس میں حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا گیا کہ احمدیوں کو ذمہ دار عہدوں سے موقوف کر دیا جائے اور عطاء اللہ شاہ بخاری نے میجر جنرل نذیر احمد کی گرفتاری کا ذکر کر کے کہا کہ اس گرفتاری نے ''یوم تشکر'' کو ''یوم تفخر'' بنا دیا ہے۔ کیونکہ مملکت ایک بہت بڑے خطرے سے بچ گئی ہے۔ بخاری نے حسب معمول اپنے مبتذل اور پست مزاح سے کام لے کر کہا کہ میجر جنرل نذیر احمد ننگا ہو گیا ہے۔ اب احمدی اس کو نئی پتلون پہنائیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میجر جنرل نذیر احمد کو مرزا بشیر الدین محمود احمد نے اکسا کر سازش میں شامل کر دیا ہے۔ بخاری نے اس جلسے میں حاضرین سے جو نعرے لگوائے وہ یہ تھے:

نمک حرامان پاکستان مردہ باد!

غداران پاکستان مردہ باد!

مرزا بشیر الدین محمود احمد مردہ باد!

مرزائیت مردہ باد!

پاکستان زندہ باد!

اس جلسے میں قاضی احسان احمد شجاع آبادی نے پھر مقدمہ سازش راولپنڈی کا ذکر کیا اور پھر شیخ حسام الدین نے اعلان کیا کہ احمدی جو مسلمانوں کے قومی اتحاد کے لئے ایک خطرہ ہیں، کلیدی عہدوں سے موقوف کئے جانے چاہئیں۔ شیخ حسام الدین اور علامہ علاؤ الدین صدیقی نے چودھری ظفر اللہ خان کے متعلق توہین آمیز کلمات کہے اور اس کی موقوفی کا مطالبہ کیا۔'' جب معمول کے مطابق اس جلسے کی تقریروں کی روداد وزیر اعلیٰ ممتاز دولتانہ کو پیش کی گئی تو اس نے اس پر یہ معنی خیز رائے لکھی کہ ''احرار ایک ایسے مسئلے سے فائدہ اٹھا کر جس کو پاکستانی عوام میں واضح مقبولیت حاصل ہے اپنے لئے محض سیاسی موقف و مقام پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمیں اس امر پر گہری نظر رکھنی چاہیے کہ یہ معاملہ ایک خاص حد سے متجاوز نہ ہو۔''[16]

گویا دولتانہ کی رائے میں اس وقت تک احراریوں نے حد سے تجاوز نہیں کیا تھا۔ اس

نے یہ عجیب وغریب رائے اس بنا پر قائم کر رکھی تھی کہ لیاقت علی خان راولپنڈی سازش کیس سے پورا سیاسی فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ پنجاب کے عوام کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ اس سازش کی وجہ سے پاکستان کا وجود خطرے میں ہے اس لئے وہ کسی مخالفانہ سرگرمیوں میں حصہ نہ لیں۔ ان دنوں حسین شہید سہروردی نے پنجاب کو اپنا سیاسی ہیڈکوارٹر بنایا ہوا تھا اور وہ ہر روز صوبائی انتخابات میں دھاندلیوں کا ذکر کر کے لیاقت کے اقتدار کو چیلنج کرتا تھا۔ اس کے برعکس احراری مُلّا شب وروز ''پاکستان خطرے میں ہے'' کا نعرہ لگاتے تھے اور یہ الزام عائد کرتے تھے کہ حسین شہید سہروردی، نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ اور نوائے وقت کے ایڈیٹر حمید نظامی نے احمدیوں سے ساز باز کر رکھی ہے بلکہ یہ بھی کہتے تھے کہ حمید نظامی احمدیوں کا رشتہ دار ہے اور عقیدۃً خود بھی احمدی ہے۔

چونکہ احراریوں کی یہ روش سیاسی لحاظ سے لیاقت علی خان اور ممتاز دولتانہ کے لئے فائدہ مند تھی اس لئے وہ کہتے تھے کہ احمدیوں کے خلاف احراریوں نے ابھی تک حد سے تجاوز نہیں کیا۔ ان کی اس رائے کی عکاسی صوبہ کے ہوم سیکرٹری سید احمد علی کی ایک چٹھی سے بھی ہوئی جو اس نے سمندری میں احمدیوں کی ایک مسجد جلانے کے واقعہ کے بارے میں برائے اطلاع حکومت پاکستان کو بھیجی تھی۔ اس کی اس چٹھی کا مضمون یہ تھا کہ ''13 رمئی 1951ء کی سہ پہر کو قصبہ سمندری ضلع لائل پور کے غیر احمدیوں (احراریوں) کا ایک ہجوم جمع ہوا اور اس نے ایک کچی مسجد کی چھت اور اس کی چٹائیوں کو آگ لگا دی۔ یہ مسجد ایک کمرے اور ایک چبوترے پر مشتمل ہے اور ڈسٹرکٹ بورڈ سکول کے نواح میں اراضی متروکہ پر بنائی گئی ہے۔ احمدی جماعت کے چند افراد اس وقت وہاں موجود تھے جو نشانہ زدوکوب بنائے گئے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ سکول کے ایک چپڑاسی نے توہین مسجد اور آتشزدگی کی اطلاع مقامی پولیس کو پہنچائی اور پولیس فوراً موقع پر پہنچ گئی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی بلا تاخیر موقع پر پہنچ گئے اور صورتحال پر قابو پا لیا گیا۔ کل 20 اشخاص گرفتار کئے گئے اور پھر مقدمہ عدالت میں دائر کر دیا گیا۔ مقامی حکام کی فوری اور مستعدانہ کاروائی نے صورتحال کو بگڑنے سے بچا لیا اور اب فضا بالکل پر سکون ہے۔ جن اشخاص نے پولیس کو ابتدائی رپورٹ دی انہوں نے واقعہ کے متعلق مبالغہ آمیز بیان دیا اور بعض بے گناہوں کو بھی لپیٹ میں لے لیا جن میں سے دو محکمہ مال کے ملازم ہیں۔ تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ انہوں نے ارتکاب جرم میں کوئی حصہ نہیں لیا اور ان کے خلاف الزامات بے بنیاد ہیں۔''[17] ہوم سیکرٹری ایک

ریٹائرڈ پی۔سی۔ایس۔افسر تھا۔اس کی ملازمت کی میعاد میں توسیع کر کے اسے اس عہدے پر محض اس لئے فائز کیا گیا تھا کہ وہ لیاقت علی خان کا خاص الخاص آدمی تھا۔اس نے یہ چٹھی وزیراعلیٰ ممتاز دولتانہ کی ہدایت کے مطابق مکمل کی تھی اور اس کا مطلب یہ تھا کہ سمندری میں مسجد جلانے کا واقعہ اتنا سنگین نہیں تھا جتنا کہ احمدیوں کی طرف سے ظاہر کیا جارہا تھا۔اس کی یہ اطلاع گمراہ کن تھی۔حقیقت یہ تھی کہ لیاقت علی خان اور ممتاز دولتانہ کی سیاسی مصلحت کے تحت نہ صرف فرقہ احمدیہ کو قربانی کا بکرا بنایا جارہا تھا بلکہ ان پڑھ اور نیم تعلیم یافتہ عوام الناس کو ایک ایسے مذہبی جنون میں مبتلا کیا جارہا تھا جو ملک وقوم کے اتحاد و یکجہتی کے لئے تباہ کن تھا۔

مذہبی جنون کی حالت یہ تھی کہ 7رمئی کو پنجاب کی نئی اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا تو دو مُلّاؤں نے مروجہ ''غیر اسلامی'' آئین کے تحت حلف اٹھانے میں بہت تامل کیا۔ان میں سے ایک جھنگ کا مولوی محمد ذاکر تھا اور دوسرا جماعت اسلامی کا مولوی محی الدین تھا۔یہ دونوں مروجہ حلف نامے میں تصرف کر کے اپنے تصور کے ''اسلامی آئین'' کے وفادار رہنے کا حلف اٹھانے کے خواہاں تھے مگر جب سپیکر نے انہیں اس تصرف کی اجازت نہ دی تو انہوں نے کافی پس وپیش کے بعد مروجہ حلف اٹھایا۔15رمئی کو شکار پور میں قتل کے ایک مجرم کو برسر عام پھانسی دی گئی جس کو دس ہزار تماشائیوں نے کئی گھنٹے تک دیکھا۔اس پر امروز کا تبصرہ یہ تھا کہ ''مجرموں کو برسرعام پھانسی کے تختے پر لٹکانا، قاتلوں کو سربازار سولی پر چڑھانا، خوف ودہشت پھیلا کر رعایا کو مطیع کرنا قرون وسطیٰ کے حکمرانوں کا طرہ امتیاز تھا۔اب یہ طریقے مذموم سمجھے جاتے ہیں، اس لئے کہ مطلق العنانی کی جگہ جمہوریت نے لے لی ہے۔جرم وسزا کے تصورات تبدیل ہو چکے ہیں۔جرائم کے انسداد کے سائنٹیفک طریقے وضع کئے جاچکے ہیں۔قانون کے احترام اور تہذیبی وتمدنی زندگی کی حفاظت کے لئے کہیں زیادہ مہذب، کہیں زیادہ مؤثر اور کہیں زیادہ قابل قبول ذرائع موجود ہیں پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ سندھ کی حکومت نے قرون وسطیٰ کی طرف مراجعت کو کیوں ضروری سمجھا۔اس طرح جرائم کی رفتار میں کوئی کمی نہیں ہوتی البتہ ہمارے ملک کے نیک نام، اس کے مہذب قانون اور جمہوری تصور حیات پر حرف آتا ہے۔''[18]

24رمئی کو آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن کی صدر بیگم لیاقت علی خان نے کراچی میں اپنی پہلی پریس کانفرنس کو خطاب کیا تو اس نے عورتوں کے پردہ کے بارے میں وہ موقف اختیار

نہ کیا جو اس نے 1949ء میں اختیار کیا تھا۔ 1949ء میں اس کا اعلان یہ تھا کہ اگر عورتوں کو پردہ میں رکھنے کے لئے کوئی قانون نافذ کیا گیا تو میں سب سے پہلے اس کی خلاف ورزی کروں گی۔ لیکن اب اس مسئلہ کے بارے میں ایک سوال پر اس کا جواب یہ تھا کہ "اگر پردہ رہے تو بڑی اچھی بات ہے اور اگر پردہ نہ رہے تو بھی بڑی اچھی بات ہے۔ اس سے ہماری تعلیم کے کام پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔"[19] اس کا یہ جواب مُلاؤں کی سیاسی کامیابی کا واضح ثبوت تھا۔

چونکہ پنجاب میں لیاقت علی خان اور ممتاز دولتانہ کے لئے مُلاّئیت کا اتنا دبدبہ قابل برداشت نہیں تھا اس لئے احراری مُلاؤں کے زور کو توڑنے کے لئے روزنامہ زمیندار کے ایڈیٹر اختر علی خان کی زیر صدارت انجمن اتحاد المسلمین کی تحریک شروع کروائی۔ غالباً ان کا خیال یہ تھا کہ جس طرح 1935ء میں مولانا ظفر علی خان نے شہید گنج تحریک شروع کر کے احراریوں کا سیاسی جنازہ نکال دیا تھا اسی طرح اس کا بیٹا اختر علی خان 1951ء میں احراریوں کا بندوبست کرے گا۔ مگر یہ خیال خام ثابت ہوا۔ مولانا اختر علی خان کی انجمن اتحاد المسلمین کی پہلی سہ روزہ کانفرنس یکم جون 1951ء کو شروع ہوئی تو اس میں ایک مقرر نے پاکستان کے مسلمانوں کو اتحاد کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ "احمدی فرقے کے لوگ بھی دوسرے فرقوں کی طرح ہیں اور انہیں بھی بھائی سمجھنا چاہیے۔" اس موقع پر حاضرین میں سے کوئی نہ بولا لیکن جب کانفرنس کے دوسرے دن کے اجلاس میں خلیق قریشی تقریر کر رہا تھا تو مجمع میں سے ایک آدمی کھڑا ہو گیا اور اس نے مقرر سے مطالبہ کیا کہ کل کے اس بیان کی تردید کی جائے کہ "احمدی فرقے کے لوگ بھی دوسرے فرقوں کی طرح ہیں اور انہیں بھائی سمجھنا چاہیے۔" اس پر عوام نے فرقہ احمدیہ کے خلاف نعرے لگانے شروع کر دیئے اور مجمع میں افراتفری پھیل گئی۔"[20] اس کے بعد اس کانفرنس کا تیسرے دن کا کوئی اجلاس نہ ہوا۔

سرکاری وغیر سرکاری سطح پر مذہبی جنون کی حوصلہ افزائی

4 رجون کو کراچی میں عوام کی آئینی تجاویز پر غور کرنے والی سب کمیٹی کا پہلا دوروزہ اجلاس ختم ہوا تو معلوم ہوا کہ عام لوگوں نے جو تجویزیں بھیجی ہیں ان میں بڑا تنوع اور رنگا رنگی ہے ان میں ایک تجویز یہ تھی کہ نماز ہر مسلمان کے لئے لازمی قرار دے دی جائے اور نماز نہ پڑھنے والوں کو سزا دی جائے اور ایک تجویز یہ بھی تھی کہ رئیس المملکت کو امیر المومنین کا خطاب دیا جائے۔"[21]

6/جون کو رمضان کا مہینہ شروع ہوا تو وزیر اعظم لیاقت علی خان سے لے کر جمعیت اہل حدیث کے صدر مولانا عبید اللہ تک بہت سے سیاسی اور مذہبی لیڈروں نے مسلم عوام کو تلقین کی کہ وہ ''رمضان کے مقدس ماہ میں اسلام کی تعلیمات پر سختی سے عمل کریں۔'' اسی دن ڈپٹی کمشنر لاہور نے حکم صادر کیا کہ اس پورے مہینے میں برسر عام کھانے پینے اور سگریٹ نوشی پر پابندی ہو گی اور 9/جون کو پتہ چلا کہ شہر میں رمضان کا احترام نہ کرنے کے الزام میں 300 افراد کا تعزیرات پاکستان کی دفعہ 298 کے تحت چالان کیا گیا ہے۔''[22]

لیاقت کی دوغلی پالیسی...... ایک جانب مُلّا ئیت کو فروغ دوسری جانب مُلّا ئیت کو حد کے اندر رکھنے کی کوشش

قبل ازیں 6/جون کو ایسوسی ایٹڈ پریس کے حوالے سے یہ خبر شائع ہو چکی تھی کہ ''کراچی ایڈمنسٹریشن شہر میں آٹھ نئی مسجدیں تعمیر کرے گی۔ یہ نئی مسجدیں شہر کے کونسے علاقوں میں ہوں گی اس کا فیصلہ علما کے مشورے کے مطابق کیا جائے گا۔'' یہ چھوٹی سی خبر کراچی کے روزنامہ ڈان پر بھی گراں گزری اور اس نے جل بھن کر ایک اداریے میں اس رجحان کی مذمت کی کہ جو اس خبر کا سرچشمہ تھا۔ اس اداریے کا خلاصہ یہ تھا کہ علما چھوٹے ہوں یا بڑے اپنی اپنی جگہ واجب الاحترام ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے بعض حلقوں کی طرف سے ان مولاناؤں کے کندھوں پر غیر ضروری بوجھ ڈالا جا رہا ہے اور ان حلقوں میں حکومت بھی شامل ہے۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کراچی ایڈمنسٹریشن کو نئی مسجدوں کی جائے وقوع کے بارے میں مولاناؤں سے مشورہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا عام مسلمانوں کو مسجدوں کی تعمیر کے کام میں شریک نہیں کیا جا سکتا اور کیا مسجد کے ڈیزائن کے بارے میں عام مسلم ماہرین تعمیرات کی خدمات حاصل نہیں کی جا سکتیں؟ بظاہر اس میں مشکل یہ ہے کہ ہم نے طویل عرصے تک اور بلند آہنگی سے ''اسلامی مملکت'' کا چرچا کیا ہے۔ چونکہ ارباب اختیار کو معلوم نہیں کہ عملاً اس اصطلاح کا کیا مطلب ہے اس لئے ان میں یہ رجحان پیدا ہو رہا ہے کہ وہ ہر چھوٹی موٹی چیز کو 'اسلامی' رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ یا تو خود اپنی مبہم سی اسلامی خواہشات کا اظہار کرتے ہیں یا پھر وہ اس قسم کی ادنیٰ حرکتوں سے عوام کی مبہم اسلامی توقعات کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجتاً غیر ضروری

اسلامی رسوم کا انبار بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا ہے اور معاشی اور معاشرتی مسائل کے بارے میں اسلام کے عملی تقاضے کہیں نظر نہیں آتے۔ دریں اثنا یہ تاثر پیدا کر کے کہ مذہبی پیشواؤں اور مسلم عوام کے درمیان امتیاز ہوتا ہے، اسلام کو سخت نقصان پہنچایا گیا ہے۔ یہ تاثر بڑھ کر پہلے مثال اور پھر رسم کی صورت اختیار کر سکتا ہے اور پھر یہ ملک کے آئین میں بھی گھس سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بات اسلام کے منافی ہوگی کیونکہ اسلام خالق اور مخلوق کے درمیان کسی آڑھتی کو تسلیم نہیں کرتا۔ ہمارے خیال میں صحیح اسلامی روش یہ ہے کہ علما کو کوئی الگ طبقہ تصور نہ کیا جائے بلکہ ان کی اسی طرح عزت کی جائے جیسے کہ دوسرے اہل علم کی مثلاً جیسے سائنس دانوں کی، ادیبوں وغیرہ کی جاتی ہے۔ ضرورت پڑنے پر علما سے مشورہ لیا جا سکتا ہے لیکن ان کے مشورے کو مقدس تصور نہیں کرنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس تعلیم یافتہ مسلمان نے قرآن و حدیث کا مطالعہ کیا ہے اور وہ انہیں معقول حد تک سمجھتا ہے اس کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی عالم یا مولانا کے مشورے کو قبول کرے۔ تاہم ہمارے ملک میں دوسرے رجحانات فروغ پا رہے ہیں اور آئین کے بنیادی اصولوں کے مسئلہ سے لے کر نئی مسجدوں کی جائے وقوع تک عام مسلمانوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ علما کے مشوروں کی اسی طرح تائید کریں جیسے کہ مسیحی عوام پادریوں کے مشوروں کی کرتے ہیں۔''[23]

ظاہر ہے کہ ڈان نے اس اداریے میں لیاقت علی خان کے نقطہ نگاہ کی ترجمانی کی تھی۔ لیاقت مُلّاؤں کو محض اپنے سیاسی مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا مگر وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ مُلّائیت کو اتنا سر پر چڑھا لیا جائے کہ وہ اس کے سیاسی عزائم کے راستے میں رکاوٹ بن جائے۔ ڈان کو یہ اداریہ لکھنے کی اس لئے ضرورت محسوس ہوئی تھی کہ پاکستان کے اندر اور باہر واقعی یہ تاثر پیدا ہو رہا تھا کہ پاکستان میں مُلّا گردی بڑی تیزی سے فروغ پا رہی ہے۔

مس فاطمہ جناح کا انٹرویو...... پاکستان میں تھیوکریسی (مذہبی حکومت) کبھی قائم نہیں ہوگی

ایک امریکی نامہ نگار نے ان ہی دنوں مس فاطمہ جناح سے ملاقات کے دوران اس امر پر تعجب کا اظہار کیا تھا کہ ''مسٹر جناح نے، جو بذات خود مذہبی آدمی نہیں تھے، ایک مذہبی مملکت کی بنیاد رکھی۔'' اس پر مس جناح نے اس کے اس تاثر کو غلط قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''تھیوکریسی

یا دینی مملکت سے تمہاری کیا مراد ہے؟ ہماری مملکت ایک مسلم مملکت ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ یہ مذہبی مملکت ہے۔ اس سے مراد یہی ہے کہ یہ مملکت مسلمانوں کے لئے ہے۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہماری مملکت عیسائیوں کے لئے ہو یا ہندوؤں کے لئے ہو؟ ہماری مملکت میں پادریوں یا مُلّاؤں کی حکمرانی نہیں ہے۔ ہاں اس مملکت کی تنظیم اسلامی اصولوں کے مطابق عمل میں آئی ہے اور میرا خیال ہے کہ اسلامی اصول کسی مملکت کی تنظیم کے لئے بہترین اصول ہیں۔"

سوال: آپ کے ملک کی باگ ڈور ایک ہی جماعت کے ہاتھ میں ہے اور یہ جماعت مسٹر جناح کی جماعت مسلم لیگ ہے اور اگر کوئی شخص دوسری جماعت کی تشکیل کرتا ہے تو اسے غدار اور غیر وفادار کے لقب سے نوازا جاتا ہے۔

جواب: آپ کو اس ملک میں آئے بمشکل ایک ہفتہ گزرا ہے۔ آپ ان امور کے متعلق رائے زنی کر رہے ہیں جن کا آپ کو بہت کم علم ہے۔ مسلم لیگ ایک سیاسی جماعت کا نام ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اس کا تعلق کسی کلیسا یا مذہب سے نہیں ہے اور اس کی تنظیم مذہبی رہنماؤں کے ہاتھ میں نہیں۔ مسلم اور غیر مسلم دونوں ہی اس کے رکن ہو سکتے ہیں۔ خود ہماری حکومت میں بعض ایسے لوگ ہیں جو اسلام پر عامل نہیں ہیں۔ پاکستان دو وجوہات کی بنا پر اسلامی ملک ہے۔ اول یہ کہ پاکستانیوں کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے اور دوئم یہ کہ مذہب اسلام ایک مکمل معاشرتی ضابطہ حیات ہے...... جہاں تک مُلّاؤں کی حکومت کے سوال کا تعلق ہے میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ پاکستان میں تھیوکریسی کبھی قائم نہیں ہوگی۔"[24]

اگرچہ مس فاطمہ جناح کا یہ جواب غیر مبہم اور قطعی تھا لیکن یہ اس لحاظ سے نامکمل تھا کہ انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اگر خدانخواستہ یہاں مُلّاؤں کی حکومت قائم ہوگئی تو مسلم اکثریت کا یہ ملک تباہ و برباد ہو جائے گا اور اگر نہ ہوئی تو پھر بھی مُلّاؤں کی جانب سے اس ملک کو برباد کرنے کی سر توڑ کوشش کی جائے گی۔ اسلامی تاریخ میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں تھی کہ مُلّائیت کے ہاتھوں کئی سلطنتیں تباہ ہوگئی تھیں۔

لیاقت کے گلے میں مُلّا ئیت کا پیر تسمہ پا...... جا گیرداری، سامراجی مفاد اور مہاجر غلبہ کی خاطر اسلام کا نعرہ اس کی ضرورت بن گیا تھا

تاہم اب لیاقت علی خان کے لئے مُلّا ئیت سے چھٹکارا پانا آسان نہیں رہا تھا۔ پنجاب میں زمینداری نظام اور مُلّا ئیت کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ اس صوبہ کے بڑے بڑے زمیندار لیاقت کے اقتدار کا سب سے بڑا سہارا تھے اور وہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے اٹھتے بیٹھتے مُلّا ئیت کا سہارا لیتے تھے۔ کراچی اور سندھ میں یو۔ پی سے مہاجرین کی آمد کا سلسلہ جاری تھا اور انہیں صوبہ سندھ میں صرف اسلام کے زور پر ہی آباد کیا جا سکتا تھا۔ لیاقت علی خان نے قرارداد مقاصد کے ذریعے خود مُلّا ئیت کی پرورش کی تھی اس لئے وہ اسے پھلنے پھولنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ مزید برآں کراچی میں یو۔ پی سے جو مہاجرین آئے تھے ان کے ساتھ پیشہ ور مُلّاؤں کی اچھی خاصی تعداد بھی آئی تھی۔ یہ مُلّا کراچی میں فارغ تو نہیں بیٹھ سکتے تھے، انہیں اپنا دھندا تو بہر صورت چلانا تھا۔ چنانچہ وہ آئے دن انتظامیہ پر زور ڈال کر کوئی نہ کوئی نیا کاروبار شروع کر دیتے تھے۔ ان کی ایک دکان دستور ساز اسمبلی کے سپیکر مولوی تمیز الدین کی قائم کردہ جمعیت الفلاح تھی۔ یہ جمعیت مئی 1951ء میں قائم کی گئی تھی اور اس کا نصب العین یہ تھا کہ ایک عالمی اسلامی مشن قائم کر کے اسلامی نظریات کی تبلیغ کی جائے گی۔

15 رجون کو مولوی تمیز الدین، سید سلیمان ندوی، مولانا احتشام الحق تھانوی اور میر غلام علی تالپور کا ایک مشترکہ بیان شائع ہوا جس میں انہوں نے سارے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ مسلمانوں میں حقیقی اسلامی تعلیم کے فروغ اور عالمی مشن کے قیام کے لئے جمعیت الفلاح کی مدد کریں۔ جمعیت کا نصب العین یہ ہے کہ (1) مسلمانوں میں سچی اسلامی تعلیم کو فروغ دیا جائے، ہمارے معاشرے میں جو غیر اسلامی اثرات پھیل رہے ہیں ان کا انسداد کیا جائے اور معاشرے کو صحیح اسلامی کردار کا حامل بنایا جائے۔ (2) ایک عالمی مسلم مشن قائم کیا جائے اور غیر مسلم دنیا میں اسلام کا زندگی بخش پیغام پہنچانے کے لئے تربیت یافتہ مبلغوں کو بھیجا جائے۔ جمعیت کو اپنا ہر نصب العین پورا کرنے کے لئے ابتداً ایک مکمل سیکرٹریٹ کے لئے ایک عمارت چاہیے جس میں ایک لائبریری، ایک جلسہ گاہ اور مختلف شعبوں کے دفاتر کے قیام کی گنجائش ہو۔ اس بلڈنگ کی

زمین جمعیت کے نام الاٹ ہو چکی ہے اور امید ہے کہ اس پر بہت جلد تعمیر کا کام شروع ہو جائے گا۔ جمعیت حکومت سے مزید 150 ایکڑ زمین حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے جس پر ایک کالج اور اس کے ساتھ کئی پرائمری اور ہائی سکول بنائے جائیں گے۔ ان اداروں میں طلبا کو بہترین اسلامی تعلیم کے علاوہ جدید تعلیم بھی دی جائے گی۔"[25] مولوی تمیز الدین نے اپنی یہ جمعیت لندن اور یورپ کے دورے سے واپسی پر مغربی سامراجیوں کی ایک بین الاقوامی "اخلاقی تعمیر نو کی تنظیم" کے خطوط پر قائم کی تھی اور اس کا اولین نصب العین یہ تھا کہ مذہب کے زور پر کمیونزم کا سدباب کیا جائے۔ چونکہ یہ جمعیت جاگیرداروں اور علما کے مفاد میں تھی اس لئے پنجاب، سندھ اور کراچی میں اس کے قیام کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ بالخصوص علما کو اس جمعیت میں اپنا مستقبل خاصا روشن نظر آتا تھا۔ لیاقت علی خان کی مشکل یہ تھی کہ وہ خارجی اور داخلی وجوہ کی بنا پر پاکستان کے اندر اور باہر ایسی "مذہبی سرگرمیوں" کی حوصلہ افزائی بھی کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی چاہتا تھا کہ مُلّا ئیت اس کی سیاست پر غلبہ حاصل نہ کرنے پائے۔

لیاقت علی خان کے قریبی سیاسی رفقا اور انتظامیہ کے ارکان کو اس کی اس مشکل کا احساس تھا چنانچہ وہ اس کی اس مشکل کو آسان کرنے کے لئے اندرون ملک، "مذہبی سرگرمیوں" کی اس حد تک حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے کہ مُلّا ئیت حد سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ پنجاب کا گورنر سردار عبدالرب نشتر وزیر اعظم لیاقت علی خان کا معتمد ترین سیاسی رفیق تھا۔ چنانچہ اس قسم کے بیشتر کام اس کی نگرانی میں ہوتے تھے۔ جون کے تیسرے ہفتے میں قائداعظم میموریل فنڈ کی سنٹرل کمیٹی نے جب یہ فیصلہ کیا کہ بابائے قوم کی ایک یادگار کے طور پر ایک اسلامی دارالعلوم قائم کیا جائے گا تو اس فیصلہ کو جامہ عمل پہنانے کے لئے جو 10 رکنی کمیٹی مقرر کی گئی اس کا صدر بھی سردار عبدالرب نشتر کو بنایا گیا۔ اس کے علاوہ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا نثار الدین احمد اور مفتی محمد شفیع بھی اس کمیٹی میں شامل تھے۔[26] اس فیصلے کا مطلب یہ تھا کہ اسلامی دارالعلوم تمیز الدین خان کے مجوزہ اسلامی مشن کالج سے الگ ہوگا۔

7 رجولائی کو لیاقت علی خان نے کراچی میں ایک بہت بڑے جلسے عام کو خطاب کرتے ہوئے عالم اسلام کے اتحاد کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ "پاکستان محض ایک علاقہ حاصل کرنے یا مادی فوائد حاصل کرنے کے لئے وجود میں نہیں آیا تھا بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ عالم اسلام

اور بنی نوع انسان کی خدمت کی جائے اور اسلامی اصولوں کی پختگی کا مظاہرہ کیا جائے۔''[27] اس کی اس تقریر کے دو دن بعد کراچی کی عرب کلچرل ایسوسی ایشن نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مؤتمر عالم اسلامی کے دفاتر کے لئے ایک بہت بڑی بلڈنگ تعمیر کرے گی اور اس نے اس مقصد کے لئے حکومت سے رابطہ پیدا کیا ہے۔ وہ اس عمارت میں ایک جدید عربک یونیورسٹی قائم کرنے کا بھی ارادہ رکھتی ہے جس میں انڈونیشیا، ملائشیا اور دوسرے غیر عرب مسلم ممالک کے طلبا کو بھی داخلہ کی سہولتیں مہیا ہوں گی۔ اس مجوزہ یونیورسٹی کے ساتھ ایک ہوسٹل بھی ہوگا۔''[28] ایسوسی ایشن کے اس فیصلے کا مطلب یہ تھا کہ یہ مجوزہ عربک یونیورسٹی مولوی تمیزالدین خان کے اسلامی مشن کالج اور سردار عبدالرب نشتر کے مجوزہ اسلامی دارالعلوم سے الگ ہوگی۔ گویا مرکزی حکومت کی امداد سے ایک ہی قسم کے تین بہت بڑے بڑے اسلامی ادارے قائم کرنے کی تجویزیں زیر غور تھیں جن میں علما کو ترقی کے لئے بہترین مواقع مل سکتے تھے۔ ان سارے فیصلوں کا بین الاقوامی پس منظر یہ تھا کہ مشرق وسطیٰ میں اینگلو۔ امریکی بلاک اور سوویت یونین کے درمیان زبردست سرد جنگ ہو رہی تھی۔ عرب عوام مصر اور دوسرے ممالک میں برطانوی سامراج کے خلاف مظاہرے کر رہے تھے اور ایران میں وزیراعظم ڈاکٹر محمد مصدق نے تیل کے وسائل کو قومیانے کے مسئلہ پر برطانیہ کے ساتھ محاذ آرائی شروع کر رکھی تھی۔ تبت میں چین کی کمیونسٹ فوجیں داخل ہو چکی تھیں۔ کوریا میں امریکیوں کو چینیوں کے ہاتھوں زبردست ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔

جماعت اسلامی کی پنجاب کے انتخابات میں بری طرح شکست کے بعد ایک معاشرتی اصلاحی پروگرام کے ذریعہ دوبارہ دکان سجانے کی کوشش

امیر جماعت اسلامی ابوالاعلیٰ مودودی کو اس بین الاقوامی صورتحال کی سنگینی کا اچھی طرح احساس تھا لیکن وہ اس سے کوئی فائدہ انہیں اٹھا سکتا تھا کیونکہ پنجاب اسمبلی کے انتخابات میں عبرتناک شکست کھانے کے بعد اس کی مذہبی سیاست بہت ماند پڑ گئی تھی۔ 14 رجولائی کو اس نے ایک پریس کانفرنس میں اپنی سیاسی دکان کو ایک 9 نکاتی پروگرام کے ساتھ ازسرنو سجانے کی کوشش کی۔ اس نے بتایا کہ نئے پروگرام کے تحت اس کی جماعت پرائمری سکول کھولے گی، مسجدوں کی دیکھ بھال کرے گی، عوام میں مذہبی تعلیم پھیلائے گی، صفائی اور صحت کے حالات کو

بہتر بنائے گی، غریبوں اور محتاجوں کی امداد کرے گی اور معاشرے کی اخلاقی اصلاح کے کام کرے گی۔ ان مقاصد کے لئے ہر محلہ اور ہر قصبہ میں متفقین کا ایک حلقہ قائم کیا جائے گا جس میں وہ لوگ شامل ہوں گے جو کسی نہ کسی وجہ سے جماعت کے پورے رکن نہیں بن سکتے۔ اس نے مزید بتایا کہ اس کی جماعت مزدوروں میں ٹریڈ یونین بنانے کی کوشش کرے گی اور پھر ان سب ٹریڈ یونینوں کی ایک فیڈریشن قائم کی جائے گی۔ ان ٹریڈ یونینوں کے رکن بننے والے مزدوروں کو تین شرائط قبول کرنا ہوں گی۔ (1) وہ غیر ذمہ دارانہ مطالبات نہیں کرے گا۔ (2) وہ اپنے جائز مطالبات پورے کروانے کے لئے ذمہ دارانہ پر امن طریقے اختیار کرے گا۔ (3) وہ اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کو پورے شعور کے ساتھ پورا کرے گا۔ اس نے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ رپورٹ اب دفن ہو چکی ہے۔ اگر اس رپورٹ میں پھر جان ڈالنے کی کوئی کوشش کی گئی تو جماعت اسلامی اس کی سخت مخالفت کرے گی۔'' اس نے کہا کہ ''ہر شعبہ زندگی میں صحیح قسم کی قیادت پیدا کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ صحیح قیادت کے بغیر عوام ایک حقیقی اسلامی مملکت کے قیام کا نصب العین حاصل نہیں کر سکتے۔''[29]

15 رجولائی کو مودودی کی سیاسی بحالی کا یہ پروگرام وزیر اعظم لیاقت علی خان کے اس اعلان کے بوجھ تلے دب گیا کہ ''ہندوستان نے اپنی نوے فیصد افواج جموں وکشمیر اور پنجاب کی سرحدوں پر مجتمع کر دی ہیں اور اس بنا پر عالمی امن اور پاکستان کے تحفظ کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔'' لیاقت کے اس اعلان پر پورے ملک کے سیاسی و مذہبی حلقوں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ چنانچہ جن لیڈروں نے ہندوستان کے جارحانہ عزائم کے خلاف حکومت پاکستان کی غیر مشروط حمایت کا یقین دلایا ان میں ابوالاعلیٰ مودودی بھی شامل تھا۔ مودودی کا بیان یہ تھا کہ ''اگر بھارت نے پاکستان کو لڑنے پر مجبور کر دیا تو اس ملک کے رہنے والے تمام اندرونی اختلافات کو بھول کر تن واحد کی طرح حملہ آور کا مقابلہ کریں گے۔ اگر بھارت نے کشمیر کا مسئلہ بجائے آزادانہ استصواب کے، طاقت کے زور سے حل کرنا چاہا اور اس ضمن میں لڑائی چھڑ گئی تو بلاشبہ حق پاکستان کے ساتھ ہو گا اور ہر پاکستانی پوری طرح دشمن کا مقابلہ کرے گا۔ ہم اپنے ہمسایہ ممالک کے جائز حقوق کا احترام کرتے ہیں لیکن اگر کسی نے ہمارے امن و حقوق پر غاصبانہ حملہ کرنا چاہا تو ہمیں لوہے کی دیوار سے بھی زیادہ مضبوط پائے گا۔''[30] مودودی کا یہ بیان اس کے 1949ء کے اس بیان سے مختلف تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ

اسلام کی رو سے کشمیر کی جنگ جہاد نہیں ہے۔اس کا مطلب یہ تھا کہ اس نے گزشتہ دو سال میں سیاسی موقع شناسی یا موقع پرستی کا فن اچھی طرح سیکھ لیا تھا۔اس کی جانب سے یہ موقف اختیار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لیاقت علی خان کے اس اعلان کے فوراً ہی بعد پاکستان کے طول وعرض سے مذہبی رہنماؤں نے ہندوستان کے خلاف جہاد فی سبیل اللہ کے فتوے صادر کرنے شروع کر دیئے تھے۔

سرحدوں پر بھارتی افواج کے اجتماع سے پاک۔ بھارت کشیدگی میں اضافہ اور احراری مُلّاؤں کی قومی تضاد سے فائدہ اٹھانے کی کوششیں ۔ احمدیوں کے خلاف زوردار مہم

احراری مُلّا سید عطا اللہ شاہ بخاری نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی مجلس احرار کو اس مشکل سے نکال دیا جس میں وہ سمندری میں احمدیوں کی مسجد کے جلائے جانے کے واقعہ کے بعد پھنس گئی تھی۔ بخاری نے 2؍اگست کو ملتان میں مسلم لیگ کے زیر اہتمام ایک بہت بڑے جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے ملک کی ساری جماعتوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے وجود کو ختم کر کے مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں کیونکہ یہی جماعت مسلمانان پاکستان کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔اس جلسہ کی صدارت صوبہ کے وزیر ترقیات سید علی حسین گردیزی نے کی تھی۔ بخاری نے مزید کہا کہ آج کل ملتان کی آبادی تقریباً اڑھائی لاکھ ہے۔اس میں کم از کم چالیس ہزار مردوں کو ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے بطور قومی رضا کار تربیت حاصل کرنی چاہیے۔اس نے حاضرین سے بلند آواز میں حلف لیا کہ وہ ملک کے تحفظ کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیں گے۔''[31] بخاری نے اس جلسہ کے بعد 19؍اگست کو لاہور کے باغ بیرون موچی دروازہ میں بھی ایک بہت بڑے جلسہ میں تقریر کی جس میں اس نے الزام عائد کیا کہ :

1۔ ''چودھری ظفر اللہ خان وزیر خارجہ پاکستان مملکت کا وفادار نہیں۔وہ قادیان کی خاطر کشمیر کو حکومت ہند کے ہاتھ فروخت کر رہا ہے۔

2۔ تقسیم سے قبل جماعت احمدیہ کے امام نے اپنے پیروؤں کو بتایا تھا کہ پاکستان وجود میں نہیں آئے گا اور اگر کوئی اس قسم کی مملکت پیدا کر بھی لی گئی تو تقسیم شدہ ملک دوبارہ

متحد ہو جائے گا۔

3۔ احمدی بھارت کی حکومت کے جاسوس ہیں۔ اگر بھارت کے ساتھ جنگ چھڑ جائے تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر احمدیوں کی بیخ کنی کر دینی چاہیے جو مملکت کے دشمن ہیں۔"[32]

عطا اللہ شاہ بخاری نے یہ الزامات اس حقیقت کے باوجود عائد کئے تھے کہ فرقہ احمدیہ کے ناظم امور خارجہ نے 17 رجولائی کو وزیر اعظم لیاقت علی خان کے نام ایک تار میں اسے یقین دلایا تھا کہ "احمدیوں کو پاکستان کی سرحدوں پر ہندوستانی فوجوں کے اجتماع سے بہت صدمہ ہوا ہے۔ وہ اس ہنگامی صورتحال میں صدق دل سے حکومت پاکستان کے ساتھ ہیں اور وہ مادر وطن کی حفاظت وسلامتی کے لئے ہر ممکن قربانی دیں گے۔"[33] اور پھر 16 راگست کو وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان نے سندھ مسلم کالج کے طلبا کو خطاب کرتے ہوئے انہیں بتایا تھا کہ "اسلام موجودہ دنیا کے سارے مسائل کا حل پیش کر سکتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا تجویز کردہ علاج ہے اور یہ کبھی کسی کے لئے بھی غیر مؤثر ثابت نہیں ہوا۔ جو لوگ اسلام کے دعویدار ہیں اور اس پر عمل نہیں کرتے وہ منافق ہیں۔ ایسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔" اس نے کہا کہ "پاکستان کی اسلامی جمہوریہ میں اسلام کے مسلمات کی کارفرمائی ہونی چاہیے۔ لیکن اس سلسلے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہم اپنی زندگیوں کو اسلام کے مطابق ڈھالیں گے یا اپنے مذہبی اصولوں کو جدید اسلام کے بارے میں اپنے نظریہ کے مطابق تبدیل کریں گے؟ اس نے ان لوگوں پر نکتہ چینی کی تھی جو اسلام کو اپنے موجودہ تقاضوں کے مطابق جدید بنانے کا پرچار کرتے تھے۔" اور مزید کہا کہ "قرآن پاک میں وہ سارے بنیادی اصول موجود ہیں جن کی آج کل بنی نوع انسان کو ضرورت ہے۔"[34]

ظفر اللہ خان کی اس تقریر سے ظاہر تھا کہ وہ دوسرے علما کی طرح اسلام کے بنیادی اصولوں کی کارفرمائی کا خواہاں تھا اور وہ اس سلسلے میں کسی اجتہاد کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔ بالفاظ دیگر وہ بیشتر مُلّاؤں سے زیادہ کٹر مُلّا تھا۔ وہ جب اس قسم کی مذہبی تبلیغ کرتا تھا تو یہ بات بھول جاتا تھا کہ دوسرے علما اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہی اسے دائرہ اسلام سے خارج قرار دیتے ہیں۔ سید عطا اللہ شاہ بخاری اور دوسرے احراری مُلّا اسے اسلام اور پاکستان کا غدار کہتے تھے اور یہ فتویٰ صادر کرتے تھے کہ اس بنا پر وہ اور اس کے فرقہ کے سارے ارکان واجب القتل ہیں۔

احراری مُلّاؤں کو حد کے اندر رکھنے کی سرکاری کوششیں

لاہور کی جماعت احمدیہ کے امیر بشیر احمد ایڈووکیٹ نے 25 راگست کو لاہور کے ڈپٹی کمشنر کے نام ایک چٹھی میں عطا اللہ شاہ بخاری کی 19 راگست کی تقریر کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ ڈپٹی کمشنر نے یہ چٹھی برائے اطلاع صوبائی حکومت کے ہوم سیکرٹری سید احمد علی کو بھیج دی تو اس نے اس سلسلے میں وزیر اعلیٰ ممتاز دولتانہ سے بات چیت کرنے کے بعد یکم ستمبر کو انسپکٹر جنرل پولیس قربان علی خان کو یہ استدعا کی کہ وہ ''احراری لیڈروں تک یہ پیغام پہنچا دیں کہ وہ اپنی تقریروں میں وزیر خارجہ کے متعلق اور علی العموم جماعت احمدیہ کے متعلق اپنی حدود سے تجاوز کر رہے ہیں۔ اب تک ایک بلوہ اور قتل ہو چکا ہے۔ ایک احمدی کے منہ پر کالک مل کر اسے گدھے پر سوار کرایا گیا ہے اور ان کی ایک مسجد جلائی جا چکی ہے۔ اگر اب احراری اپنی اشتعال انگیز تقریریں بند نہیں کریں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قانون وانتظام برباد ہو جائے گا۔ ماضی میں انہیں متعدد بار تنبیہ کی جا چکی ہے۔ اب انہیں آخری دفعہ یہ بتا دینا چاہیے کہ حکومت انہیں ان اشتعال انگیز تقریروں سے روکنا چاہتی ہے جن سے صوبہ کے امن وامان میں خلل پڑنے کا احتمال ہے۔ اگر انہوں نے اس تنبیہ پر عمل نہ کیا تو حکومت اپنے احکام کی تعمیل کرانے کے لئے تمام تدابیر اختیار کرے گی اور نتائج کی ذمہ داری خود احرار پر ہی ہوگی۔'' انسپکٹر جنرل پولیس نے اسی دن وزیر اعلیٰ کی جانب سے موصول شدہ اس ہدایت پر عمل کیا اور اس نے مجلس احرار کے جنرل سیکرٹری شیخ حسام الدین کو سخت تنبیہ کی جس پر حسام الدین نے اسے یقین دلایا کہ جس حالت میں ملک کو ایک بحران کا سامنا ہے، اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اہل پاکستان کے تمام طبقوں اور گروہوں کا اتحاد ضروری ہے۔ ہماری یہ پالیسی ہرگز نہیں کہ نزاع واختلاف کی صورت پیدا کریں۔''[35] بظاہر دولتانہ کی طرف سے احراریوں کو یہ تنبیہ پہلی مرتبہ قدرے سنجیدگی کے ساتھ دلوا دی گئی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ پنجاب اسمبلی کے انتخابات کے بعد مسلم لیگ کو احراریوں کی سیاسی حمایت کی اتنی زیادہ ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان واقعی بڑی کشیدگی پیدا ہو چکی تھی۔ ایسی حالت میں احراریوں کو تفرقہ انگیزی یا فتنہ پروری کی مزید اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ فرقہ پرستی کے اس فتنہ نے کئی جگہ شیعہ۔ سنی جھگڑے کی صورت بھی

اختیار کر لی تھی مثلاً کرشن نگر لاہور میں ایک امام باڑے کی تعمیر پر جھگڑا ہو گیا تھا اور بھکر میں تعزیے کے جلوس کی وجہ سے سخت بدامنی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور تیسری وجہ یہ تھی کہ وزیر خارجہ ظفر اللہ خان ان دنوں اینگلو۔امریکی منصوبے کے تحت عالم اسلام کے اتحاد کے لئے سر توڑ کوشش کر رہا تھا جبکہ ایشیا میں اشتراکیت کے اثر و رسوخ میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ایسی صورت میں ظفر اللہ خان اور اس کے فرقہ کے خلاف مذہبی اشتعال انگیزی مغربی طاقتوں کے حلقوں میں برے اثرات پیدا کر سکتی تھی۔

ان ہی وجوہ کی بنا پر لیاقت علی خان کی مرکزی حکومت کو بھی پنجاب کی فرقہ وارانہ صورتحال کے بارے میں تشویش لاحق ہو گئی تھی چنانچہ نواب مشتاق احمد گرمانی کی وزارت داخلہ نے پہلے 4 ستمبر کو حکومت پنجاب کی توجہ عطا اللہ شاہ بخاری کی 19 اگست کی قابل اعتراض تقریر کی طرف مبذول کرائی اور پھر اس نے 7 ستمبر کو پنجاب کے چیف سیکرٹری کو یہ چٹھی لکھی کہ ''ایسے واقعات رونما ہو چکے ہیں کہ مختلف مسلمان فرقوں کے افراد نے ایک دوسرے کے خلاف قابل اعتراض پروپیگنڈا کیا ہے جس سے طرفین کی دل آزادی ہوئی ہے اور انتہائی صورتوں میں بعض اشخاص کے خلاف تشدد بھی کیا گیا ہے۔اس قسم کی شورش کا ایک نمونہ وہ ہے جو پنجاب میں احمدی و احراری نزاع کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔مرکزی حکومت کا خیال ہے کہ بلاشبہ کسی جماعت اور فرقے کے اس جائز حق پر ناواجب پابندی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ اپنے عقائد مذہبی کی تبلیغ کرے اور اس معاملے میں مختلف عقائد کے مبلغوں کے درمیان کسی قسم کا فرق و امتیاز ملحوظ نہ ہونا چاہیے۔ لیکن مذہبی مناظروں اور مناقشوں کو معقول حدود کے اندر محدود رکھنا چاہیے اور انہیں ایسے نقطہ پر پہنچنے کی اجازت نہ دینی چاہیے کہ امن وسکون عامہ خطرے میں پڑ جائے۔مرکزی حکومت کی رائے میں جنگجویانہ اور جارحانہ فرقہ آرائی کو سختی سے دبا دینا ضروری ہے۔''[36]

ابھی صوبائی حکومت نے مرکزی حکومت کی اس چٹھی پر کوئی کاروائی نہیں کی تھی کہ 23 ستمبر کو بھلوال کی جامع مسجد میں ایک جلسہ ہوا جس میں دو احراری کارکنوں، حبیب الرحمان اور مولوی محمد حیات۔نے فرقہ احمدیہ کے خلاف زہریلی تقریریں کیں۔صوبائی خفیہ پولیس کا سربراہ اس صورتحال سے خاصا مشوش تھا۔چنانچہ اس نے یکم اکتوبر کو مرکزی حکومت کی 7 ستمبر کی چٹھی پر تبصرہ کیا کہ ''احراری شائستگی کی حدود سے تجاوز کر چکے ہیں۔وہ احمدیوں کے خلاف ناپاک حملے

کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ احمدیوں کے خلاف تشدد کے لئے اشتعال انگیزی کے بھی ذمہ دار ہیں۔شیعہ۔سنی اختلافات کی اطلاعات بھی صوبہ کے مختلف حصوں میں موصول ہوئی ہیں۔موضع شاہ پور کانجرامیں پہلا واقعہ جس میں شیعہ فرقہ وارانہ تشدد کا شکار ہوئے، یہ تھا کہ ایک عورت اور تین سال کا ایک بچہ مارے گئے۔گوجرانوالہ میں اہل سنت اور وہابیوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہوئی۔ اختلاف اس مسئلے پر تھا کہ ماہ رمضان میں تراویح کی کتنی رکعتیں پڑھنی چاہئیں۔فوری مسئلہ یہ ہے کہ احرار کے متعلق کیا کیا جائے۔ان کو ایک دفعہ تنبیہ کی جاچکی ہے۔میری تجویز یہ ہے کہ اگر وہ اس تنبیہ پر توجہ نہ کریں تو ان کے خلاف سخت اقدام کرنا چاہیے۔حکومت کو یہ بھی چاہیے کہ سنیوں اور شیعوں کے درمیان اچھے تعلقات پیدا کرنے کے لئے ہر تدبیر عمل میں لائے۔'' اس پر انسپکٹر جنرل پولیس قربان علی خان کی رائے یہ تھی کہ ''اگر احرار بار بار کی تنبیہوں کے باوجود اشتعال انگیز تقریریں کرنے سے باز نہ آئیں تو مقامی حکام ان کے خلاف کاروائی کریں۔اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اب حکومت کو فرقہ وارانہ پروپیگنڈا کرنے والے تمام اشخاص اور گروہوں کے خلاف سخت اقدام کرنا چاہیے۔'' اور ہوم سیکرٹری سید احمد علی کا مشورہ یہ تھا کہ ''اس قسم کی مذہبی دیوانگی کے متعلق موجودہ حکومت کی پالیسی سب پر ظاہر کی جاچکی ہے۔اب رائے عامہ کے رہنماؤں کا فرض ہے کہ اس کو روکنے کے لئے مؤثر تدابیر اختیار کریں۔ ہمارے سامنے بہت زیادہ اہم کام ہیں اور ہم یقیناً روا نہیں رکھیں گے کہ لوگ اپنے آپ کو مذہبی جھگڑوں میں تباہ و برباد کرلیں۔ جو کچھ اس وقت ہورہا ہے اسے قدرت کی طرف سے ایک اشارہ سمجھنا چاہیے۔ اگر ہم ان جاہل لوگوں کو ایک دوسرے کے گلے کاٹنے اور دشمنوں کو مسرور و مطمئن کرنے سے نہیں روکیں گے تو پھر ہمارا خدا ہی حافظ ہے۔''[37]

مُلّا ئیت کا عفریت بوتل سے نکالنے کے بعد لیاقت کے لئے اب اسے واپس بوتل میں ڈالنا بہت مشکل تھا

ہوم سیکرٹری سید احمد علی کی مذکورہ رائے جزوی طور پر صحیح تھی، کلی طور پر صحیح اس لئے نہیں تھی کہ اس نے اس میں یہ نہیں لکھا تھا کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے مارچ 1949ء میں دستور ساز اسمبلی سے قرارداد مقاصد منظور کروا کر مُلّا ئیت کے پھلنے پھولنے کا جو سنہری موقع فراہم

کیا تھا اور اس کے بعد ممتاز دولتانہ نے احراریوں سے گٹھ جوڑ کر کے فرقہ احمدیہ کے خلاف فتنہ پروری کو جو ہوا دی تھی اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلنا تھا۔ پنجاب کے انتخابات کے بعد احراری دو ماہ تک احمدیوں کے خلاف یوم تشکر مناتے رہے لیکن دولتانہ کی حکومت خاموش تماشائی بنی رہی۔ پھر جب 15 رجولائی 1951ء کو لیاقت علی خان نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بھرپور جنگ کے خطرے کا اعلان کیا تو اس کا فائدہ بھی مُلّاؤں کو پہنچا اور وہ جہاد فی سبیل اللہ کے نعرے لگاتے ہوئے میدان سیاست میں نکل آئے۔

لیاقت علی خان سیاسی طور پر بہت ناعاقبت اندیش تھا۔ اس نے بعض اندرونی اور بیرونی مصلحتوں کی بنا پر مذہب کو سیاست کے ساتھ وابستہ کرنے پر اصرار کر کے احراریوں کے علاوہ جماعت اسلامی اور جمعیت العلمائے ہند کے مُلّاؤں کو کھلی چھٹی دے دی تھی کہ وہ پاکستان میں اپنی سیاسی بحالی کے لئے جو چاہیں کریں۔ وہ تقریباً ڈیڑھ دو سال تک تو قرارداد مقاصد کے مطابق اسلامی آئین اور اسلامی نظام کی مہم چلاتے رہے۔ ان کی یہ مہم ستمبر 1950ء میں بہت تیز ہوگئی جبکہ لیاقت علی خان نے دستور ساز اسمبلی میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی اور بنیادی حقوق کی کمیٹی کی ''غیر اسلامی'' سفارشات پیش کیں۔ نومبر 1950ء میں جب اس نے ان سفارشات پر بحث ملتوی کر دی تو اس الزام کے تحت مُلّاؤں کی مہم جاری رہی کہ اسلامی آئین کی تدوین میں بدنیتی سے تاخیر کی جا رہی ہے۔ پنجاب کے شاونسٹ عناصر مُلّاؤں کی ان ساری سرگرمیوں میں ان کے ساتھ تھے۔ دوسری طرف فرقہ احمدیہ کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود کی سیاسی ناعاقبت اندیشی کی بھی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ ابتدا میں تو پاکستان میں مسلم لیگ کو ختم کر کے غیر فرقہ وارانہ نیشنل لیگ قائم کرنے کے حق میں تھا یعنی وہ پاکستان میں سیکولر جمہوری نظام چاہتا تھا لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد اس نے سیاسی موقع پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پینترا بدلا اور وہ پاکستان کو ایک اسلامی مملکت بنانے کا پرچار کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان نے بھی جسے بچپن ہی سے مذہبی جنون کی بیماری لاحق تھی، پاکستان کے اندر اور باہر زور شور سے مذہبی تبلیغ شروع کر دی۔ اس نے مارچ 1949ء میں قرارداد مقاصد کی تائید میں بڑی لمبی چوڑی تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ پاکستان میں مذہب کو سیاست سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہو گا۔ پھر اس نے اپنی بہت سی تقریروں میں پاکستانی نوجوانوں کو یہ تلقین کی کہ وہ اپنے آپ کو قرآنی

احکامات کے مطابق ڈھالیں اور عصر حاضر کے تقاضوں کی بنا پر مذہب کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ وہ جب ایسی باتیں کہتا تھا تو اس کے پیش نظر یہ تلخ حقیقت نہیں ہوتی تھی کہ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی اور امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری کے علاوہ دوسرے بے شمار علما ان ہی قرآنی احکامات کے مطابق اسے اور اس کے فرقہ کو مرتد اور واجب القتل قرار دیتے تھے۔

حکومت پر آئین سازی میں تاخیر کے الزامات اور مذہبی جنون کی فضا میں لیاقت علی کا قتل

جب ہوم سیکرٹری احمد علی نے اپنی مذکورہ رائے کا اظہار کیا تھا اس وقت مری میں دستور ساز اسمبلی کی اس سب کمیٹی کا اجلاس جاری تھا جو ملک کے مختلف حلقوں کی جانب سے پیش کردہ آئینی تجاویز پر غور کرنے کے لئے مقرر کی گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی پنجاب کے مختلف شہروں میں عوامی سطح پر یہ الزام تراشی ہو رہی تھی کہ آئین سازی میں تاخیر کی جا رہی ہے۔ 29ر ستمبر کو لیاقت علی خان کے خلاف اس الزام تراشی کی تردید معتبر ذرائع کے حوالہ سے اس خبر کی صورت میں کرائی گئی کہ ''لیاقت علی خان نے متعلقہ حلقوں کو ہدایات جاری کی ہیں کہ دستور ساز اسمبلی کی مختلف کمیٹیاں جو دستور سازی سے متعلقہ بنیادی رپورٹیں تیار کر رہی ہیں اپنا اپنا کام جتنی جلدی ہو سکے مکمل کر لیں۔''[38]

نوائے پاکستان کا اس خبر پر تبصرہ یہ تھا کہ جب کبھی بھی ''کسی طرف سے آئین سازی میں طویل التوا اور صبر آزما تاخیر کے خلاف شکایت کی گئی تو دستور ساز حلقوں کی طرف سے ہمیشہ یہ جواب دیا جاتا رہا ہے کہ پاکستان میں آئین سازی کا ایک نیا تجربہ کیا جا رہا ہے جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ اس لئے یہ کام بہت مشکل ہے اور اس میں لامحالہ دیر لگے گی۔ ہمیں امید ہے کہ وزیر اعظم کی یہ ہدایات محض رسمی اور نمائشی ثابت نہیں ہوں گی بلکہ ان ہدایات کے بعد مختلف کمیٹیاں اپنے فرائض منصبی کو جلد از جلد پایہ تکمیل تک پہنچائیں گی اور اپنی رپورٹوں کی ترتیب و تدوین ان اعلیٰ، ارفع اور پاکیزہ مقاصد کی روشنی میں کریں گی جن کا قرارداد مقاصد میں واضح الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسے آئین کے متعلق سفارشات پیش کریں گی جو آزادی، مساوات، جمہوریت اور انصاف کے اسلامی اصولوں پر مبنی ہوگا۔''[39] پھر 6ر اکتوبر کو یہ خبر چھپی کہ

''مجلس دستور ساز کی بنیادی اصولوں کی کمیٹی، جس کی رپورٹ کے پیش ہونے پر گزشتہ سال ملک میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ اسمبلی کے آئندہ اجلاس کے دوران میں دوبارہ ضروری ترامیم کے بعد پیش کی جا رہی ہے..... خیال ہے کہ اسمبلی کا اجلاس دسمبر میں منعقد ہوگا۔''[40] لیکن وزیراعظم لیاقت علی خان کے لئے یہ دسمبر کبھی نہ آیا اور اس نے 16/اکتوبر 1951ء کو راولپنڈی کے ایک جلسہ عام میں پنجاب کی مُلّائیت اور صوبائی شاونزم کا شکار ہو کر جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

پاکستان میں مُلّائیت کی جانب سے مال و دولت، جاہ و جلال اور اختیار و اقتدار کے حصول کی یہ کوشش کوئی نئی نہیں تھی۔ اگرچہ اسلام کی تاریخ میں ایسا کئی بار ہوا کہ علمائے حق نے جابر و ظالم حکمرانوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے ترقی پسندانہ بلکہ انقلابی کردار ادا کیا۔ انہوں نے عظیم مقصد کے لئے قربانیاں بھی دیں لیکن ایسا بھی بہت مرتبہ ہوا کہ مفاد پرست یا اقتدار پسند مُلّاؤں نے اپنی تفرقہ بازی اور فتنہ پروری سے نہ صرف مسلم سلطنتوں کو غیر مستحکم کیا بلکہ انہیں تباہ و برباد کر دیا۔ برصغیر میں مسلمانوں کے تقریباً ایک ہزار سالہ عہد اقتدار کی تاریخ میں بھی ایسی مثالوں کی کمی نہیں ہے۔ اکثر و بیشتر مفاد پرست مُلّاؤں کی جانب سے یہ تخریب کاری اسلام کے احیا کے نام پر ہوتی تھی۔ دینی علوم کے نام نہاد ماہرین اسلام کو ایک جامع اور بے لچک نظریہ حیات کے طور پر پیش کرتے تھے۔ انہوں نے یہ عقیدہ استوار کر رکھا تھا کہ اجتہاد کا دروازہ چوتھی صدی ہجری کے بعد بند ہو گیا تھا۔ قرآن و حدیث کی جو تعبیر و تشریح اس وقت ہو گئی تھی اس سے سرمو انحراف نہیں ہو سکتا۔ وہ مسلم عوام کو وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے کی ممانعت کرتے تھے۔ وہ ہر چیز کو بدعت قرار دیتے تھے اور یہ فتویٰ صادر کرتے تھے کہ جو راستہ صدیوں پہلے متعین ہو چکا ہے اس پر چلو۔ ان کے اس فتوے کی بنیاد اس حقیقت پر ہوتی تھی کہ ان کے پرانے ''دینی راستے'' کے ساتھ ان کے اپنے یا ان کے سرپرست طبقہ کے مفادات وابستہ ہوتے تھے۔ ان کی جانب سے تقلید پر اصرار اس لئے بھی ہوتا تھا کہ وہ خود تبحر علمی، جدت فکر اور جرأت ایمانی کی نعمت سے محروم ہوتے تھے۔

حوالہ جات

باب : 1 قائداعظم کا سیکولر نظریۂ حکومت اور کراچی و پنجاب کے رجعت پسندوں کی طرف سے اس کی مخالفت

1- M. A. Jinnah, *The Speeches as Governer General*, Karachi, 1948, pp. 8-9

2- Chaudhri Mohammad Ali, *The Emergence of Pakistan*, Lahore, 1973 pp. 239-40

3۔ نوائے وقت۔3/ستمبر 1947ء

4۔ ایضاً۔24/اگست 1947ء

5۔ ایضاً۔3/ستمبر 1947ء

6- *The Eastern Times*, September 25,1947

7۔ نوائے وقت۔19/اکتوبر 1947ء

8- *The Pakistan Times*, October 9, 1947

9۔ نوائے وقت۔23/اکتوبر 1947ء

10- Ch. Mohammad Ali, *op. cit*, p. 297

11۔ نوائے وقت۔31/اکتوبر 1947ء

12۔ ایضاً۔4/نومبر 1947ء

13- *Dawn*, November 26, 1947

14- *Ibid*; November 27, 1947

15۔ نوائے وقت۔30/نومبر 1947ء

16۔ ایضاً۔3/دسمبر 1947ء

17۔ ایضاً۔12/دسمبر 1947ء

18۔ ایضاً۔17/دسمبر 1947ء

19- (i) M. S. M. Sharma, *Peeps into Pakistan*, Patna, 1954, pp.134-35

(ii) S.M. Ikram, *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan, 1858-1951*, Lahore, 1965. pp. 428-30

باب:2 سیکولر نظام حکومت کے علمبرداروں کی پسپائی اور مُلّاؤں کی چڑھائی

1- *The Pakistan Times*, December 20, 1947

2- *Dawn*, December 29, 1947

3- *The Eastern Times*, December 2, 1947

4- *Ibid*; December 30, 1947

5۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ اسلام کا نظام حیات (چند نشری تقریریں) لاہور۔ 1947ء۔ ص34

6۔ ایضاً۔ ص35

7۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ اسلام اور جدید معاشی نظریات۔ لاہور۔ 1963۔ ص ص151-52

8۔ ایضاً۔ ص144

9۔ انقلاب۔ 4/ جنوری 1948ء

10۔ نوائے وقت۔ 12/ دسمبر 1947ء

11- *The Pakistan Times*, January12, 1948

12۔ نوائے وقت۔ 12/ جنوری 1948ء

13- *The Pakistan Times*, January 14, 1948

14۔ طلوع اسلام (ماہنامہ)۔ دسمبر 1963 ص22

15۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم۔ مکتبہ جماعت اسلامی جمال پور۔ پٹھانکوٹ۔ 1941ء ص8

16۔ ایضاً۔ ص37

17۔ ایضاً۔ ص45

18۔ ایضاً۔ ص58

19۔ ایضاً۔ص ص69-70

20۔ ایضاً۔ص ص92-94

21۔ ایضاً۔ص ص130-31

22۔ ایضاً۔ص132

23۔ ایضاً۔ص165

24۔ ترجمان القرآن۔فروری1946ء

25۔ نوائے وقت۔یکم مئی1946ء

26- Muhammad Munir, *From Jinnah to Zia*, Lahore, 1979, p. 134

27- *Report of The Court of Inquiry, Punjab Disturbances 1953*, Lahore, 1954, p.228

28- *The Pakistan Times*, January 15, 1948

29- *The Eastern Times*, January 27, 1948

30۔ نوائے وقت۔24/جنوری1948ء

31- *The Eastern Times*, January 28, 1948

32- *Ibid.*, January 30, 1948

33- *Ibid;*

34۔ نوائے وقت۔31/جنوری1948ء

35- *The Pakistan Times*, February 4, 1948

36۔ انقلاب۔4/فروری1948ء

37- *The Eastern Times*, February 5, 1948

38- *Ibid*; February 10, 1948

39- *Dawn*, February 3, 1948

40۔ نوائے وقت۔19/فروری1948ء

41۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی۔اسلام کا نظام حیات۔محولہ بالا۔ص ص18-19

42۔ نوائے وقت۔19/فروری1948ء

43- M. A. Jinnah; *Speeches As G.G. op. cit*; p. 60

44- *The Pakistan Times*, February 10, 1948

45- M.A Jinnah; *Speeches As G.G. op. cit*; p. 67

46۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی۔اسلام کا نظام حیات۔محولہ بالا۔ص ص 16،20،21

47۔ نوائے وقت۔22/فروری1948

48۔ ایضاً۔یکم مارچ1948ء

49۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی۔اسلام کا نظام حیات۔محولہ بالا۔ص21

50- *The Eastern Times*, March 2, 1948

51۔ انقلاب۔9/مارچ1948ء

52- *The Eastern Times*, March 12, 1948

53۔ امروز۔10/مارچ1948ء

54۔ نوائے وقت۔10/مارچ1948ء

55- *The Eastern Times*, March 11, 1948

56۔ نوائے وقت۔20/مارچ1948ء

57- M.A Jinnah; *Speeches As G.G. op. cit*; pp. 86-89

58- *Ibid*; pp. 94-95

59- *Ibid*; pp. 103-04

60- *Ibid*; p. 109

61۔ امروز۔13/مارچ1948ء

62۔ ایضاً۔27/مارچ1948ء

باب:3 قائداعظم کی گرتی ہوئی صحت اور مُلّاؤں کی بڑھتی ہوئی یلغار

1- *The Pakistan Times*, December 13, 1947

2- *The Eastern Times*, December 16, 1947

3- *The Pakistan Times*, December 19, 1947

4۔ امروز۔26/مارچ1948ء

5- *Dawn*, April 3, 1948

6۔ امروز۔2/اپریل1948ء

7۔ ایضاً۔3/اپریل1948ء

8۔ ایضاً4/اپریل1948ء

9۔ انقلاب9/اپریل1948ء

10- *The Pakistan Times*, April 6, 1948

11۔ سیدابوالاعلیٰ مودودی۔ پردہ۔لاہور۔1966۔ص ص28،29،42-44،55،56

12- *The Eastern Times*, April 4, 1948

13۔ امروز۔7/اپریل1948ء

14۔ سیدابوالاعلیٰ مودودی۔مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش۔محولہ بالا۔ص130

15۔ ایضاً۔ص132

16۔ ایضاً۔ص168،169

17۔ ایضاً۔ص170

18- *Dawn*, April 6, 1948

19۔ سیدابوالاعلیٰ مودودی۔مرتد کی سزا اسلامی قانون میں۔(کتابچہ)لاہور۔1953ء ۔ص76

20۔ طلوع اسلام۔دسمبر1963ء۔ص13

21۔ سیدابوالاعلیٰ مودودی۔رسائل ومسائل۔لاہور۔1963ء ص ص152-53

22۔ ایضاً۔ص164-65

23۔ ایضاً۔ص174

24۔ ایضاً۔ص177

25۔ ایشیا۔14/جون 1969ء

26۔ سیدابوالاعلیٰ مودودی۔تفہیم القرآن۔جلد چہارم طبع چہارم۔اپریل1974۔ص287

27۔ ایضاً۔جلد پنجم۔طبع اول۔ستمبر 1971ء ص ص72-271

28۔ ایضاً۔ص271

29۔ ترجمان القرآن۔اکتوبر1969ء

30۔ سیدابوالاعلیٰ مودودی۔تفہیم القرآن۔جلدسوئم۔طبع اول۔ص341 سن اشاعت 1968

31۔ امروز۔26رجولائی1950ء

32۔ سیدابوالاعلیٰ مودودی۔ختم نبوت۔لاہور1962ء۔ص65

33۔ انقلاب۔9راپریل1948ء

34۔ نوائے وقت۔30راپریل1948ء

35۔ (1)انقلاب۔9راپریل1948ء

(2)امروز۔9راپریل1948ء

36۔ نوائے وقت۔10راپریل1948ء

37۔ امروز۔10راپریل1948ء

38۔ انقلاب۔11راپریل1948ء

39۔ انقلاب۔13راپریل1948ء

40۔ انقلاب۔16راپریل1948ء

41۔ نوائے وقت۔17راپریل1948ء

42- *Dawn*, April 21, 1948

43۔ انقلاب۔18راپریل1948ء

44۔ ایضاً۔22راپریل1948ء

45۔ ایضاً۔24راپریل1948ء

46۔ ایضاً۔26راپریل1948ء

47۔ ایضاً۔4رمئی1948ء

48۔ ایضاً۔5رمئی1948ء

49- *The Pakistan Times*, May 5, 1948

50۔ امروز۔7رمئی1948ء

51۔ نوائے وقت۔7رمئی1948ء

52۔ طلوع اسلام۔دسمبر1963ء۔ص ص20-21

53۔ امروز۔8رمئی1948ء

54۔ نوائے وقت۔12رمئی1948ء

55۔ امروز۔14رمئی1948ء

56۔ ایضاً۔

57۔ انقلاب۔14رمئی1948ء

58- *The Pakistan Times*, May 15, 1948

59۔ نوائے وقت۔17رمئی1948ء

60۔ انقلاب۔19رمئی1948ء

61- *The Pakistan Times*, May 20, 1948

62۔ بحوالہ انقلاب۔19رمئی1948ء

63- Ch. Mohammad Ali, *op. cit*; p. 305

64۔ انقلاب۔29رمئی1948ء

65۔ ایضاً۔23رمئی1948ء

66۔ ایضاً۔27رمئی1948ء

67۔ ایضاً۔28رمئی1948ء

68۔ ایضاً۔29رمئی1948ء

69۔ ایضاً۔

70۔ نوائے وقت۔28رمئی1948ء

71۔ انقلاب۔2رجون1948ء

72۔ امروز۔18/جون1948ء

73۔ (1)امروز۔10،14اور25/جون1948ء

(2)انقلاب۔17/جون1948ء

74۔ ترجمان القرآن۔جون1948ء

75۔ انقلاب۔26/جون1948ء

باب:4 جناح بستر مرگ پر اور مُلّاؤں کی مسند اقتدار کے لئے دوڑ

1۔ امروز۔25/جون1948ء

2۔ ایضاً۔ 13/جون1948ء

3۔ ایضاً۔26/جون1948ء

4۔ نوائے وقت۔11/مارچ1948ء

5۔ انقلاب۔13/اپریل1948ء

6۔ ایضاً۔26/اپریل1948ء

7۔ ایضاً۔4/مئی1948ء

8۔ نوائے وقت۔3/جولائی1948ء

9۔ ایضاً۔2/جولائی1948ء

10۔ ایضاً۔3/جولائی1948ء

11۔ ایضاً۔23/جولائی1948ء

12۔ ایضاً۔

13۔ امروز۔10/جولائی1948ء

14۔ نوائے وقت۔10/جولائی1948ء

15- *The Pakistan Times*, July 4, 1948

16۔ نوائے وقت۔4/جولائی1948ء

17۔ ایضاً۔15/جولائی1948ء

18۔ ایضاً۔14/جولائی1948ء

19۔ انقلاب۔14/جولائی1948ء

20۔ امروز۔22/جولائی1948ء

21۔ نوائے وقت۔31/جولائی1948ء

22۔ ایضاً۔6/اگست1948ء

23۔ ایضاً۔13/اگست1948ء

24۔ امروز۔12/اگست1948ء

25۔ ایضاً14/اگست1948ء

26۔ نوائے وقت۔15/اگست1948ء

27۔ ایضاً۔18/اگست1948ء

28۔ امروز۔18/اگست1948ء

29۔ ایضاً۔21/اگست1948ء

30۔ نوائے وقت۔25/اگست1948ء

31۔ ایضاً۔

32- *The Pakistan Times*, August 24, 1948

33- *Ibid*;

34- *Ibid*; August 25, 1948

35۔ انقلاب۔26/اگست1948ء

36۔ نوائے وقت۔13/اگست1948ء

37- *The Pakistan Times*, August 26, 1948

38- *Ibid*; August 13, 1948

39۔ امروز۔31/اگست1948ء

40۔ نوائے وقت۔28/اگست1948ء

41- *Report of the Court of Inquiry, Punjab Disturbances, 1953, op. cit*; p.15

42۔ نوائے وقت۔29/اگست1948ء

43۔ ایضاً۔یکم ستمبر1948ء

44۔ امروز۔4/ستمبر1948ء

45۔ نوائے وقت۔4/ستمبر1948ء

46۔ ایضاً۔3/ستمبر1948ء

47۔ تسنیم۔یکم جنوری1956ء

48۔ ترجمان القرآن۔اگست1948ء

49- *The Pakistan Times*, September 5, 1948

50۔ انقلاب۔4/ستمبر1948ء

51۔ ایضاً۔7/ستمبر1948ء

52۔ ایضاً۔12/ستمبر1948ء

53۔ نوائے وقت۔17/ستمبر1948ء

54۔ ایضاً۔

55۔ ایضاً۔19/ستمبر1948ء

باب:5 جہادِ کشمیر کے لئے حکومت نے اسلام کا نام استعمال کر کے مُلّاؤں کو دبالیا، جنگ بندی کے بعد مُلّاؤں نے اقتدار کے حصول کے لئے پھر یلغار کر دی

1۔ انقلاب۔19/ستمبر1948ء

2۔ ایضاً۔22/ستمبر1948ء

3۔ ایضاً۔23،24/ستمبر1948ء

4۔ نوائے وقت۔9/اکتوبر1948ء

5۔ ایضاً۔10/اکتوبر1948ء

6۔ امروز۔11/اکتوبر1948ء

7۔ انقلاب۔10/اکتوبر1948ء

8۔ نوائے وقت۔10/اکتوبر1948ء

9۔ ایضاً۔

10۔ ایضاً۔11/اکتوبر1948ء

11۔ ایضاً۔18/اکتوبر1948ء

12۔ ایضاً۔28/اکتوبر1948ء

13۔ ایضاً۔30/اکتوبر1948ء

14- *The Pakistan Times*, October 7, 1948

15- *Ibid*; October 8, 1948

16- *Ibid*; October 8, 1948

17۔ نوائے وقت۔11/اکتوبر1948ء

18۔ امروز۔26/اکتوبر1948ء

19۔ ایضاً۔

20۔ انقلاب۔23/ستمبر1948ء

21۔ نوائے وقت۔25/ستمبر1948ء

22۔ ایضاً۔26/ستمبر1948ء

23۔ ایضاً۔24/نومبر1948ء

24۔ ایضاً۔23/دسمبر1948ء

25۔ ایضاً۔14/نومبر1948ء

26۔ ایضاً۔18/دسمبر1948ء

27۔ ایضاً۔20/دسمبر1948ء

28- *The Pakistan Times*, December 22, 1948

29۔ نوائے وقت۔25/دسمبر1948ء

30۔ ایضاً۔26/دسمبر1948ء

31۔ ایضاً۔29/دسمبر1948ء

32۔ ایضاً۔6/جنوری1949ء

33۔ ایضاً۔17/جنوری1949ء

34۔ ایضاً۔

35- *The Pakistan Times*, January 23, 1949

36- *Ibid*; January 25, 1949

37- *Ibid*; January 22, 1949

38- *Ibid*; January 27, 1949

39۔ امروز۔3/جنوری1949ء

40۔ نوائے وقت۔27/جنوری1949ء

41- *The Pakistan Times*, February 9, 1949

42۔ امروز۔13/فروری1949ء

43۔ نوائے وقت۔30/جنوری1949ء

44- *Dawn*, February 2, 1949

45- *Ibid*; February 4,5, 1949

46- *Ibid*; February 9, 1949

47- *The Pakistan Times*, February 2, 1949

48- *Dawn*, February 10, 1949

49- *Ibid*; February 13, 1949

50- *Ibid*; February 16, 1949

51۔ امروز۔5/فروری1949ء

52- *The Pakistan Times*,February 11, 1949

53- Leonard Binder, *Religion And Politics in Pakistan*, University of California, Berkley 1961, p. 140

54۔ نوائے وقت۔14/فروری1949ء

55۔ امروز۔19 / فروری 1949ء

56۔ امروز۔5 / جنوری 1949ء

باب:6 قرارداد مقاصد کی منظوری سے ملک میں مُلاّ ئیت اور فرقہ واریت کو مضبوط بنیاد فراہم کردی گئی

1- Jehan Ara Shah Nawaz, *Father And Daughter*, Lahore, 1971. pp. 247- 48

2۔ نوائے وقت۔4 / مارچ 1949ء

3- *The Pakistan Times,* March 4, 1949

4۔ امروز۔10 / مارچ 1949ء

5- *The Civil And Military Gazette*, March 5, 1949

6- *Dawn*, March 5, 1949

7۔ نوائے وقت۔7 / مارچ 1949ء

8- *Constituent Assembly of Pakistan Debates, Vol. V, Fifth* Session, 1949, Karachi, 1949. p.49

9- *Ibid*; pp. 13-17

10- *Ibid*; pp. 43-49

11۔ امروز۔5 / مارچ 1949ء

12- *Constituent Assembly Debates, op. cit*; p. 13-17

13- *Ibid*; p. 48

14- *Dawn*, March 5, 1949

15- *Constituent Assembly Debates, op. cit*; p. 91

16- *Ibid*; p. 18

17- M.Rafiq Afzal (ed). *Speeches of Quaid-i-Millat Liaquat Ali Khan (1949-51)*, Lahore, 1975, pp. 238-44

۱۸۔ امروز۔17/مارچ1949ء

۱۹۔ ایضاً۔یکم اپریل1949ء

۲۰۔ ایضاً۔4/اپریل1949ء

21- *Jehan Ara Shah Nawaz, op. cit*, pp. 247-48

22- *Dawn*, April17, 1949

23- *Ibid*; April 16, 1949

۲۴۔ نوائے وقت۔16/مارچ1949ء

۲۵۔ ایضاً۔2/مئی1949ء

۲۶۔ ایضاً۔26/مئی1949ء

باب:7 احراری مولویوں کی طرف سے احمدیوں کے خلاف بھرپور مہم کا پس منظر

۱۔ الفضل۔23/اگست1948ء

2- *The Pakistan Times*, December 19, 1947

۳۔ انقلاب۔10/جون1948ء

4- *The Pakistan Times*, December 15, 1948

۵۔ نوائے وقت۔19/جنوری1949ء

6- *The Pakistan Times*, September 9,11, 1947

7- *Ibid*; November 4, 1947

8- *Ibid*; December 12, 1947

۹۔ نوائے وقت۔28/جنوری1948ء

۱۰۔ ایضاً۔5/مارچ1949ء

11- *Constituent Assembly Debates, op. cit*; p. 66

۱۲۔ امروز۔17/مارچ1949ء

باب:8 مُلّاؤں نے جاگیرداری اور زمینداری نظام کے حق میں فتوے دیئے اور کسانوں کے لئے زرعی اصلاحات کی مخالفت کی

1۔ امروز۔6/مارچ1949ء

2- *The Pakitan Times*, March 15, 1949

3۔ نوائے وقت۔17/مارچ1949ء

4۔ امروز۔18/مارچ1949ء

5- *The Pakistan Times*, March 20, 1949

6- *Ibid*; March 23, 1949

7۔ امروز۔2/مئی1949ء

8۔ ایضاً۔3/مئی1949ء

9- *Dawn*, April 29, 1949

10۔ امروز۔2/جولائی1949ء

11۔ ایضاً۔3/جولائی1944ء

12- *The Civil And Military Gazette*, July 3, 1949

13۔ امروز۔18/جولائی1949ء

14- *The Civil And Military Gazette*, July 26, 1949

15- *Ibid*; August 26, 1949

16- *Ibid*; August 27, 1949

17- *The Pakistan Times*, May 11, 1949

18- *The Civil And Military Gazette*, August 30, 1949

19۔ نوائے وقت۔2/ستمبر1949ء

20۔ امروز۔2/ستمبر1949ء

21- *The Pakistan Times*, September 11, 1949

باب:9 پنجاب میں دولتانہ۔ممدوٹ دھڑوں کی سیاسی کشمکش میں احراری مُلّا دولتانہ دھڑے کے ساتھ، جماعت اسلامی ممدوٹ دھڑے کے ساتھ

1۔ امروز۔4/ستمبر1949ء

2۔ ایضاً۔9/ستمبر1949ء

3- *Dawn*, August 2, 1949

4۔ امروز۔6/ستمبر1949ء

5- *The Pakistan Times*, September 9, 1949

6- *The Civil And Military Gazette*, September 10, 1949

7- *Ibid*; September 11, 1949

8- *The Pakistan Times*, September 14, 1948

9- *Ibid*; September 30, 1949

10۔ نوائے وقت۔2/اکتوبر1949ء

11۔ امروز۔3/اکتوبر1949ء

12- *Dawn*, October 4, 1949

13- *Ibid*; October 6, 1949

14۔ نوائے وقت۔15/اکتوبر1949ء

15- *Dawn*, October 15, 1949

16- *The Pakistan Times*, December 24, 1949

17- *Report of the Court of Inquiry, op. cit*; p. 15

18- *Ibid*; p. 16

19۔ نوائے وقت۔21/نومبر1949ء

20۔ ایضاً۔17/ستمبر1949ء

21- *Report of the Court of Inquiry, op. cit*; p. 6

22۔ نوائے وقت۔12/دسمبر1949ء

23- *Report of the Court of Inquiry, op. cit*; p. 17

24۔ امروز۔23/اکتوبر1949ء

25- *The Pakistan Times*, January 7, 1950

26- *Ibid*; February 15, 1950

باب:10 ملک میں اسلامی نظام کے بارے میں مختلف تاویلیں اور لیاقت کی دورۂ امریکہ میں اسلام اور مغربی جمہوریت کی یکسانیت پر تقریریں

1- *Proceedings of the First All Pakistan Political Science Conference 1950*, Lahore, 1950

2۔ نوائے وقت۔13/مارچ1950ء

3۔ امروز۔14/مارچ1950ء

4۔ نوائے وقت۔13/مارچ1950ء

5۔ ایضاً۔25/مارچ1950ء

6۔ ایضاً۔24/نومبر1948ء

7۔ ایضاً۔24/مارچ1950ء

8۔ ایضاً۔26/مارچ1950ء

9- *The Pakistan Times*, April 1, 1950

10۔ نوائے وقت۔12/اپریل1950ء

11۔ ایضاً۔

12۔ ایضاً۔3/اپریل1950ء

13- *Speeches of Quaid-Millat Liaquat Ali Khan, op. cit*; p. 366

14- *Ibid*; pp. 369-73

15- *Ibid*; p. 374

16- *Ibid*; p. 381

17- *Ibid*; p. 416

18۔ نوائے وقت۔13/مارچ1950ء

19۔ ایضاً۔25/مارچ1950ء

20۔ ایضاً۔13/مئی1950ء

21۔ ایضاً۔24/مئی1950ء

22۔ امروز۔8/اپریل1950ء

23- *The Pakistan Times*, April 25, 1950

24- *Ibid*; April 20, 1950

25۔ امروز۔29/مارچ1950ء

26۔ ایضاً۔11/اپریل1950ء

27۔ نوائے وقت۔31/مئی1950

28۔ امروز۔17/جون1950ء

29۔ امروز۔

30- *The Pakistan Times*, June, 23, 1950

31- *Ibid*; May 29, 1950

32- *Report of the Court of Inquiry, op. cit*; pp. 19-24

33۔ نوائے وقت۔8/مارچ1950ء

34۔ امروز۔29/اپریل1950ء

35۔ ایضاً۔28/جون1950ء

36۔ ایضاً۔29/جون1950ء

37۔ ایضاً۔13/جولائی1950ء

38- *Dawn*, July 25, 1950

39۔ نوائے وقت۔26/جولائی 1950ء

40- *Dawn*, July 29 and 30, 1950

41- *Ibid*; August 9, 1950

42- *Ibid*; August 15, 1950

43۔ امروز۔18/ستمبر 1950ء

باب: 11 آئین سازی کے لئے بنیادی اصولوں اور بنیادی حقوق کی رپورٹوں کو مُلّاؤں نے خلاف اسلام قرار دے دیا

1۔ نوائے وقت۔30/ستمبر 1950ء

2- *The Civil And Military Gazette*, October 1, 1950

3- *Leonard Binder, op. cit.*, pp. 383-429

4- *The Pakistan Observer,* Dacca, October 1, 1950

5۔ نوائے وقت۔4،5/اکتوبر 1950ء

6۔ ایضاً۔7/اکتوبر 1950ء

7۔ ایضاً۔9/اکتوبر 1950ء

8۔ ایضاً۔11/اکتوبر 1950ء

9۔ ایضاً۔

10- *The Civil And Military Gazette*, October, 11 1950

11- *Report Of the Court of Inquiry, op. cit*; pp. 24-25

12۔ نوائے وقت۔16/اکتوبر 1950ء

13۔ ایضاً۔20/اکتوبر 1950ء

14۔ ایضاً۔28/اکتوبر 1950ء

15۔ صدیق علی خان۔بے تیغ سپاہی۔کراچی۔1971ء ص 547

16۔ نوائے وقت۔3/نومبر 1950ء
17۔ ایضاً۔5/نومبر 1950ء
18۔ ایضاً۔6/نومبر 1950ء
19۔ ایضاً۔3/نومبر 1950ء
20۔ ایضاً۔6اور 9/نومبر 1950ء
21۔ ایضاً۔6/نومبر 1950ء
22۔ ایضاً۔16/نومبر 1950ء
23۔ ایضاً۔18/اکتوبر 1950ء
24۔ ایضاً۔
25۔ ایضاً۔17/نومبر 1950ء
26۔ ایضاً۔23/نومبر 1950ء
27۔ قاصد۔لاہور۔2/اکتوبر 1950ء
28۔ نوائے وقت۔20/نومبر 1950ء

باب:12 پنجاب کی انتخابی مہم...... پنجابی شاونسٹوں اور مُلّاؤں کی جانب سے لیاقت کے خلاف نفاذ اسلام کی مہم

1۔نوائے وقت۔23اور 30/نومبر 1950ء
2۔ایضاً۔27/نومبر اور 7/دسمبر 1950ء
3- *The Pakistan Times*, November 28, 1950
4۔ امروز۔30/اکتوبر 1950ء
5- *The Pakistan Times*, December 18, 1950
6- *The Civil And Military Gazette*, December 21, 1950
7- *Dawn*, December 22, 1950
8- *The Civil And Military Gazette*, December 25, 1950

9۔ نوائے وقت۔30/دسمبر1950ء

10۔ پنجاب مسلم لیگ کا انتخابی منشور۔شائع کردہ چودھری محمد اقبال چیمہ سیکرٹری پنجاب مسلم لیگ۔لاہور۔دسمبر1950ء ص ص17-18

11۔ نوائے وقت۔4/جنوری1951ء

12- *Report of the Court of Inquiry, op. cit*; p. 28

13- *Dawn*, December 30, 1950

14۔ نوائے وقت۔18/جنوری1951ء

15۔ ایضاً۔19/جنوری1951ء

16۔ ایضاً۔25/جنوری1951ء

17۔ ایضاً۔2/فروری1951ء

18- *The Civil And Military Gazette*, February 1, 1951

19- *The Pakistan Times*, February 3, 1951

20۔ نوائے وقت۔3/فروری1951ء

21۔ ایضاً۔18/فروری1951ء

22۔ ایضاً۔24اور25/فروری1951ء

23- *The Pakistan Times*, February 25, 1951

24- *Ibid*; February 26, 1951

25۔ امروز۔9/مارچ1951ء

26- *Dawn*, March 9, 1951

باب:13 ملک میں مذہبی جنون کی فضا اور لیاقت علی کا قتل

1- *Dawn*, April 2 and 3, 1951

2- *Ibid*; April 5, 1951

3- *Ibid*; April 8, 1951

4- *Ibid*; April 9, 1951

5- *Proceedings of the Second All Pakistan Political Science Conference, Paksitan,* Herald Press, Karachi, 1952

6۔ نوائے وقت۔5اور12/اپریل1950ء

7- *Proceedings, op. cit;*

8- *Ibid;*

9 ۔ جہاد۔30/اپریل1951ء

10۔ ایضاً۔2/مئی1951ء

11۔ امروز۔یکم مئی1951ء

12- *Report of the Court of Inquiry, op. cit*; pp. 28-29

13- *Ibid.*

14۔ امروز۔24/اپریل1951ء

15- *Dawn*, May 6, 1951

16- *Report of the Court of Inquiry, op.cit*; pp. 29-30

17- *Ibid*; pp. 30-31

18۔ امروز۔19/مئی1951ء

19- *Dawn*, May 25, 1951

20۔ امروز5/جون1951ء

21۔ ایضاً۔6/جون1951ء

22- *The Pakistan Times*, June 11, 1951

23- *Dawn*, June 11, 1951

24۔ جہاد۔11/جون1951ء

25- *Dawn*, June 15, 1951

26- *Ibid*; June 24, 1951

27- *Ibid*; July 8, 1951

28- *Ibid*; July 11,1951

29- (i) *The Pakistan Times*, July 15, 1951

(ii) *Dawn*, July 16, 1951

30۔ امروز۔18/جولائی1950ء

31- *Dawn*, August 3, 1951

32- *Report of the Court of Inquiry, op. cit*; p. 31

33- *The Pakistan Times*, July 18, 1951

34- *Dawn*, August 17, 1951

35- *Report of the Court of Inquiry, op. cit*; pp. 31-32

36- *Ibid.*

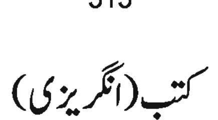
37- *Ibid*; pp. 34-35

38۔ نوائے پاکستان۔یکم اکتوبر1951ء

39۔ ایضاً۔3/اکتوبر1951ء

40۔ ایضاً۔6/اکتوبر1951ء


کتابیات



Afzal, M. Rafiq (ed), *Speeches and Statements of Quaid-e-Millat Liaqat Ali Khan (1949-51)*, Research Society of Pakistan, University of Punjab, Lahore, 1975 Ist Printed 1967.

Ali, Chaudhry Mohammad, *The Emergence of Pakistan,* Originally Published by Columbia University Press, New York and London, 1967. Reprinted by the Research Society of Paksitan, University of Punjab, Lahore, 1974.

Binder, Leonard, *Religion and Politics in Pakistan*, University of California, Berkley, 1961

Ikram, S. M., *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan, 1858-1951*. Shiekh Mohammad Ashraf, Lahore, 1965

Munir, Mohammad, *From Jinnah to Zia*, Vanguard, Lahore, 1979

Shah Nawaz, Jehan Ara, *Father And Daughter*, Nigarshat, Lahore 1971

Sharma, M. S. M., *Peeps into Pakistan*, Pustak Bhandar, Patna, 1954

کتب (اردو)

صدیق علی خان۔ بے تیغ سپاہی۔ الائڈ بک کارپوریشن۔ کراچی 1971ء
مودودی، سید ابوالاعلیٰ اسلام اور جدید معاشی نظریات۔ اسلامک پبلیکیشنز۔ لاہور 1963
اسلام کا نظامِ حیات (چند نشری تقریریں)۔ لاہور 1948ء
پردہ۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ لاہور 1966ء
تفہیم القرآن۔ جلد چہارم۔ مکتبہ تعمیر انسانیت۔ لاہور طبع چہارم۔ اپریل 1974ء
تفہیم القرآن۔ جلد پنجم۔ مکتبہ تعمیر انسانیت۔ لاہور۔ طبع اول۔ 1971ء
ختم نبوت۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ لاہور 1962ء
رسائل و مسائل۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ لاہور 1963ء
مرتد کی سزا، اسلامی قانون میں (کتابچہ)۔ لاہور 1953ء
مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم۔ مکتبہ جماعت اسلامی۔
جمال پور۔ پٹھانکوٹ 1941ء

دستاویزات و سرکاری مطبوعات

Constituent Assembly of Pakistan Debates, Fifth Session 1949, Government of Pakistan, Karachi, 1949.
Proceedings of the First All Pakistan Political Science Conference 1950, Punjab University Press, Lahore.1950.
Proceedings of the Second All Pakistan Political Science Conference 1952, Pakistan Herald Press, Karachi, 1952.

Report of the Court of Inquiry, Punjab Disturbances,
Government Printing Press, Lahore, 1954.

پنجاب مسلم لیگ کا انتخابی منشور۔شائع کردہ چودھری محمد اقبال
سیکرٹری پنجاب مسلم لیگ لاہور 1950ء

اخبارات وجرائد

The Civil And Military Gazette, Lahore, Files of 1949
Dawn, Karachi Files of 1947-51.
The Eastern Times, Lahore, Files of 1947 and 1948.
The Pakistan Observer, Dacca, Files of 1950-51.
The Pakistan Times, Lahore, Files of 1947-51

روزنامہ امروز۔لاہور۔فائلیں 1948ء تا 1951ء
روزنامہ انقلاب لاہور۔فائلیں 1948ء
نوائے وقت لاہور۔فائلیں 1947ء تا 1951ء
ماہنامہ ترجمان القرآن۔فروری 1946ء تا 1951ء
ماہنامہ طلوع اسلام۔شمارہ دسمبر 1963ء

اشاریہ

آ

ا

پ

ش

م

ی